جنوری 2024
www.pklibrary.com
دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
قیمت 150 روپے
بانی
معراج رسول

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

سالِ نو مبارک

جلد54 • شمارہ 01 • جنوری 2024 • زرِ سالانہ 3000 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 200 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر229 کراچی74200 • فون (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیر : لبنیٰ خیال

نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

مارکیٹنگ و سرکولیشن مینجر

محمد شہزاد خان

0333-2256789

HAPPY NEW YEAR

2024

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من...... السلام علیکم!

تو نیا سال ہے تو دکھا صبح نئی، شام نئی
ورنہ اِن آنکھوں نے دیکھے ہیں نئے سال کئی

سال 2024ء کا پہلا شمارہ مبارک باد کے ساتھ حاضر ہے۔ جاتے سال کو الوداع کہیں یا پھر نئے سال کو خوش آمدید...... لہو میں ڈوبے فلسطین کی حالتِ زار ان دنوں کا تلخ ترین سچ ہے۔ عالمی جنگی مجرم، انسانیت کے دشمن، قاتل اور غاصب معصوم بچوں، نہتے شہریوں پر فاسفورس بموں سے وحشیانہ حملے کر کر کے ہزاروں فلسطینیوں کو شہید کر چکے ہیں۔ ان کے ناپاک عزائم جاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دل کی گہرائیوں سے دعائے خاص ہے کہ محصور فلسطینیوں کی دادرسی فرمائے۔ ملکی سطح پر بھی فلسطین سے اظہارِ یکجہتی کے لیے نئے سال کی آمد پر کسی بھی قسم کے جشن پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ تمام پاکستانیوں سے اپیل ہے کہ مظلوم فلسطینیوں کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کریں اور نئے سال کی صبح کا آغاز سادگی اور بھرپور دعا سے کریں۔ چلتے چلتے گزشتہ سال کی کامیابیوں اور ناکامیوں پر نظر ڈالیں...... اور گزرے سال کی غلطیوں کو دہرانے کے بجائے درست کرنے کی کوشش کریں۔ گزشتہ سال مہنگائی، سیاسی بے چینی، بے یقینی اور عدلیہ کے حوالے سے اتار چڑھاؤ...... سیاسی تصادم جیسے المناک واقعات کا حامل رہا...... دردِ دل سے سوچیں کہ جس چیز نے ملک اور معیشت کو تباہ کیا، وہ سیاسی عدم استحکام، اداروں کے درمیان کشیدگی اور سیاسی رسّاکشی ہے جس نے قوم کو بھی تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ نئے سال کے آغاز پر امید کی صرف ایک کرن دکھائی دیتی ہے جس پر ملک کی ترقی، معاشی استحکام کا دارومدار ہے۔ وہ ہے آنے والے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات۔ عوام اور پوری قوم کو امید ہے کہ اب کی بار ہم ایسا لیڈر منتخب کریں جو ملک اور عوام کے لیے ہر لحاظ سے ہر شعبے کے لیے ترقی کا ضامن ہو۔

آیئے نئے سال کی پہلی محفل میں چلتے ہیں جہاں آپ کے نئے ولولے، خوب صورت تجزیے اور تبصرے بھرپور انداز میں منتظر ہیں۔

سڈنی، آسٹریلیا سے ڈاکٹر ارسلان شاہ اپنے تفصیلی تبصرے اور خوب صورت باتوں کے گلدستے کے ساتھ ”تقریباً ایک سال کے وقفے کے بعد ایک بار پھر سے آپ کے ساتھ تجدیدِ تعلق کرنے کے لیے حاضر ہوں۔ فاصلہ یقیناً ہے لیکن دل میں بالکل نہیں کیونکہ جاسوسی سے محبت سمجھیں گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اس لیے ایک بار پھر وقت نکال کر آپ کی کاوشوں کو سراہنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ (بے حد نوازش) اس وقت جاسوسی ڈائجسٹ کے بارہ پھولوں جیسے بارہ شماروں سے بھرا 2023ء کا گلدستہ میں اپنے سامنے سجائے بیٹھا ہوں تاکہ ان سب کی مہک سے حظ اٹھاتے ہوئے اپنے احساسات آپ تک پہنچا سکوں۔ اپنے پیارے بھائی حنان کا بھی شکریہ ادا کروں گا جس کی وجہ سے مجھے یہاں آسٹریلیا میں بھی جاسوسی وقفے وقفے سے لیکن باقاعدگی سے مل جاتا ہے۔ تو سال بھر کی خاص خاص کہانیوں پر میرا تجزیہ کچھ اس طرح سے ہے۔ جنوری کے شمارے کا ٹائٹل پسند نہیں آیا۔ ضرورت سے بڑے چہروں نے لڑکی کا چہرہ ہی چھپا دیا۔ امجد رئیس نے سنسنی خیز کہانی زندہ مردہ پیش کر کے دل جیت لیے۔ قدم قدم پر رنگ بدلتی اس داستان نے ابتدا سے اختتام تک جکڑے رکھا۔ تراجم میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ سرورق کی کہانیوں میں اسما قادری نے پگھلتے رشتے خوب لکھی جبکہ ایچ اقبال خوبصورت موت کے ساتھ زیادہ متاثر نہ کر سکے۔ بہت ہی فلمی سی لگی۔ مختصر کہانیاں میں طاہر جاوید مغل نے چارہ گر کی صورت میں ایسی محبت کی کہانی لکھی جو دل میں اتر گئی۔ عائشہ نصیر کی چکما بھی بہترین رہی۔ فروری کے شمارے میں لبوں پر انگلی رکھے ٹائٹل گرل خوب صورت لگی۔ ٹائٹل پر ایکشن بھی اچھا پینٹ کیا گیا۔ سرورق کی دونوں کہانیاں شاندار تھیں۔ فاروق انجم نے وحشت اور محبت کے نام سے جہاں ایک زبردست جرم کہانی لکھی وہاں یعقوب بھٹی بھی پیچھے نہ رہے اور بلوچستان میں ہونے والی عالمی سازشوں کے پس منظر میں وطن پرست کے نام سے ایک شاہکار لکھ دیا۔ راغ اور بانو کی آپسی محبت کے ساتھ ساتھ وطن سے محبت بھی قابلِ رشک رہی۔ مختصر کہانیوں میں عمران قریشی نے میں لکھ کر کمال کر دیا۔ مدتوں یاد رہنے والی ایک یادگار کہانی تھی۔ عکس فاطمہ کی شرلاک ہومز کے پس منظر میں لکھی رسمِ قتل بھی پسند آئی۔ فروری کے شمارے میں کہانیاں تو خوب تھیں لیکن مجھے آپ کا معراج رسول کو پیش کیا گیا خراجِ تحسین بہت زیادہ پسند آیا۔ مختلف رائٹرز کی ان کے بارے میں آرا پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔ مارچ کے شمارے کا ٹائٹل بھی ایک خوب صورت ٹائٹل کہا جا سکتا ہے۔ طاہر جاوید مغل کی عمران جونیئر سیریز کی کہانی زہریلا تریاق کا دوسرا اور آخری حصہ ابتدائی صفحات پر پیش کیا گیا اور ایک بھرپور کہانی تھی۔ عمران جونیئر اور تابش کی جوڑی کمال

ہے اور ان دونوں نے جعلی ادویات بنانے والوں کے خلاف زبردست کارروائی کرکے دل جیت لیے۔ سرورق کی کہانی اسما قادری نے گرد و باد بہت اچھی لکھی۔ سسپنس سے بھرپور اس کہانی میں رشتوں میں بدگمانی پیدا کرنے والے عناصر پر خوب گہرائی سے روشنی ڈالی گئی۔ یعقوب بھٹی نے مارخور کے نام سے اناڑی سیریز کی داغ بیل ڈالی اور شاید یہ اس سال کی رنگوں میں شائع ہونے والی سب سے اعلیٰ کہانی تھی۔ مجھے اس سے بڑھ کر اس سال کوئی اور سرورق کہانی نہیں لگی۔ مختصر کہانیوں میں عائشہ نصیر کی مہربان اجنبی اور مظہر سلیم ہاشمی کی ہوشیار پسند آئیں۔ اپریل کے شمارے کا ٹائٹل دل میں کھب جانے والی خوب صورتی کا حامل تھا۔ میرے نزدیک یہ سال کے بہترین ٹائٹلز میں اول نمبر رکھتا ہے۔ سرورق کی خوب صورتی کی وجہ سے امید تھی کہ سرورق کی کہانیاں بھی زبردست ہوں گی۔ زویا صفوان نے یہ توقع پوری کی۔ تجسس سے بھرپور سود و زیاں لکھ کر انہوں نے خوب معرکہ مارا۔ عبدالرب بھٹی کی فتنہ قامت ایک اچھی کوشش تھی لیکن ماورائی حصے پسند نہ آئے اور کچھ واقعاتی غلطیاں بھی تھیں جس کی وجہ سے کہانی غیر متاثر کن رہی۔ ابتدائی صفحات پر ایچ اقبال نے گمشدہ لمحے کی شکل میں ایک نفسیاتی ناول لکھا۔ ایک اچھی اٹھان والی کہانی ہونے کے باوجود اس کا اختتام جلد بازی کا شکار لگا اور کہانی ادھورے پن کا احساس چھوڑ گئی۔ جمال دتی کی قلا پا اپنے نام اور کام کی وجہ سے بہت پسند آئی جبکہ سیر نار اض کی یاد رفتہ بھی خوب رہی۔ مئی کے شمارے کا ٹائٹل بھی خوب صورت تھا اور ٹائٹل اسٹوریز بھی دونوں زبردست تھیں۔ مظہر سلیم ہاشمی نے اپنی سابقہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے پورے سال میں ایک ہی سرورق کہانی لکھی لیکن زیادہ شکایت بھی نہیں کرسکتے کیونکہ تجسس اور سسنی سے بھرپور کہانی لکھی تھی بس درخواست کرسکتے ہیں کہ سستی چھوڑ کر زیادہ لکھا کریں۔ راو مقتل میں سائیکو کلرز کی سائیکی پر اچھی روشنی ڈالی گئی۔ غلام قادر نے فریب ذات کے نام سے بڑے عرصے بعد ایسی کہانی لکھی جو واقعی پسند آئی۔ مئی کے شمارے میں تقریباً ساری ہی مختصر کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ عمران قریشی کی آخری پیشی عکس فاطمہ کی پہاڑ او جھل اور عبدالرب بھٹی کی راہ تو اچھی تھیں لیکن زویا صفوان کی سراب ان سب پر بازی لے گئی۔ حب رسولؐ کے نازک موضوع پر ایک شاہکار کہانی تھی۔ جون پر بڑے منہ والی حسینہ والا ٹائٹل بالکل بھی پسند نہیں آیا۔ ابتدائی صفحات پر امجد رئیس کے شاہکار شیطانی ہتھیار کا دوسرا اور آخری حصہ تھا جسے اس سال کی بہترین ترجمہ کہانی کہا جاسکتا ہے۔ ولن کی شیطانی چالیں اس ناول میں عروج پر تھیں۔ ایلکس اور اینڈریو نامساعد حالات کی وجہ سے کھل بنے اور کیا ہی خوب کھل بنے۔ شاندار کہانی تھی اور دل و دماغ پر نقش ہوکر رہ گئی۔ یہ اس شمارے کی واحد کہانی تھی جو ہر لحاظ سے چھائی رہی اور اس کے مقابلے میں کسی دوسری کہانی کی دال نہ گل سکی۔ سرورق کی کہانیاں البتہ جون کے مہینے میں تھوڑی ہلکی ہی لگیں۔ فاطمہ حسام کی کار آمد کے تو صفحات ہی اتنے کم تھے کہ نہیں جچی لیکن یعقوب بھٹی کی زور آزما بھی کوئی خاص پسند نہیں آئی۔ ان کی پاکستان کی محبت کے پس منظر میں لکھی گئی کہانیاں ہی زیادہ پسند آتی ہیں۔ مختصر کہانیوں میں بھی بس اسما قادری کی تاریک راستہ اور عائشہ نصیر کی بروقت فیصلہ کچھ بہتر لگیں۔ جولائی کے ٹائٹل پر حسینہ اپنی بلیو آئیز سے مجھے اپنا تاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ ابتدائی صفحات پر ایچ اقبال نے… لمحوں کے اسیر کے ذریعے اپنا اسیر بنانے کی کوشش کی لیکن انہیں جزوی کامیابی ہی ملی۔ کہانی میں بہت سے جھول تھے جنہوں نے کہانی کا حسن ماند کردیا۔ سرورق کی کہانیاں البتہ دلچسپ رہیں۔ انجل بھٹی نے عہد وفا کے نام سے مغرب کی نسل پرستی پر ایک بہترین کہانی لکھی۔ احمد سلیم سلیمی کی خواب سراب بھی ایک اچھی کہانی تھی۔ اس شمارے میں مختصر کہانیاں زیادہ پسند نہیں آئیں۔ اگست کا شمارہ اپنے ٹائٹل پر جشنِ آزادی مبارک کی وجہ سے قابلِ قبول لگا۔ اسما قادری نے ابتدائی صفحات پر شبِ دیجور لکھ کر وطن سے محبت کا بھرپور ثبوت دیا۔ ان کی اس کاوش کو سیلیوٹ کہ ایسی کہانیاں کبھی کبھی ہی معرضِ وجود میں آتی ہیں۔ بہت ہی زبردست انداز میں ایک شاندار کہانی لکھ کر انہوں نے کمال کردیا۔ زویا صفوان کی خوابیدہ جذبے بھی ایک اچھی کوشش رہی البتہ ڈرامائی عنصر زیادہ ہونے کے ساتھ ساتھ اینڈنگ بھی کچھ عجلت بھری لگی۔ عبدالرب بھٹی کی روپوش چہرہ ایک اوسط درجے کی کہانی تھی۔ اس ماہ عمران قریشی کی شہادت بہت اچھی کہانی لگی۔ ستمبر کا ٹائٹل نظرانداز کردینے کے قابل تھا اور میں نے وہ پوری خوشی سے کیا کیونکہ ابتدائی صفحات پر ایک بار پھر سے میرے پسندیدہ امجد رئیس براجمان تھے۔ سرد جہنم ایک لاجواب کہانی تھی اور مجھے یہ خواہش کرنے پر مجبور کردیا کہ آپ ہر ماہ ہی امجد رئیس کی کہانی پیش کیا کریں۔ ایسی لاجواب کہانیاں ہی جاسوسی کی خاصیت ہیں کیونکہ ایسے زبردست تراجم پاکستان کے کسی دوسرے ڈائجسٹ میں شائع نہیں ہوتے ہیں۔ یعقوب بھٹی کی زخم گزیدہ معاشرتی برائیوں کے خلاف ایک اچھی کہانی تھی۔ ایک بات ضرور کہوں گا کہ عربی میں بھیڑیے کو ”الذئب“ کہتے ہیں اور کہانی میں بار بار ”الزیب“ کہا گیا۔ اردو میں تو یہ تلفظ ایک جیسا لگتا ہے لیکن عربی بولنے والے اس کی ادائیگی قدرے مختلف کرتے ہیں۔ احمد سلیم سلیمی کی اسیران ہوس بھی تجسس سے بھرپور رہی۔ البتہ انجام میں بہت زیادہ تفصیل نے بور کیا۔ کچھ حصہ قارئین کی سمجھ بوجھ پر بھی چھوڑ دینا چاہیے۔ چھوٹی کہانیوں میں عائشہ نصیر کی ہوم بہت پسند آئی۔ ٹیکنالوجی کی انسان سے محبت کی ایک شاندار کہانی تھی۔ عکس فاطمہ کی نکتہ بین بھی اچھی لگی۔ اکتوبر کا شمارہ پرانے زمانے کے ہیرو ہیروئین والے ٹائٹل سے سجا ہوا تھا۔ ابتدائی صفحات پر زویا صفوان نے سزائے دوراں کے نام سے ایک زبردست کہانی لکھی۔ ان کا شمار اب بلاشبہ ایسے لکھاریوں میں ہونے لگا ہے جن کی کہانیوں کا قاری باقاعدہ انتظار کرتے ہیں۔ یعقوب بھٹی اور ایچ اقبال کی جوڑی نے سرورق کی کہانیوں میں اپنے قلم سے خوب صورت رنگ بکھیرے۔ یعقوب صاحب کی دھندلی تصویر ایچ اقبال کی سودائے زر سے تھوڑی زیادہ پسند آئی۔ چھوٹی کہانیوں میں علی عباس کی موت کا رقص نے متاثر کیا جبکہ ایشا گل کی زہریلا پھول بھی کمال کی تحریر ثابت ہوئی۔ نومبر کے شمارے کا ٹائٹل بلاشبہ بہت خوب

صورت تھا۔ نشیلی آنکھوں والی حسینہ دل کشی کی مثال تھی۔ ابتدائی صفحات پر یعقوب بھٹی اپنی زبردست تحریر بلاکش کے ساتھ چھائے ہوئے تھے۔ اناڑی سیریز کی یہ کہانی بھی یادگار رہی۔ کرکٹ اور جرم کے پس منظر میں ایک لاجواب تحریر لکھنے پر مصنف کا شکریہ۔ طاہر جاوید مغل کو سرورق کی کہانی سلگتی چنگاریاں میں جلوہ افروز دیکھ کر دلی خوشی ہوئی۔ انہوں نے بھی دھماکے دار اور تیز رفتار کہانی لکھ کر دل جیت لیا۔ بڑے عرصے بعد انہوں نے عمران اور تابش سے کچھ ہٹ کر لکھا جو پسند آیا۔ عبدالرب بھٹی کی ''جعلی شکار'' بھی مناسب رہی۔ مختصر کہانیوں میں بلال یوسف کی کمرا نمبر تیرہ پسند آئی۔ دسمبر کے شمارے میں دہر کے سوا ابھی کچھ نہیں پڑھا لیکن امید ہے کہ علی عباس کی ''پسِ نقاب'' اور نجمہ مودی کی زہریلی شناسائی کمال کی کہانیاں ثابت ہوں گی۔ بات کروں اس سال جاسوسی کی سلسلے وار کہانیوں کی تو روبینہ رشید کی شعلہ زن اختتام پذیر ہوئی۔ ایک زبردست اور شاندار کہانی تھی۔ انجام بہت بہتر ہو سکتا تھا لیکن شاید رائٹر کی ناول میں دلچسپی ختم ہو گئی تھی اس لیے ایک روکھا پھیکا اختتام ہم قارئین کو پڑھنا پڑا۔ امید ہے کہ اس کی جگہ کوئی بہت ہی اعلیٰ درجے کی کہانی شائع ہو گی جو ''للکار، آتش فشاں، انگارے اور دیوی'' کے پائے کی ہو گی۔ حسام بٹ دہر میں خوب فینٹیسی لکھ رہے ہیں۔ جاسوسی میں پہلی بار ایسی سائنس فکشن پڑھ رہا ہوں اور حسام بٹ کا طرزِ تحریر پسند نہ ہونے کے باوجود یہ اعتراف کروں گا کہ وہ بہت محنت سے ''دہر'' لکھ رہے ہیں۔ کہانی کی جزئیات اور واقعات کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی لوکیشن کے بارے میں بھرپور معلومات ملتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ تفصیلات بوریت کا سبب بھی بنتی ہیں لیکن ایکشن کی بھی ناول میں کوئی کمی نہیں ہے۔ ویلڈن حسام بٹ صاحب۔ چٹپٹی نکتہ چینی میں اس سال ٹاپ تین لوگ تین مرد حضرات رہے۔ جنید علی نے ملتان سے لمبے لمبے اور تفصیلات سے بھرپور تبصرے لکھے۔ ملتان کے ہی محمد حسنین اپنے تنقیدی تبصروں سے دھماکے کرتے رہے۔ ان کی ایک بات یاد ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ اگر ہر ماہ تبصرہ لکھوں تو سال بعد ایسا تبصرہ نہیں لکھنا پڑے گا۔ صحیح کہا بھائی لیکن مجبوری سمجھیں اور شکریہ قبول کریں۔ کراچی کے محمد اقبال نے بھی تواتر کے ساتھ حاضری لگوائی۔ بینا راجپوت اس بار پیچھے رہ گئیں نجانے کیا بات ہوئی؟ جنوری دو ہزار تیئس میں ڈیڑھ سو والا رسالہ دسمبر تک دو سو کی قیمت کو چھو چکا ہے۔ ہم باہر رہنے والوں کو تو یہ پچاس روپے کا اضافہ اتنا زیادہ محسوس نہیں ہوتا لیکن پاکستان کی غریب عوام اس سستی تفریح سے بھی اب محروم ہوتی جا رہی ہے۔ موبائل فون کی نت نئی ایپس نے بھی پڑھنے کے رجحان میں کمی کر دی ہے۔ آپ سے بھی گزارش ہے کہ جاسوسی کا کوئی الیکٹرونک ورژن مارکیٹ میں لے آئیں تاکہ آپ کی محنت' جو ویب سائٹس مفت میں ڈائجسٹ اپ لوڈ کر کے ضائع کر رہی ہیں، اس سے بچا جا سکے۔ اسی پیغام کے ساتھ اجازت چاہوں گا اور امید ہے کہ اس بار سال بعد کے بجائے جلد حاضری لگے گی۔ اتنی محنت سے جاسوسی ہم تک پہنچانے کے لیے ایڈیٹر اور ٹیم کا بہت شکریہ۔ اللہ آپ سب کو صحت مند اور سلامت رکھے تاکہ آپ ہم تک ایسے ہی جاسوسی ڈائجسٹ کی خوب صورت محفل سجاتے رہیں۔ آمین۔'' (نیک تمنائیں آپ کے لیے...... سال میں ایک بار ہی سہی لیکن ضرور حاضر ہوں)

ملتان سے جنید علی کی دھماکے دار سالانہ کارکردگی ''یہ جاسوسی ڈائجسٹ ہے تو آئیں ذرا اسی کے انداز میں چوری چکاری، ڈاکا زنی دہشت گردی، بے ایمانی، دھوکا دہی، قتل و غارت اور سنگین جرائم کے خطرناک سالانہ پوسٹ مارٹم سے نئے سال کا آغاز کرتے ہیں۔ جاسوسی کے 2023 کے پورے سال کے شمارے 2712 صفحات ظلم و جبر، ناانصافی، وارداتِ قتل اور جرائم کی سنسنی خیز و سنگین داستان سنا رہے تھے وہیں ہمارے جاسوسی کے جاسم و کامل، کریم علی، شمشیر اور اناڑی بھی ہر برائی کا اپنی جرأت و بہادری سے منہ توڑ جواب دے رہے تھے۔ ہر ماہ کہانیوں کے بیچ کباب میں ہڈی بن کر کارٹونسٹ کے لطائف اور مزاحیہ خاکوں نے ہنسانے کی کبھی کامیاب اور کبھی ناکام کوشش کی۔ شعلہ زن کا اختتام نومبر میں ہوا جس میں شیطان کا رذیل چیلا مینٹل کیس بن گیا جو جلد جہنم واصل بھی ہو جائے گا۔ اب طوفانی حملے، تعریفیں، شوخیاں، چالاکیاں، ناراضگیاں اینڈ حاضریاں، داد و تحسین اور طنز و تیر کے دھماکے دار نشتر دیکھنے کے لیے ذرا چٹپٹی نکتہ چینی میں چلتے ہیں۔ پورے سال قارئین کی خطوط کے سلسلے میں دھماکا خیز انٹری ہوئی وہیں لوگوں کے خون سے لکھے گئے محبت و چاہت نامے ڈاک کی اعلیٰ ترین کارکردگی کے سبب شامل نہیں ہو سکے۔ کرائم رپورٹر جنید علی یعنی ہمارے ہر ماہ طویل تبصروں کے ساتھ ساتھ محمد اقبال، محمد حسنین، آفاق احمد، زرینہ شاہ، حمیرا رفیق، انور یوسف زئی، عائکہ کامران، انوشے ملک، بینا راجپوت، راحیلہ بھٹی، ارسلان شاہ، محمد اکمل کمال، راحت قمر، ارم راجپوت، سلمان سلیم، فاطمہ راجپوت، احتشام الحق، احسن زمان درویش، تنویر ایم اے، آسیہ بتول، سہانا شیخ اور ساتھ ہماری پکار پر پرانی قاری مومنہ کشف بھی دسمبر میں لوٹ آئیں۔ اب دوسرے غیر حاضر قارئین بھی آ جائیں اور زیادہ نخرے نہ کریں اور اسی طرح دیگر کی جاسوسی میں طویل و مختصر ہنگامہ خیز حاضریاں لگتی رہیں۔ وہیں خطوط کے بیچ میں ایڈیٹر کے بریکٹ میں ایٹم بم کی طرح نصب برجستہ جوابات خطرناک زہریلے کیمیکل سے کم نہ تھے جو ہم چٹپٹی نکتہ چینی کرنے والوں کی بولتی بند کر دیتے تھے۔ ابتدائی صفحات سے دو دو ہاتھ اور سرورق کے دو تیکھے رنگوں سے مار اماری کرنے سے پہلے ذرا ان مصنفین کی اچھے سے خبر لیتے ہیں جن کی تحریریں ابتدائی صفحات اور سرورق کے رنگوں کے سینٹر میں کافی ہوشیاری سے موجود تھیں۔ کسی سے کم نہ تھیں، ان کی سالانہ کارکردگی کچھ اس طرح ہے یعنی عمران قریشی: سایہ، میں، تناؤ، انکشاف، آخری پیشی، خدوخال، شہادت، پڑتال، پرکھ اور ہائے ری قسمت۔ عکس فاطمہ: بے باک، ریشم فتن، بے باق، پہاڑ اوجھل، پاداش، عمل تدبیر، نکتہ بین، مجرم ذہن، مدوجزر اور حجامت۔ عائشہ نصیر: چکما، اجنبی مہربان، شناخت کی چوری، بروقت فیصلہ، ہوم۔ اے آر راجپوت: کھوج، شب گزیدہ، راہ، گندم اور بازی۔ عبدالرب بھٹی: طوفانی رات، اصل قانون،

ثبوت، حسابی قتل، پھندا۔ مظہر سلیم ہاشمی: ہوشیار، بے خوف، انوکھی لاش اور پھندا۔ جمال دستی: قلابہ، کاروبار، مفید مصیبت۔ علی حیدر: آخری موقع۔ سیر بنا راض: دس قدم، یادِ رفتہ۔ زویا صفوان: سراب، قیمت اور جواز۔ مرزا امجد بیگ: درندے، زہرناک۔ اسما قادری: تاریک راستہ۔ طاہر جاوید مغل: چارہ گر، قاتل مسیحا تابش و عمران جونیئر سیریز۔ احمد جعفری: تن اور دھن۔ غلام قادر: زہریلی قربت اور خونِ وفا۔ فاطمہ حسام: کلائمیکس۔ خالد شیخ طاہری: مداوا۔ یعقوب بھٹی: بے بکرا۔ سلمان بشیر: سراب۔ محمد فاروق انجم: سپاری۔ منشی عزیز مئے: در پردہ۔ علی عباس: موت کا رقص۔ ابراہیم عبدالہادی: دوست۔ خلیل جبار: بازی۔ غزالہ زاہد: بلاعنوان۔ عیشا گل: زہریلا پھول۔ نسرین شمیم: بلا در ماں۔ بلال یوسف: کمرا نمبر 13۔ تراب حیدر: ادھورا شاہکار، دی تحریریں شامل تھیں اب جاسوسی کے اولین صفحات کے ساتھ آخر میں سرورق کی دو کہانیاں بہت دلچسپ و سنسنی خیز انداز میں شاملِ اشاعت رہیں، ان کی تفصیل شماروں کے سرورق پر نشتر زنی کرتے ہوئے کچھ اس طرح ہے کہ جنوری کا سرورق ویسے تو صحیح تھا بس دوشیزہ کے فیس کو ایک صاحب آگے ہو کر چھپا رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں کہ کم کیا کسی سے کم ہیں۔ آغاز میں زندہ مردہ از امجد رئیس کی کہانی تھی۔ سرورق کی کہانیاں پگھلتے رشتے از اسما قادری پڑھنے کو ملی جس میں خوب صورت موت از ایچ اقبال تو کچھ زیادہ ہی خوب صورت تھی۔ فروری کا سرورق بہت اچھا تھا جس میں ایک صاحب قتل کر رہے تھے تو دوشیزہ منہ پر انگلی رکھ کر ششششش خاموش رکھنے کا اشارہ کر رہی تھی جو پسند آیا۔ شروع کے صفحات پر زہریلا تریاق از طاہر جاوید مغل کی پہلی قسط شامل تھی جو عمران جونیئر کی بہادری اچھے سے دکھا رہی تھی وہیں سرورق کی کہانیوں میں وحشت اور محبت از محمد انجم فاروق اور دوسری وطن پرست از یعقوب بھٹی شامل تھی جس میں حب الوطنی کے جذبے سے سرشار راغ کی بہادری دیکھی جس نے غیر ملکی جوڑے کو باحفاظت ان کی سرزمین تک پہنچا دیا۔ مارچ کا سرورق بھی دلکش تھا جس کا بیک گراؤنڈ اور دوشیزہ کی مسکراہٹ جاذبِ نظر تھی وہیں ایک ڈریکولا نما صاحب ایک حسین دوشیزہ کو اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ شروع میں زہریلا تریاق از طاہر جاوید مغل کی آخری قسط شامل تھی جس میں بالآخر میڈیکل فیلڈ میں جرائم کرنے والے پکڑے گئے اور عمران جونیئر کو اس کی محبت مل ہی گئی اور سرورق کے رنگوں میں مارخور از یعقوب بھٹی ایک دلچسپ و سنسنی خیز داستان تھی۔ دوسری سرورق کی کہانی گرد و باد از اسما قادری شامل تھی جو تلخ حقیقت کو اجاگر کر رہی تھی جس میں ماہم نے جگ ہنسائی کے ڈر سے خودکشی کر لی تھی۔ اپریل کا سرورق پیلے رنگ سے مزین تھا جس میں حسینہ اپنے مردانہ ہاتھ کو سر پر لا کر آداب وسلام کر رہی تھی ساتھ وہیں ایک صاحب شاید پانی والی گن سے ہمیں ڈرانے کی ناکام حرکت کر رہے تھے۔ شروع کے صفحات پر گمشدہ لمحے از ایچ اقبال عتیقہ اور جاذب کی پریم کتھا سنا رہے تھے جو آخر میں بھی مل نہیں سکے اور سرورق کے رنگوں میں فتنہ قامت از عبدالرب بھٹی۔ دوسری سرورق کی کہانی سود و زیاں از زویا صفوان شامل تھی جو مراد و ثانیہ اور ان کے بیٹے کی بے راہ روی کی تلخ داستان سنا رہی تھیں۔ مئی کا سرورق نیلے رنگ سے مزین کافی تر و تازہ تھا جو حسینہ کی مسکراہٹ اور نیچے دو حضرات سیریس انداز میں مزاحیہ لڑائی کر رہے تھے جو پسند آیا۔ شروع میں ٹریور اور اس کے دیگر ساتھیوں کے شیطانی ہتھیار از امجد رئیس کی پہلی قسط شامل تھی جبکہ سرورق کی کہانیاں راہِ مقتل از مظہر سلیم ہاشمی کی تھی جو یونس کے باپ کی شیطانی سازش کو بے نقاب کر رہی تھی۔ سرورق کی دوسری کہانی فریبِ ذات از غلام قادر پوری کہانی اسپتال میں شرجیل کے گرد گھومتی رہی جس میں کافی دوشیزائیں اس کی زندگی میں آگئیں۔ جون کا سرورق کچھ منفرد انداز میں تھا حسینہ کے بوائے کٹ بال تھے وہیں ایک نوجوان لڑکا دانت بھینچ کر اپنے غصیلے اور وحشیانہ انداز کا مظاہرہ کر رہا تھا تو نیچے ایک حسین لڑکا بھی فخریہ انداز میں کھڑا تھا اور وہ میں تھا۔ (ہے؟ کیا کہا، سنا نہیں) شروع میں شیطانی ہتھیار از امجد رئیس کی دوسری اور آخری قسط شامل تھی جو بھرپور انداز میں معاشرتی ناسوروں کی نشان دہی کر رہی تھی جبکہ سرورق کی کہانیوں میں زور آزما از یعقوب بھٹی کی پہلی کہانی تھی جو کھلاڑی فیری کی داستان سنا رہے تھے جس نے اپنا بدلہ لینے اور گاؤں کی عزت کو بچانے کے لیے اپنے دشمن کو منہ توڑ جواب دیا اور دوسری کہانی کارآمد از فاطمہ حسام کی شامل تھی جس میں لالچی باسط کا انجام اچھا ہوا اور سلیم کی ہوشیاری خوب رہی۔ جولائی کے سرورق پر ایک معصوم سی دوشیزہ ہمیں دیکھ رہی تھی۔ شروع میں لمحوں کے اسیر از ایچ اقبال میں تمام کردار لمحوں کے اسیر ہی تھے جو بعد میں بہک گئے۔ سرورق کی کہانیوں میں خواب سراب از احمد سلیم سلیمی تھی جو نور بانو کے خواب جو تھے فخر کی وجہ سے سراب دکھا رہی تھی۔ دوسری سرورق کی کہانی سفید و سیاہ شامل تھی جو جارج ایول کی رنگ میں طاقت کو اچھے سے ظاہر کر رہی تھی وہیں ان کا مدِ مقابل دوبار بہت شرمندہ ہوا وہیں ایوا اور راک براورز کی موجودگی اچھی رہی۔ اگست کا سرورق تو بہت ہی زبردست تھا جس میں حسینہ کا سائڈ پوز تھا نیچے گھر بنا ہوا تھا اور اوپر کالے کلوٹے صاحب بھاؤ کر کے ڈرا رہے تھے۔ شروع میں شبِ دیجور ایک بہت ہی دلچسپ پلاٹ پر مبنی کہانی اسما قادری نے پیش کی جس میں ولید اور شایان کی وجہ سے دشمنوں کا خطرناک مشن پورا نہیں ہو سکا اور ہنی کو سبق حاصل ہوا وہیں واصف ملک سے بھاگ گیا۔ سرورق کی کہانیوں میں روپوش چہرہ از عبدالرب بھٹی پہلی کہانی تھی جس میں اداکارہ شائلہ کا روپوش چہرہ انسپکٹر شہباز کی وجہ سے سامنے آہی گیا۔ خوابیدہ جذبے از زویا صفوان کی کہانی تھی جس میں بہت سے محبِ وطنوں کی قربانیاں ظاہر ہوگئیں۔ ستمبر کا سرورق پرپل کلر سے تیار کردہ تھا جس میں ایک صاحب تعمیراتی کام میں مصروف تھے وہیں حسینہ پیچھے مڑ کر کس کو دیکھ رہی تھی، یہ ایڈیٹر صاحب آپ ہی بتائیں جواب دیں بریکٹ میں۔ (ارے بھول گئے، جاتے جاتے وہ تمہیں ہی ڈھونڈ رہی تھی) ابتدائی صفحات پر سرد جہنم از امجد رئیس میں انتونیا گالو کی پیشہ ورانہ کارکردگی عروج پر تھی۔ سرورق کی کہانیوں میں زخم گزیدہ از یعقوب بھٹی پہلی کہانی تھی جو نفیس راجا اور زخم گزیدہ کی بہادری کی داستان سنا رہی

تھی وہیں کہانی کا پلاٹ بہت دلچسپ رہا اور دوسری سرورق کی کہانی اسیرانِ ہوس از احمد سلیم سلیمی شامل تھی جو تین دوستوں کی لالچ کی وجہ سے بربادی کی دلچسپ داستان سنا رہی تھی۔ اکتوبر کے سرورق کا رنگ اورنج کلر سے مزین تھا۔ دوشیزہ کے تیکھے انداز اور ساتھ دو صاحب بھی جاسوسی کی روایت کو تازہ کرتے ہوئے گن کی نمائش کر رہے تھے۔ شروع میں سزائے دوراں از زویا صفوان میں زوہیب کو اس کی برائیوں کی سزا حمزہ نے اپنی بہن کا بدلہ پورا کر کے دی وہیں کتنے کردار دنیا سے چلے گئے۔ سرورق کی کہانیوں میں سودائے زر میں انچ اقبال لالچ بری بلا ہے پر مبنی کہانی سنا رہے تھے وہیں دوسرے رنگ میں یعقوب بھٹی دھندلی تصویر میں ہلکے پھلکے انداز میں شامل تھے۔ نومبر کا سرورق سردیوں کی آمد کو ظاہر کر رہا تھا۔ شروع میں یعقوب صاحب بلائنش میں پھر سے آنند راؤ کو موت کے منہ میں لے کر جا رہے تھے وہیں اتازی کی حاضری بھی خوب رہی۔ سرورق میں طاہر جاوید مغل کی بے بسی اور انتقام کی عملی کارروائی پیش کر رہے تھے اور یہ ساتھ ہی بھٹی صاحب جعلی شکار میں سرمد کے جعلی شکار کا تذکرہ کر رہے تھے۔ ارے کدھر چلے ابھی اینڈ نہیں ہوا کہ دسمبر کے شمارے پر ابھی طویل تبصرہ ہے باقی کہ ہم نے اتنی جلدی آپ کو بخشا نہیں تو دسمبر کا سرورق بتا رہا تھا کہ دوشیزہ کو کافی سردی لگ رہی ہے وہیں پیچھے دو موٹی توند والے ایک دوسرے کا خون پینے کے درپے ہیں۔ خطوط کی محفل میں آسیہ بتول کا خط دلچسپ تھا جن کے اعتراضات پر (کون سے اعتراضات) ہم بھی ان کے ساتھ ہیں باقی سب کے سہانے خط بھی مہک رہے تھے۔ شروع میں زہریلی شناسائی ایک معیاری تحریر تھی مگر کچھ غیر ضروری طوالت محسوس ہوئی (انگلش ناول پوری ریسرچ کے بعد لکھے جاتے ہیں) تراب حیدر شاید نئے مصنف ہیں مگر پہلی مختصر تحریر معیاری تھی جس کا آغاز دلچسپ رہا۔ ذوالقرنین نے اپنے خوف پر قابو پالیا اور قیمتی پینٹنگ چوری کرنے والے الفریڈ اور دلاور کے ارادے خاک میں ملا دیے۔ قاتل مسیحا میں پھر سے عمران جونیئر تابش کے ساتھ ہمیں انٹرٹین کرنے کے لیے آ گیا ہے جس کا آغاز کافی اچھا ہے۔ بے حد معلوماتی اور scientific fiction پر مبنی ہماری پسندیدہ ترین تحریر دہر بھی کافی دلچسپ ہوتی جا رہی ہے جس میں جاسم کے سنگ اِشعار نے بننے سے پہلے ہی ٹی یوم مشن کو تباہ کرنے کی عملی کارروائی کر لی ہے وہیں ڈیوڈ نمبر دو تو پہلے والے سے بھی گیا گزرا ہے کہ آتے ہی آؤٹ ہو گیا اب سلور کو مین ناک میں دم کر کے رکھے گی۔ فاطمہ حسام نے حجامت میں کافی اچھے سے قبر میں پاؤں لٹکائے بابے کی حجامت بنوائی کہ دوبارہ اب ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ عمران قریشی کی کہانی کا عنوان اور دو صفحات پڑھ کر ہی ساری کہانی سمجھ آ گئی تھی اس لیے پسند نہیں آئی۔ بھٹی صاحب کی تحریر اچھی تھی جو کچھ دلچسپ تھی جس میں محسن جال سے باہر آ ہی گیا اور جال بنانے والے اپنے ہی جال میں پھنس گئے۔ جواز بدگمانی پر لکھی گئی ایک تلخ تحریر تھی مگر حقیقت سے قریب تر بھی جس میں شوہر نے بدگمانی کی بنا پر سب ختم کر دیا اور آخر میں پچھتاوا ہی مقدر رہا۔ سرورق کا پہلا رنگ کچھ منفرد تھا جس میں میر حسن اپنی دوست کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا رہا تھا وہیں سرورق کا دوسرا رنگ کچھ پھیکا تھا۔ شہروز نے ڈبل گیم چلی اور اپنی شاطرانہ طبیعت سے فائدہ اٹھایا وہیں مرجان بھی زر کی چاہ میں سونیا کے جرم کی پاداش میں جان سے گیا اور دوسرا دوست بھی خالی ہاتھ رہا۔ سالانہ رپورٹ کیسی رہی خطوط میں ضرور بتائیں اور اگر تبصرہ پڑھ کر دماغ کی دہی بن گئی ہو تو ایڈیٹر کے ساتھ آپ بھی پناڈول ایکسٹرا لیں کہ یہ ہی ہمارا بھروسا۔" (مشورہ، بُرا نہیں)

ملتان سے محمد حسنین "دسمبر کا جاسوسی جب ملا تو اتنی سردی نہیں تھی لیکن اب تبصرہ لکھتے ہوئے ہاتھ کانپ رہے۔ (یہی سزا ہے پچھلے ماہ کی غیر حاضری پر) ملتان میں سردی کے ساتھ ساتھ دھند اور اسموگ کا بھی راج چل رہا ہے۔ ظفر صاحب نے اپنے مخصوص روایتی انداز میں ایک ماہ اچھا ٹائٹل پیش کرنے کے بعد اس ماہ کارٹون بنا کر دے دیے اور آپ نے بخوشی جاسوسی ڈائجسٹ پر چپکا دیے۔ کسی بھی ڈائجسٹ کا ٹائٹل اس کی طرف پہلی اٹریکشن ہوتی ہے۔ اگر ٹائٹل ہی دل کھینچنے والا نہیں ہوگا تو نیا بندہ کیوں اندر کی چیزوں میں دلچسپی لے گا؟ اس جانب خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ چٹکی نکتہ چینی نئے پرانے ناموں کا مربا بنی ہوئی تھی۔ آسیہ بتول کے ذہنی مدوجزر پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ان کو ہر وہ چیز جاسوسی کے شمارے میں اچھی لگی جو کسی اور کو پسند نہیں آئی۔ یہاں تک تو خیر تھی کہ کچھ لوگوں کی پسند ہوتی ہی میڈیوکر ہے لیکن موصوفہ نے جب مغل صاحب کی کہانی کو بے ربط اور بھٹی صاحب کی کہانی کو شاہکار قرار دیا تو تبصرہ کم لطیفہ زیادہ بن گیا۔ پڑھے بغیر کہانیاں لگانے کی بات بھی خوب رہی کیونکہ ان کا تبصرہ بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ کہانیاں پڑھے بغیر ہی کیا گیا ہو۔ ایڈیٹر سے معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ مثبت تنقید کو ضرور جگہ دیا کریں لیکن کم از کم ایسی بغیر سر پیر کی بکواس کو تنقید کا نام دے کر پہلے نمبر پر مت لگایا کریں۔ اب اقبال صاحب نے کیا کمال خوبی سے اپنی پسند ناپسند کا اظہار کیا ہے کہ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ جنید علی نے ملتان سے خوب حاضری لگائی۔ بہاولپور کی مومنہ کشف کا تو پورا تبصرہ ہی شعلہ زن کی تعریف و تنقید میں گزر گیا۔ سلمان سلیم اور کوٹری کی حمیرا کے تبصرے بھی اچھے رہے۔ ابتدا قاتل مسیحا سے کرنا چاہتا تھا لیکن مغل صاحب کی یہ عمران سیریز چونکہ دو تین اقساط کی ہی ہوتی ہے اس لیے اس کے مکمل ہونے کا انتظار کرتے ہوئے گاڑی کا رخ حسام بٹ کی دہر کی جانب موڑ دیا۔ دسمبر کی قسط کو بلاشبہ دہر کی بیسٹ قسط کہا جا سکتا ہے۔ ایکشن، سسپنس، مسٹری، رومینس اور سائنس فکشن کا بہترین امتزاج۔ اگرچہ مجھے یہ ایلین اور ٹائم ٹریول والی باتیں کچھ پسند نہیں ہیں لیکن حسام بٹ نے کہانی میں ان کا استعمال مناسب انداز میں کیا اور کہیں بوریت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ جاسم کی گردن پر گن رکھوا کر فریز ہونے کے ساتھ ساتھ اگلی قسط کا انتظار ہے کہ اس میں سے کیا نکلتا ہے؟ چھوٹی کہانیاں اس بار نسبتاً اچھی تھیں۔ زویا صفوان کی جواز بہت اچھی لکھی گئی تھی لیکن ایکشن ری ایکشن کا جواز کمزور سا لگا۔ دادا کی محبت اپنی جگہ لیکن ایسے کیسے کوئی اپنی نسل برباد ہونے کے لیے چھوڑ سکتا؟ عبدالرب بھٹی کی پسند ابھی

اچھی رہی لیکن وہ آج کل اس محنت سے کہانیاں نہیں لکھ رہے جیسے کچھ عرصے پہلے تک لکھتے رہے ہیں۔ فاطمہ حسام کی حجامت بے وقوف سی کہانی تھی لیکن عمران قریشی نے ہائے ری قسمت لکھ کر دسمبر کی سب سے فضول کہانی کا ایوارڈ اپنے نام کرلیا۔ تراب حیدر کی ادھورا شاہکار ایک لاجواب کہانی تھی۔ ٹائٹل اسٹوریز کی بات کریں تو علی عباس کی پس نقاب جاسوسی کے معیار کے عین مطابق تھی۔ اہم سیاسی رہنما کے قتل کی سازش کو بخوبی بے نقاب کیا گیا۔ ان کے قلم میں واقعی ایک صحافی کی کاٹ نظر آئی۔ انداز بیاں کہیں کہیں یعقوب بھٹی سے بھی ملتا جلتا نظر آیا۔ ایک چھوٹی سی شکایت بس یہی رہی کہ اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ سیکریٹری اتنی پاورفل کیسے ہوگئی تھی کہ وہ تفتیشی اداروں کی آزادانہ تحقیقات پر اثر انداز ہونے لگی۔ مرزا عمران بیگ کی فتنہ زر روایتی اور عام سی کہانی لگی۔ شاید صفحات زیادہ ہوتے تو کچھ بہتر لگتی۔ نجمہ مودی کی زہریلی شناسائی کو بچا کر رکھ لیا ہے۔ اب مونگ پھلیاں اور سوہن حلوہ کھاتے ہوئے اسے ہضم کروں گا۔" (اکیلے اکیلے کھاؤ گے تو کچھ ہضم نہیں ہوگا)

کراچی سے محمد اقبال کا سال کا آخری مکتوب "دسمبر کے جاسوسی کا ٹائٹل کچھ الگ سا لگا۔ سب سے اوپر دو صنف گرخت مار پیٹ میں مشغول ہیں بیچ میں ایک نازک حسینہ، جوانِ افراد کی حرکات و سکنات سے محظوظ ہو رہی ہے، اس کی بیک پر ایک خستہ حال مکان اور نیچے سوٹڈ بوٹڈ آدمی ریوالور سے فائر کررہا ہے۔ فہرست بھی مناسب ہے۔ لیکن طاہر جاوید مغل کا نام دیکھ کر فہرست جگمگاتی ہوئی لگی۔ حسبِ معمول اداریہ فکر انداز ہے۔ آپ کی تمام تر باتوں سے اتفاق بھی ہے، خوشی صرف اتنی ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کا یومِ پیدائش بروز پیر کو ہے۔ یعنی اتوار اور پیر دو دن آرام کریں گے۔ (یا اللہ، پاکستانی نہیں سدھریں گے......) مسیحی برادری کو حضرت عیسیٰ کا یومِ ولادت مبارک ہو۔ محفل میں ساہیوال سے آسیہ بتول کے مدوجزر اچھے لگے۔ مبارکاں جی۔ آپ کی اپنی رائے ہے۔ تمام ساتھیوں کے خطوط اچھے لگے۔ طاہر جاوید مغل کی قاتل مسیحا واہ جی کیا بات ہے مغل صاحب کی ان کی تحریروں کا انتظار یونہی تو نہیں رہتا۔ کب کہانی شروع کی کب ختم ہوئی کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ (جاری ہے) کے بعد ڈائجسٹ ایک طرف رکھا اور سردُھن لیا۔ عمران کی مسخری، تابش کی ہوش مندی، ایکشن مزہ دیتی ہے۔ پچھلے کرداروں سے پھر تابش اور عمران کا اتفاقاً سامنا ہوگیا ہے۔ جادو راسے کوئی بڑی اونچی چیز دکھائی گئی ہے۔ خوب صورت کلائمکس پر کہانی کا اختتام ہوا ہے۔ اگلے حصے کا بے چینی سے انتظار ہے۔ نجمہ مودی زہریلی شناسائی کے ساتھ حاضر ہیں۔ یہ کہانی لیزلی سے شروع ہوئی اور لیزلی پر اختتام پذیر ہوئی۔ کہانی میں سب کچھ تھا، پیار محبت، سسپنس، تھرل، ایکشن۔ لیزلی نے کیا کچھ جھیلا اور کس طرح مقابلہ کرکے اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کیے۔ اولیورا اپنے انجام کو پہنچا۔ بلاشبہ کہانی پڑھنے کا مزہ آگیا۔ حسام بٹ کی دہری کی یہ قسط بہت اچھی لگی۔ اسٹارٹ سے ہی جاسم ایکشن میں تھا اس نے نئے ڈیوڈ کی ٹیم کو جو چکر دیے، واہ مزہ آگیا۔ اتنا مزہ تو ابشار کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں بھی محسوس نہیں ہوا جتنا مزہ نئے ڈیوڈ کے منصوبے کی ناکامی پر آیا۔ جرمن شیفرڈ کتوں کا جاسم نے جو حشر کیا ہے، امید ہے اس سے زیادہ برا حشر وہ سلور کوئین اور نئے ڈیوڈ کا کرے گا۔ فاطمہ حسام کی حجامت ایک مختصر اچھی تحریر تھی۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ رفیق بھائی کی ٹھرک نے بالآخر ان کی صحیح معنوں میں حجامت کروادی۔ عمران قریشی کی ہائے ری قسمت کہانی کے لحاظ سے بہترین نام تھا۔ بے چارے راجو کی ساری پھرتیاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ جیدی کو ڈکیتی کے لیے راضی کرنا، سب منصوبہ بندی کرنا اور اس سے جیدی کو مطمئن کرنا ان سب کے ساتھ کامیاب ڈکیتی بھی کرلی لیکن ہائے ری قسمت سارے کیے کرائے پر پانی پھر گیا۔ مرزا عمران بیگ کی فتنہ زر پڑھی۔ زر ہی نہیں زن، زر اور زمین تینوں ہی فتنہ ہیں۔ سیٹھ نواز اور سردار کی دشمنی میں نواز کی دولت اور بیٹی کی عزت گئی۔ سونیا اور شیری کی کم عمری کی محبت ایسے ہی گل کھلاتی ہے۔ عوام کے خدمت گار یعنی پولیس والوں کی مجبوریاں اپنی جگہ۔ مگر ان کی تو جیبوں میں رقم آجاتی ہے اور تعلقات کا بھی کہیں نہ کہیں فائدہ اٹھالیتے ہیں۔ مگر مرجان اور اکرم جیسے کرداروں کی مجبوریاں ان کی جان لے لیتی ہیں۔ پارو جیسی عورتیں ہمیشہ مزے میں رہتی ہیں۔ باقی رسالہ نہیں پڑھ سکا۔ 2023ء ماہ دسمبر کا آخری خط ارسال کررہا ہوں، دعاگو ہوں جنوری 2024ء کا شمارہ زوردار ہو۔ تمام ساتھیوں کو نیا سال مبارک ہو۔"

آزاد کشمیر، کوٹلی سے احتشام الحق کی سالِ نو کی مبارک باد اور خوش امیدی "سال کا آخری شمارہ ہمارے ہاتھوں میں جگمگا رہا ہے۔ ظفر صاحب نے اس بار سرورق پر خاصی محنت کی حسینہ پھر بھی ہمیشہ کی طرح ٹیڑھی کھڑی ہے اوپر دو بھائی صاحب ہنستے ہوئے آپس میں گتھم گتھا ہیں اور نیچے والے بھائی صاحب اپنے پستول سے فائر فرما چکے ہیں۔ نکتہ چینی کی محفل میں پہنچے جو کہ ہماری پسندیدہ محفل ہے۔ کھٹے میٹھے خطوط ہمیشہ سے ہی ہمیں پسند رہے ہیں۔ آپ کا اداریہ پڑھا، بے شک مہنگائی کا جن بھی پوری طرح سے ملک پر حملہ آور ہے۔ اللہ فلسطین کے مسلمانوں پر اپنا خاص کرم فرمائے۔ ساہیوال سے آسیہ بتول رقم طراز ہیں بہت بہت مبارک ہو بھئی پہلی نشست..... پر براجمان ہیں۔ کراچی سے محمد اقبال کی حاضری بھی خوب رہی۔ شہر ملتان سے جنید علی بھائی اپنے طویل مگر جامع تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ آپ کا تبصرہ پڑھ کر ہی ہمیں بھی شہ ملتی ہے کہ ہم بھی کچھ طویل لکھیں۔ بہاولپور سے مومنہ کشف کی حاضری اچھی رہی۔ آپ ایک اچھی تبصرہ نگار ہیں اپنی حاضری ہر ماہ یقینی بنائیں اس کے علاوہ کوٹری سے آفاق احمد راولپنڈی سے سہانا شیخ ملتان سے محمد حسنین اور بہاولپور سے سلمان سلیم کی حاضری بھی پسند آئی سب نے بہت اچھا لکھا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف چونکہ اس بار ہمیں شمارہ کچھ زیادہ ہی دیر سے

ملا اس وجہ سے بہت سی کہانیاں پڑھنے سے رہ گئی ہیں بہرحال جو پڑھی ہیں، ان کی پوسٹ مارٹم رپورٹ حاضر ہے۔ سب سے پہلے عبدالرب بھٹی کی پھندا کی طرف رخ کیا، کمال مرزا نے اپنی بیوی کا قتل کر کے محسن جیسے شریف انسان کو پھنسانا چاہا اور بوڑھے منجو جیسے جعل ساز کی مدد حاصل کی۔ کہانی کی اینڈنگ نے مزہ دیا۔ ہائے ری قسمت عمران قریشی اس بار پھر ایک سسپنس سے بھرپور کہانی لے کر آئے راجو اور جیدی کا اتنی محنت سے بنایا گیا پلان تو کامیاب ہو گیا لیکن ہڑابڑی میں وہ غلط نوٹ اٹھا کر لے آئے ایسے کاموں کا ایسا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ زویا صفوان جو کہ اپنے جداگانہ طرزِ تحریر کی وجہ سے مقبول ہیں، اس بار بھی مایوس بالکل نہیں کیا۔ جواز کی صورت میں ایک اچھی کہانی پیش کی۔ وقاص نے محض ایک چھوٹی سی غلط فہمی پر اپنی شریکِ حیات اور عزیز از جان دوست کو زندگی سے محروم کر دیا جذبات میں کیے گئے فیصلوں کا ایسا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ سرورق کی پہلی کہانی علی عباس صاحب ایک نیا نام دیکھ رہے ہیں کچھ عرصے سے۔ پس نقاب ایک بہتر کہانی ہو سکتی تھی اگر اسے زیادہ پھیلایا نہ جاتا بہت سے غیر ضروری کرداروں کو ایویں ہی کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے بیچ میں گھسیٹا گیا بہرحال یہ ایک اچھی کوشش تھی۔ مرزا عمران بیگ صاحب کو پہلی بار سرورق کی کہانی میں دیکھا، ویلڈن بیگ صاحب فتنۂ زر کی صورت میں ایک اچھی کہانی پیش کی آپ نے۔ مرجان اور اکرم دولت کے لالچ میں سردار جیسے ڈان کے چنگل میں پھنس گئے اور آخر میں سردار نے بھی انہیں دھوکا دیا اور دونوں کو اپنی جان سے ہاتھ منہ دھونا پڑا۔ مجموعی طور پر دسمبر کا شمارہ خوب سے خوب تر رہا۔ تمام قارئین کو قائداعظم کا جنم دن، کرسمس کی خوشیاں اور نیا سال بہت بہت مبارک ہو بشرطِ صحت و زندگی اگلے سال ملاقات ہوگی۔''

کوٹری سے حمیرا رفیق کی خوشگوار موسم میں جاندار آمد ''دسمبر 2023ء کا آخری شمارہ میرے بھائی کاشف نے بغیر منت سماجت کے لا دیا تو بے حد خوشی ہوئی۔ کوٹری میں سخت سردی شروع ہو چکی ہے۔ لحاف میں گھس کر ڈائجسٹ پڑھنے کا مزہ ہی الگ ہے۔ خوب صورت نازک سی حسینہ نے ٹائٹل کو چار چاند لگا دیے۔ مرد حضرات کی تعداد اس بار ٹائٹل پر تین ہو گئی۔ فہرست اچھی ہے۔ پہلی کہانی نجمہ مودی کی زہریلی شناسائی بہترین کہانی رہی۔ مرکزی کردار لیزلی اور اولیور تھے۔ لیکن سینیٹر ڈیوس کا کردار بہت جاندار تھا۔ تینوں کردار اپنے اپنے رول اچھی طرح ادا کرتے رہے لیکن آخر میں فتح لیزلی کی ہوئی۔ اولیور کی بیوی کو اپنے والد کے کرتوت ساری زندگی نظر نہیں آئے اور میاں کی بے وفائی پر اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اولیور کے سارے کس بل نکل گئے۔ اس کے بعد باری آئی طاہر جاوید مغل کے قاتل مسیحا کی۔ تابش اور عمران کا سامنا ایک بار پھر اسی کردار سے ہو گیا جس سے ایک بار پہلے ہو چکا تھا۔ جادورا ے جعلی دوائیں بنانے کا بزنس کرتا ہے اور فطرتاً بہت ظالم بھی ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ تابش اور عمران اس کردار کو کیسے کیفرِ کردار تک پہنچاتے ہیں۔ خوشی اس بات کی زیادہ ہوئی کہ اگلے مہینے بھی طاہر جاوید مغل کی کہانی پڑھنے کو ملے گی۔ سلسلے وار دہر کی یہ قسط بہت شاندار رہی۔ واہ بھئی حسام بٹ صاحب۔ جاسم کے ایکشن در ایکشن سے مزہ ہی آ گیا، لگتا ہے نئے ڈیوڈ کو جاسم بھگا بھگا کر مارے گا۔ سلور کوئین کی بے قراریاں مزہ دے رہی ہیں۔ آئندہ قسط کا انتظار ہے۔ عمران قریشی کی ہائے ری قسمت بھی بہت عمدہ لگی۔ زویا صفوان کی جواز، پسِ نقاب علی عباس کی، مرزا عمران بیگ کی فتنۂ زر مناسب لگیں۔ کوٹری کی سردیاں ہوں اور ہاتھ میں جاسوسی ڈائجسٹ کیا بات ہے زندگی کا مزہ ہی آ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نیا سال تمام عالمِ اسلام اور خصوصاً پاکستانیوں کے لیے خیر کا سال ثابت ہو۔ نئے الیکشن کی باتیں ہو رہی ہیں نئی حکومت کیا گل کھلائے گی یہ تو وقت ہی بتائے گا۔''

بہاولپور سے سلمان سلیم کی مبارک باد ''نئے سال کی ہماری طرف سے آپ سب کو مبارک باد۔ اگرچہ جاسوسی کے ساتھ سسپنس اور سرگزشت ہر ماہ لیتا ہوں مگر شاپ کی ذمے داریاں اور نجی مصروفیات کے سبب جلد پڑھ کر وقت پر تبصرہ کرنا مشکل لگتا ہے مگر جنید بھائی بھی جیسے تیسے کر کے ہم سے وقت پر تبصرہ کروا ہی دیتے ہیں اور ہم انہیں انکار نہیں کر سکتے جی تو سرورق آخری شمارے کا بالکل خاص نہیں ہے کہ ہر بار دوشیزہ کے ساتھ عجیب کارٹون ظفر صاحب سرورق پر چسپاں کر دیتے ہیں جو کسی بچکانہ ڈائجسٹ کا سرورق محسوس ہوتا ہے۔ لگتا ہے، ظفر صاحب کا ہاتھ بس خوب صورت دوشیزہ کا ہی نقشہ کھینچ سکتا ہے ظفر صاحب مرد حضرات کی بھی لاج رکھ لیں۔ تبصرے سب ہی کے اچھے رہے۔ شعلہ زن کا اختتام اعلیٰ رہا، سب ہی ہو گیا اور ہیپی اینڈنگ رہی ساتھ سارہ کی مشکلات ختم ہو گئیں۔ مصنفہ کو زبردست سلسلے کے ختم ہونے پر مبارک باد۔ دہر کی دلچسپی مسلسل زیادہ ہوتی جا رہی ہے کہ ہیرو جاسم آخر جاسوسی کے ہیرو ہیں جو سلور کوئین اور اس کے خطرناک مشن کو نیست و نابود کر دے گا پھر ہماری ہمراہی بھی ساتھ ہے تو ڈر کس بات کا۔ شروع کے صفحات پر نجمہ مودی صاحبہ کی ترجمہ زاد کہانی حسبِ معمول شاندار تھی جو جاسوسی کا خاصہ ہے۔ سرورق کی پہلی کہانی پسند آئی مگر دوسری کہانی کچھ خاص نہیں لگی جسے پڑھ کر اور... عمران قریشی کی کہانی پڑھ کر بھی لالچ بری بلا ہے کہانی یاد آ گئی۔ زویا صفوان کی کہانیوں میں یکسانیت محسوس ہوتی ہے ہر بار ایک ہی طرح کے اختتام مگر معاشرے کے حقائق نظر آتے ہیں۔ مغل صاحب کا شمار میرے پسندیدہ مصنفین میں ہوتا ہے اور عمران جونیئر کو ایک بار پھر سے پڑھ کر موڈ ہمارا خوش گوار ہو گیا کہ ہمارے پسندیدہ مصنف کا اپنا ہی دلچسپ و تیکھا انداز ہے۔ مغل صاحب کے بعد بھٹی صاحب کا پھندا دیکھا جو کافی سخت تھا اور فاطمہ حسام نے ٹھرکی بڈھے کی اچھی سے حجامت کروائی۔ تراب حیدر کا ادھورا شہکار کافی حسین تھا جو ایک فنکار کی

جرأت و مردانگی کا احوال سنا رہا تھا۔ مجموعی طور پر سال کا آخری شمارہ کافی دلچسپ تھا۔"

کوٹری سے آفاق احمد کے سردیوں کے مزے "ماہ دسمبر کا شمارہ کراچی سے خریدا اور ٹرین کے سفر کے دوران اس کا پوسٹ مارٹم شروع کر دیا۔ کراچی میں تو سردی کا کچھ معلوم ہی نہیں ہوا۔ لیکن کوٹری پہنچتے ہی احساس ہوا کہ ماہ دسمبر اسٹارٹ ہے۔ ٹائٹل اچھا لگ رہا ہے۔ اداریہ بھی بہت پسند آیا۔ بہت زیادہ اور بیجا تنقید کے بعد بھی ساہیوال سے آسیہ بتول پہلے نمبر پر براجمان ہیں، مبارکاں جی۔ محمد اقبال کی خیال آرائی، جنید علی کے گلے شکوے، مومنہ کشف کی شاندار واپسی، حمیرا رفیق کی خوش گفتاری، سلمان سلیم کا نقطہ نظر، سہانا شیخ کا اندازِ گفتار، محمد حسنین کی پریشانی اور حیرانی سب ہی کے تبصرے اچھے لگے۔ شگفتہ گلزار، شاہین خان، مشتاق احمد کی بلیک لسٹ میں بے چارگی بھی نظر آ رہی ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے حسام بٹ کی دہر پڑھنی شروع کی۔ سلور کوئین کے نئے سیٹ اَپ کی جاسم نے دھجیاں اڑا کر رکھ دی ہیں۔ نئے ڈیوڈ کے کتوں کو کتوں کی طرح مارا جاسم نے۔ مزہ آ گیا جی۔ بھرپور ایکشن نے بہت مزہ دیا۔ آخر میں جاسم کو پھر فریز کر دیا گیا ہے لیکن وہ فریز ہونے والی چیز نہیں ہے۔ یہ جو کوئی بھی ہے اس کی خام خیالی ہے کہ وہ جاسم کو فریز کیے گا اور جاسم فریز ہو جائے گا۔ تو، نیور۔ اس کے بعد شروع کی نجمہ مودی کی سسپنس سے بھرپور زہریلی شناسائی۔ واہ جی واہ نجمہ مودی صاحبہ۔ واقعی ایک ملاقات میں لیزلی اور اولیور کی جو شناسائی ہوئی، وہ کہانی کے اختتام پر زہریلی ہو کر ختم ہوئی۔ اولیور کی طبیعت میں حُسن پرستی تھی جس نے اسے ڈالی ڈالی گھمایا اور پھر درخت کی اونچی ڈالی سے بیوی، سسر، لیزلی اور دیگر لوگوں کے سامنے بری طرح لا پٹخا۔ لگ پتا گیا ہوگا اولیور کو۔ اس کا سسر بہت چالاک اور عیار تھا، اپنے آپ کو بچا لیا اور بیٹی کی نظروں میں سرخرو رہا۔ طاہر جاوید کی قاتل مسیحا شروع کرنے سے پہلے آخری صفحہ دیکھا پھر سوچا کہ دوسرے حصے کے ساتھ شروع کروں گا مگر رہا نہیں گیا بس شروع کی تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ جاری ہے پر جا کر رکا۔ تابش اور عمران اپنے منصوبے کے تحت جادو رامے کے اڈے میں تو گھس گئے ہیں۔ جہاں کئی نئے کردار سامنے آئے ہیں۔ تابش اور عمران کی جدوجہد جاری ہے۔ کہانی کے اختتام پر بھی یہی لکھا ہوا ہے کہ جاری ہے۔"

ساہیوال سے آسیہ بتول کی ناقص رائے "جاسوسی ڈائجسٹ کی پوری ٹیم کو نئے سال کے نئے عزائم مبارک ہوں۔ ماہ دسمبر کے جاسوسی کی تمام کہانیاں (ماسوائے سلسلہ وار) پڑھنے کے بعد یہ سطور لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ آپ نے میرے پہلے خط کو ہی کرسیِ صدارت پر فائز کر دیا، اس کے لیے آپ کی ممنون ہوں۔ امید ہے کہ یہ خط بھی قبولیت اور شمولیت کا شرف پائے گا۔ ابتدائی صفحات کی طویل کہانی زہریلی شناسائی سب سے پہلے ایک ہی نشست میں ختم کی۔ کہانی کی بُنت اور روانی نے باندھے رکھا۔ گو کہ پلاٹ کوئی بہت پیچیدہ نہیں تھا، سیدھی سادی کہانی تھی مگر پھر بھی بوریت کا کہیں ذرا سا بھی احساس نہ ہوا۔ مودی صاحب بہت عرصے بعد تشریف لائے اور کیا خوب تشریف لائے۔ یہ اس شمارے کی نمبر ون کہانی ثابت ہوئی۔ اس بار سرورق کے رنگوں میں غیر روایتی نام نظر آئے۔ پہلی کہانی پسِ نقاب خاصی دلچسپ کہانی تھی، علی عباس نے اس کہانی کو سرپٹ دوڑایا۔ پلاٹ بہترین تھا۔ اگر کہانی کی بُنت پر محنت کی جاتی تو یہ کہانی اور بھی موثر ثابت ہو سکتی تھی۔ دوسری کہانی فتنہ زر بھی مناسب ہی لگی۔ ایوریج کہہ لیں۔ دو باتیں یہاں پر کہنا چاہوں گی۔ ایک تو لگتا یوں ہے جیسے سرورق کی دونوں کہانیاں ایک ہی لکھاری کے نوکِ قلم سے برآمد ہوئی ہیں۔ بہت مماثلت تھیں۔ (جی نہیں، یہ دو مختلف مصنفین کے قلم سے لکھی گئی تھیں، اور مختلف وقت میں موصول ہوئی تھیں) اسلوب، پلاٹ، رفتار، رنگ ڈھنگ۔ دوسری بات یہ کہ اب سرورق کی کہانیوں پر بھی مختصر کہانیوں ہی کا گمان ہوتا ہے۔ (صفحات کی کم یابی کے سبب بھی کبھار مختصر کہانی لگانی پڑ جاتی ہے، ہر دفعہ ایسا ہوتا نہیں ہے) زویا صفوان کی جواز پڑھی اور رائٹر کی ذہانت پر رشک و حسد سے سر پیٹ لیا۔ کیا بچگانہ کہانی ہے بھئی۔ عمر کی آمنہ سے پہلی چیٹ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے درمیان کیا چل رہا ہے۔ آگے جا کر رائٹر نے نہایت گھناؤنے طریقے سے کہانی کا ستیاناس پھیر دیا۔ یہ اس ماہ کی سب سے احمقانہ اور مضحکہ خیز کہانی ثابت ہوئی۔ (حیرت ہے۔ یہی کہہ سکتے ہیں کہ اپنی اپنی پسند کا معیار ہوتا ہے شاید یہ آپ کے معیار سے اوپر تھی) عمران قریشی میرے پسندیدہ لکھاری ہیں۔ اس ماہ بھی ان کی تحریر پسند آئی۔ یہ واحد لکھاری ہیں، جنہوں نے ابھی تک مایوس نہیں کیا۔ ویلڈن۔ (شکر الحمدللہ) عبدالرب بھٹی کی "پھندا" بہترین کہانی تھی۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ خدا کرے کہ ڈاکٹر بھٹی بھی طویل کہانیاں نہ لکھیں۔ وہ مختصر کہانیاں زبردست لکھتے ہیں۔ یہ تھی کہانیوں کے بارے میں میری ناقص رائے۔"

گوجرانوالہ سے آصف محمود کی شکایات "جاسوسی ڈائجسٹ ہر ماہ مہنگا کیا جا رہا ہے اور کہانیاں تقریباً تھرڈ کلاس ہیں۔ دہر اب کچھ بہتر جا رہی ہے۔ شکر ہے شعلہ زن ختم ہو گئی۔ مصنفہ کے بس کی بات نہیں تھی کہ سلسلے وار کہانی لکھ سکے۔ اس نے کرداروں کی بھرمار کر دی تھی۔ شمشیر خان نے دو دہشت گردوں کی ڈاکٹر سمیت گرفتاری کی تھی اور مصنفہ نے آخر میں کریم کا نام ٹھوک دیا۔ ویسے مصنفہ روبینہ رشید اغوا کرانے کی ماہر لگتی ہیں۔ یعقوب بھٹی، عبدالرب بھٹی، طاہر جاوید مغل ذرا فحاشی کرداروں پر نظرِ ثانی کریں۔ ایسی کہانی کے کردار نہ لکھیں۔ جاسوسی ڈائجسٹ ماہ اگست کے چار اوراق دو سطر کے تھے باقی پرنٹ غائب اور کئی درجن صفحات کی سیاہی اتنی مدھم ہوتی ہے کہ پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کئی چھوٹی چھوٹی کہانیاں صحیح تھیں مگر سلسلے وار کہانیوں کی تھسا تھسی بند کر کے جاندار سلسلے کو فوقیت دیں۔"

جاسوسی کے اوّلین صفحات پر ایڈونچر اور تھرل سے بھرپور سوغات

آبی قیامت

امجد رئیس

ارضِ کائنات میں کہیں نہ کہیں
کوئی بھی حادثہ رونما ہوتا
ہے... حادثات سے بچنے کی تدبیر
کی جاسکتی ہے مگر آفاتِ الٰہی سے بچنا
ناممکنات میں سے ہے... گوکہ جدید
سائنس اِن قدرتی آفات کو روک نہیں سکتی
مگر قبل ازوقت پیش گوئی کر کے اُس کی
خطرناکی اور ہولناک تباہی سے بچنے کے خطرے کا
الارم دینے میں کامیاب ہو چکی ہے... زیرنظر ناول بھی
قدرتی آفات میں سے ایک آفت کے گرد گھومتا ہے... ایسی
انجانی... طوفانی... آناً فاناً جھپٹ لینے والی کہ دوسرا
سانس لینا اور اگلا منظر دیکھنے کی سکت نہ رہے۔ ہنستی
مسکراتی زندگی کے بھرپور کرداروں سے آغاز کرتی ایک المناک
داستان... سمندر کے خوب صورت ساحلوں پر اپنی زندگی کا یادگار
وقت گزارتے شوخ چُلبلے لوگوں کی اٹکھیلیاں... کسی عفریت کے مانند
اونچی، لمبی اور بے مثال طاقت سے بھرپور لہروں نے... انہیں ہرشے سمیت
اپنے اندر نگل لیا...

سنسنی خیز ناقابلِ فراموش لمحوں میں دوسروں کے لیے اپنی زندگی وار دینے والی فیصلہ کن گھڑیاں

8:41am

کیپٹن مائیکل راب نے آنکھیں کھولیں اور خود کو کاک پٹ کے فرش پر لیٹا پایا۔ فینیش کی آن دیکھی لہروں نے اسے لپیٹ لیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دہکتی، سلگتی بھٹی میں پڑا ہو۔ جبکہ وہ ہوائی جہاز میں تھا۔ خطرے کے متعدد سائرن سماعت کو چیر رہے تھے۔ پیشانی سے خون کے قطرے رس کر آنکھ میں جا رہے تھے۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔ دُھندلے ذہن کے ساتھ سوچنا شروع کیا کہ ہوا کیا تھا پھر اُسے تصادم یاد آیا۔

مائیکل راب ٹوائلٹ کا تیسرا چکر لگا کر کاک پٹ میں پہنچا ہی تھا اور فلائٹ لاس اینجلس سے سڈنی کی طرف جاتے ہوئے آدھا ہی راستہ طے کر پائی تھی۔ وینڈی جیکب، کو پائلٹ، مائیکل سے بیس برس عمر میں کم تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ مائیکل اپنی نشست سنبھالنے ہی والا تھا کہ یکدم حادثہ ہو گیا۔ ہوائی جہاز کے اسٹار بورڈ والے بازو پر روشنی کا جھماکا ہوا۔ وہ طوفان سے اوپر بلندی پر پرواز

کر رہے تھے۔ پہلا خیال یہی آیا تھا کہ آسمانی بجلی ٹکرائی ہے۔ لیکن اچانک جہاز جھٹکا لے کر دائیں طرف چلا گیا۔ گویا کسی دیو نے پکڑ کے ایک طرف پٹخ دیا ہو۔ جہاز خوفناک گرج سے لرز اٹھا۔ مائیکل آگے کی جانب گرا تھا۔ زیادہ ضرب سر اور کاندھے پر آئی۔ ہوش و حواس چند سیکنڈ کے لیے رخصت ہوئے تھے۔ تاہم دماغ آنکھیں کھولنے کے بعد بھی سویا ہوا تھا۔ اس نے ہمت کی، خود کو سنبھالا۔ اٹھ کر آنکھ کا خون صاف کیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنا زخمی ہوا ہے۔ تاہم حرکت کر سکتا تھا اور یہ کافی تھا۔ انسٹرومنٹ پینل کام کر رہا تھا۔ کو پائلٹ وینڈی نے آٹو پائلٹ کو ہٹا دیا۔ اس نے یوک (Yoke) تھام کر خود کنٹرول کے لیے لڑائی کا آغاز کیا۔ کیپٹن مائیکل اپنی نشست پر آیا۔ پینل پر نظر ماری۔ پریشر گیج چیک کیے۔ ہوا کے دباؤ میں کمی برق رفتار تھی۔ وہ ایک تجربہ کار پائلٹ تھا۔ اضطراری طور پر بائیں جانب لٹکتے ہوئے گیس ماسک کو لیا۔ کاندھے میں درد کی لہر اٹھی۔

''آکسیجن ماسک لے لو۔'' وہ چلایا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وینڈی.... نے یہی کیا۔ مسافروں کی طرف ماسک آٹومیٹک نیچے آگئے تھے۔ مائیکل کا دماغ بیدار ہو گیا تھا۔ کیا ہوا تھا؟ وہ تیزی سے سوچ رہا تھا۔ دہشت گردوں کا حملہ؟ میزائل اٹیک؟ کیا ایندھن کے ٹینک پھٹ گئے تھے؟ اتنی سرعت کے ساتھ دباؤ کا کم ہو جانا...... مطلب صاف تھا کہ مسافروں کی چند کھڑکیاں اڑ گئی ہوں گی۔ شاید کوئی دروازہ پورا ہی غائب ہو چکا ہو لیکن جہاز فلائی کر رہا تھا۔ یعنی ایندھن کے ٹینک جگہ پر تھے۔ اس نے کنٹرول کی طرف توجہ دی۔ مسافروں سے بات کرنے کا وقت نہیں تھا۔ فلائٹ کے میزبان دیکھیں گے۔ وہ خود مسافروں کے لیے بہترین کام یہی کر سکتا تھا کہ جہاز کو دس ہزار فٹ کی بلندی پر نیچے لے آئے۔ جہاں سانس لینے کے لیے ہوا میسر ہو گی۔ مائیکل نے چیخ پکار کرتے الارم بند کیے۔ لیکن ایک ابھی تک شور مچا رہا تھا۔ اسٹار بورڈ کی سرخ روشنی اشارہ کر رہی تھی کہ دونوں انجن آگ کی زد میں ہیں۔

''انجن نمبر تین...... ٹی ہینڈل۔'' وہ چیخا۔ وینڈی نے ہینڈل کھینچ کر ساتھ ہی آگ بجھانے کے لیے اس کے نیچے موجود بٹن دبا دیا۔

آنکھوں سے جائزہ لینے کے لیے وینڈی نے کھڑکی سے جھانکا۔ ''ایک انجن سرے سے غائب ہے۔''

''غائب، کیا مطلب؟'' کیپٹن نے سوال کیا۔

''الگ ہو چکا ہے۔ نظر نہیں آ رہا۔''

مائیکل نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اس کا جہاز 400-74 تین انجن کے ساتھ فلائی کرنے کا اہل تھا۔ وہ فی الحال خوش قسمت تھے کہ دو انجنوں کے ساتھ ابھی فضا میں تھے۔ اس نے وینڈی کو دیکھا جس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

''مدد کے لیے کال دو۔'' مائیکل نے کہا۔

وینڈی نے سر ہلایا۔ وہ جانتی تھی کہ کسی نے سن بھی لیا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ انحصار اس پر تھا کہ وہ اپنی پوزیشن بتا سکیں اور یہ کہ وہ کتنی دیر فضا میں رہ سکتے ہیں۔ یہ بھی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق تھا۔

''مے ڈے! مے ڈے! مے...... دس از ٹرانس پیک آٹھ سو تئیس۔ ہم گرنے والے ہیں۔ ہم صرف دو انجنوں پر ہیں۔ ہماری پوزیشن پچھتر میل دو چار پانچ پامیرا وی اوR(VOR)۔''

کوئی جواب نہیں آیا۔

''ایمرجنسی ٹرانسپونڈر کو فعال کر دو۔'' مائیکل نے کہہ تو دیا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ طریق کار کام نہیں آئے گا۔ کیونکہ وہ کسی بھی رڈار یونٹ کے دائرہ کار سے باہر تھے۔ وینڈی نے خاموشی سے ہدایت پر عمل کیا۔ طیارہ بہت کم وقت میں پینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر آ چکا تھا۔ دائیں جانب دبیز بادلوں میں چمک نظر آئی۔ پھر بادلوں نے اسے چھپا لیا پھر نظر آئی۔ بے پناہ روشنی کے ساتھ۔

''یہ کیا بلا ہے؟'' وینڈی کا منہ کھل گیا۔

بادلوں کو پھاڑتا ہوا آگ کا گولا بلند ہوتا گیا۔ اس کی شکل مشروم کی تھی۔ مائیکل سحر زدہ دیکھ رہا تھا۔ ایسی اشکال اس نے لاتعداد تصاویر میں دیکھی تھیں۔ بحر ہند میں ایٹمی تجربات پر پابندی کو عرصہ بیت گیا تھا اور اس علاقے میں کوئی آتش فشاں بھی نہیں تھا۔ پھر ایسا مہیب دھماکا کیا تھا۔ جو کچھ تھا اس کا جواب معلوم کرنا اس وقت بے معنی تھا۔

''بائیں طرف نکلو۔'' مائیکل چیخا۔ جہاز کو متوازن رکھنا پہلی ترجیح تھی۔ دھماکے کی لہر سے بچنے کے لیے بلاسٹ زون سے نکلنا ضروری تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ جہاز کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اب جہاز کا جو حال تھا، وہ کیونکر بروقت آواز کی لہر سے بچ سکتے تھے۔ وینڈی لمحہ بھر کے لیے ہچکچائی تھی۔ وہ لوگ دس منٹ پہلے پامیرا اٹول پر سے گزرے تھے۔ لیکن اس جانب پلٹنا کارِ لاحاصل تھا۔ وہاں کا رن وے دوسری جنگ عظیم کے دوران تعمیر ہوا تھا۔ وہ کئی دہائیوں سے ناقابل استعمال تھا۔ قریب ترین وے کا دوسرا امکان کرسمس

آئی لینڈ کا تھا۔ وہاں کارن وے آپریشنل تھا لیکن جزیرہ پانچ سو میل دور تھا۔ جہاز کو جو نقصان پہنچا تھا اس کے باوجود وہ فضا میں تھا۔ جزیرے تک پہنچنے کی کوشش میں موہوم امید پوشیدہ تھی۔ مائیکل نے کنٹرول سے لڑنا شروع کیا۔ جسیم طیارے کی ناک نہایت دھیرے سے مڑی اور اسی وقت نامعلوم دھماکے کی دوسری لہر وزنی جناتی تھپڑ کے مانند ٹکرائی اور جہاز دم کی جانب سے اوپر اٹھا اور کھلونے کے مانند جھنجھنا اٹھا۔ کھڑکیاں متاثر ہوئیں۔ ہوا کا طوفانی جھکڑ کاک پٹ میں در آیا۔ ایک اور انجن الگ ہو گیا۔ ایندھن کی ٹنکیوں میں آگ بھڑک اٹھی۔ طیارے کا آدھا پورٹ ونگ الگ ہو گیا۔ طیارہ یوں بے قابو ہوا جیسے ایلیویٹر کیبل ٹوٹنے سے بے آسرا ہو کے گرتا ہے۔ دو انجن داغ مفارقت دے گئے تھے اور ایک ناکارہ تھا۔ گویا جہاز زخموں سے چُور چُور تھا۔ کیپٹن مائیکل نے دھواں دھواں ذہن کے ساتھ مسافروں کے بارے میں سوچا۔ تین سو بہتر مرد و زن اور بچے۔ کلیجا خون ہو گیا۔ وہ ہتھیار نہیں پھینک رہا تھا لیکن کوئی امید کی کرن بھی نظر نہیں آرہی تھی...... جہاز گھومتا ہوا نیچے گر رہا تھا۔ یہ موت کی چک پھیریاں تھیں۔ آناً فاناً وہ نیچے بادلوں میں گھس کر نچلی تہ سے بھی نکل گئے اور مائیکل نے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ بحرالکاہل کا نیلا پانی دیکھا۔ میٹر بتا رہا تھا کہ وہ محض ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں۔

کوئی معجزہ نہیں ہونا تھا۔ وقت آخر تھا۔ بھیانک حقیقت کو قبول کرنا ہی تھا۔ مائیکل نے کنٹرول چھوڑ دیا۔ پشت نشست سے لگا دی۔ اس نے ہاتھ وینڈی کی جانب دراز کر دیا۔ وینڈی نے ہاتھ تھام لیا...... بہت سختی کے ساتھ۔ مائیکل نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ زیرلب دعا کر رہا تھا، جب طیارہ پانچ سو میل گھنٹا کی رفتار سے عمیق سمندر سے ٹکرایا......

☆☆☆

8:51 am

کائی تنا کا اس بات کے خلاف تھا کہ اس کی تیرہ سالہ بیٹی لانی اسکوبا ڈائیونگ کے لیے جائے۔ لانی اور اس کی بہترین سہیلی میا میز پر میگزین کے اوراق پلٹتی ہوئی کھلکھلا رہی تھیں۔

''ہم آج صبح نکل جائیں گے۔'' لانی نے کہا اور میا نے اثبات میں سر ہلا کر لانی کے فادر کائی تنا کی طرف دیکھا۔ کائی نے مشکوک انداز میں شانے اچکائے۔ وہ کاؤنٹر پر رکھے ٹی وی کو دیکھ رہا تھا۔ ہونولولو کی خبروں میں اینکر وومین کے ساتھ بریکنگ نیوز کی سلائیڈ چل رہی تھی۔ لیکن والیم کم تھا اور لڑکیاں شور مچا رہی تھیں۔ کچھ پلے نہیں پڑا۔

''ہیلو؟ ڈیڈ؟ کیا میں جا سکتی ہوں؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' بالآخر کائی نے زبان کھولی۔ ''تم دونوں ڈائیونگ کے لیے بہت چھوٹی ہو۔''

''میں اگلے مہینے چودہ برس کی ہو جاؤں گی۔''

بات تو لانی نے ٹھیک کہی تھی۔ ویسے بھی وہ تیرہ سال کے بجائے سولہ کی دکھائی دیتی تھی۔ قد پانچ فٹ آٹھ انچ، وہ ماں سے بھی دو انچ لمبی ہو گئی تھی۔ اس کی عمر بھی بچوں والی نہیں تھی۔ اس کے بال کشمشی رنگت کے تھے۔ خدوخال میں اٹالین اور جاپانی ورثے کی آمیزش تھی۔ مختصر یہ کہ وہ خاصی حسین تھی۔ کائی حیران تھا کہ بیٹی کتنی تیزی سے کم سنی کی منازل طے کر کے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے والی تھی۔

''کیا ٹریسا نے اجازت دی ہے؟'' کائی نے سوال کیا۔ جواب مثبت تھا، جو میا نے دیا تھا۔

''یعنی میں جا سکتی ہوں؟'' لانی نے پھر کہا۔

کائی نے ٹھہر کر جواب دیا۔ ''مجھے سوچنا پڑے گا۔''

لانی نے منہ بنا کر اپنی سہیلی کو دیکھا۔

''یہ ایک خطرناک کھیل ہے۔'' کائی نے کہا۔

''آپ کم سے کم پچاس مرتبہ غوطہ خوری کر چکے ہیں۔'' لانی نے بسورتے ہوئے کہا۔

''یہی وجہ ہے کہ میں جانتا ہوں یہ خطرناک کام ہے۔ دوسرے تمہاری ماں سے بھی بات کرنا پڑے گی۔''

''وہ راضی ہیں، ہم بات کر چکے ہیں۔ میا کی موم ٹریسا کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''میں پھر بھی بات کروں گا۔'' کائی تنا کا نے کہا۔

☆☆☆

8:56 am

بارش متواتر دو گھنٹے سے برس رہی تھی۔ وانی ڈطب بہرحال اپنے کام میں جتی ہوئی تھی۔ وہ تین ہفتے سے پالی مارو ٹول جزیرے پر تھی۔ (یہ شمالی جزائر میں سے ایک ہے اور ہوائی کے جزائر کے جنوب میں ہے) وانی وہاں موسم کا حال جانچنے کے لیے آئی تھی۔ سالانہ ایک سو بہتر انچ بارش نے جزیرے کو بھرپور شاداب ہریالی بخشی تھی۔ وانی کے لیے سائنسی تحقیق کے اعتبار سے وہ کوئی معقول جگہ نہیں تھی۔ اس نے مخصوص لباس اور جوتے پہنے ہوئے تھے۔ پریشانی پھر بھی لاحق تھی۔ بارش رکنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ وہ

ساحل کی طرف سے اکیلی آرہی تھی۔ وانی کے تینوں ساتھی ہیں کیمپ میں واپس چلے گئے تھے۔ وہ تینوں کمپیوٹرز پر مصروف کار تھے۔

افق تک سیاہ بادلوں کا راج تھا۔ بادلوں میں گاہے گاہے بجلی تڑپ کر غائب ہو جاتی۔ نیچر کنزرویسی پائی مارڈول جزیرے کو خرید چکی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ انسانوں کی آمد کو روکا جائے۔ ایکو سسٹم کو انسانی آمد و رفت سے محفوظ رکھنا تھا۔ وہ بہت کم تعداد میں محققین کو وہاں آنے کی اجازت دیتے تھے۔ وانی اُن خوش قسمت افراد میں سے ایک تھی۔

پریشانی کے باوجود بارش والی صبح اس کے لیے خاص تھی۔ قدرتی عجائب کا مشاہدہ وہ بھی عالم تنہائی میں خاموشی سے...... اس پر ایک اجنبی کیفیت طاری تھی جو روح کی گہرائی میں اتر رہی تھی۔ اچانک اس نے اپنا ڈیجیٹل کیمرا نکالا۔ وہ ایک بڑی جسامت والا نیلا کوکونٹ کریب (کیکڑا) تھا۔ جو تیزی سے پام کے درخت پر جا رہا تھا۔ وانی کیکڑے کی جسامت دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ وہ ایک نایاب نمونہ تھا۔ ڈھائی فٹ سے بڑھ کر اور وزن دس پاؤنڈ کے آس پاس...... امریکن یا کینیڈین کیکڑے اس نیلے جسیم کیکڑے کے سامنے بے حیثیت تھے۔ وانی نے ایسا عجوبہ کیکڑا پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اوپر جا کر کیکڑے نے ایک ناریل دبوچا اور اپنے بڑے پنجوں سے اس کو بہ آسانی تربوز کے مانند کھول دیا۔ وانی نے کیمرا وڈیو پر کر دیا۔ اس وقت ایک مہیب گونج سنائی دی۔ آواز اتنی بلند اور شدید تھی کہ وانی کے ہاتھ سے کیمرا گر گیا۔ کیکڑے نے بھی ناریل چھوڑا اور تیزی سے اتر کے کہیں اپنے بل میں غائب ہو گیا۔ وانی نے جھک کر کیمرا اٹھایا اور گونج کے معدوم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ ساتھ ہی اس کی آنکھیں وہ مرکز تلاش کر رہی تھیں، جہاں سے آواز بلند ہوئی تھی لیکن ایک سرے سے دوسرے سرے تک بادل سیاہ دبیز کمبل کے مانند چھائے ہوئے تھے۔ ایسا کوئی اشارہ نہ تھا جو بتاتا کہ کوئی خوفناک طوفان چل پڑا ہے اور راستے میں ہے۔

وانی کیکڑے کا بل تلاش کر رہی تھی کہ کلوز اَپ بنایا جا سکے۔ معاً جزیرے کے اندرون سے نئی آواز بلند ہونے لگی۔ پائی مارڈول جزیرہ کی چوڑائی صرف نصف میل تھی۔ اس نے ساکت ہو کر نگاہوں سے درختوں کو کھنگالا۔ آواز بلند ہوتی گئی اور جیسے اس کا رخ وانی کی جانب تھا۔ یوں لگ رہا تھا گویا ہزاروں ہاتھی راہ میں آنے والی ہر شے کو تہس نہس کرتے چلے آرہے ہیں۔ وانی غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹی۔ پھر اس نے ہاتھیوں کو دیکھ لیا...... وہ ہاتھی نہیں تھے۔ بپھرے ہوئے پانی کی مہیب گھومتی گرجتی دیوار تھی۔ جو راہ میں آنے والے ہر درخت کو جڑ سے اکھاڑتی چلی آرہی تھی۔ ہاتھی ہوتے تو وانی کو ایسا شاک نہ لگتا۔ وہ مفلوج ہو کے رہ گئی تھی۔ پانی کی آواز اور ہوا کی طوفانی لہریں تھیں۔ ملبا ساتھ آرہا تھا۔ وانی کی آنکھیں دہشت سے پھٹی رہ گئیں۔ آناً فاناً وہ قیامت صغریٰ میں غائب ہو گئی۔ اپنی آخری چیخ وہ خود بھی نہ سن سکی تھی۔

☆☆☆

ثریا اور بچے بوگی بورڈز (چھوٹے، ہلکے بورڈ سمندر میں سرفنگ کے لیے استعمال ہوتے ہیں) پیک کر کے جیپ میں رکھ رہے تھے۔ وہ لوگ اواہو (Oahu) میں تھے۔ (اواہو جزیرہ ہونولولو میں ہے) صبح روشن تھی۔ فضا میں پھولوں کی روح افزا خوشبو مشام جان کو معطر کر رہی تھی۔

پیسیفک سونامی وارننگ سینٹر (PTWC) (PTWC) ریاست ہوائی کے دارالحکومت ہونولولو میں ہے۔ ریاست ہوائی میں سو سے زیادہ چھوٹے بڑے جزائر ہیں) کے گیٹ نے توجہ مبذول کرائی۔ گہرے سیاہ رنگ کی بار سے غراتی ہوئی دھیمی رفتار سے آرہی تھی۔

''اوہ نو۔'' کائی نے آہ بھری۔

''شیطان کو یاد بھی نہیں کیا اور وہ آ گیا۔'' ثریا بولی۔

''وہ شیطان نہیں، براڈ ہے۔''

''بلے بوائے کا لفظ اس کے لیے بہتر ہے۔''

''یہ مت کہنا کہ میں پہلے ہی خبردار کر چکا ہوں۔''

''مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' ثریا نے کہا۔ ''لیکن وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟''

''میں لاعلم ہوں۔ لیکن مجھے پسند نہیں ہے۔'' کائی جب سے ہوائی آیا تھا، براڈ باقاعدگی سے چکر لگاتا تھا۔

براڈ نے بائیک گروپ کے قریب روکی اور ہیلمٹ اتار دیا۔ انگلیاں گھنے بھورے بالوں میں گھمائیں۔ لائی دوڑ کر اس کے بازوؤں میں چلی گئی۔ ''انکل براڈ!''

''ہیلو مائی ڈارلنگ۔'' اس نے لائی کو فضا میں گھما کر نیچے اتار دیا۔ ''تم لوگ اکیلے جا رہے ہو۔ مجھے مدعو نہیں کیا؟''

میا کی آواز آئی۔ ''آپ چاہو تو آ سکتے ہو۔'' وہ مرعوب کن انداز میں براڈ کی مسکولر باڈی کو دیکھ رہی تھی۔ جو ٹی شرٹ میں مزید نمایاں ہو گئی تھی۔ براڈ کی آنکھیں

نیلگوں آسمانی تھیں۔ وہ کم سن لڑکیوں اور عورتوں کو یکساں متاثر کرلیتا تھا۔

''تم یقیناً میا ہو، میں نے سنا ہے تمہارے بارے میں۔'' براڈ مسکرایا۔'' اور ہاتھ ملایا۔'' پیاری میا۔''

''اور میں اس کی ماں ہوں۔ ثریا گومز۔'' ثریا پر اس کی جسامت اور مردانہ وجاہت کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''براڈ ہاپکنز۔'' اس نے تعارف کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔''تم ڈاکٹر ہو؟''

''تیسرا سال ہے۔'' ثریا نے جواب دیا۔''تم نے جیسا بتایا تھا، تمہارا بھائی ویسا ہی ہے۔'' ثریا نے کائی کو دیکھا۔

براڈ اور کائی دونوں چھ چھ فٹ کے تھے۔ بھائی تو تھے لیکن آدھے۔ کائی جب چار سال کا تھا تو باپ انتقال کر گیا۔ ماں نے چارلس ہاپکنز سے دوسری شادی کی۔ ہاپکنز کی ریئل اسٹیٹ جزائر میں بے حد کامیاب تھی۔ بعدازاں براڈ کی پیدائش ہوئی۔ یہ ایک اچھی فیملی تھی لیکن یہ واضح ہوتا گیا کہ ہاپکنز، براڈ کو ریئل اسٹیٹ بزنس کے لیے تیار کررہا تھا۔ کائی کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کا شوق سائنس تھی۔

بعدازاں والدین کار کریش میں ہلاک ہوگئے۔ ریئل اسٹیٹ براڈ نے سنبھال لی۔ وہ ایک آزاد پنچھی تھا۔ بیوی نہ بچے...... اس نے آزادی کو خوب انجوائے کیا۔ پیسا، کاروبار سے آرہا تھا......

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد براڈ نے ہیلمٹ سر پر جمایا۔ ہارلے اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا۔

''شکر ہے۔'' ثریا بولی۔

''مجموعی طور پر وہ اچھا آدمی ہے۔'' کائی نے کہا۔

وہ سب جیپ میں بیٹھ گئے۔ ثریا نے شیشہ نیچے کر کے مرکزی عمارت کو دیکھا۔ ''ہیگ میٹر پیسفک سونامی سینٹر'' جلی حروف میں لکھا تھا۔ عمارت کائی کے گھر سے محض سو گز دور تھی۔ تیس سیکنڈ کی واک۔

''راشیل فون کرے گی۔'' کائی نے بتایا۔

''اوکے۔'' ثریا نے کائی کی طرف ہاتھ ہلایا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ کائی نے بلبو (کتا) کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''بلبو، اب ہم دونوں ہیں۔'' کائی کے سیل نے بولنا شروع کیا۔ اسے خیال آیا کہ راشیل کی کال ہے۔ لیکن کالر آئی ڈی کہہ رہی تھی کہ پی ٹی ڈبلیو سی سے فون کیا گیا تھا۔ کائی نے کال وصول کی۔ ریگی پونا کی آواز آئی۔ وہ سینٹر میں جیو فزیسٹ تھا۔

''ہائے، کائی میں نے گھر فون کیا تھا۔ کہاں ہو؟''

''فیملی کو چھوڑنے نکلا تھا۔ سینٹر کے قریب ہوں۔''

''جیسا کہ تم جانتے ہو کہ ٹور گروپ ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔ ان کے آنے سے پہلے کچھ بتانا چاہتا ہوں۔''

''کیوں؟ کیا معاملہ ہے؟'' کائی نے سوال کیا۔

''ہم نے ابھی سونامی بلیٹن جاری کیا ہے۔''

☆☆☆

ہوائی کا گرینڈ ہوٹل نیا اور دلکش ترین لگژری ہوٹل تھا۔ اس کا رخ ''وائی کی کی'' ساحل کی جانب تھا۔ ہوٹل میں ایک ہزار پینسٹھ کمرے موجود تھے۔ اسکائی برج چھٹی منزل پر تھا (یہ عام پل کے مانند نہیں ہوتا) اسکائی برج اٹھائیس منزلہ دو ٹاورز کو آپس میں ملاتا تھا۔

راشیل کامی ٹاور میں اپنے دفاتر سے نکل کر اسکائی برج کے ذریعے مونا ٹاور میں جارہی تھی۔ اس کا رخ مرکزی بال روم کی جانب تھا۔ چلتے چلتے وہ جسمانی نقائص کے شکار سابق فوجیوں کی چیک لسٹ کا جائزہ لے رہی تھی۔ ان کو برنچ (دوپہر سے پہلے کا ناشتا) پر موجود ہونا تھا۔ ہوائی کے گورنر کو گروپ کے سامنے تقریر کرنی تھی۔ پھر ان کے ہمراہ ہوائی اسٹیٹ کی یادگار پر جانا تھا۔ جو دراصل سابق فوجیوں کا قبرستان تھا۔ نئے ہوٹل کی تاریخ میں یہ ایک نہایت اہم ایونٹ تھا۔

لہٰذا راشیل پوری طرح چوکس تھی کہ کوئی کسر رہ نہ جائے۔ اس کی جاب بطور ہوٹل منیجر ایک آرام دہ ذمے داری تھی اور معاوضہ بھی معقول...... اس کے خیالات کا رخ ثریا کی طرف چلا گیا۔ خیالات میں گم وہ باب لائمین سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ باب کانفرنس کا چیئرمین تھا۔ باب کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ راشیل نے خود کو سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔

''مسٹر باب، کیا میری مدد کی ضرورت ہے؟'' اس نے چلنے کی رفتار کم کردی۔

''مسز تناکا۔'' وہ بولا۔ اپنی موٹر والی وہیل چیئر کو راشیل تناکا کے برابر لے آیا۔ ''بال روم میں ایک مسئلہ ہے جو فوری توجہ کا متقاضی ہے۔''

اسکائی برج کے فرش سے سیلنگ تک شیشے کی کھڑکیاں تھیں۔ راشیل نے سورج کی روشنی میں آنکھوں کو سکیڑا۔ ''مسٹر باب آپ کی تشویش اور سرپرستی دونوں ہمارے لیے بہت اہم ہیں۔ میں ہر ممکن مدد کروں گی۔ مجھے مسئلہ بتائیے۔'' وہ دونوں برج سے گزر کر دوسرے ٹاور میں آگئے

تھے۔ شاندار فوارے کے پاس سے ہو کر دونوں کامی میسا ہال روم میں آ گئے۔ جو ہوٹل کا سب سے بڑا ہال روم تھا۔

''بات یہ ہے کہ برنچ شروع ہونے میں زیادہ وقت نہیں ہے اور میں ڈائس تک نہیں جا سکتا۔'' باب نے ہال روم کے عقبی جانب قدرے اونچی جگہ پر بڑی سی میز کی طرف اشارہ کیا۔

دائیں جانب معمول کے مطابق اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں موجود تھیں۔ باب یا کوئی اور سیڑھیاں استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ ایک چھوٹا سا ریمپ بائیں جانب بنایا گیا تھا۔ ریمپ دیکھ کر مسئلہ راشیل کی سمجھ میں آ گیا تھا جس نے یہ کام کیا، غالباً پہلی مرتبہ کیا تھا۔ باب کی وھیل چیئر کے لیے وہ ناقابلِ استعمال تھا۔

''میں سمجھ گئی سر، آپ اطمینان رکھیں۔'' راشیل نے واکی ٹاکی نکالا اور اسسٹنٹ منیجر سے رابطہ کیا۔

''میکس، ڈائس کونٹریکٹر چلا گیا؟''

''نہیں، وہ ابھی یہیں ہے۔'' میکس والش نے جواب دیا۔

''بات کراؤ میری۔'' راشیل نے مطالبہ کیا۔

چند سیکنڈ بعد جان شیور کی آواز آئی۔ راشیل نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا۔ ''تم اور تمہارے آدمی فوراً یہاں آؤ۔ ریمپ ٹھیک نہیں بنایا گیا ہے۔''

''میرے ماہر آدمیوں نے کام کیا ہے۔'' کونٹریکٹر جان نے کہا۔

راشیل، باب سے کچھ فاصلے پر چلی گئی۔

''ریمپ قطعی بیکار ہے۔'' وہ بولی۔ ''ہوٹل میں اس سال ڈیڑھ سو کانفرنس کا انعقاد ہوگا۔ اگر تمہیں ہوٹل کے ساتھ کام کرنا ہے تو بیس منٹ میں ریمپ درست کروا دو۔ میں منتظر ہوں۔''

''مسز تناکا مجھے ایک منٹ دیجیے۔'' کچھ دیر خاموشی رہی پھر کونٹریکٹر جان شیور کی آواز آئی۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔'' وہ بولا۔ ''میں نے اپنے آدمیوں سے بات کی ہے۔ ان میں سے ایک نے غلطی کا اعتراف کیا ہے۔ ہم مطلوبہ ریمپ لا رہے ہیں۔''

''گڈ۔'' راشیل چیئرمین باب کے پاس آ گئی اور شائستگی سے کہا کہ وہ ان کے لیے کتنا اہم مہمان ہے اور ہر قسم کے بہترین سلوک کا مستحق بھی۔

''آپ کا کام بیس منٹ میں ہو جائے گا۔ شاندار ہی کا شکریہ۔'' راشیل نے واکی ٹاکی بیلٹ میں لگا لیا۔

''میں آپ کی مدد کی قدر کرتا ہوں، شکریہ۔''

''شکریہ کی بات نہیں۔ آپ کی کوفت پر میں شرمندہ ہوں۔ مجھے امید ہے کہ مستقبل میں آپ آئندہ بھی ہمارا ہوٹل منتخب کریں گے۔''

''میں مطمئن ہوں۔'' کانفرنس چیئرمین نے جواب دیا۔

جان شیور بھی آ گیا۔ راشیل اسے باب کے پاس چھوڑ کر آگے چلی اور ٹریسا کی کال آ گئی...... اس کے بعد اسکائی برج میں واکی ٹاکی بیدار ہو گیا۔ وہ میکس تھا۔

''راشیل، شینن ٹور گروپ کے ساتھ پرابلم ہے۔''

''کیسی پرابلم؟''

''معلوم نہیں۔ سمجھ رہا ہوں اور نہ سمجھا پا رہا ہوں۔''

''کوئی مترجم نہیں ہے؟''

''نہیں، کوئی نہیں۔'' اسسٹنٹ منیجر میکس نے جواب دیا۔

''وہ لوگ کہاں پر ہیں؟'' راشیل نے سوال کیا۔

''سیکنڈ فلور میزنائین۔''

''میں آ رہی ہوں۔''

راشیل نے ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگا کر گہری سانس لی۔ شیشوں کے اس پار نگاہ ماری۔ ہزاروں بے فکرے ساحل پر چھٹیاں منا رہے تھے۔ پھر وہ ایلی ویٹر کی طرف بڑھنے لگی، آج کی دوسری ایمرجنسی نمٹانے کے لیے۔

☆☆☆

کائی تناکا کے لیے ریگی کے سونامی بلیٹن کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ پیغام معمول کے مطابق تھا۔ بلیٹن ہر مرتبہ اس وقت نشر ہوتا تھا جب سینسرز پیسفک بیسن میں کوئی نمایاں تحریک نوٹ کرتے۔ ایسی حرکت جو سونامی میں تبدیل ہونے کا امکان رکھتی ہو۔ سونامی وارننگ کا مطلب میگنیٹیوڈ اسکیل پر چھ اعشاریہ پانچ سے سات اعشاریہ پانچ کی ریڈنگ ہے۔ زیرِ آب یہ حرکت ایک عام بات تھی اور ایسی کسی حرکت کا سونامی میں تبدیلی ہونا ایک نایاب عمل تھا۔ اگر ریڈنگ چھ اعشاریہ پانچ سے نیچے ہو تو وارننگ جاری کرنے کی زحمت بھی نہیں کی جاتی تھی۔

بلیٹن بحرہند میں تمام مونیٹرنگ اسٹیشنز کو پہنچا دیا گیا تھا۔ ویسٹ کوسٹ سونامی وارننگ سینٹر، پامر، الاسکا...... برٹش کولمبیا اور امریکا کی مغربی ساحلی پٹی کو بھی باخبر کر دیا گیا تھا۔ پی ٹی ڈبلیو سی نے باقی بحرہند کو کور کیا۔ پیسفک رم کے

تمام ایمرجنسی اور سول ڈیفنس کے اداروں کو مطلع کر دیا گیا۔ ان میں امریکا کی ملٹری بھی شامل تھی۔ جس کے وسیع اڈے بحر ہند میں موجود تھے۔ مذکورہ بالا میں سے کسی نے بھی ایکشن نہیں لینا تھا، یہ محض سیسمک ایونٹ کی خبر تھی۔ پی ٹی ڈبلیو سی پہلے ہی سال میں چالیس بلیٹن جاری کر چکا تھا اور کوئی بھی سونامی میں تبدیل نہیں ہوا۔

بلیٹن جاری ہونے کے بعد سینٹر کو تمام معمول کی کارروائی کرنی پڑتی تھی۔ اگرچہ بہت سا کام کمپیوٹرز پر منتقل ہو چکا تھا۔ پھر بھی کافی جھک مارنی پڑتی تھی۔ صرف یہ معلوم کرنے کے لیے کہ تھریٹ کی وقعت کیا ہے اور سونامی کی لہریں کب کہاں ہوں گی؟ الاسکا سے ہوائی تک آنے میں سونامی کو پانچ گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں بمشکل ہی اتنا وقت مل پاتا ہے کہ وسیع پیمانے پر آبادی کا انخلا یقینی بنایا جاسکے۔

کائی نے ایک شیٹ اٹھا کر میز پر پھیلائی۔ شیٹ پر اسکول گروپ کے بارے میں تفصیلات تھیں۔ گروپ جاپان سے وزٹ کے لیے صبح پہنچ رہا تھا۔ جنوب مشرقی ایشیائی سونامی ڈیزازٹر کے بعد ایسے گروپس کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ تیس منٹ کا ٹور تھا۔ اس کے بعد بقیہ دن اہم مقامات کو دیکھنے کے لیے مخصوص تھا۔ کائی نے شیٹ لپیٹی اور ڈیٹا اینالیسس لیب کا رخ کیا۔ جدید لیب میں بہترین کمپیوٹرز اور زلزلہ محسوس کرنے کے لیے خصوصی آلات موجود تھے۔ بحرالکاہل کا بہت بڑا نقشہ دو دیواروں پر نظر آرہا تھا۔ میڈیا اطلاعات حاصل کرنے میں تیز تھا۔ لہٰذا وہاں دو عدد ٹی وی بھی موجود تھے۔ ایک پر سی این این مستقل چل رہا تھا۔

عموماً جارج ہٹلے اور میری گیریسن کمپیوٹرز پر ہوتے تھے۔ دونوں جونیئر جیوفزسٹ تھے۔ کائی نے جلد اندازہ لگا لیا تھا کہ دونوں کے درمیان رومان پرورش پا رہا تھا۔ اس روز بھی دونوں چھٹی لے کر شمالی ساحل پر سرفنگ کے لیے نکل گئے تھے۔ تین سائنسداں سان فرانسسکو میں کانفرنس بھگتانے گئے تھے جبکہ ڈائریکٹر ہیری ڈو پر بحرالکاہل میں ہوائی کے ایک خوب صورت جزیرے ماوئی میں تین دن کی چھٹی منا رہا تھا۔ کائی اور ریگی کمپیوٹرز پر تھے۔ پالتو کتا بلبو بھی وہیں تھا۔

کائی نے ریگی کے آدھے سینڈوچ کو دیکھا۔ ”دن میں کوئی وقت ایسا بھی آتا ہے جب تم کھاتے نہ ہو؟“

تین سو پاؤنڈ وزنی ریگی نے منہ چلاتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہاری طرح دُبلا رہنا نہیں چاہتا۔“

کائی نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ بطور جیوفزیسٹ وہ ریگی کی صلاحیتوں کا معترف تھا۔

”تمہیں ٹریسا اور بچوں کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔“ ریگی نے مشورہ دیا۔

”میں تمہیں آنے والے گروپ کے ساتھ تنہا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔“ کائی نے جواب دیا۔ ”اچھا بلیٹن دکھاؤ۔“

ریگی نے ایک شیٹ کائی کے حوالے کی۔ کائی نے بلیٹن پر نظر ڈالی پھر ریگی کو دیکھا۔

”قابلِ تشویش تو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔“ کائی بولا۔

عام طور پر کائی تنا کا ہیری سے رائے لیتا تھا۔ لیکن آج وہ اور ریگی ہی وہاں تھے۔ اگرچہ کائی نارمل ہوتا جا رہا تھا لیکن پھر

بھی وہاں پر آئے اسے بہت زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ اس کی موجودگی میں پہلی مرتبہ سونامی وارننگ جاری ہوئی تھی۔

سابقہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر NOAA واشنگٹن ہیڈ کوارٹر چلا گیا تھا۔ مقصد عالمی سونامی وارننگ سسٹم کی ترقی میں شریک رہنا تھا۔ کائی این او اے اے سے شارٹ لسٹ ہوکر یہاں آیا تھا۔ راشیل کے ہونولولو کے ہوٹلز میں جاب کے متعدد مواقع تھے......

''ہاں، پریشانی کی بات نہیں ہے۔'' ریگی نے کہا۔ ''لیکن کچھ ہیجان سا ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''ریڈنگ 6.6 ہے قابلِ نظرانداز ہے۔ بلیٹن دینا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

''بڑا یقین ہے تمہیں۔'' کائی نے کہا۔

''میں این ای آئی سی (نیشنل ارتھ کوئیک انفارمیشن سینٹر) کو دیکھ رہا ہوں۔ سینٹر عالمی اسٹیشنز کے ڈیٹا پر نظر رکھتا ہے۔ وہ لوکیشن کا تعین سو میٹرز کے اندر بھی کرلیتے ہیں...... اور زلزلے کی لہروں کا انداز عمودی نہیں ہے۔ عمودی ہوتا تو سمندر کی تہ سے سونامی کا قہر نمودار ہوتا۔ لہٰذا درحقیقت یہ سونامی تھریٹ نہیں ہے۔ دوسری بات مذکورہ علاقے میں پہلے کبھی سونامی نہیں آیا۔''

''لیکن بلیٹن تو معمول کے مطابق ہے۔''

''ٹھیک ہے، لیکن یہ دیکھو۔'' ریگی نے کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ''بحرالکاہل کے درمیان نیلے ڈاٹ کیا بتا رہے ہیں۔ پوزیشن کرسمس آئی لینڈ کے شمال مغرب میں پانچ سو میل ہے۔ جزیرہ، پائی ماروٹول جزیرے جنوب مغرب میں ہے۔ نیلے رنگ کا مطلب ہے کہ زلزلے کی مبینہ شدت سطحِ زمین سے قریب ہے۔''

''یہاں سے کتنا فاصلہ ہے؟'' کائی نے سوال کیا۔

''تقریباً دو ہزار کلومیٹرز، بارہ سو میل سے کچھ اوپر۔''

کائی نے تیزی سے دماغ میں میلوں کا فاصلہ نکال لیا تھا۔ تمام سونامی سائنسدانوں کی یہ عادت ہوتی ہے۔ کیونکہ کھلے سمندر میں سونامی پانچ سو میل فی گھنٹا کی رفتار سے سفر کرتا ہے۔ یہ تقریباً وہی رفتار ہے جو کسی جیٹ طیارے کی ہوتی ہے۔

''گویا ہمارے پاس دو یا ڈھائی گھنٹے بچیں گے۔'' کائی نے حساب لگایا۔

''اگر سونامی آیا تب کی بات ہے۔'' ریگی نے کہا۔

''کرسمس کے جزیرے کا ٹائیڈ سینسر ٹھیک نشاندہی کردے گا۔''

''اگر واقعی ایسا ہوا تو اٹھنے والی لہر پینتیس منٹ میں کرسمس کے جزیرے تک پہنچ جائے گی۔ زیادہ تر ٹائیڈ گیج، ڈیٹا سیٹلائٹ کو منتقل کرتے ہیں۔ سیٹلائٹ پی ٹی ڈبلیو سی کو ریلے کردیتا ہے۔ لہر یا جوار بھاٹے (ٹائیڈ) کو گیج چوبیس گھنٹے مانیٹر کرتے ہیں۔ لیکن ایک کمی ہے کہ ایسا گھنٹے میں ایک مرتبہ ہوتا ہے۔ کرسمس آئی لینڈ کے لیے ٹرانسمیشن میں پانچ منٹ باقی تھے۔ جس کے بعد پتا چل جاتا کہ لہریں وہاں تک پہنچیں یا نہیں۔ کائی نے زلزلے کا نقشہ دیکھا۔ مختلف رنگ زلزلے کی گہرائی کو ظاہر کررہے تھے۔ چند سرخ نشان بتا رہے تھے کہ سونامی کہاں سے شروع ہوا تھا۔

سرخ، نیلے نشانات کے دائرہ کار میں تھے جو پانچ سو میل وسعت کا حامل تھا۔

''اس علاقے کا کبھی سونامی سے واسطہ نہیں پڑا۔''

''ہے نہ عجیب بات۔'' ریگی نے سر ہلایا۔ ''دو امکانات ہوسکتے ہیں۔ پہلا یہ کوئی ایسا فالٹ ہے جس کی پہلے کبھی نشاندہی نہیں ہوئی۔''

''ایسا ہونا تقریباً ناممکن ہے۔'' کائی نے کہا۔

''رائٹ، لیکن دوسرا امکان ہیجان رکھتا ہے اور سونامی حقیقت بن جائے گا۔ یہی دوسرا امکان وضاحت کرتا ہے کہ زلزلہ سطحِ زمین (جزیرہ) سے قریب کیوں ہے؟''

کائی، ریگی کی زبان سے نکلے لفظ ''ہیجان'' کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ وہ ایک غیر معمولی نایاب امر کی بات کررہا تھا۔ یعنی ''سی ماؤنٹ'' ایک نئے جزیرے کی پیدائش۔ سمندر کی تہ میں آتش فشاں پھٹنے تو پانی میں لاوا سخت ہوکر پہاڑ بنا دیتا ہے۔ علاوہ ازیں دورانِ عمل زلزلوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اگر پہاڑ کی بلندی بڑھ جائے تو یہ سطحِ آب کو پھاڑ دیتا ہے۔ ہوائی کے جزائر نے اسی طرح جنم لیا تھا اور چھوٹے بڑے ایسے جزائر بننے کا سلسلہ وقتاً فوقتاً جاری رہتا تھا۔ بالکل جیسے بگ آئی لینڈ پر کیلاؤ (Kilauea) جزیرے کی متواتر آتش فشانی......

اگر یہ سی ماؤنٹ نکلا تو دریافت کا سہرا ریگی کے لیے ہوگا۔ یہ جیو فزیسٹ کے لیے ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کوئی ماہر فلکیات نیا مدار ستارہ دریافت کرلے۔

''اگر ایسا ہوا تو میری طرف سے مبارک باد۔'' کائی نے کہا۔ ''اگلے پانچ سال تک تمہارے مضامین چھپتے رہیں گے۔''

ریگی نے آنکھ ماری۔ ''ایسی صورت میں تم میرے سیکنڈ آتھر (Author) ہو گے۔''

''تم بہت فیاض ہو۔لیکن جشن منانے سے پہلے یقین کر لینا چاہیے کہ ہمارا واسطہ سونامی سے نہیں پڑنے والا ہے۔''

''ہاں تصدیق کے بعد میرے ''سی ماؤنٹ'' کے نام کے بارے میں سوچنا۔'' ریگی نے قہقہہ لگایا۔

''این ای آئی سی کے ساتھ میں اے این ایس ایس (ایڈوانس نیشنل سیسمک سسٹم کا ڈیٹا بیس بھی چیک کر رہا ہوں۔''

کائی نے سراہنے والے انداز میں سر ہلایا۔ ریگی تیز جارہا تھا۔ ''بہت اچھے۔ کرسمس آئی لینڈ کے بعد مدوجزر کی جانچ اس وقت تک نہیں کریں گے، جب تک اس کی لہر جانسٹن جزیرے تک نہیں پہنچتی۔''

اچانک کائی کو ہلر یاد آیا۔

''کیا ہلر فری مین یہاں سے جنوب مشرق کی سمت ایک ہزار کلو میٹر کے فاصلے پر ''ڈارٹ بوائے'' چیک نہیں کر رہا؟'' ڈارٹ DART (ڈیپ اوشین اسسمنٹ اینڈ رپورٹنگ آف سونامی)

ریگی نے کمپیوٹر پر انگلیاں چلائیں۔ ''ہاں دو دن پہلے ڈارٹ بوائے سسٹم آن کر دیا گیا ہے۔ ڈارٹ ایک ہفتہ وہیں رہیں گے......''

فرنٹ گیٹ کا بزر بولنے لگا تھا۔

''تم ٹور گروپ کو سنبھالو۔'' ریگی نے کہا۔

☆☆☆

9:23 am

ہیرالڈ فرینکلن آرام دہ کرسی میں آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا۔ وہ لوگ کروز پر کرسمس آئی لینڈ کے مغرب میں تین میل دور تھے۔

''ہم کتنی دیر پانیوں میں رہیں گے؟'' ہیرالڈ نے آنکھیں کھولیں۔

''مجھے کیا پتا۔'' اس کی بیوی جینا نے کہا۔ ''مجھے تم سے ہوائی جانے کی بات کرنی چاہیے تھی۔ وہاں شاپنگ کا موقع تو ملتا......''

ان دونوں کو سیکرامونٹو سے ہونولولو پہنچنے میں چھ گھنٹے لگے تھے۔ پھر تین گھنٹے ہوائی سفر کے ذریعے انہوں نے تیرہ سو میل کا فاصلہ طے کیا...... اب وہ آبی سفر کے دوران کرسمس آئی لینڈ کے قریب تھے......

''کم از کم بارش تو نہیں ہو رہی۔'' ہیرالڈ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ کئی مہینوں سے چھٹیوں میں یہاں آنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔

''بادل ہیں، بارش ہو بھی سکتی ہے۔'' جینا نے کہا۔ ''جنہیں مچھلی کا شکار بھی یہیں کرنا تھا؟'' اس نے منہ بنایا۔

ہیرالڈ نے جواب نہیں دیا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ جزیرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟''

''پرندوں کو کیا ہوا۔ لگتا ہے جزیرے کے تمام پرندے ایک ساتھ فضا میں آگئے ہیں۔'' وہ بولا۔

وہ ایک چھوٹا جزیرہ تھا۔ آبادی محض تین ہزار دو سو۔ امریکیوں کے علاوہ سیاح وہاں کم ہی آتے تھے۔ جزیرے کا بلند مقام بھی سطح سمندر سے محض بارہ فٹ اونچا تھا۔

ذرا دیر میں کروز پر موجود دیگر افراد بھی متوجہ ہو چکے تھے۔ پرندوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ کیپٹن پیٹر اور اس کا ساتھی ڈیوی بھی فضا میں پرندوں کو تک رہے تھے۔ وہ دونوں امریکی تھے۔

''آگ لگی ہے کیا؟'' ڈیوی نے پیٹر سے سوال کیا۔

''نہیں، کوئی اور بات ہے۔''

''زلزلہ ہو سکتا ہے۔'' ہیرالڈ نے رائے ظاہر کی۔ وہ جانتا تھا کہ زلزلے سے پہلے جانور اور پرندے غیر معمولی ردعمل پیش کرتے ہیں۔

''نہیں۔'' پیٹر نے تردید کی۔ ''یہ زلزلے کا علاقہ نہیں ہے اور نہ ہی آتش فشاں ہو سکتا ہے۔'' ہیرالڈ نے بیگ سے دوربین نکالی۔

''ریڈیو استعمال کرنا چاہیے۔'' ڈیوی نے کہا۔

ہیرالڈ کی آنکھیں دوربین سے لگی تھیں۔ ''ناقابلِ یقین۔'' وہ بڑبڑایا۔

''کیا؟'' جینا نے سوال کیا۔

''جزیرہ بڑا ہو رہا ہے۔''

''کیا بکواس ہے۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟'' جینا کی آواز بلند تھی۔

ڈیوی نے بھی سن کر استفسار کیا۔ جزیرے کا ساحل درختوں کے برابر اونچا ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی جزیرہ سیکنڈوں کی رفتار سے اوپر جا رہا تھا۔ جزیرے کے اطراف میں زیرِ آب روپوش مونگے کی چٹانیں عیاں ہو گئی تھیں۔

''اوہ نو۔'' ڈیوی، پیٹر کی طرف دوڑا۔ ٹرانسمیٹر اس کے ہاتھ سے چھینا۔ ''بوٹ کو جزیرے سے دور لے جاؤ۔

جتنی جلدی ہو سکے...... جلدی کرو۔'' وہ چیخا۔ پیٹر اُلجھن میں پڑ گیا۔ کروز بوٹ اس کی تھی اور اسی کو حکم دیا جا رہا تھا۔ تاہم اس نے ڈیوی کی آنکھوں میں ناچتی وحشت اور خوف کو پڑھ لیا تھا۔

وہ رفتار بڑھا کر بیس ناٹ تک لے گیا۔

''ہیں، دس اِز ''بیبی کٹ'' مجھے سن رہے ہو؟''

کسی عورت نے جواب دیا۔ ''ہاں، بیبی کٹ۔ مجھے علم ہے۔ مدوجزر کسی اور طرف ہے۔''

''یہ ٹائڈ نہیں ہے۔'' ڈیوی چلّایا۔ ''سونامی آرہا ہے۔ بلند ترین جگہ پر چلی جاؤ۔''

ہیرالڈ نے تاشا کی آواز پہچان لی تھی۔ وہ لوگ کبھی جزیرے پر اور کبھی سمندر میں ہوتے۔ چھٹیاں خوب گزر رہی تھیں۔ ہیرالڈ نے تاشا اور ڈیوی کی قربت کا ادراک کر لیا تھا۔ اب تاشا جزیرے پر اور وہ لوگ کروز پر تھے۔ ہیرالڈ حیران تھا کہ ڈیوی اپنی دوست کو کہاں اوپر جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔

''تمہارا کیا ہوگا؟'' تاشا کی پریشان کن آواز آئی۔

''ہم گہرے سمندر میں ہیں۔''

''لیکن میں کہاں جاؤں؟'' تاشا کی آواز میں ہراس تھا۔ ہیرالڈ جانتا تھا کہ تاشا بے بس تھی۔ جزیرے کا بلند مقام سطح سمندر سے محض بارہ فٹ اونچا تھا۔

''درخت پر چڑھ جاؤ۔'' ڈیوی نے کہا۔

جینا کی چیخ سنائی دی۔ ''وہ دیکھو۔''

پہاڑ جیسی لہر نے آناً فاناً درختوں کو نگل لیا۔

ریڈیو سے صرف سنسناہٹ کی آواز آرہی تھی۔

ہیرالڈ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سر ہلایا۔

''مجھے ہوائی جانا چاہیے تھا۔'' اس نے سرگوشی کی۔

☆☆☆

جاپانی اسکول کے بچے پی ٹی ڈبلیو سی میں خاموش بیٹھے کائی کی باتیں سن رہے تھے۔ ان کے ساتھ موجود ٹیچر ترجمہ کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اگرچہ کائی نے جاپانی زبان اپنے باپ کے آبا سے سیکھی تھی اور اٹالین ماں کی طرف سے...... تاہم وہ اب دونوں زبانوں میں رواں نہیں تھا۔ جاپانی بچوں نے سری لنکا، تھائی لینڈ اور انڈونیشیا کے سونامی کی وڈیوز دیکھ رکھی تھیں۔ خود جاپان ہمیشہ سے زلزلوں اور سونامی کے لیے ایک حساس علاقہ رہا تھا......

کائی انہی حوالوں سے باتیں کر رہا تھا۔ ماضی میں سونامی نے ہوائی میں تباہی مچائی تھی۔ کائی نے اس کا ذکر کیا۔ چند بچوں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ کائی نے 1946ء میں ہونے والی تباہی کی کہانی سنائی...... سینٹر کی ابتدا اور کارکردگی کے بارے میں بتایا۔ سیلاب اور سونامی میں تفریق کا ذکر کیا۔ سونامی کے بارے میں چند غلط فہمیوں کو سامنے رکھا۔ کانفرنس روم میں پروجیکٹر چلا کر کائی نے تصاویر کی مدد سے بھی وضاحت کی۔ گاہے گاہے وہ بچوں کے سوالات کے جواب بھی دے رہا تھا۔

جاپانی بچوں کے جانے کے بعد کائی سیدھا وارننگ سینٹر میں ریگی کے پاس واپس آیا۔ پُرسکون نظر آنے والا ریگی قدرے مضطرب تھا۔

''کیا یہ فلوک ہو سکتا ہے؟'' وہ بولا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' اچانک براڈ کی آواز آئی۔ اس نے ریگی کو حالتِ تناؤ میں دیکھ لیا تھا۔ ''کیا یہ سونامی ہے؟'' براڈ نے کہا۔

''دیکھو براڈ'' کائی نے غصہ دبایا۔ ''ہم مصروف ہیں۔ تم یہاں رہ سکتے ہو لیکن اگر مداخلت کرنی ہے تو باہر چلے جاؤ۔''

براڈ نے ہاتھ اٹھا کر امن کا اشارہ کیا۔ ''میں صرف دیکھوں گا۔ مطمئن رہو۔'' وہ خاموشی سے کمرے میں ایک طرف بیٹھ گیا۔

کائی، ریگی کے شانوں پر جھکا۔ ریگی کمپیوٹر پر ٹائپ کر رہا تھا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ مدوجزر دکھانے والا پیمانہ خراب ہوا ہے اور کیا یہ اتفاق ہے؟'' کائی نے سوال کیا۔

''میں نہیں جانتا۔ جس علاقے میں زلزلہ ریکارڈ ہوا تھا عین اس وقت ٹائیڈ گیج کیوں خراب ہوا؟'' ریگی نے جواب دیا۔

''میں جب سے یہاں ہوں، ایسا کبھی نہیں ہوا۔'' کائی نے کہا۔ ''لیکن تم نے بتایا تھا کہ یہ خرابی ماضی میں دو مرتبہ ہوئی تھی۔''

''ہاں ایک بار شارٹ سرکٹ کی وجہ سے۔ دوسری بار طوفان نے سیٹلائٹ لنک گرا دیا تھا۔''

''وہاں کوئی طوفان ہے؟''

''میں نے ابھی چیک کیا ہے۔ طوفان ہے لیکن یہ کرسمس آئی لینڈ کے شمال مغرب میں ہے۔ خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔'' ریگی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''اگر سونامی ہے تو لہر کتنی بلند ہوگی جو ٹائیڈ گیج کو ناکارہ کر دے؟'' کائی نے اگلا سوال کیا۔

''لہر کم از کم آٹھ میٹر بلند ہونی چاہیے۔ پچیس فٹ

سے زیادہ اور اتنی بلندی پورے جزیرے کو نگلنے کے لیے کافی ہے۔‘‘

’’ وکرسس آئی لینڈ میں ہمارا آدمی اسٹیو برینٹ ہے؟ وہ گیج کو سنبھالتا ہے۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ ریگی نے کہا۔ ’’لیکن وہ رابطے میں نہیں آرہا۔ گھر پر اور نہ آفس میں۔ اس کی وائس میل بھی نہیں پہنچ رہی ہے۔‘‘

’’کوشش جاری رکھو۔‘‘ کائی نے ہدایت دی۔ ’’میں آپریٹر کو کال کرتا ہوں۔‘‘

کائی نے آپریٹر کو کئی نمبر دیے لیکن آپریٹر کسی بھی نمبر سے رابطہ کرنے میں ناکام رہی۔

’’کیا یہ غیر معمولی ہے؟‘‘

’’ہاں، اور فوراً مجھے کال کرنا۔‘‘ کائی نے کہا۔

یہ سب اتفاق نہیں ہوسکتا۔ ریگی بھی متواتر نا کام تھا۔ کائی نے اسے آپریٹر کی بات بتائی کہ ممکن ہے بجلی فیل ہو۔

’’اچھا خیال ہے۔ ٹائیڈ پر نظر رکھنے والا آلہ بیٹری بیک اپ کے ساتھ ہے۔‘‘ ریگی بے چین نظر آیا۔ ’’فرض کرو بجلی نہیں ہے اور بیٹری بھی ڈیڈ ہے۔ لیکن اسٹیو، ٹائیڈ گیج کو مین ٹین کرتا ہے......‘‘

’’ہم مفروضوں اور اتفاقات پر نہیں جاسکتے۔ یہ صرف ایک اتفاق نہیں ہے۔ کہنا پڑے گا کہ آج صبح نو بج کر پچیس منٹ پر بلند لہر جزیرے پر تھی۔ نوتیس پر گیج نے سگنل نہیں دیا جبکہ آٹھ تیس پر سگنل موصول ہوا تھا...... اگر آٹھ تیس پر بھی اشارہ نہ آتا تو مجھے تشویش نہ ہوتی۔ آٹھ تیس کا اشارہ لاگ شیٹ پر موجود ہے۔‘‘ کائی نے خلاصہ پیش کیا۔

ریگی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر بند کرلیا۔

’’کچھ کہنا ہے؟‘‘

ریگی کی پیشانی پر لکیریں تھیں۔ ’’کیا تم چاہتے ہو کہ میں وارننگ جاری کردوں؟‘‘

’’وارننگ۔‘‘ اچانک براڈ سے رہا نہ گیا۔ وہ بول اٹھا۔ ’’ہاں یہ بھی بہتر ہوگا۔‘‘

’’براڈ، پلیز۔‘‘ کائی نے اکتائے انداز میں ہاتھ اٹھایا۔ سونامی کی وارننگ جاری کرنا بولڈ قدم تھا۔ بلیٹن کی بات اور تھی۔ صورت حال سائنسی بنیاد پر ابھی تک مضبوط شواہد سے عاری تھی۔ کائی کو چھٹی حس اور تجربے پر انحصار کرنا تھا۔ وارننگ جاری کرنا مذاق نہیں تھا۔ اور ایسی صورت میں جبکہ سینٹر میں وارد ہوئے اسے بمشکل سال بھر ہوا تھا۔ ہوائی کے کاروبار اور سیاحت میں ہلچل مچ جاتی تھی اور آبادی کے انخلا کی بات ہوتی تو اخراجات کہیں سے کہیں چلے جاتے۔

رشیا میں 1994ء میں زیرِ آب زلزلے نے سونامی بپا کیا تھا۔ شدت 8.1 تھی۔ پی ٹی ڈبلیو سی کو وارننگ جاری کرنی پڑی۔ بحرالکاہل کے لیے۔ دیگر جزائر کے ساتھ ہوائی بھی خطرے میں تھا۔ وہ لوگ لہروں کی بلندی کی پیش گوئی نہ کر سکے تھے۔ سونامی تو پہنچا تھا لیکن موجیں تین فٹ سے بلند نہیں تھیں جبکہ سونامی وارننگ کی وجہ سے ریاست کو تیس ملین ڈالرز کے اخراجات برداشت کرنا پڑے تھے۔

ماضی قریب میں پیسفک سونامی وارننگ سینٹر (PTWC) نے الاسکا میں سات اعشاریہ چھ کے زلزلے پر سونامی وارننگ جاری کی تھی۔ لیکن مدوجزر کا ڈیٹا تباہ کن لہروں کا اشارہ نہیں دے رہا تھا۔ بعد میں پینتالیس منٹ بعد وارننگ واپس لے لی گئی تھی۔ مالی بچت تو ہوگئی تھی لیکن سسٹم پر عوام کا بھروسا متزلزل ہوگیا۔ فالس الارم کے اپنے متعدد نقصانات ہوتے ہیں...... اس مرتبہ پھر ایسا ہوا تو 1994ء کے مقابلے میں مالی نقصان پچاس ملین ڈالرز سے بڑھ جاتا تھا۔

’’تم وارننگ کے حق میں ہو؟‘‘ کائی نے سوال کیا۔

’’میں چاہوں گا کہ یہ فیصلہ تم کرو۔‘‘ ریگی نے اظہار تردد کیا۔

کائی اگر ٹھوس بنیادوں کے بغیر وارننگ کا فیصلہ کرتا اور وہ فالس الارم ثابت ہوتا تو ہر کوئی اسی کو تنقید کا نشانہ بناتا۔ گورنر سے لے کر ’’این او اے اے‘‘ (NOAA) تک۔ سب سے بڑھ کر عوام بار بار فالس الارم سے ڈپریس ہوجاتی اور بعد میں آنے والی وارننگ کا کوئی نوٹس نہ لیتا۔ کائی گومگو کی کیفیت میں تھا۔ وارننگ کے لیے شواہد کچے تھے۔

’’کائی، کیا کرنا چاہیے؟‘‘ ریگی نے سوال کیا۔

کائی نے گہری سانس لی۔ اسے مزید معلومات درکار تھیں۔ دل اور دماغ آپس میں دست و گریبان تھے۔ وہ فیصلہ کن موڑ پر تھا۔ کائی کی پوزیشن نازک تھی۔

’’ہم انتظار کریں گے۔‘‘ بالآخر وہ بولا۔ ’’امید کرنی چاہیے کہ وہاں بجلی فیل ہوئی ہو۔‘‘

ریگی نے سرہلا کر پھر فون اٹھایا۔

کائی کے دماغ میں ایک کمزور آواز تھی، جسے وہ نظر انداز کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ آواز کہہ رہی تھی کہ اس نے غلط فیصلہ کیا ہے۔

☆☆☆

ثریا جب گرینڈ ہوائین کی پارکنگ لاٹ میں پہنچی تو وہ تقریباً بھرا ہوا تھا۔ ''وائی کی کی'' (ہوائی کا پڑوس) بھی فل تھا۔ ثریا نے کار لاک کی۔ ''چلو آؤ۔'' اس نے لڑکیوں سے کہا۔ میا نے ہچکچاہٹ کے ساتھ اپنا بورڈ اٹھایا اور ماں کے پیچھے چل پڑی۔ وہ گیراج سے نکل گئے۔ ''چلو تفریح کے لیے ساحل کی طرف چلتے ہیں۔'' میا کی ماں ثریا نے کہا۔ وہ کالاکاؤ ایونیو پر آگئے۔ ایونیو وائی کی کی کی طرف جاتا تھا۔ اَن گنت بلند ہوٹل مناظر کی راہ میں حائل تھے اور ہونولولو کی دفتری عمارتیں۔ کالاکاؤ آخری ہوٹل تھا۔ وائی کی کی سے نصف میل کے فاصلے پر۔ وہاں زو (Zoo) بھی تھا۔

اونگھتا ہوا مہیب آتش فشاں ڈائمنڈ ہیڈ نمایاں سنگ میل تھا۔ ثریا دونوں لڑکیوں کے ساتھ ساحل پر تھی۔ وائی کی کی ساحل پر عوام کا ہجوم تھا۔ جاپانی، فرنچ، جرمن، اسپینش...... ہوائی کے دیگر ساحلوں کے مانند وائی کی کی بھی عوام کے لیے کھلا تھا۔

ایک ہوٹل کے قریب کھلی جگہ پر ساحل کے نزدیک ثریا نے بیگ کھولا۔ چوڑا تولیا نکال کر بچھایا۔ وہاں سے لہروں کا نظارہ روح افزا تھا۔ لہریں قدرے اونچی تھیں۔ لیکن بوگی بورڈنگ کے لیے ماحول محفوظ تھا۔ (بوگی بورڈ پر بچے الٹے لیٹ کر سرفنگ کرتے ہیں) میا نے اپنا بوگی بورڈ ریت پر رکھا اور کہا۔

''مام میں لانی کے ساتھ پانی میں جا رہی ہوں۔ کتنا صاف اور نیلا پانی ہے۔''

ثریا بے فکر تھی۔ ''کتنی دیر لگاؤ گے؟''

لڑکیوں نے کپڑے اتار دیے تھے۔ نیچے بکنی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ''ایک گھنٹا۔''

''او کے، ساڑھے گیارہ بجے سے پہلے آجانا۔''

''بائے آنٹی۔'' لانی نے ثریا کی طرف ہاتھ ہلایا۔

ثریا تولیا پر لیٹ کر سن اسکرین (دھوپ سے بچاؤ کی کریم) لگانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ سیل فون نے پکارا۔ ثریا نے بیگ سے فون نکال کر ڈسپلے پر نگاہ ڈالی۔ فون چارج کرنے کا اشارہ آیا تھا۔ پاور بچانے کے لیے فون بند کر کے واپس بیگ میں ڈال دیا۔

☆☆☆

9:57 am

تیس منٹ پہلے کرسس آئی لینڈ سے ٹائیڈ گیج ریڈنگ موصول ہو جانی چاہیے تھی۔ کائی کی پریشانی میں ہر منٹ کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ ریگی کو اسٹیو برنیٹ کی جانب سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ کائی نے پُرامید انداز میں جھپٹ کر ریسیور اٹھایا۔

''ڈاکٹر تناکا میں شرلے نائل ہوں۔'' اسی آپریٹر کی آواز آئی۔

''رابطہ ہو گیا؟'' کائی تناکا نے جھٹ سوال کیا۔ پھر کہا۔ ''پھر تم نے تاخیر کیوں کی؟''

''دراصل میں نے دوسرے آپریٹر کرس سے مدد مانگی تھی۔ اس نے بتایا کہ زیر آب کیبل کے علاوہ جزیرے کے لیے سیٹلائٹ بیک اَپ بھی ہے لیکن عجیب بات ہے کہ سیٹلائٹ سے بھی کوئی مدد نہیں ملی......''

''تم نے عجیب کا لفظ کیوں استعمال کیا؟''

''کرس نے کہا تھا کہ سیٹلائٹ ٹرانسمیٹر کا اپنا جنریٹر ہے۔ جزیرے پر بجلی نہ ہونے کے باوجود مجھے رابطہ ملنا چاہیے تھا۔ کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ کوئی سگنل نہیں ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہاں جزیرہ موجود ہی نہیں......''

کائی سناٹے میں رہ گیا۔ اس نے کوشش جاری رکھنے کے لیے مزید ہدایات دیں۔ تاہم وہ جان گیا تھا کہ اس کی ہدایات بے معنی ہیں۔ تقریباً تین ہزار افراد وہاں تھے۔ حقیقت تسلیم کرنا نہایت دشوار تھا کہ سونامی نے جزیرے کو غائب کر دیا ہے۔ یعنی تین ہزار افراد بھی جان سے گئے......

ڈیسک کی دراز سے اس نے دو اسپرین نکال کر منہ میں ڈالیں اور بوتل سے پانی پیا۔ ریگی بغور کائی کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

''کیا معاملہ ہے؟'' ریگی نے استفسار کیا۔

کائی نے سیٹلائٹ ٹرانسمیٹر کے بارے میں بتایا اور کہا۔

''لگتا ہے سونامی جزیرے سے ٹکرایا ہے۔ تباہ کن سونامی۔''

''کیسے ہو سکتا ہے؟'' ریگی بڑبڑا کے رہ گیا۔

''کیا کہہ سکتا ہوں۔ ممکن ہے لینڈ سلائڈ ہو۔ تمہاری تھیوری کے مطابق ''سی ماؤنٹ'' ہی ہو۔ جس کی وجہ سے لینڈ سلائڈنگ کا مضبوط جواز ہے۔''

ریگی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میری تھیوری کے مطابق ممکن ہے۔ لیکن اس کے لیے بڑا زلزلہ ہونا بھی ضروری ہے۔ میں ڈیٹا میں چیک کر چکا ہوں۔ مذکورہ علاقے میں گزشتہ دس برسوں میں کوئی شدید زلزلہ نہیں آیا۔

''لیکن زلزلے کی شدت......''

''میں نے این ای آئی سی کو پھر چیک کیا تھا۔ ان کے مطابق شدت چھ اعشاریہ نو ہے۔'' ریگی نے کہا۔ ''جنوب مشرقی ایشیائی سونامی میں زلزلے کی شدت زیرآب نو (9) تھی۔ چھ اعشاریہ نو میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ سمندر کی تہ کو زیروزبر کرسکے۔''

کائی نے ایک ڈیٹا شیٹ اٹھائی جو لہروں کے سفر کے بارے میں تھی۔ اگلا نمبر جونسٹن آئی لینڈ کا تھا۔ لہریں بیس منٹ میں وہاں پہنچ جاتیں۔ پھر بیس منٹ بعد بگ آئی لینڈ...... اور موجودہ وقت سے ایک گھنٹا پچیس منٹ میں لہریں اواہو پر ہوتیں۔

''ہمیں ڈارٹ بوائے سے لہروں کی اونچائی کا کب تک پتا چلے گا؟'' کائی نے سوال کیا۔

''ڈارٹ بوائے سے پانچ منٹ میں۔ بلرفری مین کا کہنا ہے کہ وہ سیٹلائٹ لنک دس منٹ میں بحال کردے گا۔ مطلب ہمیں اتنا وقت مل جائے گا کہ جونسٹن کا ٹائیڈ گیج دیکھ سکیں اور تصدیق ہوجائے گی کہ واقعی یہ سونامی ہے۔''

براڈ اب تک تو خاموش تھا لیکن اس کا ضبط جواب دے گیا۔ ''مطلب تم لوگ بیس منٹ مزید انتظار کرو گے؟''

''تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہیے؟'' ریگی نے کہا۔ ''پاور ڈاؤن کی وجہ سے ملین افراد کا انخلا شروع کردیں؟''

''تو تم عوام کی ہلاکت کا چانس لو گے، محض اس خیال سے کہ وہاں پاور ڈاؤن ہے؟''

''میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ہمیں مزید معلومات درکار ہیں۔'' ریگی نے مدافعانہ انداز اختیار کیا۔ ''اگر زلزلے کی شدت نو اعشاریہ صفر (9.0) ہوتی تو میں وارننگ جاری کرنے میں ایک لمحہ نہ گنواتا...... اگر کرسمس آئی لینڈ غائب ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ لہریں کم از کم بیس فٹ اونچی ہیں۔ اور یہ ناممکن ہے کہ چھ اعشاریہ نو کا زلزلہ اتنی بلند لہریں پیدا کرسکے۔''

''تمہیں یقین ہے؟'' براڈ نے کہا۔

''میں گزشتہ ساٹھ برسوں میں آنے والے بڑے سونامی پر ریسرچ کرچکا ہوں۔'' ریگی نے جواب دیا۔

کائی بھی مجبور تھا۔ اندھادھند فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ خیالات میں گم تھا کہ اگر غلط وارننگ جاری ہوگئی۔ تو کہاں کہاں سے ردعمل آئے گا۔ سب سے زیادہ گولا باری خود اس پر ہوگی جبکہ دوسری طرف دماغ کی گہرائی میں ایک آواز تھی کہ یہ صرف بجلی کا مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن منطقی اعتبار سے تباہ کن سونامی کا امکان بھی نہیں تھا لیکن وہ سونامی کو سو فیصد نظرانداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہی بات اسے خوف زدہ کررہی تھی۔

آخر میں فطری طور پر ذہن فیملی کی طرف چلا گیا۔ بیٹی ساحل پر تھی اور بیوی ہوٹل میں کام کررہی تھی جبکہ ہوٹل سمندر سے صرف سو گز کے فاصلے پر تھا۔ وہ جاب کے بغیر زندہ رہ سکتا تھا لیکن بیوی اور بیٹی اگر اس لیے مارے گئے کہ کائی نے ایک غلط فیصلہ کیا تھا تو پھر وہ بچ بھی گیا تو ایک زندہ لاش بن جائے گا۔ بے شمار لوگوں کی جان بھی اس کی ذمے داری تھی۔

وارننگ کی کال ریگی نے نہیں کائی کو دینی تھی۔ فیصلہ غلط ہوا تو جھوٹا الارم بجانے پر جاب سے ہاتھ دھونا پڑیں گے اور یہ اتنا بڑا جوا نہیں تھا۔ اس نے ذہن بنالیا۔

''کافی انتظار ہوگیا۔ مزید انتظار نہیں کیا جاسکتا۔'' کائی نے پُراعتماد لہجہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

براڈ اور ریگی، کائی کے تاثرات دیکھ رہے تھے۔ کائی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بلند آواز میں کہا۔ ''ریگی میری طرف سے وارننگ جاری کردو۔ میں ایچ ایس سی ڈی (ہوائی اسٹیٹ سول ڈیفنس) کال کرتا ہوں۔''

''تمہیں یقین ہے؟'' ریگی نے سوال کیا۔ ''گزشتہ برس جو وارننگ دی گئی تھی۔ صورت حال اس سے بھی ہلکی ہے۔'' ریگی کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔ حالانکہ وارننگ کی حد تک وہ ایک تماشائی تھا۔ نزلہ کائی پر گرنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کائی ایک سخت اور مشکل فیصلہ کررہا تھا۔ کائی کی وقتی ہچکچاہٹ ختم ہوگئی۔ اگر واقعی سونامی آرہا ہے تو ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ کرسمس آئی لینڈ سے رابطہ ہوجاتا تو صورت حال مختلف ہوتی۔ اس نے مثبت اور منفی نکات کاؤنٹ کرلیے تھے۔

''ہاں، وارننگ جاری کرو۔'' کائی نے حتمی انداز اختیار کرلیا۔ ریگی نے لمحہ بھر کے لیے کائی کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ پھر وہ کمپیوٹر پر مصروف ہوگیا۔ کائی نے پچاس ملین ڈالرز کا فیصلہ کیا تھا۔ بحرالکاہل میں موجود ہر ایک سرکاری ایجنسی کو ریگی نے وارننگ روانہ کردی۔

☆☆☆

10:01 am

(پہلی لہر کے آنے میں ایک گھنٹا اور اکیس منٹ بچے ہیں)

کائی نے HSCD میں جونیئر ڈیوٹی آفیسر برائن رین فرو کو فون کیا۔ اپنا تعارف کرایا اور کہا۔ ''مجھے جم ڈینس سے بات کرنی ہے۔ جم ڈینس HSCD کا وائس ڈائریکٹر تھا۔ بڑے فیصلے کرنے کا اختیار اس کے پاس تھا۔ وہ ریاست کی ایمرجنسی میں تمام کوششوں کو باہم مربوط کرتا تھا۔

برائن نے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ ڈینس دوستوں کے ساتھ کوائی (ہوائی کا جزیرہ) گیا ہوا ہے پھر اس نے استفسار کیا کہ معاملہ کیا ہے؟

کائی کو برائن سے کوئی خاص امید نہیں تھی۔ وہ جونیئر اور ناتجربہ کار تھا اور عمر پچیس سال۔ تاہم اس نے برائن کو مختصر احوال گوش گزار کیا اور واضح کیا کہ کرسمس آئی لینڈ کو سونامی نے اُڑا دیا ہے۔ برائن نے وقفے کے بعد جواب دیا۔

''میں ایک منٹ بعد کال کرتا ہوں۔'' برائن نے کہا۔

کائی نے فون رکھ دیا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' براڈ نے کہا۔

اچانک ریگی کو کچھ یاد آیا۔ وہ بولا۔

''مائی گاڈ، جونسٹن آئی لینڈ پر سائنسدانوں کی ایک ٹیم موجود ہے۔''

جزیرے سے کبھی امریکا کیمیائی ہتھیاروں کو ٹھکانے لگانے کا کام لیتا تھا۔ 2004ء میں یہ سلسلہ بند کر دیا گیا اور وہاں موجود تیرہ سو افراد بھی رخصت ہو گئے۔ اب چھوٹا سا جزیرہ جنگلی حیات کی محفوظ پناہ گاہ تھا۔ جزیرے کو امریکن فش اینڈ وائلڈ لائف سروس دیکھتی تھی۔

''تمہیں کیونکر معلوم ہے؟ کائی نے سوال کرتے ہوئے جزیرے کا نقشہ اٹھایا۔

''یو ایس فش اینڈ وائلڈ لائف کے ایلون پیٹر نے کہا تھا کہ ٹیم وہاں ایک مہینے سے موجود ہے۔ اس نے مجھے فون نمبر بھی دیا تھا۔'' ریگی نے انکشاف کیا۔

کائی کی نظریں نقشے پر تھیں۔ جزیرے کا بلند ترین مقام بھی چالیس فٹ اونچا تھا۔ اتنی بلندی ایک بڑے سونامی کے لیے ناکافی تھی۔

''ان کو سمندر میں نکلنا ہوگا۔ صرف دس منٹ ہیں۔ فون کر دو۔ امید ہے وہاں بوٹ ہوگی۔'' کائی نے ریگی سے کہا۔ وہ فون کی طرف لپکا۔ دوسری طرف سے برائن کی کال آگئی۔

''وائس ڈائریکٹر سے رابطہ نہیں ہو سکا۔'' وہ بولا۔

''لیکن میں وارننگ کے مطابق معین طریقہ کار پر عمل کروں گا۔ ہم گورنر سے رابطہ کر رہے ہیں اور جلد ہی سائرن بج اٹھیں گے۔ پھر میں براڈ کاسٹنگ بھی شروع کر رہا ہوں۔ اگر یہ جھوٹا الارم ہے تو فوراً مجھے بتا دینا۔'' برائن نے فون بند کر دیا۔

''ٹریسا کو کال کرو۔'' کائی نے براڈ سے کہا۔ ''اس کے فون کی بیٹری ختم ہو رہی تھی۔ شاید فون آن ہو۔ پھر ہوٹل میں راشیل کو فون کرو۔ وہ مصروف ہے۔ اس لیے ممکن ہے کال وصول نہ کرے۔ لہٰذا میرے فون سے کال کرو۔'' کائی نے سیل فون براڈ کو دیا۔ ''ورنہ پیجر استعمال کرنا۔''

براڈ فون لے کر کانفرنس روم میں چلا گیا۔

ریگی نے کائی کو مخاطب کیا۔ ''رابطہ ہو گیا۔''

''کتنے سائنسداں ہیں؟''

''سات، لیکن بوٹ نہیں ہے۔ جہاز ہے۔''

کائی کے پیٹ میں گڑگڑاہٹ ہونے لگی۔ ''جہاز؟''

''چھوٹا ائرکرافٹ ہے۔ ٹیک آف کر جائے گا۔ لیکن وہ پانچ کو ہی لے جا سکتا ہے۔'' ریگی نے کہا۔

کائی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ سونامی سائرن کی تیز آواز بلند ہوئی۔

☆☆☆

10:05 am

(لہر کے آنے میں ایک گھنٹا اور سترہ منٹ)

دس پانچ کا ایونٹ شروع ہو رہا تھا۔ گورنر ایلزبتھ کول کی تقریر سر پر تھی۔ راشیل وہاں موجود تھی۔ ہوٹل میں اس کے پاس واکی ٹاکی اور سیل فون دونوں ہوتے تھے۔ واکی ٹاکی اندرونی اور سیل فون بیرونی رابطے کے لیے۔ اس وقت راشیل نے فون وائبریٹ پر کر دیا تھا۔ تھرتھراہٹ پر اس نے فون نکال کر دیکھا۔ نمبر کائی کا تھا۔ گہری سانس لے کر اس نے فون واپس رکھ لیا۔ نظریں اسٹیج پر تھیں۔ فوراً ہی سیل فون کے پیجر فیچر نے متوجہ کیا۔ راشیل نے پھر فون دیکھا اور ڈسپلے کے لیے نمبر چیک کیا۔ توقع تھی کہ کائی کا نمبر نظر آئے گا لیکن وہاں تین ہندسے چمک رہے تھے۔ نو نو نو (999) ٹرپل نائین ماں بیوی کے درمیان طے شدہ کوڈ تھا۔ جسے کائی نے تین سال پہلے سیٹ کیا تھا۔ یہ ایمرجنسی کے لیے تھا۔ راشیل نے فوراً نمبر ملایا۔

''کیا مسئلہ ہے؟'' اس نے سرگوشی کی۔

''میں براڈ ہوں۔ کائی مصروف ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں تمہیں بتا دوں کہ سونامی وارننگ جاری کر دی گئی

ہے۔ آفیشلی ہوٹلوں کو بھی پتا چلنے والا ہے۔''

''اوہ مائی گاڈ...... یہاں گورنر موجود ہے۔ بال میں برنچ شروع ہو جائے گا۔''

کائی نے فون لے لیا۔

''ہنی، کیا یہ حقیقت ہے؟'' راشیل نے تناؤ محسوس کیا۔

''سو فیصد تو نہیں لیکن آثار ایسے ہی ہیں۔ میں رسک نہیں لے سکتا۔''

''کتنا وقت ہے؟''

''تقریباً ایک گھنٹا۔'' کائی نے جواب دیا۔

''وہاٹ؟ تم کہتے تھے کہ الاسکا سے یہاں پہنچنے میں پانچ گھنٹے لگتے ہیں۔'' وہ دھیمی آواز میں بات کر رہی تھی۔

''سونامی الاسکا سے نہیں آرہا۔ بحرالکاہل میں...... براڈ سے بات کرو۔''

''براڈ یہاں بہت کام ہے۔'' راشیل نے کہا۔

''کام کو گولی مارو۔ کچھ دیر میں ہوٹلوں تک خبر پہنچنے والی ہے۔ ویسے ہی سب بھاگ جائیں گے۔'' براڈ نے کہا۔ ''اور یہ بتاؤ کہ لانی کے پاس سیل فون ہے؟''

''کیوں؟ کیا وہ ٹھیک ہے؟''

''ٹھیک ہونا چاہیے۔ دراصل میں ٹریسا سے رابطہ نہیں کر پا رہا ہوں۔''

''لانی کے پاس فون نہیں ہے۔ لیکن وہ لوگ سائرن سن لیں گے۔ اس دوران پلیز تم کچھ کرو۔''

''فکر مت کرو۔ دیکھتا ہوں۔'' براڈ نے اعتماد سے کہا۔ اور بات ختم کر دی۔ راشیل راستہ بناتی ہوئی گورنر کے اسسٹنٹ ولیم کم تک پہنچی۔

''مسٹر ولیم!'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''مجھے ضروری بات کرنی ہے۔'' وہ ولیم کو ایک طرف لے گئی۔

''ایسا کیا ہے؟ گورنر کی تقریر شروع ہو گئی ہے۔'' وہ بولا۔

''ہاں، دیکھ رہی ہوں۔ بات یہ ہے کہ سونامی سر پر ہے۔ گورنر کے لیے یہ خبر زیادہ اہم ہے۔''

ولیم نے غیر یقینی نظروں سے راشیل کو دیکھا۔ ''لیکن وارننگ تو جاری نہیں ہوئی؟''

''وارننگ جاری کر دی گئی ہے۔ آفیشل اعلان ہونے والا ہے۔''

''تم کیسے جانتی ہو؟''

''میرے شوہر نے اطلاع دی ہے۔''

موسم کی خطرناک پیش گوئی کے سبب حفاظتی انتظام ضروری ہے

''تمہارا شوہر......'' ولیم کا منہ بن گیا۔ ''تمہیں پتا ہے کہ گورنر کے لیے اگلے سال یو ایس سینیٹ کی آزمائش آئے گی۔ اور یہاں متعدد اہم ڈونرز موجود ہیں۔ اگر میں نے مداخلت کی اور اطلاع غلط نکلی تو......''

راشیل نے ولیم کی بات کاٹ دی۔ ''مسٹر ولیم میں کوئی ایڈیٹ نہیں ہوں۔ میرا شوہر پیسفک سونامی وارننگ سینٹر کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ اعلان ہونے دو۔ جب تک تقریر بھی ختم ہو جائے گی۔'' ولیم نے پہلو بدلا۔

''شاید تم سونامی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ میرے پاس وقت ہے اور نہ گورنر کے پاس۔'' یہ کہہ کر راشیل نے اسٹیج کا رخ کیا۔ ولیم ڈھیلے انداز میں اس کے پیچھے تھا۔ راشیل پوڈیم تک پہنچی تو اسے شک ہوا کہ سماعت سے سائرن کی ہلکی آواز ٹکرائی تھی جو بلند ہو رہی تھی۔ راشیل نے نرمی سے گورنر کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ گورنر نے تقریر روک کر دیکھا کہ کون رخنہ انداز ہوا ہے۔ ''کون ہو تم؟''

راشیل نے اپنا اور کائی تنا کا تعارف کراتے ہوئے حالات سے آگاہ کیا۔

''ہاں میں تمہارے شوہر کو جانتی ہوں۔'' گورنر نے

اعتراف کیا۔

''تقریباً ایک گھنٹے میں سونامی یہاں ہوگا۔''

''ایک گھنٹا؟'' ولیم بھونچکارہ گیا۔ ''گورنر! مجھے ایک گھنٹے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔'' ولیم نے مدافعت کی۔

''ولیم! تم خاموش رہو۔'' گورنر نے کہا۔ حاضرین کا سکوت ٹوٹ گیا تھا اور بھنبھناہٹ شروع ہوگئی۔

''مسز تناکا، تم پُریقین ہو؟'' گورنر نے محتاط انداز میں استفسار کیا۔

کائی سونامی سینٹر میں نیا ضرور تھا لیکن راشیل اس کی صلاحیتوں سے بخوبی آگاہ تھی۔

''میم میرا شوہر اس آفت بلاخیز کو خوب جانتا ہے۔ ہمیں فوراً تیاری کرنی ہے۔''

''ولیم میری گاڑی نکالو۔ جب تک میں حاضرین کو آگاہ کرتی ہوں۔'' گورنر نے حکم دیا۔ ولیم دم دبا کر وہاں سے بھاگا تھا۔

گورنر پُروقار انداز میں حاضرین کی طرف متوجہ ہوئی۔ ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ معذرت کر کے اس نے بتایا کہ ہوائی کے جزیرے سونامی کی زد میں آنے والے ہیں۔ مجھے تقریر روک کر ایمرجنسی کو دیکھنا ہوگا۔ پھر گورنر نے مختصر دعا کی۔ بعدازاں راشیل نے پوڈیم سنبھالا۔ اس کا پُرسکون رہنا ضروری تھا۔ اس نے مختصر تعارف کے بعد کہا کہ ہوٹل کے ڈیزائن میں آفتوں سے نمٹنے کا بہترین بندوبست ہے۔ آپ سطح زمین سے ساٹھ فٹ اوپر رہ سکتے ہیں۔ یقیناً جو جانا چاہے وہ جا سکتا ہے لیکن ہم مشورہ دیں گے کہ پُرسکون رہیں اور ہماری میزبانی سے لطف اندوز ہوں۔ حالات بہتر ہونے کا انتظار کریں۔ نئی بات سامنے آئی تو آپ کو باخبر رکھا جائے گا۔

☆☆☆

10:07 am

(لہر کے آنے میں ایک گھنٹا اور پندرہ منٹ)

ثریا نیم گرم ریت پر سمندر سے آنے والے ہوا کے نرم جھونکوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ دفعتاً سائرن کی کرخت آواز نے اسے بُری طرح چونکا دیا۔ وہ اٹھ کے بیٹھ گئی۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ وہاں موجود چند اور لوگ بھی متوجہ ہو گئے۔ ایک بڑے میاں نے کہا یہ تو ایسا لگ رہا ہے جیسے جنگ شروع ہو گئی ہے یا کوئی ڈرل ہو رہی ہے۔

اس کے ساتھ موجود عورت نے ریڈیو اٹھایا۔ ثریا کی توقع کے برخلاف سائرن متواتر چلا رہا تھا۔

''ڈیرل بیٹھ جاؤ۔'' عورت نے ریڈیو کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی۔ کچھ دیر بعد وہ بولی۔

''سونامی وارننگ ہے۔ شاید ٹیسٹنگ کی جا رہی ہے۔'' ثریا نے ساحل پر موجود چھوٹوں بڑوں کو دیکھا۔ نوٹس لینے والے کم تھے۔ باقی ویسے ہی اپنے اپنے شغل میں مگن تھے۔ ثریا ریڈیو کے قریب چلی گئی۔ وہ جو کچھ سن رہی تھی وہ دل دہلانے کے لیے کافی تھا۔ PTWC سونامی وارننگ کے بارے میں بتاتے ہوئے خبردار کر رہا تھا کہ ہوائی خطرے میں ہے۔ آبادی کے انخلا کے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ انخلا کے راستوں کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ فون بکس اور نقشے کہاں پر ہیں۔ ساتھ ہی ہدایت کی گئی تھی کہ فوری طور پر بلند مقام پر منتقل ہو جائیں۔ اس کے بعد بتایا گیا کہ سونامی کی لہر کس جزیرے پر کب پہنچے گی۔ اوہائیو (ہوائی کا دارالخلافہ) کا وقت گیارہ بج کر بائیس منٹ بتایا جا رہا تھا۔ ثریا نے خود کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کی اور گھڑی نکالی۔ دس بج کر آٹھ منٹ۔ ''اوہ مائی گاڈ!'' ثریا کی سانس رک گئی۔ ریڈیو پر ہدایات دہرائی جا رہی تھیں۔

''آپ لوگ ہوٹل میں ہیں؟'' ثریا نے ریڈیو والی عورت سے سوال کیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہ ٹیسٹنگ نہیں ہے۔ آپ لوگ ہوٹل کی کون سی منزل پر ہیں؟''

''بیسویں منزل پر۔''

''اچھی بات ہے۔ وہیں رکیں۔ جب تک حالات بہتر نہیں ہو جاتے۔''

''اور تم؟''

''میں دوسرے ہوٹل میں ہوں۔ جا رہی ہوں۔'' ثریا نے جھوٹ بولا۔ ان کے جانے کے بعد وہ بے قراری سے آگے پیچھے ٹہلنے لگی۔ بچوں کے پاس فون نہیں تھا اور اس کے فون کی بیٹری تقریباً مردہ تھی۔ اس کو وہیں رکنا تھا۔ بچوں نے واپسی پر اسے نہیں پایا تو کوئی حماقت کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

لانی اپنی کائیک کو آگے بڑھا رہی تھی۔

(کائیک یا کینو چھوٹی کشتی ہوتی ہے۔ درمیان میں ایک شخص بیٹھ سکتا ہے۔ دونوں ہاتھوں میں ایک چپو ہوتا ہے جو باری باری دائیں بائیں پانی میں چلایا جاتا ہے۔ بعض میں دو افراد آگے پیچھے بیٹھ سکتے ہیں)۔ ''میا'' اپنے کائیک (Kayak) میں تھی۔ وہ ساحلی پٹی سے تقریباً آدھا میل دور آ چکے تھے۔

دو دوست ساتھ مل گئے تھے۔ ٹام اور جیک۔ لائی نے اعتراض کیا تھا لیکن میا اس کا مذاق اُڑانے لگی کہ وہ کب بڑی ہوگی۔ لڑکے دونوں کے تقریباً ہم عمر تھے۔ اب وہ چاروں کا ٹیک استعمال کر رہے تھے۔

☆☆☆

10:10 am

(لہر کے آنے میں ایک گھنٹا اور بارہ منٹ)

کائی نے جوسٹن آئی لینڈ پر سائنسداں نیل ایسپن سے رابطہ قائم کیا۔ ریگی، ایسپن کو حالات سے آگاہ کر چکا تھا۔ ایسپن نے ائرکرافٹ استعمال کیا۔ لیکن وہ خود اور ایک ساتھی سوار نہ ہو سکے۔ ایسپن بائیولوجسٹ تھا۔ کائی پُرامید تھا کہ سائنسداں وہاں عمارت میں ایسی مضبوط جگہ پر جا سکے جو سونامی کے غضب کو برداشت کر لے۔

ریگی، ثریا اور بچوں سے رابطہ کرنے میں ناکام رہا تھا۔ تاہم اسے یقین تھا کہ سائرن کے شور کو نظرانداز کرنا ناممکن تھا۔

''کوئی نکتہ ہے، جو ابھی تک ہمارے ذہن کی دسترس سے باہر ہے۔'' کائی نے بلند آواز میں کہا۔

''درحقیقت زیرِآب اتنا چھوٹا زلزلہ سونامی نہیں لا سکتا اور کہاں ایسا سونامی جو کرسس آئی لینڈ کو برباد کر دے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' براڈ نے سوال کیا۔

''اس طرح ناممکن ہے۔'' کائی نے گردن دائیں بائیں ہلائی۔ ''البتہ اگر ایسا زلزلہ لینڈ سلائڈ کا سبب بن جائے تو پھر سونامی کا امکان ہوتا ہے۔''

ریگی نے کائی کو دیکھا اور دونوں نے ہاتھ ملایا۔

''ممکن ہے۔'' ریگی نے کہا۔

''بس تم لوگوں کے پاس مفروضے رہ گئے ہیں۔'' براڈ نے منہ بنایا۔ ''اور زیرِآب لینڈ سلائڈ کا کیا مطلب ہوتا ہے؟''

''دیکھو بحرالکاہل کا مذکورہ علاقہ لینڈ سلائڈ کا اہل نہیں ہے۔'' کائی نے براڈ کو دیکھا۔ ''براعظم کی وہ سطح جو زیرِآب ہوتی ہے۔ وہ زلزلے سے متاثر ہو کر ٹوٹتی ہے اور چٹانیں ٹوٹ کر سمندر کی تہ میں گرتی ہیں۔ یوں سونامی کا امکان بن جاتا ہے۔ ایسا سب سے بڑا لینڈ سلائڈ آٹھ ہزار دو سو سال پہلے بحرِ ناروییجین میں پیش آیا تھا۔ جو اسٹوریگا لینڈ سلائڈ کے نام سے مشہور ہے جس نے بڑا سونامی تخلیق کیا تھا۔''

ریگی نے ہاتھ بلند کیے۔ ''کیا مسئلہ ہے؟ زلزلہ بھی چھوٹا، لینڈ سلائڈ بھی نہیں، نہ کوئی سینسر ریڈنگ اور نہ ہی جزیرے سے رابطہ......؟''

''اور......'' کائی نے اضافہ کیا۔ ''اور زلزلے کی لوکیشن بھی ایسی ہے جہاں پہلے کبھی زلزلہ ریکارڈ نہیں ہوا۔ کیا طُرفہ تماشا ہے...... اسرار ہے یا کوئی پہیلی......''

''مطلب سونامی بلاوجہ آرہا ہے۔'' براڈ نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔ عین اس وقت کائی نے ٹی وی پر نظر ڈالی۔ وہاں سی این این کی اسٹوری چل رہی تھی۔ ٹرانس پیسفک فلائٹ لاپتا تھی۔ ٹی وی کے کونے میں ٹرانس پیک کا لوگو نمایاں تھا۔ پھر بحرالکاہل کو دکھایا گیا۔ ایک لکیر لاس اینجلس سے آتی دکھائی گئی جو سمندر کے درمیان یوں غائب ہوئی جیسے وہ بڑھتی جاتی تو ہوائی پہنچ جاتی۔

''کمال ہے۔'' کائی بڑبڑایا۔ ''یوں معلوم ہوتا ہے گویا فلائٹ زلزلے کے مرکز میں گری ہے۔ صرف یہی اطلاع تجزیے سے باہر رہ گئی۔'' کائی کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

''کیا مطلب؟'' ریگی نے کہا۔

''یہ پاگل پن ہے، لیکن ہم اس کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔''

''تم کیا بات کر رہے ہو؟''

''تم وہ گفتگو بھول گئے جو ماضی میں ہم کرافورڈ اور میڈر کے بارے میں کرتے رہے ہیں؟'' کائی نے حوالہ دیا۔

ریگی کی آنکھوں کا ایک ابرو اوپر چلا گیا پھر اس نے چٹکی بجائی اور مسکرایا۔ ''ہاں وہ ریسرچ مضحکہ خیز تھی۔ تم نے بھی اسے وقت کا زیاں کہا تھا اور کہا تھا......'' ریگی اچانک رک گیا۔ پھر یک لخت کھڑا ہو گیا اور ٹی وی کی جانب دیکھا۔ معاً اس کے تاثرات بدل گئے۔ چہرے پر دہشت واضح نظر آرہی تھی۔ لمحہ بھر میں وہ بات کی تہ تک پہنچ گیا۔

''نہیں، نہیں......'' وہ بولا۔ چہرے پر دہشت کے ساتھ بوکھلاہٹ بھی شامل ہو گئی۔ ''میں نے گھر کو نئے سرے سے بنایا ہے۔ دو سال لگائے تھے۔''

''لیکن کرافورڈ اور میڈر کی تھیوری حقیقت بن رہی ہے۔ ہم نظریں نہیں چُرا سکتے۔'' کائی نے کہا۔

براڈ سے برداشت نہ ہوا۔ ''کیا باتیں کر رہے ہو؟ ریگی کا گھر درمیان میں کیسے آگیا؟ اور یہ کرافورڈ......''

''تم جاننا چاہتے ہو؟''

''ہاں، کیوں نہیں؟'' براڈ نے کہا۔

"ایک گھنٹے میں ریگی کا گھر صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔" کائی نے سنجیدگی سے کہا۔

☆☆☆

10:15 am

(لہر آنے میں ایک گھنٹا اور سات منٹ بچے ہیں)

کائی اور برائن کی بات چیت کے بعد ہوائی سول ڈیفنس کے دو اہلکار رینکن اور ڈیکن متواتر فون پر مصروف تھے۔

گورنر ہوٹل سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ میئر کارل رولینڈ بھی راستے میں تھا۔ دونوں نے برائن سے رابطہ قائم رکھا تھا۔ میئر اور گورنر بھی رابطے میں تھے۔

رینکن، پرل ہاربر سے رابطہ کر رہا تھا۔ ڈیکن کی ذمے داری تھی کہ وہ سول ائر پورٹس اور سی پورٹس کے درمیان اطلاعات کو مربوط رکھے۔

☆☆☆

10:19 am

(ایک گھنٹا اور تین منٹ)

سونامی جونانسٹن جزیرے سے دو منٹ کے فاصلے پر تھا۔ بائیولوجسٹ ایسپن اور برینٹ فیدر اسٹون دونوں جزیرے سے روانہ نہیں ہو سکے تھے۔ ایسپن اسپیکر فون پر ڈاکٹر کائی تناکا سے رابطے میں تھا۔ ان کا وڈیو کیمرا لنک، سیٹلائٹ نیٹ ورک سے جڑا تھا۔ برینٹ اور ایسپن دونوں کا تعلق یونیورسٹی آف لندن سے تھا۔ ایسپن نے وڈیو فیڈ کے لیے ویب ایڈریس لکھوایا جو کائی نے ریگی کو دے دیا...... لمحوں میں ریگی جزیرے کا منظر دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔

"جو دیکھ رہے ہو اسے ریکارڈ کرتے رہو۔" کائی نے ریگی کو ہدایت دی پھر ایسپن سے کہا۔

"ڈاکٹر مجھ پر یقین کرو۔ میری دلی خواہش ہے کہ میرا فیصلہ غلط ثابت ہو۔"

"ہم مضبوط عمارت میں ہیں۔" بائیولوجسٹ حیرت انگیز طور پر پُرسکون محسوس ہوا۔ کائی نے بلندی دریافت کی۔

"ہم سطحِ زمین سے تیس فٹ اوپر ہیں۔" کیمرے نے حرکت کی اور عمارت کی چھت نظر آئی۔ پھر ایسپن کا ہیولا دکھائی دیا۔ سر پر ہیٹ تھا۔ وہ ٹی شرٹ اور نیکر پہنے ہوئے تھا۔ ہاتھ میں یقیناً بڑے سائز کا فون تھا جو اس نے کان سے لگایا ہوا تھا۔

"کیمرا اب تمہیں سمندر کا جنوب مشرقی حصہ دکھائے گا۔ بقول تمہارے سونامی اسی سمت سے نمودار ہو گا۔" بائیولوجسٹ ایسپن کی آواز آئی۔ چند سیکنڈ بعد اس کا ہیولا غائب ہو گیا اور جزیرے کے ساتھ سمندر کی جھلک نظر آئی۔ ایک پتلی سڑک چند عمارتوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی ساحل کی طرف گئی تھی۔

"میں سمجھتا ہوں۔" ایسپن کی آواز آئی۔ "ہمارے سامنے کی طرف دو یک منزلہ چوبی عمارتیں ہیں۔ ان کی بلندی زیادہ سے زیادہ پندرہ فٹ ہے۔ ساحلی پٹی پندرہ سو گز دور ہے۔ ہم انتہائی فاصلے پر ہیں اور یہ عمارت کنکریٹ سے بنی ہے۔ حیرت کی بات ہو گی اگر پانی یہاں تک آیا۔"

کائی نے دوسری مرتبہ پس منظر میں غیر واضح گڑگڑاہٹ کی آواز سنی۔ اس نے غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ وڈیو فیڈ شروع سے دھندلی تھی۔ تاہم اس نے دیکھ لیا کہ پانی ساحل سے پسپا ہو کر واپس پیچھے کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے ایسپن کو بتا کر سوال کیا۔ چند سیکنڈ بعد اس کا جواب آیا۔

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" تاہم وہ کائی کے سوال کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔

کائی نے ایسے مناظر تصاویر میں دیکھے تھے لیکن براہِ راست دیکھنے کا تجربہ بلاشبہ ہوشربا تھا۔

"ایسا کبھی نہیں دیکھا۔" بائیولوجسٹ نے کہا۔ "یہ ناقابلِ فراموش منظر ہے۔"

کائی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ پانی کئی سو گز پیچھے چلا گیا تھا۔ "بس کرو۔" وہ بڑبڑایا۔ اسے امید تھی کہ اب پانی پلٹ کر واپس آئے گا۔ لیکن یہ دیکھ کر اس کے اعصاب ٹوٹنے لگے کہ پانی متواتر پیچھے جا رہا تھا۔

"اوہ نو...... اوہ گاڈ......" ریگی کی سانس رکنے لگی۔

دوسری طرف دور جزیرے پر ایسپن انوکھے نظارے کو بیان کرتے ہوئے مزے لے رہا تھا۔

"پانی تو ہزار گز پیچھے چلا گیا ہے۔" ایسپن نے کہا۔
"ڈاکٹر تناکا کیا تم یہ توقع کر رہے تھے؟"

"نہیں۔" کائی نے بمشکل کہا۔ وہ اپنی زندگی کا بھیانک ترین خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ایسپن سے کیا کہے۔ وہ وہاں چھت پر محفوظ نہیں تھا۔ لیکن اور کہاں جا سکتا تھا۔

"پانی کی واپسی رک گئی ہے۔" ایسپن نے کہا۔

پانی کی غیر موجودگی میں دور تک ساحل پر مچھلیاں

اچھل رہی تھیں۔

''اوہ نو، پرندوں کو کیا ہوا۔ یوں لگتا ہے کہ سب کے سب ایک ساتھ فضا میں ہیں۔ میں نے ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا۔'' ایسپن نے پھر تبصرہ کیا۔ عین اس وقت پس منظر میں دوسرے برطانوی سائنسداں برینٹ کی چیخ سنائی دی۔

''پانی واپس آرہا ہے۔ ناقابلِ یقین رفتار سے واپس آرہا ہے......''

ہولناک صورتِ حال تھی۔ کائی اور ریگی آگاہ تھے کہ سونامی کی لہر آنے سے پہلے پانی ساحل سے پیچھے چلا جاتا ہے۔ لیکن ہزار گز پیچھے جانے کا مطلب...... کائی کا دماغ چکرا گیا۔ سونامی کے بارے میں تمام شکوک وشبہات تحلیل ہو گئے۔ بلاشبہ ریکارڈ توڑ سونامی آرہا تھا۔ وہ ایسپن سے کیا کہے۔

دور اُفق پر تاحدِ نگاہ ایک پانی کی دیوار تھی۔ یوں لگا جیسے وہ ساکت ہے۔ اگلے ہی لمحے وہ بلند ہوتی ہوئی حرکت پذیر ہوئی اور گولی کی رفتار سے گویا کیمرے پر حملہ آور ہوتی نظر آئی۔ کائی کا سکتہ ٹوٹ گیا۔ ''ڈاکٹر ایسپن خود کو کسی مضبوط چیز کے ساتھ باندھ لو...... جلدی کرو۔''

''یہاں رسی نہیں ہے۔'' جواب آیا۔

''بیلٹ یا نائلون...... کچھ بھی استعمال کرو۔''

''زیادہ سے زیادہ آہنی سیڑھی سے لپٹ سکتے ہیں۔ لیکن کیا بات ہے؟'' وہ آنے والی قیامت سے ابھی تک بے خبر تھا۔ اس مرتبہ مہیب گڑگڑاہٹ واضح طور پر بلند ہوئی۔ سفید لکیر پانی کی دیوار میں بدل گئی تھی جو تیس فٹ بلند تھی اور اس کی اونچائی بڑھتی جارہی تھی۔ پانی کی واپسی اور گرج نے ایسپن کو چونکا دیا۔ ''ڈاکٹر تناکا، سونامی کتنا بڑا ہے؟''

حقیقت بتانی ہی تھی۔ ''بہت بڑا۔''

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ ایسپن کو آنے والی آفت کا ادراک ہو گیا تھا۔ آناً فاناً پانی کی بلند ہوتی ہوئی پُر رفتار دیوار نے قیامت برپا کر دی۔ پہلے پام کے ساحلی درخت تنکوں کے مانند اکھڑے۔ پھر ناقابلِ یقین جناتی ریلے نے جزیرے کے چوبی مکانات کو تہس نہس کیا۔ درختوں اور ملبے کو لے کر سونامی کی لہر آگے جارہی تھی۔ بلندی سو فٹ تک چلی گئی تھی۔ کائی سانس روکے دیکھ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دنیا کا سب سے بڑا ڈیم پھٹ گیا ہو۔ چیختا چنگھاڑتا بپھرا ہوا پانی ہر شے کو نگل رہا تھا۔ ایسپن اور اس کے ساتھی کی آواز سننا مشکل ہو گیا تھا۔ آخری آواز برینٹ کے چلّانے کی تھی۔ آواز کے ساتھ منظر بھی غائب ہو گیا۔ کائی، ریگی اور براڈ بے سدھ، بے آواز کھڑے تھے۔ کچھ کہنے کے لیے مناسب الفاظ ندارد تھے اور ایک گھنٹے کے اندر ہوائی میں بھی محشر بپا ہونے والا تھا۔

☆☆☆

ہارر مووی دیکھنے کے بعد سب سے پہلے براڈ کی قوتِ گویائی واپس آئی تھی۔ دس بج کر چوبیس منٹ ہو گئے تھے۔ سونامی اٹھاون منٹ کے فاصلے پر تھا۔

''تمہیں کیونکر معلوم ہوا کہ سونامی آرہا ہے اور وہ بھی اتنا بڑا؟'' براڈ نے کائی کی طرف انگلی یوں اٹھائی گویا الزام لگا رہا ہو۔

''میں نہیں جانتا تھا، سمجھے؟'' کائی کی آواز بھی بلند ہو گئی۔ وہ پُرسکون ہونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن نبض کی رفتار معمول پر نہیں تھی۔ ''یہ اندازہ میں نے کرافورڈ اور میڈر کی ریسرچ کے تحت لگایا تھا۔ جب میں نے ٹرانس پیک جیٹ کو بحرالکاہل کے مخصوص مقام پر گرتے دیکھا۔ یہ اتفاق نہیں تھا۔ زیرِ آب زلزلہ یا سونامی طیارے کو نہیں گرا سکتا۔ لہٰذا مدد کرو۔ تم FAA کو کال کر کے معلوم کرو...... جیٹ کا عرض البلد اور طول البلد معلوم کرو۔ یہ بھی معلوم کرو کہ طیارے کا رابطہ کہاں ختم ہوا تھا۔ نیز یہ کہ کیا وہاں کوئی اور طیارہ بھی تھا یا نہیں......''

''لیکن آج چھٹی ہے۔'' براڈ نے کہا۔

''کوئی ایمرجنسی نمبر ہوگا۔ HSCD میں برائن سے نمبر لو۔ اسے کہنا کہ تم میرے بھائی ہو۔'' کائی نے سمجھایا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

''ریگی تم NASA کو فون کر کے سیٹلائٹ ڈیٹا اور تصاویر کے بارے میں معلوم کرو۔ میں سائنس آف سونامی ہیزرڈ کے متعلقہ کاغذات میں کرافورڈ اینڈ میڈر کا فارمولا نکالتا ہوں......''

''وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' براڈ کی شکل نظر آئی۔

دوسرے منٹ میں کائی، برائن سے بات کر رہا تھا۔

''کیا مسئلہ ہے؟ تمہارا بھائی کیا چاہتا ہے؟'' برائن نے سوال کیا تھا۔

''ہاں، میں نے کہا تھا کہ FAA سے رابطہ کرے۔ دراصل ٹرانس پیک کی پرواز زلزلے کے مرکز میں گری تھی۔ وقت کم ہے مختصر بات کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ وہاں بحرالکاہل میں شہابِ ثاقب گرا ہے۔''

برائن ہنستے ہنستے تھم گیا کیونکہ کائی سنجیدہ تھا۔

"تم سنجیدہ ہو؟"

"سونامی کی اور کوئی وضاحت ہمارے پاس نہیں ہے۔" کائی نے جواب دیا۔ "سیٹلائٹ امیج سے تصدیق ہو جائے گی۔ دیکھو کون بہتر ہے۔ NASA، NESDIS یا GOES......؟"

"میں ذرا دیر میں بتاتا ہوں۔" برائن نے فون بند کر دیا۔

"ایک منٹ، سنو۔" براڈ نے مداخلت کی۔ "تم نے ابھی کیا کہا تھا...... شہاب ثاقب؟؟ اگر ایسا ہوتا تو ہر ٹی وی چینل پر چل رہا ہوتا۔"

"وہ مصنوعی سیارچہ نہیں ہے اور نہ زمین پر گرا ہے۔ دوسرے یہ کہ اطلاع ہوتی تو خبر چلتی۔" کائی نے وضاحت کی۔

"کرافورڈ اینڈ میڈر کیا ہے؟" براڈ نے دوسرا سوال کیا۔

وہ دونوں الاموس لیبارٹری، نیو میکسیکو میں ریسرچرز تھے۔ انہوں نے سونامی کی وجوہات میں شہاب ثاقب کے تصادم کو شامل کر کے کمپیوٹر ماڈلز بنائے تھے۔ مختصر یہ کہ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ شہاب ثاقب سمندر میں گرے تو سونامی بپا ہو سکتا ہے......

☆☆☆

10:28 am

(سونامی لہر آنے میں 54 منٹ)

دو سو فٹ بلند پانی کی دیوار آباد ساحلی علاقے سے ٹکرائے۔ ایسا مہذب دنیا کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا۔ عفریت نما بڑے سونامی کا ریکارڈ 1883 میں ملتا ہے۔ جب کراکاٹوا ہولناک دھماکے سے پھٹا تھا۔ سو فٹ بلند لہر نے سنڈا اسٹریٹ کے گاؤں کو انڈونیشیا میں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تھا۔ چھتیس ہزار افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

اب ہوائی کو جس آفت کا سامنا تھا، وہ دو سو فٹ بلند تھی۔ دنیا کی گنجان ترین ساحلی آبادی قیامت کی زد میں تھی۔ فون کی گھنٹی بجنے پر کائی نے کال وصول کی اور اپنا تعارف کرایا۔ دوسری طرف CNN کی جینیٹ لیز لی تھی۔

"سونامی وارننگ کے بارے میں چند سوالات ہیں میرے پاس۔" وہ بولی۔

"معذرت خواہ ہوں۔ اس وقت سوال جواب کا وقت نہیں ہے۔" کائی نے جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔ فون دوبارہ بولنے لگا۔ چند بار اسی طرح ہوا پھر فون خاموش ہو گیا۔ ایک ایک منٹ قیمتی تھا۔ دوسرے میڈیا سے بات کرنا دو دھاری تلوار پر چلنے کے مترادف تھا۔ لیکن ایک مثبت پہلو یہ تھا کہ میڈیا کی مدد سے عوام کو جلد از جلد بلند مقام تک پہنچایا جا سکتا تھا۔ تاہم کائی پہلے HSCD سے بات کرنا چاہتا تھا۔

"کائی میں تمہارا نظریہ تسلیم کر لیتا ہوں۔ لیکن شہاب ثاقب والی بات قبل از وقت معلوم ہوتی ہے۔" ریگی نے کہا۔

"دو جزیروں سے ہم رابطہ کھو چکے ہیں۔ جونسٹن آئی لینڈ کا حال دیکھ لیا ہے...... وقت ہی نہیں ہے کسی اور امکان پر غور کرنے کا۔ یہ ایکشن کا وقت ہے۔ نتیجہ کچھ بھی برآمد ہو۔" کائی نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "ہمیں چاہیے کہ عوام کو جزیرے کے اندر دور تک دھکیل دیا جائے۔"

"کیا عمودی انخلا نامناسب نہیں ہے؟"

"ہونولولو کے ڈاؤن ٹاؤن اور وائی کی کی گنجان آباد ہیں۔ اگر متوازی انخلا کیا گیا تو ٹریفک جام ہو جائے گا اور ایمرجنسی کی گاڑیاں بھی پھنس جائیں گی۔" کائی نے کہا۔ "جو ساحل پر ہیں اور پیدل یا گاڑی پر نہیں نکل سکتے...... انہیں کم از کم چھ منزلہ ہوٹل یا عمارت میں جانا ہوگا۔"

"لیکن اس طرح تو سب سے بڑی لہر سے بچنے کے لیے بیس منزلہ عمارت میں جانا ہوگا۔" ریگی نے اعتراض کیا۔ "اور اگر ہم درست نہیں تو یہ سونامی نہیں بلکہ میگا سونامی ہے۔"

"تم کسی حد تک درست ہو۔" کائی نے کہا۔ "لیکن میگا سونامی کوئی سائنسی اصطلاح نہیں ہے۔ اس کو پاپولر پریس استعمال کرتا ہے۔ اتنی بلند لہر کے لیے ہم ذاتی طور پر لفظ "میگا" استعمال کر سکتے ہیں۔ سونامی کی وارننگ ایک بات ہے۔ میگا سونامی کی وارننگ پر بات کہیں سے کہیں نکل جائے گی جبکہ عمومی سونامی ہی متعلقہ افراد اور اداروں سے ہضم نہیں ہو رہا ہے۔ میگا سونامی کی اصطلاح پاپولر پریس کے کانوں میں گئی تو نت نئی کہانیاں بن جائیں گی۔"

"لیکن ہمیں عوام کو بھی تو بچانا ہے۔" براڈ نے کہا۔

"ہاں، تاہم ناسا یا ڈارٹ بوائے سے تصدیق آنے دو......"

"کائی۔" ریگی نے آواز دی۔ "ایک لائن پر برائن ہے جبکہ دوسری طرف ہیری، جارج ہمفلے اور میری گریشن بھی منتظر ہیں۔ ہیری ماؤئی (Maui) کاؤنٹی پولیس، جبکہ جارج اور ہیری شمالی ساحل پر یہاں سے ایک گھنٹے کے

فاصلے پر......"

"ٹھیک ہے۔ دوسروں کو انتظار کراؤ۔ پہلے برائن سے بات کروں گا۔" کائی نے عندیہ ظاہر کیا۔

☆☆☆

"ہیلو، برائن؟"

"ہاں، میں ناسا سے رابطے میں ہوں بات کرو۔" برائن نے اطلاع دی۔ چند سیکنڈ کا وقفہ آیا پھر لائن بدل گئی۔ کائی نے اپنا تعارف کرا کر سوال کیا۔ "میں کس سے مخاطب ہوں؟"

ایک نسوانی آواز آئی۔ "میرا نام گیل وینٹ ورتھ ہے۔ NOAA کی سیلائٹ اینالسز برانچ میں ڈیوٹی سائنٹسٹ۔ میں کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

کائی نے خطرے کے بارے میں بتاتے ہوئے مدعا بیان کیا۔ چند سیکنڈ بعد گیل نے جواب دیا۔ "1830 GMT کا ایک امیج ہے میرے پاس، لیکن......"

"نہیں......نہیں، مجھے 1841 GMT یا اس کے بعد کا عکس درکار ہے۔ ہمارے پاس یقین کرنے کے لیے وجہ ہے کہ ایک شہاب ثاقب صبح کے وقت مذکورہ علاقے میں سمندر میں گرا ہے۔ نتیجے کے طور پر ایک مہیب سونامی ہوائی کی جانب آ رہا ہے۔" کائی نے میگا کے بجائے massive کا لفظ استعمال کیا۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ شہاب ثاقب ہے، اور وہ سونامی کی وجہ بن سکتا ہے؟" گیل کا انداز اُلجھن زدہ تھا۔

"ایک سے زیادہ وجوہات ہیں۔ لیکن میرے پاس تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے۔ میں پہلے بتا چکا ہوں۔"

"دوسرا GOES عکس 1900 GMT کا ہے۔" گیل نے بتایا۔ "لیکن میں نہیں سمجھتی کہ وہ عکس کوئی مدد کرے گا۔ کیونکہ طوفان کی وجہ سے امیج غیر واضح ہے۔"

گیل کے جواب نے کائی کی بے چینی میں اضافہ کر دیا۔

"کوئی اور ذریعہ؟ میرا مطلب ہے خلائی شٹل؟" کائی نے استفسار کیا۔

"مدار میں واحد "ڈسکوری" ہے جو اسپیس اسٹیشن کے ساتھ جڑی ہے اور اسٹیشن اس وقت مصر کے اوپر خلا میں ہے۔ تم جس خطے کی بات کر رہے ہو اس سے بہت دور۔ مجھے دوسرا سیارچہ دیکھنا ہوگا جو صبح میں متاثرہ علاقے پر تھا۔"

"ٹھیک ہے، فوراً بتانا...... ہر منٹ قیمتی ہے۔" کائی نے بات ختم کر کے رگی کی طرف متوجہ ہوا۔ رگی ڈارٹ بوائے سے ڈیٹا جمع کرنے میں لگا ہوا تھا۔ کائی اس کے کمپیوٹر ٹرمینل پر جھک گیا۔ رگی نے ڈارٹ میکنزم کے بارے میں اختصار سے بتایا کہ ڈارٹ عام لہروں کے ذریعے کیونکر سطح سمندر میں ہونے والی تبدیلی کو پکڑ لیتا ہے۔ دراصل سائنسی آلات سمندر کی تہ میں ہوتے ہیں۔ ڈارٹ سطح سمندر پر محض ٹرانسمیٹنگ ڈیوائس ہے۔ جو پانی کے دباؤ میں ہونے والی تبدیلی کو پڑھ کر سیٹلائٹ کے ساتھ ابلاغ کرتا ہے۔ ہوا کے دباؤ سے بننے والی لہریں اتنی بڑی نہیں ہوتیں جو وہ سمندر کی تہ میں موجود سینسر (Sensor) کو متاثر کر سکیں۔

رگی نے گراف کی ہسٹری دکھائی جو روزانہ کی بنیاد پر مرتب ہوتی تھی۔ "لیکن اگر سونامی گزرتا ہے تو پانی کا مہیب ستون نیچے سے اوپر تک بلند ہوتا ہے۔" رگی کی آواز میں ہیجان تھا۔ اس نے گراف کی طرف اشارہ کیا۔ گراف کی مخصوص لائن اوپر کی جانب محو سفر تھی۔ بلا ارادہ کائی کی سانس رک گئی۔ وہ توقع کر رہا تھا کہ بلند ہوتی لکیر کا سفر جلد ہی رک جائے گا۔ لیکن یوں معلوم ہو رہا تھا کہ پانی کا ستون کبھی نہ رکنے کے لیے بلند ہو رہا تھا۔ پانچ سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے دو منٹ میں لہر سطح سمندر سے اعشاریہ پینسٹھ فٹ اوپر نظر آئی۔

"تین فٹ سے بھی کم۔" براؤ نے اطمینان سے کہا۔ تاہم رگی کی سنجیدگی دیکھ کر اس کا اطمینان تحلیل ہو گیا۔ رگی نفی میں گردن ہلا رہا تھا۔ "وہ کھلا سمندر ہے اور وہاں بوٹ میں حقیقت کا پتا ہی نہیں چل سکتا۔"

"اب شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔" کائی نے کہا۔ "گہرے سمندر میں لہر سمندر کی تہ تک گئی ہے۔ ذرا دیر کے لیے سو جائے گی۔ قوت پکڑ کر اٹھے گی اور سطح سمندر کے اوپر چڑھتی جائے گی۔ یہ "رن اَپ فیکٹر" ہے۔ سطح پر لہر کی بلندی رن اَپ فیکٹر سے ضرب کھا کر تعین کرے گی کہ ساحل پر سونامی کتنا بلند ہوگا۔"

"ہونولولو میں رن اَپ چالیس ہے۔" رگی نے بتایا۔

براؤ نے تیزی سے دماغ میں جمع تفریق کی اور بولا۔ "پچیس میٹر، یعنی پچھتر فٹ...... کم از کم دو سو فٹ سے تو کافی کم ہے۔"

"نہیں۔" کائی نے انکار کیا۔ "پچھتر فٹ خوفناک ہے۔ اس لیے کہ وہ پہلی لہر ہوگی۔ دو یا تین لہریں مزید آئیں گی۔"

"لاس الاموس لیب کے کمپیوٹر موڈلز کے مطابق سونامی

شہاب ثاقب کی وجہ سے آتا ہے تو پہلی لہر ہی سب سے بڑی ہوگی۔'' ریگی نے تبصرہ کیا۔ ''لیکن جبکہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تو حتمی طور پر کیا کہا جاسکتا ہے۔ ہمیں اگلے ڈارٹ DART کی ریڈنگ لینی چاہیے۔ تاہم میں کہہ سکتا ہوں کہ ناسا کی تصویر کے بغیر بھی شہاب ثاقب کی تصدیق ہوگئی ہے۔''

کائی نے سر ہلایا۔ ''براڈ، برائن کو کال کرو، فون پر کانفرنس ہوگی...... ہیری، جارج اور میری کو شامل کرلو۔''

چند سیکنڈ میں کانفرنس کال شروع ہوگئی۔ پہل برائن نے کی تھی۔ ''کائی تمہاری تھیوری کا علم ہوتے ہی میں نے گورنر کو بھی مطلع کر دیا تھا۔ میں نے درخواست کی تھی کہ گورنر کو HSCD بنکر میں آنا چاہیے۔ وہ ابھی راستے میں ہیں اور کار سے ہی کانفرنس میں شامل ہوں گی......''

گورنر نے وقت ضائع کیے بغیر براہ راست مطلب کی بات کی۔ ''ڈاکٹر کائی، کیا الارم جھوٹا ہوسکتا ہے؟''

کائی کے پاس بھی ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ مختصر احوال کے ساتھ اس نے بڑے سونامی کی تصدیق کر دی۔ گورنر نے سوالات سے احتراز کرتے ہوئے کانفرنس سے ہٹنے کا عندیہ دیا اور کہا۔ ''میں نیشنل گارڈ کو متحرک کرتی ہوں اور دس منٹ میں HSCD پہنچ جاؤں گی۔''

بعدازاں میری کی لرزتی ہوئی آواز آئی۔ ''جارج اپنی ماں کو فون کر رہا ہے۔ وہ ہائی لو (Hilo) کے قریب رہتی ہے (ہائیلو۔ ہوائی کا ایک قصبہ)''

کائی نے سوالیہ نظروں سے براڈ کو دیکھا۔ براڈ نے انکار میں سر ہلا کے اشارہ کیا کہ ٹریسا کا کوئی پتا نہیں ہے۔

کائی نے میری سے کہا۔ ''جلد یا بدیر ہمیں سینٹر چھوڑنا پڑے گا۔ میرے خیال میں وھیلر فیلڈ، اوہایو بہترین آپشن ہے...... تم لوگ بھی اس طرف نکلو۔ ہم عوام کو سمجھانے کے لیے تمام ممکنہ وسائل استعمال کریں گے کہ وہ لوگ اندر کی طرف دور تک نکل جائیں اور بلند سے بلند مقام پر جانے کی کوشش کریں۔''

''تم لوگ سینٹر میں کب تک ہو؟'' ہیری کی آواز میں تشویش تھی۔

''ہمیں نکلنا ہوگا۔ پچاس منٹ رہ گئے ہیں۔ نکلنے سے پہلے بھرپور کوشش ہوگی کہ ہونولولو میں سے زیادہ سے زیادہ افراد کو نکال لیا جائے۔ وہاں نصف ملین سے زیادہ افراد موجود ہیں۔''

☆☆☆

10:33 a.m

(سونامی لہر آنے میں انچاس منٹ باقی ہیں)

اس مرتبہ کائی نے راشیل کو خود فون کیا تھا۔ اس کا دل جانے انجانے خدشوں سے لرز رہا تھا۔ وہ راشیل کو بدترین اور بظاہر ناقابلِ یقین صورتحال سے آگاہ کر رہا تھا۔ راشیل شہاب ثاقب کے نظریے کو مذاق سمجھ رہی تھی۔

''وقت ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ مجھ پر یقین کرو۔'' کائی نے آواز کو متوازن رکھنے کی ناکام کوشش کی۔ ''وہاں اس ہوٹل میں کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔''

''اٹھائیسویں منزل پر اسٹار لائٹ ریسٹورنٹ ہے۔ وہاں کافی کمرے ہیں۔'' راشیل نے بتایا۔

''راشیل اگر لہر اتنی اونچی نہ جاسکی تب بھی خدشہ ہے کہ عمارت ہی ڈھے جائے۔''

''لیکن یہاں ہزار سے زیادہ مہمان ہوٹل میں ہیں جبکہ بال روم سابق معذور فوجیوں سے بھرا ہوا ہے۔''

''مجھے مجبوریاں مت بتاؤ۔ سونامی کے کان نہیں ہیں۔ کسی طرح ان کو پنچ باؤل تک پہنچاؤ۔'' (پنچ باؤل، نیشنل میموریل قبرستان کا نام ہے۔ جو ٹھنڈے آتش فشاں کے دہانے میں ہے۔ وہاں اطرافی عمودی ڈھلوانیں چار سوفٹ سے زیادہ بلند ہیں) مقامی اسے پنچ بال بھی کہتے ہیں۔

''ٹھیک ہے۔'' راشیل نے کہا۔ ''لانی، میا اور ٹریسا کے بارے میں بتاؤ۔''

''اب تک کوئی خبر نہیں ہے لیکن انہوں نے سائرن کی آواز سن لی ہوگی اور بلند مقام کی طرف رواں ہوں گی۔'' کائی نے خیال ظاہر کیا۔

''لیکن انہوں نے کال کیوں نہیں کی؟'' راشیل کے لہجے میں تشویش تھی۔

''لائنز جام ہیں۔ میں لکی رہا کہ تم سے رابطہ ہوگیا۔ ٹریسا کی بیٹری مردہ ہے۔ خیال ہے کہ وہ محفوظ مقام پر پہنچ کر ہی کال کرے گی...... ہنی تم وعدہ کرو کہ تیس منٹ میں نکل آؤ گی۔''

''یہ افراد بھی میری ذمے داری ہیں۔'' راشیل نے جواب دیا۔ ''میری بھرپور کوشش ہوگی کہ انہیں نکال کر خود بھی نکل جاؤں۔''

''سمجھتا ہوں، جلدی کرو۔ راشیل، آئی لو یو۔''

''آئی لو یو ٹو...... ہم ملیں گے!''

کائی بند فون کو گھورتا رہ گیا۔

☆☆☆

راشیل نے ہلا تامل واکی ٹاکی نکال کر میکس سے رابطہ

قائم کیا۔ ”تم نے ٹی وی دیکھا؟“ میکس کا پہلا سوال تھا۔
”نہیں۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ کیا چل رہا ہے۔ ہمیں ہوٹل جلد از جلد خالی کرنا ہے۔“
میکس نے چند عذر پیش کیے۔
”وقت نہیں ہے۔ ہر آپشن استعمال کرو۔ سب کو کالا کاؤ ایونیو کے ذریعے مانوا روڈ اور پھر ووڈلان کی طرف روانہ کردو...... تمہیں پتا ہے نا کہ میرا شوہر PTWC میں ہے۔ کائی کا ابھی فون آیا تھا۔ جو ٹی وی پر چل رہا ہے، صورت حال اس سے کہیں زیادہ خوفناک ہے۔“ راشیل تیز تیز بول رہی تھی۔
”ت...... تمہارا کیا ہوگا؟“ میکس بوکھلا گیا۔
”پُرسکون رہو۔ یہاں بال روم کے مہمان میری ذمے داری ہیں۔ میں انہیں چھوڑ کر نہیں نکل سکتی۔“ راشیل نے اپنا پلان بتایا۔
”تمہارے پاس ان کے لیے بسیں (buses) ہیں؟“
”ہاں بے فکر رہو، تم اپنا کام کرو۔“

☆☆☆

10:35 am

(سونامی لہر آنے میں سینتالیس منٹ)

ہوائی کے جزائر میں ہونولولو کے پاس اڑتالیس منٹ تھے، جبکہ بگ آئی لینڈ کے لیے صرف گیارہ منٹ بچے تھے۔ برائن بخوبی آگاہ تھا کہ ہوائی کے بیشتر افراد بروقت محفوظ جگہ تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ اگر پھرتی دکھائی تو صورت حال مثبت ہو جائے گی۔ ایک پوائنٹ ان کے حق میں تھا، جس سے کرسمس آئی لینڈ اور جونسٹن آئی لینڈ محروم تھے۔ وہ پوائنٹ تھا...... ٹھنڈے آتش فشاں۔ ہوائی کے جزائر اس قسم کے آتش فشانی عمل کے ذریعے وجود میں آئے تھے۔ لہٰذا ڈھلوان ساحل غیر معمولی ترچھے تھے۔ اگر عوام نے سستی نہیں دکھائی تو محفوظ بلندی تک پہنچ جائیں گے۔
برائن کو احساس تھا کہ ہر سیکنڈ قیمتی ہے۔ گورنر کے پہنچنے میں اب بھی چند منٹ باقی تھے۔ تاہم وہ انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے خود ہی نیا اعلان نشر کرنے کا فیصلہ کر لیا اور براڈ کاسٹ بوتھ میں آ گیا۔ آواز مستحکم نہیں تھی۔ لیکن اس نے بولنا شروع کیا۔
”گیارہ منٹ میں ایک بڑا سونامی بگ آئی لینڈ کے جنوب میں ٹکرائے گا۔ اس کے بعد تقریباً تیس منٹ میں سونامی، ہونولولو پر ہوگا...... میں اَپ ڈیٹ دیتا رہوں گا۔“

کیتھی نے ہاتھ بلند کیا۔ ”مجھے کیا کرنا چاہیے؟“
”تم ہوٹلوں میں فون کر کے سیاحوں کے انخلا کے بارے میں ہدایت دو۔“
ہوٹل اور عمارتوں کی تعمیر میں ممکنہ قدرتی آفات کو سہنے کا خیال رکھا گیا تھا۔ سمندری طوفان کی حد تک ایک سو پچاس میل فی گھنٹا کا دباؤ برداشت کیا جا سکتا تھا۔ تعمیرات میں سونامی کا بھی خیال رکھا گیا تھا۔ لیکن کوئی بھی عمارت اتنی مضبوط نہیں تھی کہ بیس منزلہ بلند پانی کی جناتی لہر کے تصادم کو برداشت کر سکتی جبکہ کم سے کم بھی پچاس ہزار ٹن کا دباؤ آتا تھا۔ عمارت کی بالائی منزلوں پر جانا بے معنی تھا۔ اکثر کا نچلا حصہ ہی کاغذی رکاوٹ بن کر پھٹے ہوئے گریبان کے مانند کھل جاتا۔ جس کے بعد عمارت یا ہوٹل کو زمین بوس ہونا ہی تھا۔
برائن وقفے وقفے سے اعلان کر رہا تھا۔ وقت کم تھا اور عوام زیادہ...... افراتفری اور دہشت نے اکثر سڑکوں کو بُری طرح جام کر دیا۔ سراسیمگی کے باعث پیدل فرار ہونے کی درخواستوں پر کسی نے کان نہیں دھرا تھا۔ ایمرجنسی وہیکلز اور بسز بھی پھنس گئی تھیں۔ جن کا کام پیدل لوگوں کو نکالنا تھا۔ ایسی صورت حال نے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا۔ وہ مسئلہ تھا اسپتالوں اور نرسنگ ہومز کا۔
برائن نے تھامپسن کو اشارہ کیا۔ ”ٹام تم کونز میڈیکل سینٹر کے ساتھ رابطے میں رہو۔ وہاں سے سب کو نکالنا ہے۔ وہ ایسی جگہ پر ہیں کہ تیسری، چوتھی لہر آنے تک ان کو وقت مل جائے گا۔ اس کے علاوہ تمام نرسنگ ہومز کو الرٹ کر دو۔ کونز میری والوں کو ٹرپلر پر لے جانا پڑے گا۔ وہاں نوزائیدہ بچے بھی ہیں۔“
ٹرپلر، پرل ہاربر پر شمال مشرق میں تھا۔ یہ آرمی میڈیکل سینٹر تھا۔
”جو مریض خراب حالت میں نہیں ہیں، ان کے لیے بس استعمال کرو اور باقی کے لیے ہیلی کاپٹر۔“ برائن نے مزید کہا۔
اوہائیو میں ملٹری کی موجودگی خوش آئند تھی۔ آرمی نیوی اور ائرفورس کے ہیلی کاپٹر پہلی لہر سے قبل فضا میں ہوں گے۔ متعدد کمرشل ہیلی کاپٹر بھی شامل ہو جائیں گے۔
”میشل تم ملٹری کے ساتھ کوآرڈی نیٹ کرو گی...... زیادہ سے زیادہ ائرکرافٹ فضا میں ہونے چاہئیں۔“
”رونالڈ تم ہونولولو انٹرنیشنل ائرپورٹ کو دیکھو گے۔ ہر ایک کو ہوائی اڈوں سے نکالنے کی کوشش کرو۔ اگر وہاں

جہاز تیار ہیں تو ان کو فضا میں لاؤ......''

''آنے والے جہازوں کا کیا ہوگا؟'' ڈیکن نے سوال کیا۔

''اگر واپس جانے کے لیے ان کے پاس فیول نہیں ہے تو وہ وھیلر آرمی فیلڈ پر لینڈ کریں گے۔ کوئی بھی کمرشل اڈوں پر نہیں اترے گا۔'' برائن اٹھ کھڑا ہوا۔

''میرا کیا مصرف ہے؟'' ہرمن کی آواز آئی۔

''تم براڈ کاسٹنگ میں میری مدد کرو۔'' برائن نے براڈ کاسٹنگ بوتھ کی طرف قدم بڑھائے۔

اعلان کے دوران اس نے عوام کو پھر صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ وہ جلد دوسرا اعلان کرے گا۔ ثبوت نہ ہونے کی بنا پر اس نے شہاب ثاقب کا ذکر نہیں کیا۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ شہاب ثاقب کے ذکر پر پبلک وارننگ کو سنجیدہ نہیں لے گی۔ تاہم اس نے ضروری حقائق اور ہدایات جاری کردیں۔

☆☆☆

کیپٹن مارٹن وٹرائٹ نے C-130 کی کھڑکی سے نیچے چمکدار نیلے سمندر کو دیکھا۔ ریڈیو پر جو کچھ چل رہا تھا، وہ اس نے اپنے آٹھ سالہ ائرلفٹ ونگ کیریئر کے دوران بھی نہیں سنا تھا۔ اکتیس ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے بحرالکاہل ایک پُرسکون تالاب کے مانند نظر آرہا تھا۔

وہ تین گھنٹے سے ائرفورس ٹرانسپورٹ کی کمانڈ کررہا تھا۔ اس کے ساتھ برانڈ نیو تین ہموی (Humvee) تھے۔ لیکن اب جو احکامات وہ وصول کررہا تھا، وہ غیر معمولی تھے۔ احکامات ہونولولو ائرٹریفک کنٹرول سینٹر سے دیے جارہے تھے۔ اسے اپنی سماعت پر شک ہوا۔ اس نے دوبارہ کہا۔ ''دس از ائرفورس 547 پلیز دوبارہ کہیے۔''

''راجر دیٹ، 547۔ فوراً مرکز کی طرف واپس جاؤ اور قریب ترین جگہ پر لینڈ کرو۔'' کنٹرولر کی آواز میں پریشانی کا عنصر تھا۔ سونامی کا وہ پہلے ہی بتا چکا تھا۔

''ہونولولو کنٹرول، یہ ممکن نہیں ہے۔'' کیپٹن مارٹن نے کہا۔ ''ہمیں ہکام ائرفورس بیس پہنچنا تھا۔ ہم سان ڈیاگو سے بہت دور آچکے ہیں۔ ٹنکیاں آدھے سے زیادہ خالی ہو چکی ہیں۔ فیول اتنا نہیں ہے کہ ہم واپس تین سو میل پیچھے جائیں۔''

''راجر دیٹ، 547۔ ٹھیک ہے آگے بڑھتے رہو۔ ہم تمہارے لیے وھیلر فیلڈ پر جگہ نکالتے ہیں۔''

''افرمیٹو، ہونولولو کنٹرول۔''

''اور ذہن میں رکھنا کہ تیس منٹ میں ہم ہونولولو خالی کردیں گے۔ اور وھیلر کو کنٹرول کریں گے۔''

مارٹن نے غیر یقینی نظروں سے کو پائلٹ کو دیکھا۔ ائرپورٹ بند کرنا اتنا غیر معمولی نہیں تھا۔ لیکن کنٹرول سینٹر چھوڑ دینا حیران کن تھا۔ ساتھی پائلٹ بھی ہکا بکا نظر آیا۔ وہ بے خبر تھے کہ سونامی کس حد تک تباہ کن ہے۔

☆☆☆

ٹریسا کو انتظار کرتے ہوئے تیس منٹ ہو گئے تھے۔ میا اور لانی کا کوئی پتا نہیں تھا۔ سائرن وقفے وقفے سے متواتر چیخ رہا تھا۔ ریڈیو کی غیر موجودگی میں سائرن کی اصلیت غیر واضح تھی۔ نصف گھنٹے میں ساحل کے حالات میں ڈرامائی تبدیلی نظر آئی تھی۔ وہاں موجود لوگوں کو احساس ہو چلا تھا کہ سائرن کی مستقل آواز کوئی ٹیسٹ نہیں تھا۔ اکثر نے سامان سمیٹ کر نکلنا شروع کردیا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر ابھی تک بیشتر افراد اپنے اشتغال میں مست تھے۔ وہ قطعی بے خبر تھے کہ جان لیوا آبی قیامت برق رفتاری سے انہیں نگلنے کے لیے آرہی ہے۔

سائرن کی پہلی آواز کے دس منٹ بعد ہی پولیس آن دھمکی تھی۔ وہ لاؤڈ اسپیکر پر لوگوں کو خبردار کررہے تھے۔ تاہم جو وہاں موجود تھے، ان پر کوئی اثر نہیں ہوا...... ایک پولیس مین ٹریسا کے قریب رکا۔

''میم فوراً یہاں سے چلی جائیں۔ سونامی زیادہ دور نہیں ہے۔''

ٹریسا لرز اٹھی۔ ''میں اپنی بیٹی اور اس کی دوست کے بغیر کیسے جاسکتی ہوں۔ وہ دونوں کسی بھی وقت آجائیں گی۔ کیا سونامی والی بات درست ہے؟''

''مختلف اطلاعات ہیں۔ تاہم ہمارے لیے حکم ہے کہ ساحل کو خالی کرانا ہے۔'' اہلکار نے جواب دیا۔ اور آگے بڑھ گیا...... بچوں کو سائرن سن کر آجانا چاہیے تھا۔ ٹریسا کا وجود دو حصوں میں تقسیم ہوگیا...... اسے جانا چاہیے یا رکنا چاہیے؟ اس نے قسمت آزمانے کے لیے فون آن کر دیا۔ پھر بیگ کھول کر قلم اور پیڈ نکالا۔ ایک کاغذ پھاڑ کر اس نے لڑکیوں کے لیے پیغام لکھنا شروع کیا۔

''میا اور لانی میں یہ جگہ چھوڑ کر تمہیں تلاش کرنے جارہی ہوں۔ تمہیں یہ تحریر ملے تو گرینڈ ہوائین ہوٹل میں راشیل کے پاس چلی جانا۔ میں تم دونوں سے وہاں ملوں گی۔''

ٹریسا نے والٹ اور چابیاں نکالیں۔ پیغام کو والٹ

پر رکھ کے تولیا میں لپیٹ کر چھوڑ دیا۔ اگر والٹ چوری نہیں ہوا تو لڑکیاں پیغام پڑھ لیں گی۔

بعد ازاں ثریا نے ڈائمنڈ ہیڈ کی طرف جاگنگ شروع کر دی۔ ساتھ ہی وہ دونوں کا نام لے کر چلا رہی تھی۔ ایک منٹ بعد اچانک اس کا فون بولنے لگا۔ دھیان فوراً ہی لڑکیوں کی طرف گیا۔ وہ رک گئی تھی۔ نمبر اجنبی تھا۔ کوئی پے فون سے کال کر رہا تھا۔ ثریا نے کال وصول کی۔ اسے حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ براڈ کی آواز تھی۔

''تھینک گاڈ۔'' وہ بولا۔

''لڑکیوں نے تمہیں کال کی؟'' ثریا نے عالمِ اضطراب میں سوال کیا۔

''وہاٹ؟ وہ تمہارے ساتھ نہیں ہیں؟''

''وہ پانی میں گئی تھیں...... میں ان کو تلاش کر رہی ہوں۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟ ہر ممکن کوشش کرو۔ سونامی ایک حقیقت ہے۔ اور یہ ایک بڑا ہی تباہ کن سونامی ہے۔''

''کچھ غلط ہے، آخر انہوں نے سائرن کیوں نہیں سنا؟'' ثریا نے کہا۔

''او کے، پُرسکون رہو۔ کوئی حل نکالتے ہیں۔ تم کہاں پر ہو؟'' براڈ نے استفسار کیا۔

''میں ''وائی کی کی'' پر ہوں اور فون جواب دے رہا ہے۔''

براڈ نے جواب میں کچھ کہنا شروع کیا اور ثریا کا فون مردہ ہو گیا۔ ثریا نے فون بند کیا۔ کالا کاؤ ایونیو کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے پھر سے لڑکیوں کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ وہ اندر ہی اندر خاصی خوف زدہ تھی۔ ایونیو پر جانے کا فائدہ یہ تھا کہ وہ سڑکوں اور دکانوں کے علاوہ ساحل پر بھی نظر رکھ سکتی تھی۔ معاً اسے ایک اسٹور نظر آیا جو بچوں کے کپڑوں کے لیے مخصوص تھا۔ اندر جا کے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور آواز لگانا شروع کی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو افراد چونک پڑتے لیکن یہ عام حالات نہیں تھے۔ دیواروں پر ٹیلی ویژنز پر عموماً میوزک وڈیوز دکھائی جاتی تھیں۔ لیکن اس وقت ہر ٹی وی پر مختلف خبروں کے چینل نظر آ رہے تھے اور سونامی کی خبریں چل رہی تھیں۔

ہراساں ثریا کو پکارتے دیکھ کر ایک سیلز وومین قریب آ گئی۔ ''میم...... ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔''

لیلیٰ

نئے ڈاکٹر نے دماغی اسپتال کا چارج سنبھالا تو اپنے ایک ماتحت کے ساتھ ہر وارڈ کے معائنے کے لیے نکلا۔ پہلے وارڈ میں ایک شخص بکھرے بالوں اور پھٹے ہوئے لباس کے ساتھ کونے میں بیٹھا۔ ''لیلیٰ...... ہائے لیلیٰ'' پکار رہا تھا۔

ماتحت نے اپنے افسر کے استفسار پر بتایا کہ وہ شخص لیلیٰ نامی ایک خوب صورت دوشیزہ سے والہانہ محبت کرتا تھا۔ اس سے شادی میں ناکامی پر اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ اب وہ ہر پل اسی کی یاد میں آہیں بھرتا رہتا ہے۔

مختلف وارڈز سے ہوتے ہوئے وہ ایک پنجرے نما کمرے کے قریب پہنچے تو وہاں بھی بکھرے بالوں، پھٹے ہوئے لباس اور ویران آنکھوں والا ایک اور مخبوط الحواس شخص نظر آیا۔ وہ بھی ''لیلیٰ...... ارے لیلیٰ...... ہائے لیلیٰ'' پکار رہا تھا۔

''یہ کیا معما ہے؟'' نئے ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''یہ بھی لیلیٰ، لیلیٰ کر رہا ہے۔''

''سر! اس بدنصیب نے اسی لیلیٰ سے شادی کی تھی اور اس حال کو پہنچ گیا...... دونوں دکھیارے ہیں بے چارے۔''

وزیر آباد سے محمد احسن زمان کا احسان

ثریا نے میا کا فوٹو نکالا۔ ''کیا تم نے اس لڑکی کو دیکھا ہے؟''

سیلز وومین نے تصویر پر نظر ڈالی اور نفی میں گردن ہلائی۔

ثریا نے رخ دروازے کی طرف کر لیا، تلاش تو جاری رکھنی تھی۔ چلتے چلتے اس نے سوال کیا کہ جو اطلاعات گردش کر رہی ہیں، کیا تم ان پر یقین کرتی ہو؟''

''یقین تو نہیں آتا۔ لہروں کی بلندی دو سو فٹ تک بتائی جا رہی ہے۔'' سیلز وومین نے کہا۔ ''بہت خوفناک ہے۔''

ثریا چلتے چلتے رک گئی۔ ''کیا کہہ رہی ہو تم؟'' ثریا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''یہی بتایا گیا ہے۔ افواہ ہو تو اچھا ہے۔'' سیلز وومین بولی۔ معاً ثریا کو یاد آیا کہ براڈ نے لفظ ''تباہ کن'' استعمال کیا تھا۔

''وہ دیکھو۔'' عورت نے ایک ٹی وی کی طرف اشارہ کیا۔ فضا میں ہیلی کاپٹر کا کیمرا ساحل کے مناظر دکھا رہا تھا۔ عورت نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کی جانب کیا اور آواز

بلند کردی۔ ٹی وی اسٹیشن کا ہیلی کاپٹر مناظر دکھاتے ہوئے کمنٹری کررہا تھا۔ ٹی وی کا کیمرا ہر طرف گھوم رہا تھا۔

☆☆☆

10:41 am

(پہنچنے میں اکتالیس منٹ)

سونامی وارننگ کی صورت میں معین طریقہ کار کے مطابق سول ائر پٹرول کو بھی حرکت پذیر ہونا تھا...... ساحل سے ہٹ کر اور دور افتادہ علاقوں میں غالب امکان ہوتا ہے کہ سرفرز اور بوٹ پر موجود افراد سائرن کی آواز نہ سن سکیں۔ فضا سے ہیلی کاپٹر اور ائر کرافٹس، لاؤڈ اسپیکرز استعمال کر کے ایسے لوگوں کو باخبر کرتے ہیں۔

CAP (سول ائر پٹرول) کا ایک والنٹیئر پرجوش انیس سالہ جوان میتھیو پارکن تھا۔ اسے پہلی مرتبہ اس قسم کے حالات کا سامنا تھا۔ میتھیو، سیسنا فلائی کررہا تھا۔ اسے جو علاقہ دیکھنا تھا، وہ ''وائی کی کی'' بیچ کے اطراف میں تھا......

☆☆☆

لانی اور میا اپنے نئے دوستوں کے ساتھ ڈائمنڈ ہیڈ کے قریب تھیں۔ لانی ابھی تک لطف اندوز ہورہی تھی جبکہ میا پیڈل چلاتے چلاتے تھک گئی تھی۔ ہوا نسبتاً تیز ہو چکی تھی اور پرسکون پانی میں بھی ہلچل تھی۔ جس کے باعث ان کی کائیک ڈول رہی تھیں۔ تھکی ہوئی حالت میں (kayaks) سانس سوسی بیچ سے واپس وائی کی کی بھی جانا تھا۔ لانی ائر کرافٹس اور ہیلی کاپٹرز کی غیر معمولی سرگرمی سے حیرت زدہ تھی۔ وہ چہ میگوئیاں کرتے ہوئے واپس ''وائی کی کی'' روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

10:43 am

(لہر پہنچنے میں انتالیس منٹ)

ریگی ڈارٹ (DART) پر مصروف تھا جبکہ کائی کیبل چینلز پر حالت انخلا کو دیکھ کر حالت خوف میں چلا گیا تھا۔ برائن نے پُرزور براڈ کاسٹنگ کی تھی۔ بعدازاں گورنر نے بھی پیغام دیا تھا۔ تاہم یوں معلوم ہوتا تھا کہ عوام کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھے اور ان میں سے کچھ الجھن کا شکار تھے۔ کائی جانتا تھا کہ ایسے ردعمل کے پس پشت وجہ کون سی ہے۔ انہوں نے اب تک شہاب ثاقب کا ذکر نہیں کیا تھا۔ یہی سمجھا جارہا تھا کہ عام زلزلہ ہے جو سونامی کی لہریں بلند کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ اگرچہ کچھ نہ کچھ ہلچل دکھائی دے رہی تھی۔ تاہم گومگو کی کیفیت نے حتمی نتیجہ روک رکھا تھا۔

''عوام کچھ زیادہ سنجیدہ نہیں۔ کچھ کرنا پڑے گا۔''

''مثلاً کیا؟'' ریگی نے سوالیہ نظروں سے کائی کو دیکھا۔

کائی نے عالم پریشانی میں گہری سانس لی۔ اسے اندازہ تھا کہ بہت زیادہ اموات ہوں گی۔ وہ دماغ پر زور دے رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔

براڈ آپریشن روم میں داخل ہوا اور کائی کو بتایا کہ ٹریسا سے اس کی کیا بات ہوئی...... لڑکیاں کہاں ہیں، نہیں پتا۔ محفوظ ہیں یا پھر...... یہ ذاتی صدمہ تھا جو کائی کو سہنا پڑا۔

''پولیس کی مدد لینی چاہیے۔'' براڈ نے کہا۔

''جزیرے کی نصف آبادی پولیس سے رابطے میں ہو گی۔'' ریگی نے آئیڈیا مسترد کردیا۔

''کچھ تو کرنا پڑے گا۔'' براڈ نے کہا۔ ''گورنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''ویری گڈ۔'' ریگی نے تبصرہ کیا اور کمپیوٹر کا رخ کیا اور کائی، براڈ سے باتیں کرنے لگا۔ یک لخت کئی فون ایک ساتھ بجنا شروع ہوگئے۔ براڈ کالز وصول کرتے ہوئے لکھتا جارہا تھا۔

''سب ہی آگئے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''نیویارک ٹائمز، سی این این، فوکس، اے بی سی، این بی سی، CBS۔ یہ لوگ فرنٹ گیٹ پر ہیں، میں نے کہہ دیا کہ وہ اندر نہیں آسکتے۔''

''کیوں؟''

''تمہارا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ تم بہت زیادہ مصروف ہو۔''

''فون انٹرویو سے بہتر ہے کہ چند ایک کو جونسٹن جزیرے کی وڈیو دکھا دی جائے۔ وہ وڈیو دنیا بھر کے ڈیٹا سے زیادہ مؤثر ثابت ہوگی۔ کیا خیال ہے؟'' کائی نے تجویز دی۔

''بات میں وزن ہے۔'' ریگی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں ایسا کرتا ہوں کہ چند رپورٹرز اور کیمرا مینز کو اندر آنے دیتا ہوں۔ بھیڑ لگانا مناسب نہیں ہے۔ باقی باہر انتظار کریں گے۔''

چند منٹ میں ریگی نے اپنا کام کرلیا۔ کیمرا مین ایک ہی آیا تھا۔ باقی دو رپورٹرز تھے۔ ایک رپورٹر نے اپنا تعارف کرایا۔ ''ڈاکٹر تنا کا میرا نام لارا پیالو ہے۔'' اس نے کائی سے ہاتھ ملاتے ہوئے دوسرے رپورٹر کا نام بتایا۔ پھر باریش کیمرا مین کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ راجر ایموس ہے۔ آپ کے وقت کا شکریہ۔ میں آپ کی مصروفیت کو سمجھ

سکتی ہوں۔''
''درحقیقت میں انخلا کے عمل سے خوف زدہ ہوں۔ عوام کا ردِعمل میری توقعات کے برخلاف ہے۔ ان کو مزید متحرک کرنے کے لیے آپ لوگ مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ آپ کو دکھانے کے لیے میرے پاس کچھ ایسا ہے۔ جو آپ کے ذریعے عوام تک گیا تو بہت اچھا رہے گا۔'' کائی نے وضاحت کی۔
''ایسا کیا ہے؟'' لارا کے چہرے پر ہیجانی تاثرات نمایاں ہو گئے۔
''میں کمپیوٹر اسکرین پر ایک وڈیو دکھاؤں گا۔ راجر اسے ریکارڈ کر کے براڈ کاسٹ کر دے گا۔ کھلبلی تو مچے گی لیکن یہ ناگزیر ہے۔''
اندر آنے والے تینوں افراد عالم حیرت و اضطراب میں خاموشی سے سن رہے تھے۔ راجر نے کیمرا تیار کیا اور سوال کیا کہ وڈیو کون سے کمپیوٹر پر ہے...... میں اسٹیشن کو خبر کرتا ہوں کہ وہ براڈ کاسٹ کے لیے تیار رہیں۔
کمپیوٹر آن ہوا۔ کیمرے نے کام شروع کر دیا۔ اسکرین پر جو نظر آرہا تھا، کائی اس کے لیے کنٹری کر رہا تھا۔
وڈیو اسٹیشن تک چلی گئی۔ راجر اسٹیشن کے ساتھ رابطے میں تھا۔ کام ختم نہیں ہوا تھا۔ کائی نے براڈ اور ریگی کو دیکھا اور کھنکھار کر گلا صاف کیا۔
اپنا نام اور عہدہ بتا کر اس نے بولنا شروع کیا۔
''تقریباً چالیس منٹ قبل ہوائی کے جزائر کے لیے میں نے سونامی وارننگ جاری کی تھی۔ میں سونامی کی بھیانک شدت کی اصلیت کو عیاں نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ ہمارے پاس مناسب ثبوت موجود نہیں تھے جو ثبوت ہے اسے ظاہر نہ کرنے کی وجہ میرے پاس تھی۔ انخلا میں تیزی نہیں ہے لہٰذا یہ وڈیو ریلیز کی جا رہی ہے۔ یہ وڈیو دیوزاد سونامی کی علامت ہے اور ہمارے پاس خود کو بچانے کے لیے بہت کم وقت ہے۔ عوام وجہ سمجھنے سے قاصر ہیں کیونکہ سونامی کی پیداوار شہاب ثاقب ہے جو سمندر میں گرا ہے۔ ہمیں یقین ہے لیکن ثبوت کا انتظار ہے۔ ثبوت ملتے ہی سب کو قیامت سے گزرنے کے لیے تیار رہنا ہے۔ میں کہوں گا کہ ثبوت کے انتظار میں وقت ضائع نہ کریں۔ شواہد موجود ہیں۔ اسی لیے میں نے یہ وڈیو چلوا دی ہے۔''
راجر کے اسٹیشن سے فون آیا۔ ''معاف کیجیے ڈاکٹر تناکا، آپ کیسے کہہ رہے ہیں کہ آج صبح شہاب ثاقب بحرالکاہل سے متصادم ہوا ہے؟''

انٹرویو کا نازک تر مرحلہ آن پہنچا۔ کائی جانتا تھا کہ یہ سوال آئے گا۔ اگر وہ تفصیل میں گیا تو دیکھنے والوں کی دلچسپی کھو دے گا اور وہ اس بات سے بھی واقف تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ تو کہنا پڑے گا۔
''وقت اتنا کم ہے کہ میں تفصیل میں جانے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ شواہد ہیں لیکن ٹھوس ثبوت......''
''ثبوت مل گیا۔'' براڈ نے بات کاٹ دی۔ ''گیل وین ورتھ لائن پر ہے۔ NOAA نے تمھیں آٹھ امیج ای میل کیے ہیں، جو نیوز ایجنسیز کو ریلیز کیے جانے والے ہیں۔ بحرالکاہل میں مہیب تصادم ہوا ہے۔ NASA نے شہاب ثاقب کی تصدیق کر دی ہے۔''

☆☆☆

10:47 am

(لہر پہنچنے میں پینتیس منٹ)

سیسنا کے کاک پٹ میں میتھیو پارکن ہر ممکن کوشش کر رہا تھا لیکن ساحل پر موجود لوگ گویا بہرے ہو گئے تھے۔ اس نے کئی مرتبہ نیچے پرواز بھی کی......
کچھ دیر بعد اسے اندازہ ہوا کہ اب تک کی پچیس منٹ کی محنت ضائع ہو گئی تھی۔ سیسنا کا لاؤڈ اسپیکر ہی خراب تھا۔ اس نے CAP (سول ائرپورٹ) کو رپورٹ دی۔ ہدایت ملی کہ واپس آؤ، دوسرا ائرکرافٹ روانہ ہو رہا ہے۔

☆☆☆

پیالو نے سوال کیا کہ ''ناسا نے زمین کی طرف آتے شہاب ثاقب کو کیونکر دریافت نہیں کیا۔ نشاندہی تو ہفتوں پہلے ہو جاتی ہے؟''
''کئی بلین سال میں چھوٹے بڑے ایک سو تیرے ایسٹرائڈز زمین سے ٹکرائے۔'' کائی نے کہا۔ ''بیشتر ویران علاقوں میں گرے۔ ان کی رفتار پچیس ہزار میل فی گھنٹا ہوتی ہے۔ ہر ایک کی نشاندہی ایک مشکل کام ہے۔ 2002ء میں ایک شہاب ثاقب زمین سے صرف پچھتر ہزار میل کی دوری سے گزر گیا تھا۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ ایک شہر تباہ کر سکتا تھا۔''
''مطلب ہم بال بال بچے تھے؟''
''ہاں، لیکن اس سے بھی قریب سے ایک 14 جون کو گزرا تھا اور اداروں کو تین دن بعد سترہ جون کو پتا چلا۔ اس مرتبہ شہاب ثاقب ٹکرانے سے پہلے کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک اور بات 66 ملین سال قبل جو شہاب ثاقب ٹکرایا تھا، وہ نو میل چوڑا تھا۔ ڈائنوسارز کے علاوہ بے شمار نسلوں کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ اس وقت جو ہولناک سونامی بپا ہوا

تھا۔ اس کی لہریں ایک میل سے زیادہ بلند تھیں۔"

☆☆☆

کائی ٹی وی پر ہیلی کاپٹر کو دیکھ رہا تھا جس کا کیمرا تباہی کی منظر کشی میں مصروف تھا۔ متعدد سرفر ساحل کی طرف جا رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر وائی کی کی پر تھا۔ معاً کیمرے نے ایک منظر زوم کیا۔ اور کائی کا منہ کھل گیا۔

"او مائی گاڈ۔"

"وہ چار بچے تھے۔ دو لڑکوں کو کائی نے نہیں پہچانا۔ لیکن پلک جھپکنے میں لڑکیوں کو پہچان لیا۔ دونوں لانی اور میا تھیں۔ اس کی اپنی بیٹی اوپر دیکھتے ہوئے کیمرے کی جانب ہاتھ لہرا رہی تھی۔

☆☆☆

10:51 am

(لہر پہنچنے میں اکتیس منٹ)

لانی کو پہچان کر کائی شاک میں چلا گیا تھا۔ سانس رک سی گئی تھی۔ نیوز رپورٹ کا موضوع بدل گیا تھا۔ لیکن دہشت نے کائی کو گرفت میں لے لیا تھا۔ اسے ادراک تھا کہ لڑکیاں قیامت خیز آنے والے عذاب سے بے خبر ہیں۔

"ہم جا رہے ہیں۔" وہ بولا۔

"کون جا رہا ہے؟" لارا پیالو نے سوال کیا۔

"میں، تم...... ہم سب۔" کائی نے جواب دیا۔

"لیکن ابھی تیس منٹ باقی ہیں۔" وہ بولی۔

"صرف تیس منٹ۔" کائی نے کہا۔ "اور ہم سطح زمین پر ہیں۔ بلند مقام پر پہنچنے میں وقت لگے گا۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ ٹریک جام ہونے لگا ہے۔ تم کچھ دور تک تو جا سکتی ہو لیکن اس کے بعد پیدل آگے بڑھنا ہوگا۔"

"مجھے لگ رہا ہے کہ ہم ایک ساتھ نہیں جا رہے۔" براڈ نے کہا۔

"ہاں۔" کائی بولا۔ "تم کتنی تیزی سے بائیک پر مجھے وائی کی کی لے جا سکتے ہو؟" کائی نے سوال کیا۔

"تم جانتے ہو کہ میں موٹر سائیکل کیسے چلاتا ہوں۔ ہم بروقت پہنچ جائیں گے۔" بیٹی کے لیے کائی کو ڈیوٹی چھوڑنی پڑ رہی تھی۔ تاہم ناسا کی تصدیق کے بعد اس کا کام تقریباً ختم ہو گیا تھا۔

"لیکن میں یہاں اکیلا......" ریگی کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔ "میں نہیں کر سکتا۔"

"تم ایک ضروری کمپیوٹر اٹھا لو اور میڈیا ٹیم کی وین میں نکل جاؤ۔ کمپیوٹر پر تم ہوائی جزیرے سے رابطہ رکھ سکتے ہو۔ علاوہ ازیں میں موبائل پر پالمر کو بتا دوں گا کہ تم انچارج ہو۔ (ویسٹ کوسٹ/الاسکا سونامی وارننگ سینٹر، پالمر، الاسکا)...... چلو نکلو۔" سب باہر نکل گئے۔

ریگی کمپیوٹر کے ساتھ اپنے گھر کی طرف بھاگا جو کچھ دیر بعد فنا ہونے والا تھا۔ کائی نے اپنے گھر کی طرف دوڑ لگائی۔ کائی گھر کی ہر شے نہیں اٹھا سکتا تھا...... ممکن ہی نہیں تھا۔ گہری سانس لے کر اس نے قیمتی اور یادگار اشیا کو نظر انداز کیا اور چند فوٹو منتخب کیے۔ ان میں راشیل سے شادی، راشیل کی فیملی اور لانی کا فوٹو شامل تھا۔ باہر نکلتے ہوئے وہ پلٹا۔ طائرانہ نظر گھر کے اندر ڈالی، اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ براڈ کی آواز سن کر وہ باہر نکل گیا۔

اسی وقت ریگی بھی اپنے گھر سے نکل رہا تھا۔ کائی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ریگی کے ہاتھ میں صرف کمپیوٹر اور ایک ہیلمٹ تھا۔ "تمہیں بائیک پر اس کی ضرورت ہے۔" وہ بولا۔

"تم نے گھر میں سے کچھ نہیں لیا؟" کائی نے سوال کیا۔

"ایسی کوئی چیز نہیں ہے وہاں۔"

کائی نے اسے گلے لگا لیا۔ "اپنا خیال رکھنا۔"

"اور تم بھی۔" وہ میڈیا وین کی طرف چلا گیا۔ کائی نے آخری بار PTWC کی عمارت کو دیکھا اور براڈ کے پیچھے موٹر بائیک پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

140 ہارس پاور کی ہارلے اسٹارٹ ہوئی اور کائی بچوں کے مانند براڈ کی کمر سے لپٹ گیا۔ کائی کے ایک ہاتھ میں موبائل تھا۔ سڑک پر ٹریفک کی رفتار کم تھی۔ وہ بہت جلد میڈیا وین کو کراس کر گئے۔ براڈ کی ڈرائیونگ کا انداز خطرناک تھا۔ وہ گاڑیوں کے جنگل میں راستہ بناتا ہوا رفتار بڑھا رہا تھا...... کائی خوف کے عالم میں اس کے ساتھ لپٹا ہوا تھا۔

☆☆☆

10:59 am

(سونامی کی لہر پہنچنے میں تیئس منٹ)

ڈائمنڈ ہیڈ سے گھومتے ہی کالا کاؤ ایونیو پر لانی کو انتہائی بھگدڑ کے آثار دکھائی دیے۔ لوگ مختلف سمتوں میں اندھا دھند بھاگ رہے تھے۔

"میا؟" اس نے اشارہ کیا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" ان کے ساتھ دونوں لڑکے بھی بدکے ہوئے نظر آئے۔

جلدی نکلو بھائی، راستہ بند ہونے والا ہے

''پتا نہیں۔'' میا کا چہرہ بجھی ہوئی راکھ کے مانند نظر آیا۔
''شدید گڑبڑ ہے۔'' ٹام نے جیک سے کہا۔
وائی کی کی بے اور ایلا وائی مرینا پر بوٹس غیر متوازن انداز میں ہار بر سے گویا اُبل رہی تھیں۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ فاصلے پر دو بوٹس کے درمیان تصادم ہوا ہے...... بڑی تعداد میں ائرکرافٹس فضا میں موجود تھے۔ پھر ایک نیوز ہیلی کاپٹر نظر آیا جس کے کیمرے کا رخ ان پر تھا۔ لانی نے ہاتھ لہرانے شروع کر دیے۔ چند سیکنڈ میں ایک چھوٹا طیارہ بھی ان کے سر پر تھا۔ اس نے فضا میں چکر لگایا اور اس کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہونے لگا۔ پہلا لفظ ہی سونامی تھا۔
''سونامی وارننگ جاری ہو چکی ہے۔ یہ ہوائی کے لیے ہے۔ فوراً یہاں سے نکل کر بلند مقام پر جاؤ...... سونامی کی پہلی لہر تیس منٹ میں ہونولولو پہنچے گی۔ اگر اعلان سمجھ میں آ گیا ہے تو اپنے ہاتھ بلند کر کے لہراؤ۔''
چاروں نے بجھی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور ہاتھ لہرانے شروع کر دیے۔ طیارہ پانچ سو گز دور ایک گروپ کی طرف چلا گیا۔
''ہم نے سائرن کیوں نہیں سنا تھا؟'' جیک نے کہا۔
''شاید ہم ساحل سے دور تھے اور ہوا کا رخ مخالف سمت میں تھا۔'' لانی نے اظہارِ خیال کیا۔ تاہم سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔
''یہ سوال جواب کا وقت نہیں۔'' میا جیسے چیخ اٹھی۔ ''نکلو یہاں سے۔''
چاروں نے کائیک کے رخ تبدیل کیے اور دیوانہ وار ایک چپو کو دائیں بائیں باری باری چلانا شروع کیا۔ میا کائیک کھینے میں رواں نہیں تھی۔ یہ صورتِ حال خطرناک تھی۔
''تیزی دکھاؤ۔'' جیک چلّایا۔
''میرے بازو دکھ رہے ہیں۔'' میا نے مایوسی سے کہا۔ معاملہ اُلجھ گیا تھا۔ میا کے ساتھ بروقت وہاں سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ ٹام نے جیک سے کہا۔
''جتنی جلدی ممکن ہو تم اکیلے نکلو اور بوٹ لے کر آؤ۔'' جیک ہی کائیک کی حد تک سب سے تیز رفتار تھا۔
''بوٹ کہاں سے لاؤں؟''
''میری ماں گرینڈ ہوائین ہوٹل میں کام کرتی ہیں۔'' لانی نے کہا اور فاصلے پر ڈبل ٹاور کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہاں بوٹ مل جائے گی۔ ہم اپنی رفتار سے پیچھے آ رہے ہیں۔''
جیک برق رفتاری سے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

11:04 am

(سونامی کی پہلی لہر آنے میں اٹھارہ منٹ باقی رہ گئے تھے)
ٹریسا اسٹور سے نکل کر واپس اس مقام پر آئی جہاں لڑکیوں کے لیے اس نے پیغام چھوڑا تھا۔ سب کچھ جوں کا توں وہیں موجود تھا۔ خوف کا زہر اس کے خون میں شامل ہونے لگا۔ وہ بے جان سی ہو گئی...... خالی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ عوامی انخلا کا عمل عروج پر پہنچ چکا تھا۔ بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ لوگ دوڑ رہے تھے۔ فیملی والے زیادہ ہراساں تھے۔ کچھ لوگ چیخ رہے تھے۔ بعض رو رہے تھے۔ ٹریسا کے ذہن میں مختلف خیالات کی کھچڑی پک رہی

تھی۔ کیا لڑکیاں کسی ہوٹل میں چلی گئی ہیں یا پھر کسی گاڑی والے نے ان کو لفٹ دی ہے۔ مذکورہ دونوں صورتوں میں ٹریسا بروقت ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ وہ امید کررہی تھی کہ لڑکیاں صورت حال سے باخبر ہوں گی اور واپس ٹریسا تک پہنچنے کی کوشش میں ہوں گی۔ ٹریسا نے ساحل کے مشرق کی سمت چلنا شروع کیا۔ وہ لڑکیوں کا نام لے کر چلا رہی تھی۔ نگاہ ہر سمت چکرا رہی تھی۔ ٹریسا نے حواس پر قابو پایا اور تمام امکانات مسترد کر کے توجہ ہوٹلوں پر مرکوز کردی۔ اگر اندازہ درست ہے تو منطقی طور پر لانی کو ماں کے پاس جانا چاہیے تھا۔ یعنی گرینڈ ہوائین ہوٹل۔ ٹریسا نے رخ بدل کر دوڑنا شروع کیا۔

☆☆☆

11:07 am

(سونامی کی آمد میں پندرہ منٹ رہ گئے تھے)

گرینڈ ہوائین کی لابی خوف زدہ اور پریشان سیاحوں سے پُر تھی۔ راشیل کے اسٹاف کا ہر ممبر کمروں کے دروازے بجا رہا تھا کہ کوئی پیچھے نہ رہ جائے۔ راشیل روسی گروپ کو سمجھانے کی کوشش کررہی تھی۔ پھر وہ ریٹائرڈ معذور فوجیوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ فوجیوں کو بسوں تک پہنچانے کا بندوبست کیا گیا۔ تاہم بسیں مطلوبہ تعداد سے کم تھیں۔ لہٰذا جن کی معذوری شدید تھی انہیں ترجیح دے کر بسوں میں منتقل کیا گیا۔ باقی جو چل سکتے تھے اور معذوری کی نوعیت جسم کے بالائی حصوں میں تھی۔ ان کو کالا کاؤا ایونیو پر ہجوم میں شامل کرایا گیا۔ پھر بھی بچھتر فوجی اور ان کی بیگمات ہوٹل میں رہ گئے تھے۔

اسی اثنا میں باب لیسٹن ایک بار پھر راشیل سے اُلجھ گیا۔ راشیل نے خود کو سنبھالتے ہوئے اسے اطمینان دلانے کی ناکام کوشش کی۔ تاہم باب کو گویا صرف اپنی فکر تھی۔ راشیل کی نظر میکس پر پڑی اور اس نے باب کے احتجاج کو نظرانداز کرتے ہوئے جان چھڑائی۔ ''سر میں ابھی آئی۔'' وہ میکس کی طرف چل دی۔

''کیا کرنا چاہیے؟'' راشیل نے صورت حال بتا کر سوال کیا۔

''میری تجویز ہے کہ ہمیں نکل جانا چاہیے۔'' میکس نے کہا۔

''تم سنجیدہ نہیں ہو۔''

''اور ہم کیا کرسکتے ہیں؟''

''تم میری مدد کرو۔ ہم ان کو بالائی منزلوں پر لے جاتے ہیں۔'' راشیل نے کہا۔

میکس کا جبڑا لٹک گیا۔ ''وہاٹ؟ تم نے تو کہا تھا کہ بلڈنگ محفوظ نہیں ہے۔ سونامی اس کو گرا سکتا ہے؟''

''آہستہ بولو۔'' راشیل نے کہا۔ ''ان کو دیکھو کوئی واکر پر اور کوئی وھیل چیئر پر ہے۔ چند کے ساتھ ان کی بیگمات ہیں۔ پندرہ منٹ میں وہ کسی محفوظ جگہ پر نہیں جا سکتے۔''

''لیکن پہلی لہر کے پچیس منٹ بعد دوسری لہر بھی آئے گی۔'' میکس نے کہا۔

''میں نہیں جانتی۔ وہ پندرہ منٹ تک لابی میں نہیں بیٹھ سکتے، کچھ تو کرنا ہوگا۔''

ایلی ویٹر کھلا اور ایڈرین کی شکل نظر آئی، وہ اور چار دیگر فرنٹ ڈیسک کلرک تھیں۔ اس کے ساتھ صرف میلیسیا تھی۔

''تنہا آئی ہو؟'' راشیل نے سوال کیا۔

ایڈرین نے ہچکچاہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''وہ تینوں بھاگ گئیں۔ میں اور میلیسیا ہیں۔''

راشیل ان کو کوئی الزام نہیں دے سکتی تھی۔ وہ ہوٹل ورکرز تھیں۔ فائر فائٹرز نہیں۔ خود راشیل کے دل میں کہیں یہی آرزو بار بار سر اٹھاتی کہ وہ خود بھی نکل جائے۔

''سب تک خبر پہنچ گئی ہے؟''

''ہاں، تاہم بارہ کمرے ایسے ہیں جن کے مکینوں نے ہوٹل چھوڑنے سے انکار کردیا ہے۔ ان کے خیال میں وہ اپنی جگہ پر محفوظ ہیں۔ کیا میں پھر کوشش کروں؟'' ایڈرین نے جواب دیتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں۔ تم اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتیں۔ تم دونوں بھی فوراً نکل جاؤ۔'' راشیل نے کہا۔

''لیکن آپ......؟'' ایڈرین نے سوالیہ نظر سے راشیل کو دیکھا۔

''یہاں کچھ مہمان ہیں، جن کو ہمیں نے اوپر لے جانا ہے۔ میں رکوں گی۔ ہم نہیں جاسکتے۔'' راشیل نے جواب دیا۔

''میں بھی رکوں گی۔ مدد کروں گی۔'' ایڈرین نے ارادہ ظاہر کیا۔

''شکریہ۔ تم ایسا کرو کہ جو لوگ ہوٹل سے باہر جارہے ہیں، ان کی رہنمائی کرو کہ محفوظ مقام پر کیونکر پہنچیں۔''

''میلیسیا یہ کام کرلے گی۔'' ایڈرین نے میلیسیا کی

طرف دیکھا۔ ''میں آپ کی مدد کروں گی۔''

راشیل مسکرائی۔ ''تم اور میکس سپاہیوں کو ٹاپ پر موٹا ٹاور کے اسٹار لائٹ ریسٹورنٹ میں لے جاؤ۔ سروس ایلی ویٹرز استعمال کرو گے تو پانچ منٹ میں کام ہو جائے گا۔''

''پھر، اس کے بعد؟ جب دوسری لہر آئے گی تو کیا ہو گا؟'' میکس نے خدشہ ظاہر کیا۔

''میں نہیں جانتی۔ دوسری لہر آئے گی تب دیکھیں گے۔ فی الحال مجھے یہ معلوم ہے کہ یہ معذور سپاہی پیدل یہاں سے نہیں نکل سکتے۔'' راشیل نے باہر دیکھا۔ میلیسا، روسی گروپ کو سمجھانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ سپاہیوں کی چند بیگمات کے سوالات کا جواب بھی دے رہی تھی۔

دفعتاً ایک روسی نے ہاتھ لہرا کر چلّانا شروع کیا۔ زبان رشین تھی۔ ان سے بات کرنا لاحاصل تھا۔ میلیسا نے تھکے ہوئے انداز میں اس آدمی کے ہاتھ نیچے کیے اور ایک لفظ کئی بار دہرایا۔ سونامی، سونامی......

گروپ کے افراد اس کو بے معنی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میلیسا نے ہاتھوں سے بھی مختلف اشارے کیے۔ معاً گروپ کی ایک پستہ قامت عورت نے باریک آواز میں کہا۔ ''سونامی۔''

میلیسا نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کے کئی بار ''سونامی'' کہا۔ پستہ قد عورت نے تیزی سے گروپ سے بات چیت کی۔ آناً فاناً سب سمجھ گئے کہ معاملہ کیا ہے۔ خطرہ محسوس کر کے وہ راشیل کے قریب چلے آئے۔ راشیل نے میلیسا کی طرف اشارہ کیا جو ہاتھ لہرا کر انہیں بلا رہی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ میلیسا کے ساتھ جانا ہے۔ ان کی افراتفری میں کمی نظر آئی۔

''گڈ لک، میلیسا۔'' راشیل نے بلند آواز میں کہا۔ میلیسا نے پلٹ کر راشیل کے حد سے زیادہ سنجیدہ چہرے کو دیکھا۔

''بھاگو۔'' راشیل نے اونچی آواز میں کہا۔

☆☆☆

جیک نے پھرتی اور توانائی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ آگے جا کر پانی سے نکل گیا اور کائیک چھوڑ کر ریتیلے ساحل پر گرینڈ ہوائین ہوٹل کی طرف بھاگ رہا تھا۔ لانی اسے دیکھ سکتی تھی۔ اس نے میا کا حوصلہ بڑھایا۔

☆☆☆

11:11 am

(سونامی کی آمد میں گیارہ منٹ باقی تھے)

براڈ اور کائی وائی کی کی کے اختتامی سرے تک آگئے تھے۔ جہاں سڑکوں پر ہر طرف ہر سمت گاڑیاں تھیں۔ سائڈ واک پر بھی ٹریفک تھا۔ سب کا رخ پہاڑوں کی جانب تھا۔ براڈ نے گویا موت کے کنوئیں میں بائیک دوڑائی تھی۔ کئی جگہ حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ لیکن وہ کامیابی سے ریکارڈ ٹائم میں کائی کو نکال لایا تھا۔ لوگ پا پیادہ بھی تھے۔ کوئی چل رہا تھا۔ کوئی بھاگ رہا تھا۔ چیخ و پکار الگ مچی ہوئی تھی۔ عجب دل دہلا دینے والا منظر تھا۔ کائی نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ چند منٹ بعد کون سی قیامت نازل ہونے والی ہے اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ بخوبی آگاہ تھا کہ بہت کم لوگ زندگی بچا پائیں گے۔ وہ خود اور اس کی فیملی شدید خطرے میں تھی۔

ہوٹل کے قریب کراؤڈ کم ہو گیا تھا۔ براڈ اچھل کر بائیک سے اترا۔ دونوں نے ہیلمٹ ایک طرف پھینکے اور بیرونی دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔ اندر قدم رکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ دھماکا تھا یا جناتی گونج کی لہر...... ہوٹل کی کھڑکیوں کے شیشے بجنے لگے۔ بعض میں مکڑی کے جالے کی طرح نقشہ بن گیا۔ نامعلوم آواز اتنی بلند تھی کہ ہر کوئی از خود اپنی جگہ پر تھم گیا۔ آواز کا منبع تلاش کرنے کے لیے چند افراد اوپر صاف نیلے آسمان کو چھان رہے تھے۔ کائی ہراساں نظروں سے سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آواز دس سیکنڈ سے زیادہ زندہ رہی پھر مدھم ہوتی چلی گئی۔

''کیا بلا تھی؟'' براڈ نے کہا۔

کائی، کراکاٹوا کی تاریخ اور کہانیوں کے بارے میں جانتا تھا۔ کراکاٹوا پھٹا تو بھیانک دھماکے کی گونج ہزاروں میل دور سنی گئی تھی۔

''یہ شہاب ثاقب کے تصادم سے پیدا ہونے والی شاک ویو تھی۔'' کائی نے کہا۔ ''آواز نے بارہ ہزار میل کا سفر طے کیا ہے یہاں آنے کے لیے۔ اور دو گھنٹے سے زیادہ وقت لیا۔'' کائی اس بات سے خوف زدہ تھا کہ سونامی کی رفتار سونک بُوم سے کچھ کم ہوتی ہے۔ صاف عیاں تھا کہ سونامی کی پہلی لہر سر پر تھی۔

''وقت نہیں ہے، بھاگو۔'' کائی نے براڈ کو اشارہ کیا۔ دونوں ہوٹل کے اندر داخل ہو گئے۔ لابی میں پہنچ کر کائی نے راشیل کو آوازیں دینا شروع کیں۔

لابی سنسان تھی۔ لابی کے کونے میں آگے بیس کے قریب افراد دکھائی دیے۔ چند افراد وہیل چیئرز پر تھے۔ وہ

ایلی ویٹر میں داخل ہونے والے تھے۔کائی نے راشیل کے سرخ بال دیکھ لیے۔ اور آواز لگائی۔ راشیل نے گردن گھمائی۔کائی کو دیکھ کر فرطِ حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔وہ اچانک شوہر کی طرف بھاگی۔

''کائی۔''

اس نے ہاتھ کائی کی گردن کے گرد لپیٹ دیے اور سر کاندھے پر رکھ دیا۔ ایلی ویٹر کے قریب موجود افراد یہ جذباتی منظر دیکھ رہے تھے۔کائی نے محبت سے راشیل کو الگ کیا۔

''تم دونوں یہاں پر......؟'' راشیل نے براڈ کو دیکھا۔''کیا مسئلہ ہے؟ اوہ مائی گاڈ! لانی! وہ کہاں ہے؟''

''تم نے ثریا کو دیکھا ہے؟'' کائی نے سوال کیا۔

''براڈ نے اسے یہاں پہنچنے کے لیے کہا تھا۔''

''نہیں، وہ لوگ کہاں ہیں؟''

''ہم نے لانی اور میا کو وائی کی کی کے قریب دیکھا تھا۔''

''کیسے؟''

''سوال جواب کا وقت نہیں ہے۔ بمشکل دس منٹ بچے ہوں گے۔ ہمیں ان کو یہاں لانا ہے۔''

اور اسی وقت ثریا ہوٹل کی لابی میں نمودار ہوئی۔وہ پریشانی کے عالم میں بھاگتی ہوئی آئی تھی اور تنہا تھی۔

''تھینک گاڈ۔'' ان کو وہاں ساتھ دیکھ کر ثریا نے شکر ادا کیا اور لڑکیوں کے بارے میں استفسار کیا۔

''وہ کائیک میں وائی کی کی کے قریب کھاڑی میں ہیں۔'' کائی نے جواب دیا۔

ایک کم عمر لڑکا دوڑتا ہوا وہاں پہنچا۔عمر پندرہ سال کے قریب ہوگی۔وہ خاصی ابتر حالت میں تھا۔کائی کے لیے وہ اجنبی تھا۔

''لانی کی مام؟'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔''لانی کی مام؟'' لمحہ بھر کے لیے وہ سب ساکت رہ گئے۔راشیل اور کائی کا منہ کھلا رہ گیا۔معاً براڈ آگے بڑھا۔

''تم وہی ہو جسے ہم نے وڈیو میں دیکھا تھا۔تمہارے ساتھ ایک اور لڑکا تھا؟''

کائی نے لڑکیوں کو گھبراہٹ میں دیکھا تھا اور لڑکوں پر اس کی توجہ نہیں گئی تھی جبکہ براڈ کا مشاہدہ تیز تھا۔

راشیل، ثریا اور کائی نے سوالات کی بوچھار کر دی......

لڑکے نے بمشکل چند باتیں بتائیں اور بوٹ کی ضرورت واضح کی۔

''ہوٹل کی جیٹ اسکیز (Jet Skies) کے لیے واپس ساحل تک جانا ہوگا۔ جاؤ، نکلو......'' راشیل نے کہا۔ اسکیز کی لوکیشن بھی بتادی۔

کائی کے منع کرنے کے باوجود ثریا بھی ساتھ ہولی کہ اس کی بیٹی میا وہاں پھنسی ہوئی تھی۔

''مجھے اپنے مہمانوں کے ساتھ رکنا ہوگا۔'' راشیل نے کہا۔

کائی اسے سائڈ میں لے گیا اور سرگوشی کی۔''تم نہیں رک سکتیں۔ سب سے بڑی لہر دو سو فٹ اوپر جاسکتی ہے۔ ہوٹل عین ساحل پر ہے۔ یہ عام سونامی نہیں ہے۔ ہوٹل برداشت نہیں کر سکے گا۔''

''مہمان میری ذمے داری ہیں۔ میں کسی طرح ان کو نکالوں گی۔'' راشیل نے مضبوط لہجے میں کہا۔

کائی کے دل نے ایک دھڑکن کھودی۔ یہ تصور ہی اس کا جگر پانی کرنے کے لیے کافی تھا کہ وہ دوبارہ راشیل کو نہ دیکھ سکے گا۔ پاداشِ وفا اور بھلا کیا ہوگی۔ کیا واقعی یہ آخری ملاقات تھی۔ اندیشہ فردا اسے لرزائے دے رہا تھا۔معاً جسم و جان میں فخر کی موج نے سر اٹھایا۔ چند سیکنڈ میں کائی نے راشیل کی آنکھوں کو پڑھ لیا۔ اس کا دل و دماغ بھی انہی کیفیات سے گزر رہا تھا جن احساسات نے کائی کو بے حال کیا ہوا تھا۔

راشیل نے بیلٹ سے واکی ٹاکی الگ کیا اور کائی کے بیگ میں ڈال دیا۔''میں میکس والا استعمال کرلوں گی۔شاید سیل فون پر رابطہ نہ ہوسکے اور میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم ٹھیک ہو؟''

''ہاں، شکریہ۔'' کائی نے اُسے گلے سے لگالیا۔

''آئی لَو یو۔''

''آئی لَو یو ٹو۔''

اس نے بیوی کو آخری بار دیکھا اور باہر کی جانب بھاگا۔''محفوظ جگہ پہنچ کر کال کرنا۔'' پیچھے سے راشیل کی چیختی ہوئی آواز آئی۔ آواز سن کر کائی کے تصور میں لانی کا عکس اُبھرا جو اس نے ہیلی کاپٹر کے کیمرے میں دیکھا تھا۔وہ سمجھ گیا کہ راشیل مہمانوں کے لیے کیا کرے گی......

اس نے بھاگتے بھاگتے مڑ کر بلند آواز میں کہا۔

''ہیلی کاپٹر!''

لمحہ بہ لمحہ موت سے قریب تر کردینے والی طوفانی لہروں کی تباہی کا سنسنی خیز احوال اگلے ماہ پڑھیں

خوشی کا تعلق ڈھکے چھپے انداز میں کی گئی اچھائی اور نیکی سے جڑا ہوتا ہے... ایسا تعلق بنانے والے اور پھر نبھانے والے بہت کم لوگ ہوتے ہیں... اور جو ہوتے ہیں وہ اپنی ذات میں گم اور پوشیدہ رہتے ہیں... نئے سال کو خوش آمدید کہنے کا ایک ایسا بھی طریقہ ہوتا ہے... دل کی آنکھوں سے پڑھی جانی والی پراثر تحریر...

حقیقی کرداروں کے غمِ دوراں کا

علاج...... ایک مردِ مجاہد کا کمال

خبر اُس کے مطلب کی تھی اس لیے باقی خبروں پر دھیان دیے بغیر اس نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ گویا اس کا کام ہوگیا تھا......

وہ روزانہ صبح ناشتا کرتے ہوئے تازہ اخبار کا مطالعہ کیا کرتا تھا اور سٹی پیج ہمیشہ اُس کی توجہ کا خصوصی مرکز رہا تھا۔ اسے جس نوعیت کی خبروں کی تلاش ہوتی تھی، وہ سٹی پیج پر بہ آسانی مل جایا کرتی تھیں لیکن اخبار کے مذکورہ صفحے پر شائع ہونے والی ہر خبر اس کی دلچسپی کا باعث نہیں بن سکتی تھی۔ اس

معاملے میں وہ خاصا موڈی اور چوزی واقع ہوا تھا۔ بہرکیف، دیر یا سویر، اسے اس کی پسندیدہ خبر مل ہی جاتی تھی اور آج بھی ایک ایسی ہی صبح تھی۔

ناشتے کے دوران ہی میں اس نے اپنے ایک سابق کولیگ کو فون کیا۔ رابطہ ہونے پر اس نے رسمی علیک سلیک کے بعد گہری سنجیدگی سے کہا۔

''ملک صاحب! مجھے دو افراد کے بارے میں معلومات چاہئیں۔ اگر ان میں سے ایک کی تفصیل بھی مل جائے تو دوسرے کو میں خود ہی ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''مذکورہ بندوں کے نام بتائیں سر......!'' دوسری طرف لائن پر موجود ملک ارشاد نے اطمینان سے کہا۔

''میں اب آپ کا ''سر'' نہیں رہا ہوں......''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ محکمے میں موجود ہیں یا نہیں......'' ملک ارشاد اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''آج بھی میرے دل و دماغ میں آپ کے لیے وہی عزت و احترام ہے جو آپ کے دورانِ ملازمت میں ہوا کرتا تھا۔ جب میں آپ کو ''سر'' کہتا ہوں تو اس کا یہی مطلب ہے کہ آپ میرے سر ہیں اور سر کے بغیر دھڑ کسی کام کا نہیں ہوتا اور...... یہ بات آپ مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔''

''ملک صاحب! اگر آپ کی رطب اللسانی ختم ہوگئی ہو تو میں کام کی بات کروں......؟'' اس نے ملک ارشاد کی زبان سے اپنی تعریف کا سلسلہ روکنے کی غرض سے کہا۔

''جی منصب صاحب! میں سن رہا ہوں۔'' ملک ارشاد نے جلدی سے کہا پھر اپنے سوال کو دہرایا دیا۔ ''ان دو بندوں کے نام بتائیں سر......؟''

''میڈم نرگس اور اس کا شوہر نفیس علی۔'' منصب علی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''میرے اندازے کے مطابق، وہ دونوں میاں بیوی نہیں ہیں۔ یہ اُن کا ڈھونگ ہے۔ پچھلے دنوں انہوں نے اسی چھل فریب سے کروڑوں کمائے ہیں اور پھر وہ اچانک ہی منظر سے غائب ہوگئے۔''

''میں سمجھ گیا سر، آپ کو کس فراڈ جوڑے کی تلاش ہے۔'' ملک نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''اگر وہ غائب ہو گئے ہیں تو ہماری عقابی نگاہ سے بھلا کیسے چھپ سکتے ہیں۔ آپ مجھے تین سے چار گھنٹے کا وقت دیں۔ میں انہیں ڈھونڈ کر آپ کی خدمت میں حاضر کرتا ہوں، میرا مطلب ہے کہ ان دونوں کی کنڈلی نکال کر ساری معلومات آپ تک پہنچاتا ہوں۔''

''ویری گڈ!'' منصب علی نے ستائشی انداز میں کہا۔ ''تین چار نہیں، میں آپ کو پورے چوبیس گھنٹے دے رہا ہوں ملک صاحب۔ کل صبح تک میرا کام ہوجانا چاہیے۔''

''ہوجائے گا سر......!'' ملک ارشاد نے پورے تیقن کے ساتھ کہا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''اس کے بدلے میں آپ کو بھی میرا ایک کام کرنا ہوگا۔''

''میں حاضر ہوں ملک صاحب! آپ کام بتائیں۔'' منصب علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اب ڈپارٹمنٹ میں نہیں ہوں لیکن سیانے کہہ گئے ہیں کہ اگر زندہ ہاتھی ایک لاکھ کا تو مرا ہوا ہاتھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے...... ''پیشہ ورانہ'' موت کے بعد میں پہلے سے بھی زیادہ آزاد اور خود مختار ہوگیا ہوں۔ یہ جبری معزولی میرے لیے خاصی مبارک ثابت ہوئی ہے۔ اب میں وہ تمام کام زیادہ آسانی سے کرلیتا ہوں جو محکمے میں رہتے ہوئے ناممکن نظر آیا کرتے تھے کیونکہ انہیں سرانجام دینے کے لیے اپنے اوپر والوں کے تلوے چاٹنا پڑتے تھے اور یہ ''پابوسی'' بھی اکثر بے ثمر ہی ثابت ہوتی تھی......'' بات کے اختتام پر منصب علی کے لہجے میں اذیت ناک تلخی نمایاں ہوگئی۔

''میں آپ کے درد اور کرب کو سمجھ سکتا ہوں سر!'' ملک نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ نے ڈپارٹمنٹ کی عزت و آبرو کی خاطر اپنی متاعِ حیات کو قربان کردیا تھا مگر افسوس کہ ڈپارٹمنٹ نے آپ کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ آپ نے اپنے سینے میں ایک قبرستان آباد کر لیا اور محکمے نے اس قبرستان کی کسی ایک بھی قبر پر فخر و ستائش کے میڈل کا کوئی کتبہ نصب نہیں کیا۔''

''راکھ میں دبی چنگاریوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے سے آگ دوبارہ بھڑک اٹھتی ہے ملک صاحب!'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اب تو میرے پاس گنوانے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا اس لیے میں پہلے سے زیادہ نڈر ہوگیا ہوں۔''

''آئی ایم سوری سر!'' ملک ارشاد نے کہا۔ ''مجھے اس حساس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔''

''سوری کی ضرورت نہیں ملک صاحب! ہر انسان اپنے حالات کی روشنی میں سوچتا اور عمل کرتا ہے۔'' منصب علی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''بتائیں، اس انفارمیشن کے بدلے میں مجھے آپ کا کون سا کام کرنا ہوگا......؟''

''کام بہت آسان سا ہے منصب صاحب!'' ملک ارشاد نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ کو ''سر'' کہنا

مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ آپ محکمے میں نہیں رہے تو اس سے، آپ کے لیے میرے جذبات میں کوئی کمی یا تبدیلی تو واقع نہیں ہو سکتی نا۔ ہر حال میں آپ میرے سر ہی ہیں۔ مجھے ایسا کہنے سے مت روکیں...... پلیز سر!''

''او کے......!'' منصب علی نے مختصر جواب دیا۔

الوداعیہ کلمات کے بعد ان کے بیچ سیلولر رابطہ موقوف ہو گیا۔ منصب علی نے ایک گہری سانس خارج کی اور اپنے نئے پروجیکٹ کی حکمتِ عملی ترتیب دینے میں مصروف ہو گیا۔ وہ مہینے میں ایک آدھ ایسا مشن ضرور انجام دیا کرتا تھا۔ ایسے چھوٹے بڑے کام اس کی روحانی تسکین کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتے تھے۔

☆☆☆

وہ بے اولاد جوڑا اس وقت اپنی زندگی کے مشکل ترین لمحات سے گزر رہا تھا۔ ان دونوں کی سوچ ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہو سکتی تھی مگر ان کے ذہن میں ایک ہی سوال کسی زہریلے ناگ کے مانند پھن پھیلائے کھڑا تھا۔ وہ سوال تھا...... اب کیا ہوگا؟

اس سوال کا جواب ان کے پاس نہیں تھا۔ وہ جہاں تک بھی اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑاتے، یہاں سے وہاں تک تباہی، بربادی، ذلت اور رسوائی ہی دکھائی دیتی تھی۔ آج اس سال کا آخری دن تھا یعنی اکتیس دسمبر۔ کل صبح یکم جنوری کا سورج طلوع ہونے سے پہلے کرائے کا وہ گھر خالی کرنا تھا۔ دو روز قبل مالک مکان انہیں آخری وارننگ دے گیا تھا۔

''میں نے آپ دونوں کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے حد سے زیادہ چھوٹ دے دی ہے۔'' مکان مالک نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اس سے زیادہ افورڈ نہیں کر سکتا۔ پچھلے چند ماہ سے آپ لوگوں نے مجھے کرایہ بھی ادا نہیں کیا۔ میں جب بھی کرائے کا تقاضا کرتا ہوں، آپ کہتے ہو، بس ایک ماہ اور صبر کر لوں۔ میرے صبر اور برداشت کی انتہا ہو چکی ہے۔ بس، اب اور نہیں......!''

مکان مالک کے بگڑے تیور دیکھ کر عبدالکریم نے کہا۔ ''آپ ہمیں آخری موقع دے دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جنوری کے اختتام سے پہلے میں آپ کے تمام واجبات ادا کر دوں اور اگر ایسا نہیں کر پایا تو میں آپ کا مکان خالی کر دوں گا۔ آپ چڑھا ہوا کرایہ ایڈوانس والی رقم سے کاٹ لیجیے گا۔''

''اس قسم کے وعدے تو آپ ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں کرتے ہیں مگر آج تک آپ کا کوئی بھی وعدہ پورا نہیں ہوا۔'' مکان مالک نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور آپ کون سے ایڈوانس کی بات کر رہے ہیں؟ اگر میں آپ پر چڑھے ہوئے کرائے اور دسمبر کے بجلی، گیس، پانی کے بلز کو اس رقم میں سے کاٹوں گا تو باقی کچھ نہیں بچے گا۔ اس بات کے امکانات زیادہ قوی ہیں کہ آپ کو اپنے ہاتھ ہی سے مجھے مزید رقم دینا پڑے گی۔''

''صرف ایک ماہ ہی کی بات ہے......'' صفورا بیگم نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ ''ہم آپ کی ایک ایک پائی ادا کر دیں گے۔''

''اگر یہ کوئی نئی اور قابلِ ہضم کہانی ہوتی تو میں ضرور آپ کی بات پر یقین کر کے ایک ماہ کی مزید مہلت دے دیتا۔'' مکان مالک نے صفورا بیگم کو گھورتے ہوئے بدلحاظی سے کہا۔ ''یہ قصے کہانیاں سن سن کر میرا دماغ خراب ہو چکا ہے۔ آپ لوگوں نے ہر حال میں میرا مکان خالی کرنا ہے اور وہ بھی یکم جنوری کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ورنہ......'' اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر ان بے رحم الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''ورنہ میں یکم جنوری کی دوپہر کسی بھی وقت چند مزدوروں کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آؤں گا اور محلے والوں کے سامنے، آپ لوگوں کا سامان گھر سے باہر پھنکوا کر اپنے مکان پر تالا ڈال جاؤں گا۔''

عبدالکریم اور صفورا بیگم منت سماجت کرتے رہ گئے مگر اس شقی القلب اور بے رحم شخص نے ان کی ایک نہ سنی اور پاؤں پٹخ کر وہ غصیلے انداز میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔

عبدالکریم اور اس کی بیوی صفورا مکان مالک کے جاتے ہی سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور اس مسئلے کو حل کرنے کی تدابیر پر غور و فکر کرنے لگے۔

مگر بے بسی، لاچاری اور رسوائی کے خوف نے انہیں آنسو بہانے پر مجبور کر دیا تھا۔ جیسے جیسے یہ سال اپنے اختتام کی جانب سرک رہا تھا، ان کی سانسیں گھٹ رہی تھیں اور دل بیٹھے جا رہے تھے اور آج اس سال کی آخری تاریخ تھی...... اکتیس دسمبر!

کل نئے سال کا آغاز ہونے والا تھا۔ یہ سال کس، کس کے لیے کون، کون سی خوشی اور کامیابی لانے والا تھا، اس کا انہیں اندازہ تھا اور نہ ہی احساس۔ وہ تو اپنے کل میں ہر طرف ناامیدی اور مایوسی کا گہرا اندھیرا ہی دیکھ رہے تھے جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ کثیف، دبیز اور مہیب ہوتا چلا

جا رہا تھا۔

☆☆☆

اکتیس دسمبر کا سورج قریب الغروب تھا اور منصب علی اپنے مشن کی تکمیل کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ جب وہ پولیس ڈپارٹمنٹ کے اندر تھا تو ہر خاص مشن پر اس کے ساتھ محکمے کے چند دوسرے لوگ بھی ہوا کرتے تھے مگر اب وہ ایسے ہر ''کام'' کو اپنے انداز میں تنِ تنہا ہی انجام دیا کرتا تھا۔ اگرچہ جھوٹے کیس بنا کر اسے وقت سے پہلے جبری معزول کر دیا گیا تھا لیکن کچھ عرصے تک بے پناہ ''ذہنی اور جذباتی'' دباؤ میں رہنے کے بعد اس نے اپنے طور پر دوبارہ اس ''کام'' کو آگے بڑھانے کا آغاز کر دیا تھا۔

دنیا دکھاوے کے لیے اس نے مرکزی قبرستان کے نزدیک ایک فلورل شاپ کھول رکھی تھی۔ اسی قبرستان میں اس کے بیوی بچے بھی دفن تھے جو اس کی فرض شناسی اور بہادری کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ اس نے ایک ایسے غلیظ اور بااختیار مجرم پر ہاتھ ڈال دیا تھا جسے ایک طاقتور سیاسی شخصیت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ مذکورہ سیاسی شخصیت کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اپنی جیب میں لیے پھرتا ہے اور منصب علی کے معاملے میں اس نے ایسا کر کے بھی دکھا دیا تھا......

جب وہ خود پر بنائے گئے جھوٹے مقدمات کی سزا کاٹ رہا تھا تو ایک رات اچانک اس کے گھر میں آگ لگ گئی اور اس کے بیوی بچے حالات نیند ہی میں لقمۂ اجل بن گئے۔ پولیس کی تحقیق اور تفتیش کے مطابق، اس آتشزدگی کے واقعے کو ''شارٹ سرکٹ'' کے کھاتے میں ڈال کر اس کیس کی فائل کو داخلِ دفتر کر دیا گیا تھا لیکن منصب علی جانتا تھا کہ وہ شارٹ سرکٹ کا معاملہ نہیں بلکہ قتل و غارت گری کی ایک سوچی سمجھی سازش تھی جس کے پیچھے اسی بااثر سیاسی شخصیت کا ہاتھ تھا جو اس کی ایمان داری اور قانون پسندی کا ازلی ابدی دشمن بن گیا تھا۔

وہ اپنی سزا کاٹ کر رہا ہوا تو اس کی زندگی میں کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا، سوائے اپنی جان کے اور اس نے اپنی اس اکلوتی جان کو مظلوموں اور بے گناہوں کی دست گیری کے لیے وقف کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ وہ ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت کر آیا تھا للہٰذا انصاف کی اہمیت کو وہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ ڈپارٹمنٹ کے اندر ملک ارشاد جیسے چند لوگ اب بھی اس کی بے پناہ عزت کرتے تھے اور ضرورت پڑنے پر وہ ہر قسم کی مدد کے لیے بھی تیار رہتے تھے۔

ملک ارشاد نے گزشتہ روز ہی میڈم نرگس اور اس کے بناوٹی شوہر نفیس علی کے حوالے سے اہم معلومات اسے فراہم کر دی تھیں اور وہ انہی معلومات کی روشنی میں، اپنے منصوبے کے ساتھ رواں دواں تھا۔

موسمِ سرما نے اس کی شناخت کو پوشیدہ رکھنے کا کام حد درجہ آسان بنا دیا تھا۔ اس نے حلیے کی مناسب تبدیلی کے ساتھ ہی گرم لباس کے اوپر ایک بھاری بھرکم اوورکوٹ بھی پہن رکھا تھا جس کی سائڈ پاکٹ میں سائیلنسر لگی ایک لوڈڈ گن بھی موجود تھی۔ آنکھوں پر اس نے سیاہ چشمہ لگا لیا تھا۔ اب دور و نزدیک سے دیکھنے والا کوئی بھی شخص اسے منصب علی کی حیثیت سے پہچان نہیں سکتا تھا۔ اس کی منزل ایک لگژری اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی جس کے ایک اپارٹمنٹ میں اس کے مطلوبہ نقلی میاں بیوی، دنیا والوں کی نگاہوں سے چھپے بیٹھے تھے۔

اس نے اپارٹمنٹ کے دروازے کے سامنے پہنچ کر گھنٹی بجائی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اندر سے نسوانی آواز میں استفسار کیا گیا۔

''کون؟''

''میڈم! کوریئر سروس!'' منصب نے ایک ریڈی میڈ جواب دیا۔ ''دبئی سے کسی نے آپ لوگوں کے لیے کوئی نہایت ہی قیمتی چیز بھیجی ہے۔ میں اس خاص ڈیلیوری کو بلڈنگ کے ریسپشن پر نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ میری مجبوری کو سمجھ سکتی ہیں۔ اوپر سے ہم پر بہت سختی ہے چنانچہ بیش قیمت اشیا کی ڈیلیوری متعلقہ فرد ہی کو کی جاتی ہے۔''

منصب نے اپنی اس چال میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے ایک چھوٹا سا پارسل بھی اپنے ساتھ رکھ لیا تھا جو اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔

منصب کی ترکیب کامیاب رہی۔ ''دبئی'' اور ''قیمتی چیز'' کا ذکر سنتے ہی نرگس نے دروازہ کھول دیا اور اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''وہ بیش قیمت کوریئر میرے نام پر بھیجا گیا ہے یا نفیس کے نام پر؟''

''منصب کو یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی مشکل پیش نہیں آئی کہ ان دونوں کے لیے دبئی سے کچھ خاص آنے والا تھا ورنہ نرگس کے استفسار میں اس قدر بے قراری نہ پائی جاتی۔

اس سے قبل نرگس نے منصب کو کبھی نہیں دیکھا تھا مگر منصب نے ادھر کا رخ کرنے سے پہلے اپنا ہوم ورک اچھے سے کیا ہوا تھا۔ اگرچہ نرگس سے یہ اس کی پہلی ملاقات تھی لیکن اس نے فوٹوگرافس کے ذریعے ان دونوں نوسربازوں

کی صورتوں کو اپنی یادداشت میں محفوظ کر رکھا تھا۔
''کسی حامد خان نے دبئی سے......'' منصب نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پارسل پر نگاہ ڈالتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ ''مسٹر غلیظ کے لیے کوئی یادگار تحفہ بھیجا ہے۔''
''مسٹر غلیظ......'' نرگس نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔ ''یہ کس قسم کا نام ہے؟''
''جب انسان الٹے کاموں میں پڑ جائے تو اس کا نام بھی دائنداار ہو کر الٹ جاتا ہے جیسا کہ نفیس کا غلیظ ہو جاتا۔'' منصب نے پھرتی سے اوورکوٹ کی جیب سے سائیلنسر لگی گن نکال لی اور نرگس کو نشانے پر رکھتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اندر چلو۔ مجھے تم دونوں سے کچھ حساب کرنا ہے۔''
منصب کے ہاتھ میں گن دیکھ کر نرگس کی گویا جان ہی نکل گئی تھی۔ اس نے کوئی مزاحمت کی اور نہ ہی کسی قسم کا تردد۔ بڑا انسان موت سے بہت خائف ہوتا ہے، اسے مرنے سے ڈر لگتا ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے اسی لیے موت کو سامنے دیکھ کر وہ بلاچون وچرا، مدِمقابل کی ہر بات تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔
نرگس نے کسی روبوٹ کے مانند منصب کے حکم کی تعمیل کی اور ''ہینڈز اَپ'' رہتے ہوئے وہ اسے اپارٹمنٹ کے اندر لے گئی۔

☆☆☆

رات مخصوص رفتار سے اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے گیارہ کا ہندسہ عبور کر چکی تھی۔ ایک گھنٹے بعد اکتیس دسمبر...... یکم جنوری میں بدل جاتی۔ اس کے ساتھ ہی نئے سال کا آغاز ہو جاتا۔ وہ نیا سال جو عبدالکریم اور صفورا بیگم کی زندگیوں میں تاریکی بھر دیتا۔ کل کا سورج طلوع ہوتے ہی ان کی عزت اور حمیت کی شام ہو جاتی۔ پورے محلے کے سامنے ان کی غیرت اور شرم نیلام ہونے جارہی تھی اور اس سے پہلے ہی وہ دونوں اپنے اندر اور ایک دوسرے کی نظروں میں مرے جارہے تھے۔
''کریم! کاش تم نے میری بات مان لی ہوتی......''
صفورا نے ایک افسردہ سانس خارج کرتے ہوئے درد بھرے لہجے میں کہا۔ ''مگر تمہارے لالچ نے ہمیں ڈبو دیا۔''
''مجھے الزام مت دو صفورا۔ میں لالچی انسان نہیں ہوں۔'' کریم نے شاکی نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ ''ہمارے پاس جتنی رقم تھی، اس میں ذاتی گھر خریدنا ممکن نہیں تھا۔''
''اتنے پیسوں میں مضافات میں کوئی چھوٹا موٹا پلاٹ تو خریدا جا سکتا تھا۔'' صفورا نے ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔ ''پھر جب بھی توفیق ہوتی تو ہم اس پلاٹ پر مکان بھی بنا لیتے۔ کرائے کے مکانوں سے تو جان چھوٹ جاتی۔ دیکھ لو، اِس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں۔ کل وہ مکان مالک یہاں آئے گا اور سب کے سامنے ہماری عزت کا جنازہ نکال دے گا۔''
''کچھ باتیں کہنے میں بہت آسان لگتی ہیں مگر انہیں عملی قالب میں ڈھالنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔'' عبدالکریم نے گھائل لہجے میں کہا۔ ''اگر ہم دس لاکھ میں، کسی دور دراز علاقے میں کوئی پلاٹ خرید بھی لیتے تو اس کی حفاظت کون کرتا۔ آج کل تو بنے بنائے گھروں پر قبضہ ہو جاتا ہے۔ میں نے سنا ہے بعض مضافاتی رہائشی اسکیمز تو گورنمنٹ کے نقشے ہی میں نہیں ہیں اور اکثر پلاٹوں کی ایک سے زیادہ فائلیں بنی ہوئی ہیں۔ یہاں پر تو ''جس کی لاٹھی

معجزہ

ایک نرس کو اس کے منگیتر نے خط لکھا۔
''کاش مجھے کوئی حادثہ ہو جائے اور میں تمہارے وارڈ میں آ کر رہوں اور تم میری دیکھ بھال کرو۔''
نرس: ''پھر تو تمہیں میرے پاس حادثہ نہیں کوئی معجزہ ہی لا سکتا ہے کیونکہ میری ڈیوٹی delivery وارڈ میں ہوتی ہے۔''

☆☆☆

بیوی کا schedule

ہفتے......کو شاپنگ پر چلیں گے۔
اتوار......کو امی کے گھر جائیں گے۔
پیر......کو پارلر چلیں گے۔
منگل......کو ہوٹل ڈنر کرنے جائیں گے۔
بدھ......کو فلم دیکھنے جائیں گے۔
جمعرات......کو سیر کے لیے جائیں گے۔
شوہر......ٹھیک ہے اور۔
جمعہ......کو مسجد جائیں گے۔
بیوی......کیوں۔
شوہر......بھیک مانگنے۔

ملتان سے محمد جنید کا بیمانہ نمبر

اس کی بھینس" والا غنڈا راج ہے۔ ایسے میں مجھے جو ٹھیک لگا، وہ میں نے کر دیا۔ ہماری قسمت ہی خراب ہے تو پھر کیا کریں......" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے مزید کہا۔

"وہ انویسٹ منٹ کمپنی بہت پرُکشش منافع دے رہی تھی۔ پانچ فیصد ماہانہ اچھی خاصی رقم ہوتی ہے یعنی ایک لاکھ کی سرمایہ کاری پر پانچ ہزار کا منافع۔ اسی لیے میں نے اس کمپنی میں دس لاکھ لگا دیے۔ تم جانتی ہو، انہوں نے ہمیں پہلے ہی ماہ ہماری رقم پر پچاس ہزار کا منافع بھی دیا تھا۔"

"اور اس کے بعد وہ لوگ اس طرح غائب ہو گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ......!" صفورا نے کڑوے لہجے میں کہا۔ "ان کمینوں نے ہماری ہی لگائی ہوئی رقم میں سے پچاس ہزار ہمیں دیے۔ اس کے بعد سب ختم۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو صفورا......" عبدالکریم نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ "وہ دونوں اول درجے کے کمینے اور بدذات تھے۔ ہمارے علاوہ بھی وہ درجنوں لوگوں کے پیسے کھا کر غائب ہو گئے ہیں۔"

اِدھر عبدالکریم کی بات ختم ہوئی، اُدھر دروازے پر خاصی دبنگ دستک سنائی دی۔ دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ بے ساختہ صفورا کے منہ سے نکلا۔

"اس شیطان نے تو کل دن میں آنے کے لیے کہا تھا پھر ابھی منہ اٹھا کر آدھی رات کو کیوں چلا آیا......؟"

"یہ مکان مالک نہیں ہو سکتا......" عبدالکریم نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں جا کر دیکھتا ہوں......شاید کوئی ہمارا پڑوسی ہو۔"

محلے کے اندر اور آس پاس کے علاقوں میں اب آتش بازی اور ہوائی فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ ہر طرف سے چھوٹے بڑے دھماکوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگ جوش وخروش سے نئے سال کا استقبال کر رہے تھے۔ اکتیس دسمبر نے بالآخر کیم جنوری کا جبہ پہن لیا تھا۔ وہ آدھی رات کا وقت تھا لیکن فضا میں پھیلی ہوئی روشنی نے اسے نصف النہار کا روپ دے دیا تھا۔

عبدالکریم دروازے سے واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا۔ صفورا نے پرُاشتیاق لہجے میں استفسار کیا۔

"یہ کون دے کر گیا ہے اور......اور اس کے اندر کیا ہے......؟"

"میں اس پیکٹ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا صفورا۔" عبدالکریم نے اُلجھن زدہ لہجے میں جواب دیا۔ "جب میں نے دروازہ کھولا تو وہاں کوئی بندہ بشر موجود نہیں تھا اور...... یہ پیکٹ ہماری دہلیز پر پڑا ہوا تھا۔ پتا نہیں، دستک دینے والا کہاں غائب ہو گیا ہے۔"

"تم دروازہ بجانے والے کے بارے میں سوچ کر اپنا دماغ خراب نہ کرو۔" صفورا نے اضطراری لہجے میں کہا۔ "اس پیکٹ کو کھول کر دیکھو۔ معلوم تو ہو، اس کے اندر کیا ہے؟"

"اگر اندر سے کوئی بم وم نکل آیا تو......" کریم نے تشویش بھری نظر سے اپنی بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ بم پھٹ گیا تو سمجھ لو، ہم دونوں کے پرخچے اُڑ جائیں گے۔"

"تو پہلے کون سا زندہ ہیں ہم۔" صفورا عجیب سے لہجے میں بولی۔ "پہلے اس انویسٹ منٹ کمپنی نے ہمیں معاشی موت کے حوالے کر دیا اور اب یہ مردود مکان مالک کل ہمارا جنازہ پڑھانے آ رہا ہے۔ ہمارے تو چاروں طرف موت کا پہرا ہے، پھر اس پیکٹ سے ڈرنا کیسا؟"

بیوی کی بات عبدالکریم کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ اثبات میں گردن ہلانے کے بعد مذکورہ پیکٹ کھولنے میں مصروف ہو گیا۔

پیکٹ کے اندر سے جو کچھ برآمد ہوا، اس نے ان دونوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ وہ بے یقینی سے پھٹی ہوئی آنکھوں کے ساتھ پیکٹ سے ملی برآمدات کو تکنے لگے۔ فرطِ جذبات نے ان کی سوچ کو مقفل اور گویائی کو سلب کر لیا تھا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے دو چیزیں تھیں۔ نمبر ایک، دس لاکھ روپے کے استعمال شدہ کرنسی نوٹ۔ نمبر دو، ایک یک صفحی کارڈ جس پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ "ہیپی نیو ایئر......!"

ان دونوں کے کرائے کے مکان سے چند کلومیٹرز دور منصب علی اپنی شبینہ ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ سورج طلوع ہونے سے پہلے اس نے ابھی کئی لوگوں کو اسی طرح وش کرنا تھا۔ وہ سب عبدالکریم اور صفورا کی طرح میڈم نرگس اور نفیس علی کی کمپنی کے ڈسے ہوئے تھے لیکن شام میں منصب نے ان دونوں فراڈ نقلی میاں بیوی سے ممکنہ حد تک ریکوری کر لی تھی۔ گویا، اس کا مشن پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا تھا۔

بس، ایک کام اور بھی تھا۔ اس نے سورج کی پہلی کرن کے ساتھ، ڈھیروں پھول اٹھائے اپنے بیوی بچوں کی قبروں پر جانا تھا اور انہیں نئے سال کی مبارک باد دیتے ہوئے بہ آواز بلند کہنا تھا۔

"ہیپی نیو ایئر......!"

❖❖❖

نجاتِ شب

غلام قادر

ماحول اور معاشرت کے اثرات انسان کی زندگی پر ضرور پڑتے ہیں... جو اس کے اندازِ زیست کو یکسر مختلف بنا دیتے ہیں... وہ بھی ایک خاص قسم کے ماحول... مختلف زندگی اور ایک اور انداز کے معاشرے کی پروردہ تھی... اس میں اس سوچ اور اس قسم کی باتوں کا گزر ہی نہیں تھا... جہاں مشرق اور مشرقیت مسندِ نشیں ہوتے ہیں...

زندگی کے لمحوں کو جل تھل کر دینے والی

باغی حسینہ کی خوش گمانیاں

میں دفتر سے گھر پہنچا تو لان میں ہر جانب سالگرہ کے غبارے سجے ہوئے تھے۔ مہمان بھی آچکے تھے۔ میں نے انہیں دیکھا اور اپنی بیوی پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ جواب میں اس نے اس سے زیادہ ناراضگی کا اظہار کیا اور وہی کہا جو ہر اس موقع پر کہتی تھی۔ ”تمہیں امریکا آئے ہوئے سات برس ہو گئے مگر اب تک اس واقعے کو فراموش نہیں کر سکے ہو۔“

میں نے جیب سے ایک پیپر نکال کر اس کے حوالے کیا اور ساتھ ہی کہا۔ ”میں اگر بھولنا بھی چاہوں تو زمانہ مجھے بھولنے نہیں دیتا۔“

بیوی نے اس کو سنجیدگی سے پڑھا اور اُس کے چہرے پر تاسف کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔ ”یہ تو کورٹ آرڈر ہے۔ اس نے آپ کو اپنے بیٹے کے ساتھ پندرہ دن میں حاضر ہونے کے لیے کہا ہے۔“ اور ساتھ ہی بولی۔ ”تو آپ جا رہے ہیں؟“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اُس کے چہرے کے تاثرات کچھ کم ہو گئے اور اس نے کہا۔ ”لیکن یہ تو ہائی کورٹ کا حکم ہے۔“

میں ہنسنے لگا اور ہنستے ہوئے کہا۔ ”تم پاکستانی عدالتوں کو امریکی عدالتیں سمجھ رہی ہو؟“

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور سوال کیا۔ ”عدالتیں بہرحال عدالتیں ہوتی ہیں اور ان کے حکم کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے وکیل سے بات کر لی ہے اور اسے میڈیکل سرٹیفکیٹ بھی بھجوا دیا ہے۔“

اس نے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور سوالیہ انداز میں بولی۔ ”جعلی میڈیکل سرٹیفکیٹ؟“

میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

اس نے سوال کیا۔ ”یہ جعلی میڈیکل سرٹیفکیٹ تم نے بنوایا کہاں سے اور کس نے امریکا میں یہ بنا کر دیا؟“

میں نے کہا۔ ”تم کیا سمجھتی ہو کہ امریکا میں جعلی میڈیکل سرٹیفکیٹ نہیں بن سکتے؟“

اس نے کہا۔ ”میں ڈاکٹر ہوں اس کے باوجود میرے علم میں یہی بات ہے کہ امریکا میں جعلی میڈیکل سرٹیفکیٹ جاری کرنا بڑا جرم ہے۔“

میں نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور کہا۔ ”یہ پروپیگنڈا ہے بالکل اسی طرح کہ امریکا دنیا بھر میں جمہوری اداروں کو تحفظ دیتا ہے یا امریکا کہیں پر بھی انسانی حقوق کی کوئی بھی خلاف ورزی برداشت نہیں کرسکتا۔“

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر کہا۔ ”میں تمہاری ان دو باتوں کی مخالفت نہیں کر سکتی لیکن اب یہ بتاؤ کہ کیس کیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”میرے بیٹے کی ماں نے ہائی کورٹ میں درخواست دی ہے کہ اسے اپنے بیٹے سے ملوایا جائے جس کا باپ اسے برسوں پہلے امریکا لے کر فرار ہو گیا ہے اور اس نے وہاں دوسری شادی بھی کر لی ہے جس پر میرے وکیل نے دلائل دیے کہ ان کا بیٹا اب دس برس کا ہونے والا ہے اور وہاں کے اسکول میں زیرِ تعلیم ہے اور اچھے گریڈ لا رہا ہے۔“

اس نے ایک اور سوال کر دیا۔ ”کب سے چل رہا ہے یہ کیس؟“

میں نے کہا۔ ”دس ماہ تو ہو گئے ہیں۔“

اس پر وہ بولی۔ ”اور تم آج بتا رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”پہلے بتا دیتا تو تم پریشان ہونے کے سوا کیا کرسکتی تھیں؟“

اس نے کہا۔ ”اور کچھ نہیں تو میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوانے میں تمہاری مدد ہی کر سکتی تھی۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ابھی چند منٹ پہلے امریکا کے قوانین کے مطابق اسے جرم قرار دے رہی تھیں؟“

اس نے مسکرا کر ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے وہ میری تائید کر رہی ہو۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کچھ نہیں ہوگا۔ اگلی پیشی پر میرا وکیل عدالت میں وہ سرٹیفکیٹ پیش کرے گا اور معاملہ ختم۔“ بیوی کے چہرے پر اطمینان آ گیا پھر کچھ دیر بعد وہ بولی۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو لیکن ایک بات میں تمہیں اچھی طرح بتانا چاہ رہی ہوں کہ شایان کو میں نے جنم نہیں دیا لیکن مجھے وہ اولاد کی طرح سے عزیز ہے اتنا زیادہ کہ میری اپنی کوئی اولاد ہوتی تو شاید شایان سے زیادہ عزیز نہ ہوتی۔“ اور میں خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔

میں فیروز ملک ہوں اور کراچی کا رہنے والا۔ تقسیم ہند کے بعد والد صاحب دہلی سے کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ تقسیم سے پہلے والد صاحب سلطنتِ برطانیہ کے ملازم تھے اسی لیے ان کی اور ان کے گھر والوں کی جانیں بچ پائی تھیں۔ کراچی آنے کے بعد انہیں جیکب لائنز میں جی ٹائپ کوارٹر میں جگہ مل پائی تھی... اور ہم والد صاحب کے ریٹائرمنٹ تک وہیں رہے۔ محلے کے اکثر بچے سرکاری اسکول جاتے تھے جن میں میری بہن بھی شامل تھی، وہاں انگریزی زبان کی تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی اسی لیے ابا نے مجھے سینٹ پیٹرک اسکول میں داخل کیا تھا جہاں پہلی جماعت سے انگریزی کی تعلیم تھی۔ ابا اپنے دفتر سے واپسی کے بعد ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ ابا کی ہر وقت یہ گردان ہوتی تھی کہ ”دیکھو ہمارے پاس نہ زمین ہے نہ کوئی جائیداد اگر تمہیں زندگی میں ترقی کرنی ہے تو اپنی تمام تر توجہ تعلیم پر دینی ہے اور ہم بہن بھائی نے ان کی یہ تعلیمات ہمیشہ یاد رکھیں اور تعلیم کی طرف پوری توجہ مرکوز رکھی۔

اسکول میں ہم دونوں ہی اچھے گریڈ میں پاس ہوتے رہے تھے۔ ہر بار ابا سالانہ امتحان میں اچھے نمبر لانے پر کوئی نہ کوئی تحفہ دیتے تھے۔ میٹرک کے بعد ہم بہن بھائی نے کالج میں داخلے لیے اور وہاں بھی ہم دونوں کے روزمرہ میں کوئی فرق نہیں آیا، میں اسکول کے زمانے میں ہی شام میں محلے کے لڑکوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے چلا جاتا تھا لیکن

بہن کی توجہ تعلیم کی جانب ہی رہی اور اس کی وجہ سے میٹرک میں اس کی بورڈ میں چوتھی پوزیشن آئی جبکہ میں نے فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ کالج میں آنے کے بعد میری توجہ کھیل کی جانب بڑھ گئی جبکہ بہن کے معمولات وہی رہے بلکہ اب زیادہ ہو گئے تھے۔ جب میں نے یہ محسوس کیا کہ ابا بہن کی جانب زیادہ توجہ دے رہے ہیں تو میں نے بھی تعلیم کی جانب توجہ دینی شروع کی لیکن دیر ہو چکی تھی انٹر کا رزلٹ آیا تو بہن نے اس بار بھی پوزیشن حاصل کی تھی اور میری فرسٹ ڈویژن تھی۔

ابتدا سے جب بھی کوئی مجھ سے سوال کرتا تو میرا اور بہن کا ایک ہی جواب ہوتا میں کہتا انجینئر بنوں گا اور بہن کہتی۔ ''میں ڈاکٹر بنوں گی۔'' بہن کی پوزیشن تھی اس لیے اسے آسانی سے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا جبکہ داخلہ میرا بھی انجینئرنگ کالج میں ہو گیا لیکن سول میں ہوا جس میں نوکری ملنا آسان نہیں تھا لیکن میرے علاوہ ابا بھی خوش تھے کہ میں انجینئر بن جاؤں گا۔ انجینئرنگ کالج میں مجھے برطانیہ کی ایک یونیورسٹی کے بارے میں معلوم ہوا جہاں اسکالرشپ بھی مل سکتی تھی۔ تھرڈ ایئر میں آنے تک مجھے اس یونیورسٹی کے بارے میں تمام معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ اس ضمن میں ہمارے ایک استاد کا بہت بڑا ہاتھ تھا جو اسی یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کر کے آئے تھے اور اب انجینئرنگ کی تعلیم دے رہے تھے۔ انہی کے تحریک دلانے پر میں یونیورسٹی کی جانب مائل ہوا تھا۔ انہوں نے کچھ ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ میری تمام تر توجہ اس یونیورسٹی کی جانب ہو گئی تھی۔ میں نے ابا سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا میری اتنی گنجائش نہیں ہے کہ تمہیں باہر تعلیم حاصل کرنے بھیجوں تو میں نے کہا۔ ''ابا وہ مجھے اسکالرشپ دیں گے'' تو ابا نے یہ کہہ کر بات بنا دی کہ ''دیکھیں گے۔''

ابا سے بات کرنے کے بعد میں نے اس یونیورسٹی کے بارے میں مزید جاننا شروع کر دیا اور ان سے خط و کتابت بھی جاری کر دی۔ ایک جانب میں برطانیہ جانے کی تیاری کر رہا تھا اور دوسری جانب میری بہن زینب نے کینیڈا کی میڈیکل یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویشن میں داخلے کی کوشش کر دی تھی۔ اسے پوری امید تھی کہ اسے داخلہ مل جائے گا کیونکہ میڈیکل میں اس کی دوسری پوزیشن تھی۔ اسی دوران ابا نے ریٹائرمنٹ لے لی۔ ہم دونوں اپنے اپنے طور پر اس امید پر تھے کہ ابا کو جو گریجویٹی کی رقم ملنی تھی اس میں سے وہ کچھ حصہ ہمیں بھی دیں گے لیکن ابا نے اس وقت ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا جب انہوں نے ہمیں پلاٹ کے کاغذات دکھائے اور ساتھ ہی کہا میں نے ٹھیکیدار سے بات کر لی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ اگر مجھے صحیح وقت پر رقم ملتی رہی تو یہ مکان اوپر نیچے وہ سال بھر میں مکمل کر دے گا۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ گریجویٹی میں سے اتنی رقم بچالی ہے کہ آپ کو وقت پر رقم مل جایا کرے گی۔ میرے گریجویشن میں ابھی سال بھر باقی تھا جب مجھے اس یونیورسٹی سے داخلہ اور اسکالرشپ کے کاغذات موصول ہو گئے اور میں کاغذات وصول کرتے ہی اگلے ہفتے لندن روانہ ہو گیا۔

لندن پہنچا تو میرے لیے ایسے ہی تھا جیسے ویرانے میں بہار آجائے۔ اس یونیورسٹی میں مختلف ممالک کی لڑکیاں تھیں، ان میں انڈین اور پاکستانی لڑکیاں بھی تھیں۔ انڈین لڑکیوں میں ممبئی سے آنے والی پریا کے ساتھ ایرانی لڑکی مہک بھی تھی۔ دونوں ہی خوب صورت تھیں جبکہ پریا ایسی تھی کہ پہلی ملاقات میں میرا سوال اس سے یہ تھا کہ ''تم کہاں یہ انجینئرنگ کے چکر میں آ گئیں تمہیں تو کوئی ماڈل ہونا چاہیے تھا جہاں سے تم انڈین فلم انڈسٹری میں آ جاتیں۔''

وہ مسکرا دی اور پھر کہا۔ ''تم پہلے لڑکے نہیں ہو جس نے مجھے یہ مشورہ دیا ہے۔'' اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''ہزاروں نہیں بلکہ سیکڑوں نے مجھ سے یہی بات کی ہے لیکن میرا ان کے لیے یہی جواب ہوتا ہے کہ میرے والد کی کنسٹرکشن کمپنی ہے اور میرا بچپن سے یہی ارادہ ہے کہ میں انجینئر بنوں گی۔''

ان بہت سی لڑکیوں میں لاہور سے آئی ہوئی سعدیہ بھی تھی۔ وہ میری کلاس فیلو بھی تھی۔ وہ خوب صورت تو نہیں تھی لیکن اس کے پاس دولت بہت تھی۔ لندن آمد سے قبل ہی اس نے دو کمروں کا فلیٹ لے لیا تھا اور وہیں اس کا قیام بھی تھا۔ لندن آنے کے اگلے ہی روز اس نے اپنی کار بھی لے لی تھی اور اب اسی میں یونیورسٹی آتی اور جاتی تھی۔ دو مہینے ایک کلاس میں پڑھنے کے باوجود نہ اس نے مجھے مخاطب کیا نہ میرا اس سے تعارف ہوا لیکن پہلی بار اس نے مجھے دعوت دی کہ ''اس کی فیملی پاکستان سے آئی ہوئی ہے اور اس کے فلیٹ میں مقیم ہے۔ میں نے اپنے چند یونیورسٹی فیلوز کو اپنے فلیٹ پر مدعو کیا ہے، تم آؤ گے تو مجھے خوشی ہو گی۔''

میں نے ایڈریس معلوم کرنا چاہا تو وہ مسکرا دی جس کے جواب میں کہنا پڑا کہ ''میں تو ہاسٹل میں رہتا ہوں اور تمہارے فلیٹ کا راستہ اتنی دور ہے کہ میں شاید نہ آسکوں۔''

سعدیہ نے کہا۔ "یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے ہاسٹل مجھے معلوم ہے اور میں تمہیں بہ آسانی وہاں سے لے سکتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اور واپسی کا کیا ہوگا؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "جب لوں گی تو واپس بھی چھوڑ دوں گی۔" اور میں نے آمادگی ظاہر کر دی جس پر وہ خوش ہوگئی اور جاتے ہوئے کہنے لگی۔ "کل پانچ بجے تیار رہنا ٹھیک پانچ بجے میں ہاسٹل پہنچ جاؤں گی۔" اور اپنی کار کی جانب چل دی۔

اگلے روز پانچ بجے کے بجائے وہ ساڑھے چار بجے پہنچ گئی اور ہاسٹل کے چوکیدار سے معلوم کر کے میرے کمرے تک آگئی جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا تو سامنے سعدیہ کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا اور میں نے بے اختیار کہا۔ "آپ نے تو پانچ بجے آنے کا کہا تھا۔"

سعدیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا آپ جناب لگا رکھی ہے مانا کہ ہم دونوں ایک زبان نہیں بولتے ہیں۔ تم اردو اسپیکنگ ہو اور میرا تعلق پنجابی خاندان سے ہے لیکن ہیں تو ہم ایک ملک سے ہی اور پھر عمر میں تم سے چھوٹی بھی ہوں ویسے بھی آپ کہنے میں ہونٹ ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور تم کہنے سے ہونٹ ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اس لیے تم مجھے تم کہہ کر مخاطب کرلو تو بہتر ہے۔" اس نے پوری تقریر کر ڈالی۔

میں مسکرا دیا اور کہا۔ "ایک ملک سے ہونا ہی میرے نزدیک سب سے بڑی بات ہے۔"

اس کے ساتھ ہی سعدیہ کمرے میں آگئی اور عجیب سے لہجے میں کہا۔ "کیا حالت بنا رکھی ہے کمرے کی کسی کنوارے کا کمرا دکھائی دے رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ کنوارے کا کمرا ہے تو اسے نظر بھی آنا چاہیے۔"

اس دوران میں سعدیہ نے کمرے میں صفائی کرنا شروع کر دی اور میں صرف "ارے..... ارے" کہتا رہ گیا۔ جھاڑو دینے کے بعد اس نے کتابیں سمیٹنی شروع کر دیں اور میرے بکھرے ہوئے کاغذات سمیٹے اور ساتھ ہی کہا۔ "میں نے آج تک اپنے گھر میں جھاڑو نہیں دی لیکن تمہارے کمرے میں یہ کام بھی کر دیا آج تک میں یہی سمجھتی رہی کہ وہ انڈین لڑکی تمہارے کمرے کی جھاڑ پونچھ کرتی رہی ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "وہ تو آج تک یہاں آئی ہی نہیں، وہ آتی تو صفائی وغیرہ بھی کر لیتی۔"

اس کے ساتھ ہی سعدیہ کے چہرے پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ آگئی اور اس نے کہا۔ "وہ انڈین لڑکی یہ کہتی پھر رہی ہے کہ تم نے اسے پرپوز کیا ہوا ہے۔"

میں غصے میں آگیا۔ "ٹھیک ہے۔ اس کا فیصلہ کل میں اُس وقت کروں گا جب تم بھی موجود ہوگی کہ میں نے کب اور کہاں اسے پرپوز کیا ہے۔"

سعدیہ نے تیزی سے کہا۔ "نہیں یہ نہ کرنا۔"

میں نے کہا۔ "ایک جانب تم اطلاع دے رہی ہو کہ وہ یہ کہتی ہے کہ میں نے اسے پرپوز کیا ہے اور پھر میں اس سے وضاحت مانگ رہا ہوں تو تم انکاری ہو۔"

میرا فقرہ جیسے ہی مکمل ہوا سعدیہ نے کہا۔ "تمہارے جو دل میں آئے ضرور کرو لیکن مجھے بیچ میں سے نکال دو ورنہ وہ یہ کہے گی کہ میں کٹنی ہوں۔"

اور میں ہنس پڑا اور کہا۔ "خود کو کٹنی کے الزام سے بچانے کے لیے تم یہ کہہ رہی ہو کہ میں جھوٹ بولنے کا الزام برداشت کرلوں۔"

سعدیہ نے فوری کہا۔ "چلو چھوڑو اِن باتوں کو اور چلنے کی تیاریاں شروع کر دو میں نے دعوت دی ہے تمام لوگوں کو آٹھ بجے کی۔"

اور میں اپنے کپڑے اٹھا کر واش روم کی جانب بڑھ گیا۔ واپس آیا تو اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "یہ شلوار قمیص کیوں پہن لیا؟"

میں نے کہا۔ "اس لیے کہ یہ ہمارا قومی لباس ہے اور میں وہاں پاکستانی نظر آنا چاہتا ہوں۔"

اس پر اُس نے مجھے گھورا اور کہا۔ "پاکستانی نظر آنے کے اور بہت سے مواقع مل جائیں گے بلکہ میں یہ کرتی ہوں کہ راستے میں اسٹور سے کوئی اچھا سا سوٹ لیتی ہوں اور تمہیں تحفہ پیش کروں گی اور تم اسی سوٹ میں ڈنر میں جاؤ گے۔" یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکلی اور میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ ہاسٹل کے باہر اس کی کار موجود تھی جس میں... ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے اس نے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھولا اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی۔ کار روانہ ہوئی اور ایک اسٹور کے باہر گاڑی رکی تو اس نے اترنے سے پہلے میرا پسندیدہ رنگ دریافت کیا اور مجھے ساتھ آنے کا کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ اس نے کہا۔ "اب میں اندازے سے تو کپڑے نہیں خرید سکتی۔" اور ہم آگے پیچھے اسٹور میں داخل ہوئے۔ اس

نے آگے بڑھ کر سیلز مین سے چپکے سے کچھ کہا اور سیلز مین میری جانب دیکھ کر آہستہ سے مسکرا دیا۔ سیلز مین کے وہاں سے جانے کے بعد میں نے سوال کیا۔

''تم نے اس سے کیا بات کی؟''

سعدیہ نے کہا۔ ''تمہارے بارے میں کچھ نہیں کہا۔''

اور بات اس پر ختم ہوئی کہ میں نے کہا۔ ''تم نہ بتاؤ میں کل آکر معلوم کرلوں گا۔''

وہ بولی۔ ''میں نے کہیں پڑھا ہے کہ شکی مردوں کی شادی زیادہ نہیں چلتی۔''

میں مسکرا دیا اور کہا۔ ''شادی ہوگی تو چلے گی نا۔''

وہ ہنسنے لگی اور کہا۔ ''یعنی تمہارا ارادہ نہیں ہے شادی کرنے کا۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ ویسے بھی شادی وغیرہ فیملی کے بڑوں کے کام ہیں۔''

وہ مسکرادی اور کہا۔ ''مشرقی ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ زندگی بھر کا ساتھی منتخب کرنے کے حق سے بھی خود کو محروم کرلو۔''

میرا جواب یہ تھا کہ ''کوئی ایسی لڑکی زندگی میں آئے گی تو ابا سے بات کرلوں گا۔''

اسی دوران سیلز مین کی واپسی ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ہینگر تھا جس میں گرے رنگ کا تھری پیس سوٹ موجود تھا۔ سعدیہ نے سیلز مین سے کہا۔ ''سوٹ تو لے آئے لیکن کی میچنگ کی ٹائی لانا یاد نہیں رہا۔''

سیلز مین نے کہا۔ ''ابھی لایا۔'' اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

سعدیہ نے سرگوشی کی۔ ''یہ آرام پسند لوگ ہیں پہلی بار میں سنتے ہی نہیں ہیں اور شاید اسی لیے زندگی کی دوڑ میں پیچھے ہیں۔''

اس پر میں نے کہا۔ ''پہلی بار میں سنتے نہیں ہیں لیکن اپنی غلطی کی سزا بھی خود ہی بھگتتے ہیں اور خود ہی اس کمی کو پورا کرتے ہیں۔''

اس پر سعدیہ بول پڑی۔ ''تمہارے اندر کی مڈل کلاس ذہنیت۔''

میں نے کہا۔ ''کیا تم مجھے مڈل کلاس ہونے کا طعنہ دے رہی ہو؟''

اس پر وہ مسکرائی اور کہا۔ ''اگر تم مڈل کلاس کے نہ ہوتے تو یوں اسکالرشپ نہ لیتے اور ہاسٹل میں نہ پڑے ہوتے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو میری قابلیت ہے کہ میں اسکالرشپ پر آیا ہوں۔''

اس نے ایک بڑی سی ہنسی میں بات اُڑانے کی کوشش کی۔ بل سعدیہ نے ہی دیا ورنہ تو میں اس اسٹور میں داخل ہونے کی ہمت نہ کرتا۔ میں چینج کر کے آیا تو سعدیہ کی آنکھوں میں میرے لیے تعریفی آثار نمودار ہوئے اور اس نے مجھے جلدی سے کار میں سوار ہو جانے کے لیے کہا اور پھر بولی۔ ''آٹھ بجنے والے ہیں۔ مہمان آچکے ہوں گے اور میزبان یہاں وقت ضائع کر رہی ہے۔''

میں کار میں سوار ہوا تو اس نے کار اسٹارٹ کردی اور آگے بڑھا دی جس کا اختتام اس لان پر ہوا جس میں وہ تقریب تھی۔ وہاں واقعی کافی مہمان آچکے تھے۔ سعدیہ کی فیملی مہمانوں کا استقبال کر رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ ہماری طرف بڑھے اور ناراضگی کا اظہار کرنے لگے کہ کہاں رہ گئی تھیں تو سعدیہ نے اپنے دیر سے آنے کا ملبا مجھ پر ڈال دیا کہ پہلے انہیں ہاسٹل سے لیا اور پھر انہوں نے اسٹور سے یہ سوٹ لیا اور پھر ہم یہاں آگئے۔

مدعوئین میں پریا بھی تھی جو مجھے دیکھتے ہی میرے پاس آئی اور تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''آج تو بہت اسمارٹ نظر آرہے ہو ورنہ تو وہی جینز اور قمیص میں یونیورسٹی آتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''میں تو کپڑوں کی وجہ سے اسمارٹ نظر آرہا ہوں مگر تم تو سدا بہار ہو چاہے کچھ بھی پہن لو خوب صورت نظر آتی ہو۔''

اس کے بعد سعدیہ نے اپنی فیملی کا تعارف مہمانوں سے کروایا اور پھر باری باری اپنے مہمانوں کا تعارف اپنی فیملی سے کروایا۔ پارٹی دیر تک چلی۔ پہلے ڈنر ہوا اور پھر کچھ موسیقی ہوئی۔ جن میں پریا بھی شامل تھی۔ پریا نے مشہور انڈین نغمہ سنایا کہ ''اگر تم مل جاؤ زمانہ چھوڑ دیں گے ہم'' اپنے نغمے کے اختتام پر اس نے کہا۔ ''مجھ سے فرمائش کرنے والوں میں ایک میرے یونیورسٹی فیلو بھی تھے اب میں ان سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ بھی کچھ سنائیں۔'' پھر مائیک میری جانب بڑھا دیا اور اس کے ساتھ ہی تالیاں بجنے لگیں — میں انکار نہ کرسکا اور میں نے مشہور پاکستانی گیت ''سونا نہ چاندی نہ کوئی محل تجھ کو میں دے سکوں گا'' اور بھرپور تالیوں میں گیت ختم کیا اور واپس اپنی نشست پر آگیا تو پریا نے کہا۔ ''آپ تو بہت اچھا گاتے ہیں، میں

امید نہیں کر رہی تھی کہ آپ کو موسیقی سے اس قدر لگاؤ ہے۔''
میں نے کہا۔ ''یہ سب ریڈیو کا کمال ہے کیونکہ وہاں کراچی میں ریڈیو سے ایک بزم طلبہ ہوا کرتا تھا، اس میں مجھے بھی سلیکٹ کیا گیا تھا اور وہاں کی صحبت نے مجھے بھی خراب کر دیا۔''
پریا نے کہا۔ ''خراب کر دیا کیا مطلب؟ اگر تم انڈیا میں ہوتے تو وہاں بے شمار پلیٹ فارمز ہیں تمہیں اور نکھار دیتے اور تم ایک مشہور گلوکار ہوتے۔''
میں مسکرا کر خاموش رہا تو سعدیہ کے بھائی نے کہا۔ ''اگر تم لاہور یا اسلام آباد میں ہوتے تو میں تمہیں اپنے گیسٹ ہاؤس میں گلوکار رکھ لیتا۔''
سعدیہ پہلے ہی بتا چکی تھی کہ اس کے بھائی کے لاہور اور اسلام آباد میں گیسٹ ہاؤس ہیں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سعدیہ سے کہا۔ ''دو بج رہے ہیں تم کو مجھے واپس چھوڑنے بھی جانا ہے۔''
سعدیہ کے والدہ اور بھائی نے اصرار کیا کہ یہیں رک جاتے تو میں نے کہا۔ ''صبح یونیورسٹی بھی جانا ہے اس لیے جانا تو ضروری ہے۔''
اگلے روز سعدیہ تو نہ آئی البتہ پریا یونیورسٹی مجھ سے پہلے آچکی تھی۔ اُس روز پریا تقریباً تمام وقت میرے ساتھ ہی رہی۔ ہم نے کھانا بھی ساتھ ہی کھایا جس کا بل پریا نے ہی دیا۔ اگلے روز سعدیہ یونیورسٹی آئی اور سیدھی میری جانب آئی اور آتے ہی اس نے پیغام دیا کہ بھائی یہ کہہ رہے تھے کہ ان کے دوست کا یہاں لندن میں ایک مشہور بار ہے وہ وہاں تمہیں جاب دلوا سکتے ہیں اس طرح تم اسکالرشپ کے محتاج نہیں رہو گے۔''
میں نے سوال کیا۔ ''بار کی نوکری مگر شراب تو میرے مذہب میں حرام ہے۔''
تو سعدیہ نے کہا۔ ''یہ بھول رہے ہو کہ ہم بھی مسلم ہیں اور جانتی ہوں کہ شراب پینا حرام ہے اور پلانا بھی حرام ہے لیکن بار میں کیشیئر کی نوکری کرنا حرام نہیں ہے اور وہ بھی صرف چار گھنٹے کی جاب جس میں تمہاری تعلیم کا حرج بھی نہیں ہوگا اور دس پونڈ فی گھنٹا یعنی روز کے چالیس پونڈ یعنی مہینے کے بارہ سو پونڈ جس میں تم تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے بعد کچھ رقم گھر بھی بھیج سکتے ہو جس سے انہیں بھی کچھ معاشی آسانیاں مل جائیں گی جو اَب صرف تمہارے والد کی پنشن پر گزر کر رہے ہیں۔''
مجھے اُس کی بات تو پسند آئی تھی لیکن ابا کو یہ بتانا ناممکن تھا کہ میں بار کی نوکری کر رہا ہوں کیونکہ ابا حرام اور حلال کے معاملے میں بہت سخت تھے پھر اسی شام سعدیہ مجھے لے کر اس جگہ پہنچی جہاں اس کا بھائی ہمارا منتظر تھا پھر وہ ہمیں لے کر بار کے مالک کے پاس پہنچا اور اگلے دس منٹ میں ہمارے معاملات طے ہو گئے۔ میں نے سوال کیا کہ ''یہ دس پونڈ فی گھنٹا کم نہیں ہے۔''
اس نے کہا۔ ''ورک پرمٹ ہوتا تو دس پونڈ پندرہ پونڈ میں تبدیل ہو جاتے۔ تمہیں یہ جاب دے کر میں خود بھی ایک جرم کر رہا ہوں اور اتنا تو میرا حق بنتا ہے کہ اسٹوڈنٹ ویزا والے کو نوکری دے کر میں اتنی رقم تو بچا لوں۔'' وہ یہودی تھا اور اس کا تعلق بیلجیم سے تھا۔
میں نے چلتے چلتے اس سے سوال کیا۔ ''کب سے آنا ہے جاب پر؟''
اس نے کہا۔ ''کب سے کیوں آج اور ابھی سے کیونکہ ہمارا کیشیئر آج سے چھٹی پر جا رہا ہے اور اگلے چار گھنٹوں میں تم اس سے کام سیکھ لینا۔''
وہ کیشیئر جو اَب میرا استاد بن رہا تھا، اس نے مجھے چار گھنٹوں میں وہ بھی سکھا دیا جو شاید نہیں سکھانا چاہیے تھا اور یہ کہہ کر بتایا کہ ''تم ہمارے مسلم بھائی ہو اور ان یہودیوں کو نقصان پہنچا کر ہمیں ثواب ہوتا ہے۔'' اس کا تعلق لبنان سے تھا اور چپکے سے اس نے یہ بھی بتا دیا کہ ''وہ حزب اللہ کا جہادی ہے لیکن یہ بات بار کے مالک کو نہیں معلوم اور نہ تم میرے جانے کے بعد بتاؤ گے۔''
چار گھنٹے کے بعد میں بار سے نکلا تو سعدیہ انتظار میں تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی اس کے بھائی رمیز نے اپنی بہن سے کہا۔ ''چلو اب مجھے ائرپورٹ پہنچا دو ایسا نہ ہو کہ میری فلائٹ نکل جائے۔''
تم کیب میں بھی جا سکتے ہو۔''
رمیز نے اس کے جواب میں مجھ سے کہا۔ ''تم دیکھ رہے ہو اس کی احسان فراموشی۔''
میں یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ ''یہ آپ بہن بھائی کا معاملہ ہے، میرا کچھ کہنا مناسب نہیں ہوگا۔''
اس پر رمیز مسکرا دیا اور اس نے ٹیکسی کو اشارہ کیا اور ائرپورٹ کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کے روانہ ہونے کے بعد بھی میں کار میں نہیں بیٹھا تو سعدیہ نے تیکھے انداز میں کہا۔ ''بیٹھتے کیوں نہیں؟''
میں نے کہا۔ ''یہاں سے ہاسٹل قریب ہے اور بس وہیں ہاسٹل کے باہر ڈراپ کر دے گی۔''

سعدیہ نے مزید تیکھے انداز میں کہا۔ ”جو کہہ رہی ہوں، وہ کرو اور اب یہ بات ذہن میں بٹھالو کہ جو میں کہوں گی تمہیں زندگی بھر وہی کرنا ہوگا۔“

میں نے سوال کیا کہ ”اس فقرے کا مطلب کیا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”نہ پریا تمہارے لیے یہ گیت گائے گی کہ ”اگر تم مل جاؤ زمانہ چھوڑ دیں گے ہم“ اور نہ تم اس کے لیے یا کسی کے لیے میرے علاوہ سونا نہ چاندی نہ کوئی محل تم کو میں دے سکوں گا گاؤ گے۔“

میں نے کہا۔ ”واضح کرو گی کہ اس کا مطلب کیا ہے؟“

وہ بولی۔ ”جو کچھ کہا ہے، اسے کافی سمجھو اور وضاحت چاہو گے تو کچھ دیر میں وہ بھی ہو جائے گی۔“ اس کے اس انداز سے میں بوکھلا گیا تھا میں نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے کار میں بیٹھ گیا کہ دیکھیں اب تقدیر کیا دکھاتی ہے۔ میرے کار میں بیٹھتے ہی سعدیہ نے کار اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی اور کار تیزی سے آگے بڑھتی رہی اور اختتام سعدیہ کے فلیٹ پر ہوا۔ میں خاموشی کے ساتھ اس کے پیچھے چلتا رہا اور ہمارے اس مختصر سے سفر کا خاتمہ لفٹ پر ہوا اور سعدیہ نے اس فلور کا بٹن دبا دیا جہاں سعدیہ کا فلیٹ تھا۔ فلیٹ پر پہنچنے کے بعد سعدیہ سے میں نے سوال کیا۔ ”آخر تم چاہتی کیا ہو؟ تمہارے ارادے کیا ہیں؟“

اس نے تیکھے انداز میں جواب دیا اور کہا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ زندگی بھر اب تم وہی کرو گے جو میں کہوں گی۔“

میں نے کہا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے؟“

اس نے کہا۔ ”ناممکن کو ممکن بنانا سعدیہ کے الٹے ہاتھ کا کھیل ہے۔“

میں نے ایک اور سوال کر دیا۔ ”یہی تو میں نے سوال کیا ہے کہ تمہارے ارادے کیا ہیں؟“

اس کا جواب تھا۔ ”ایک تو تم سوال بہت کرتے ہو جو ارادے ہیں، وہ کچھ دیر میں سامنے آجائیں گے۔“

لیکن میں فلیٹ کے دروازے پر ہی کھڑا رہا اور سعدیہ فلیٹ میں داخل ہوگئی اور اندر سے کہا۔ ”اب تمہارے لیے دعوت نامہ بھجواؤں کہ فلیٹ میں آجاؤ۔“

میں فلیٹ میں داخل ہوگیا۔ سعدیہ فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھ گئی تو میں اس کے سامنے کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے بغیر کچھ کہے فون کیا اور کہا۔ ”بھائی کہاں

پہنچے؟'' وہ کچھ دیر جواب کا انتظار کرتی رہی اور پھر کہا۔ ''بھائی میں بھی گھر پہنچ گئی ہوں۔'' پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''خیریت ہے بھائی تم بھی خیریت سے لاہور پہنچو تو فون کر دینا۔'' اس کے ساتھ ہی فون رکھتے ہوئے وہ میرے برابر آ کر بیٹھ گئی اور کہا۔ ''اس فلیٹ میں تم بھائی کے بعد داخل ہونے والے پہلے مرد ہو۔''

میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُسے گھور کر رہ گیا۔

سعدیہ نے ہی کچھ دیر کی خاموشی کو توڑا اور کہا۔ ''اب تمام وقت یہیں بیٹھے رہو گے یا بیڈ روم میں بھی چلو گے؟''

میں نے کہا۔ ''وہاں کیا کریں گے؟''

تو وہ ہنس پڑی اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میاں بیوی جب بیڈ روم میں جاتے ہیں تو کیا کرتے ہیں؟''

''میں نے سوال دہرایا۔ ''کیا کرتے ہیں؟''

سعدیہ نے کہا۔ ''تم چلتے ہو یا یونہی سوال کرتے رہو گے؟''

میں نے کہا۔ ''مگر ہم میاں بیوی تو نہیں ہیں۔''

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہیں نہیں تو بن جائیں گے۔''

میرے ذہن میں فوری طور پر ابا کا چہرہ آ گیا اور میں نے کہا۔ ''اس کے لیے تو ابا سے پوچھنا پڑے گا۔ ان کی رضامندی کے بغیر ہم اس رشتے کو قائم نہیں کر سکتے۔''

سعدیہ نے کہا۔ ''ان کی رضامندی بھی لے لیں گے اب اٹھتے ہو یا مزدور بلواؤں۔'' اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا اور مجھے تقریباً دھکیلتے ہوئے اس کمرے میں لے آئی جہاں ایک ڈبل بیڈ پڑا ہوا تھا اور مجھے بیڈ پر دھکا دیتے ہوئے کہا۔ ''اب یہاں تک آ گئے ہو تو باقی کام میں خود کروں یا تم کرو گے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ میرے برابر لیٹ گئی اور میں حیرانگی سے اسے دیکھتا رہا، اس کے بعد جو کچھ ہوا بیان کرنے کے قابل نہیں ہے۔ وہ مجھے ہدایات دیتی رہی اور میں ویسا ہی کرتا رہا جب ہوش آیا تو میں نہایت پشیمان تھا۔ وہ روئے جا رہی تھی اور ساتھ کہتی جا رہی تھی۔ ''یہ تم نے کیا کر دیا اب میں دنیا کو کیا منہ دکھاؤں گی؟''

میں نے حیرانگی سے سوال کیا۔ ''جو کچھ ہوا، وہ تم نے کیا، مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ سب کچھ ہوتا ہے۔''

سعدیہ نے رونا بند کیا اور سسکتے ہوئے کہا۔ ''جو کچھ ہوا اسے میں بھی بھول جاتی ہوں اور تم بھی کسی سے ذکر نہ کرنا۔''

میں اس پر خوش تھا کہ اس نے رونا بند کر دیا ہے لیکن اس فقرے کو کہنے سے نہیں روک سکا۔ ''تم کسی کو نہ بتانا میں تو کسی سے ذکر کر کے خود کو ذلیل نہیں کروں گا۔''

اس نے مسکراتے ہوئے میرے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''وعدہ۔''

میں نے اُس کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کہا۔ ''ہاں وعدہ۔'' لیکن وہ ہاتھ میں ہاتھ آنے کے بعد مزید قریب ہوگئی اور سینے سے لگ گئی۔

میں نے کچھ کہنا چاہا تو وہ مزید قریب آ گئی اور میرے کانوں میں سرگوشی کی۔ ''مزہ تو آیا؟''

میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میری ہلتی ہوئی گردن دیکھ کر اس نے سرگوشی کی۔ ''مجھے بھی آیا بلکہ میں دوبارہ وہ مزے لینا چاہتی ہوں۔''

چاہتا تو میں بھی تھا لیکن مری مری سی آواز میں کہا۔ ''یہ حرام ہے۔''

سعدیہ ہنس دی۔ ''پہلی بار حرام نہیں تھا تو دوسری بار حرام کیسے ہوگیا؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے دوبارہ سے وہ عمل شروع کر دیا جو کچھ دیر پہلے وہ کرتی رہی تھی اس بار میں بھی اس کے ساتھ تعاون کر رہا تھا۔ یہاں تک ہم دونوں اپنی اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ اس کے بعد ہم دونوں نے غسل کیا اور فلیٹ سے نکل آئے جہاں سے دوبارہ سے ہم اس کی کار میں سوار ہوئے اور اس نے مجھے ہاسٹل پر ڈراپ کر دیا اور وہاں سے روانہ ہوگئی لیکن جانے سے پہلے اس نے مجھے وعدہ یاد دلایا۔

اگلے روز ہماری ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی جہاں وہ کچھ دیر سے آئی اور آتے ہی میری جانب آئی اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں رات بھر تکلیف سے سو نہیں سکی تھی۔'' میں نے خاموشی اختیار کی حالانکہ میں سمجھ چکا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ ہمیں وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ پریا آ گئی۔ اس نے لنچ ساتھ کرنے کی آفر کی لیکن سعدیہ نے اس سے نظر بچا کر مجھے آنکھوں سے انکار کا اشارہ کیا اور میں نے کہا۔

''آج نہیں جا سکوں گا۔''

پریا نے کہا۔ ''آج کیا بات ہوگئی، کل تو تم نے میرے ساتھ ہی لنچ کیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''کل شام ہی مجھے پارٹ ٹائم جاب ملی ہے اور شام میں مجھے جاب پر جانا ہوگا۔''

پریا نے کہا۔ ''وہ تو شام میں جانا ہوگا میں تو ابھی لنچ کا کہہ رہی ہوں۔'' اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں میرے

انکار سے اداسی اترنے لگی تھی جس کا مجھے افسوس بھی ہوا لیکن جو کچھ کہہ چکا تھا، اسے واپس تو نہیں لیا جا سکتا تھا لیکن سعدیہ میری مدد کو یہ کہتے ہوئے آئی کہ ”صحیح تو کہہ رہی ہے پریا بلکہ میں اس شرط پر ساتھ چلوں گی کہ بل تم دونوں نہیں بلکہ میں دوں گی۔“ اور ہم تینوں لنچ کے لیے چل پڑے۔ راستے میں سعدیہ نے کہا۔ ”تم اس لیے پریشان ہو رہے تھے کہ جاب کے پہلے دن لیٹ نہیں ہو جاؤ لیکن یقین کرو کہ اس بار کا مالک میرے بھائی کا اچھا دوست ہے۔ جب وہ میرے کہنے پر تمہیں جاب دے سکتا ہے تو لیٹ آنے پر کچھ نہیں کہے گا اور دیر اس لیے نہیں ہوگی کہ میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔“

اس پر پریا نے سوال کیا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم جانتی ہو کہ اسے پارٹ ٹائم جاب کہاں ملی ہے؟“

سعدیہ نے کہا۔ ”میں کہہ رہی ہوں کہ میرے بھائی نے یہ جاب دلوائی ہے تو تم یہ سوال کیوں کر رہی ہو؟“

اس کے بعد پریا کچھ نہ بولی اور ہم لنچ کے بعد پھر یونیورسٹی ..... واپس آ گئے جہاں سے کچھ دیر بعد سعدیہ مجھے جاب پر چھوڑنے چل دی لیکن راستے میں اس نے مجھے اپنے موبائل پر وہ ویڈیو دکھائی جو ایک روز پہلے کی تھی یعنی دوسری بار کی ویڈیو تو میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”تم نے یہ ویڈیو کب اور کیوں بنائی؟“

اس نے کہا۔ ”میں نے نہیں بنائی بلکہ میرے فلیٹ میں کیمرا فکس ہے، اس نے بنائی ہے۔“

میں نے سوال کیا۔ ”تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“

وہ بولی۔ ”پہلے بتا دیتی تو یہ سب کچھ نہ ہوتا اور تمہارے سوال کے دوسرے حصے کا جواب یہ ہے کہ اب تم اپنا وعدہ یاد رکھو گے۔“

میں نے کہا یہ تو بلیک میلنگ ہے۔“

لیکن وہ جواب دیے بغیر خاموش رہی لیکن کچھ دیر خاموشی کے بعد کہا۔ ”تم کچھ بھی نام دو لیکن ہر شخص کو اپنے مفاد میں کام کرنے کا حق ہے۔“

دن گزرنے لگے۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے۔ میں اور سعدیہ اپنے اپنے امتحان پاس کرتے رہے اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جب ابا نے فون پر اطلاع دی کہ اگلے مہینے زینب کا نکاح ہے اور تمہاری موجودگی اس میں لازمی ہے۔

اس پر میں نے ابا سے کہا۔ ”کیا زینب آ گئی ہے؟“

انہوں نے بتایا۔ ”وہ ایک ہفتہ پہلے آئے گی۔“

میں نے دوسرا سوال کیا۔ ”ابا شادی میں تو بہت رقم کی ضرورت ہوتی ہے کہیں تو میں کچھ رقم بھجوا دوں؟“

انہوں نے کہا۔ ”بیٹے تمہاری ہر ماہ بھیجی ہوئی رقم پوری خرچ نہیں کی بلکہ اس میں سے کچھ رقم میں بینک میں رکھتا رہا ہوں۔ اس سے بڑی بات کہ لڑکے والے جہیز کے مخالف ہیں بلکہ انہوں نے کہہ دیا ہے کہ آپ تین کپڑوں میں اپنی بیٹی ہمیں دے دیں ہم اسے بہو نہیں بیٹی بنا کر رکھیں گے۔“

مجھے اس پر حیرت ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی شرافت کا یقین ہونے لگا مگر پھر بھی میں نے سوال کر دیا۔

”لڑکا کیا کرتا ہے؟“

ابا نے جواب میں کہا۔ ”وہ کینیڈا کا رہائشی ہے اور وہیں پڑھاتا ہے جہاں زینب پوسٹ گریجویشن کر رہی تھی۔ اس نے زینب سے شادی کی بات کی تو زینب نے جواب دیا کہ میرے مستقبل کا فیصلہ میرے ابا کریں گے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے بزرگ باقاعدہ طریقے سے بات کریں اور ان کا جو بھی فیصلہ ہوگا وہ مجھے منظور ہوگا اور آپ کو..... فیصلہ تسلیم کرنا ہوگا۔“

میں نے زینب کی شادی میں شرکت کے لیے پاکستان جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کی بھنک سعدیہ کو پڑ گئی اور اس نے بھی پاکستان جانے کی ضد شروع کر دی۔ میں نے انکار کیا تو اس نے ضد مزید تیز کر دی اور طنز بھی شامل کر دیا۔ میں نے کہا۔ ”تم پاکستان جا کر کیا کرو گی؟“

وہ بولی۔ ”بہن بھائی کی شادی ایک ساتھ ہو جائے تو خرچ آدھا ہو جائے گا اور شادیاں دو ہو جائیں گی۔“

میں نے کہا۔ ”اس کے لیے ابا کی منظوری بہت ضروری ہے۔“

اس نے کہا۔ ”اگر وہ نہ مانے تو؟“ اس نے کہا۔ ”اگر وہ نہ مانے تو میں انہیں اپنے موبائل میں محفوظ وہ ویڈیو دکھا دوں گی جو ہر ہفتہ کی رات کیمرے سے بنواتے رہے ہو۔“

جب وہ اپنی ضد پر اڑی رہی تو میں نے کہا۔ ”تم وہاں جا کر کرو گی کیا؟“

اس نے رونا شروع کر دیا۔ ”میں اکلوتی نند کی شادی میں شریک نہ ہوں یہ کیسے ممکن ہے؟“

اس نے جب دیکھا کہ میں کسی طرح رضامند نہیں

ہو رہا تو اس نے اپنے بھائی کو فون کر دیا۔ اس کے بھائی نے میری یہ دلیل مان لی کہ ''ابھی کیا کہہ کر اس کا تعارف کرواؤں گا، یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ابا یہ ہیں آپ کی بہو۔''

اس پر رمیز نے کہا۔ ''یہ تو کہہ سکتے ہو کہ یہ میری کلاس فیلو ہیں اور اب اپنے خرچے پر شادی میں شریک ہونے آئی ہیں۔'' اور اس نے بھی بھائی کی اس بات سے اختلاف نہیں کیا اور آہستہ آہستہ تمام معاملات طے ہو گئے اور اس نے اسی فلائٹ میں اپنا ٹکٹ بک کروا لیا جس سے میں کراچی جا رہا تھا۔

کراچی ائرپورٹ پر میرے گھر والے اور زینب کی سسرال کے لوگ موجود تھے اور وہ بھی تھے کہ جن کے یہاں سعدیہ کو قیام کرنا تھا ابا اور زینب نے اسے گلے لگا لیا اور ہم اپنے گھر روانہ ہوئے اور وہ اس مرسڈیز میں بیٹھی جو اس کے بھائی کے کسی دوست کی تھی اور اسے وہیں قیام کرنا تھا۔ وہ ٹیلی فون پر رابطے میں تھی اور میں اس سے ملنے بھی جاتا تھا۔ بھائی کے دوست کی بیوی مجھ پر کافی مہربان تھی اور میری اس سے باتیں بھی ہوتی تھیں پھر اس نے مجھے بتایا کہ اس کے بھائی منشیات اسمگلنگ کے کیس میں دو بار جیل جا چکے ہیں اور... چونک گیا اور میرے ذہن میں نبی پاکؐ کی وہ حدیث گونجی کہ بندہ اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔ میں نے اپنے طور پر کچھ تحقیقات کیں تو معلوم ہوا کہ وہ صرف دو بار نہیں بلکہ پانچ بار تھانوں کی سیر بھی کر کے آ چکے ہیں اور یہ سیر مختلف زمینوں پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں تھیں۔ حیرت انگیز طور پر اسے اپنے دوست کی بہن کے بڑھتے ہوئے تعلقات پر کوئی اعتراض نہیں تھا جبکہ پریا سے بات کرنے پر وہ معترض تھی بلکہ وہ ان تعلقات کو بڑھاوا دے رہی تھی۔ ایک بار تو اس نے یہ تک کہہ دیا کہ زرینہ سے شادی پر اسے کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ وہ اس پر خوش ہوگی کیونکہ تمہارا مستقبل اور زیادہ روشن ہو جائے گا کہ رمیز کے پاس آج جو کچھ بھی ہے وہ زرینہ کے بھائی کی مہربانی ہے اس لیے رمیز کو ابتدائی طور پر مالی مدد کی تھی جس سے رمیز یہاں تک پہنچا ہے۔

زینب کی رسم حنا کی رات ان دونوں نے اصرار کیا کہ وہ بھی اس میں جائیں گی جس پر میں نے ان سے کہا کہ یہ مختصر سی خاندانی تقریب ہے، اس میں تمہاری شرکت کا کوئی جواز نہیں ہے۔

زرینہ نے کہا۔ ''تم نے اس کا تعارف اپنی اس کلاس فیلو کے طور پر کروایا ہے جو لندن سے شادی میں شرکت کے لیے آئی ہے اور یہ مختصر سی تقریب کا بہانہ چھوڑو، میں بھائی سے کہہ کر کسی اچھے ہوٹل میں تقریب رکھوا دوں گی جس میں مشہور گلوکار بھی آئیں گے اور ہم اس میں خوب ہلا گلا کریں گے۔''

میں نے ابا سے علیحدگی میں بات کی تو انہوں نے کہا۔ ''اس میں تو بہت زیادہ خرچ ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''ابا خرچ کی آپ فکر نہ کریں، وہ سب میں کرلوں گا۔''

ابا یہ کہتے ہوئے تیار ہو گئے۔ ''تب کوئی بات نہیں ویسے بھی یہ غیر اخلاقی بات ہے کہ جو لڑکی اپنے کلاس فیلو کی بہن کی شادی کے لیے لندن سے آئی ہو، اسے ہم مدعو نہ کریں۔''

مہندی کی تقریب بہت زور و شور سے ہوئی اور رات گئے دیر تک جاری رہی جس میں ان دونوں نے خوب دھوم دھڑکا مچایا اور ایسے ایسے ڈانس کیے جو ہم تمام لوگ صرف اسکرین پر دیکھتے تھے۔ تقریب کے بعد ہم گھر پہنچے تو ابا کی ناراضگی اپنے عروج پر تھی۔ مجھے علیحدہ بلوا کر خوب ڈانٹ پلائی اور کہا۔ ''یہ تمہاری کلاس فیلوز نے اتنے بیہودہ ڈانس کیے۔'' میں خاموشی سے وہ سب کچھ سنتا رہا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ''اسد کے درمیان میں پڑنے سے بات ختم ہو گئی ورنہ اس کی والدہ وغیرہ رشتہ ختم کر رہے تھے۔'' اور میں شرمندہ ہو کر خاموش ہو رہا۔ ابا سے فرصت ملی تو زینب ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئی کہ ''یہ ہے تمہاری کلاس میٹ جو ڈانس کے دوران تم سے چپکی جا رہی تھی۔''

اس کی سسرال اور دادی کو اس پر شدید اعتراضات تھے۔ میں اس کے جواب میں کچھ نہ کہہ سکا لیکن جب میں ان دونوں سے ملاقات کے لیے گیا تو پہلا سوال یہی ہوا کہ ''کل کیسی تھی ہماری پرفارمنس؟''

میں نے وہ سب کچھ دہرا دیا جو ابا اور زینب سے سننا پڑا تھا۔ اس وقت رمیز بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے کہا۔ ''پرانے خیالات کے لوگ ہیں۔ آج تک گزشتہ صدی میں زندہ ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ ہماری روایات نہیں مغرب اور انڈین فلمیں دیکھ کر ہم اس کلچر کو نہیں اپنا سکتے، ہماری ایک تہذیب اور کلچر ہے۔''

باقی تو خاموش رہے لیکن رمیز خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے اپنی بہن سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا اس

ماحول میں دم گھٹ جائے گا۔ لیکن فکر نہ کرو ابھی تمہارا بھائی زندہ ہے، کسی نے میری بہن کی راہ میں آنے کی کوشش کی تو وہ زندہ نہیں رہے گا۔ میں اس پستول کی گولیاں اس کے سینے میں اتار دوں گا۔'' اس کے بعد بھی وہ نہ جانے کیا کیا بھونکتا رہا اور آخر میں پستول اپنی جیب میں رکھ کر چلا گیا۔

اگلے روز زینب اور اسد کا نکاح تھا۔ ابا نے مجھے صبح ناشتے پر کہہ دیا کہ آج تمہاری وہ کلاس فیلو نہ آسکے۔'' اور زینب نے اس کے ساتھ ہی کہا۔

''اگر وہ آئیں تو یہ رشتہ ختم بھی ہوسکتا ہے۔''

اس شام میں بھی اس ہال میں موجود نہیں تھا کیونکہ مجھے رمیز نے اغوا کروالیا تھا۔ اس نے پستول دکھا کر مجھے اس پر مجبور کیا کہ میں اس کی بہن سے کورٹ میرج کرلوں ورنہ وہ ویڈیو وائرل کرکے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔ میں یہ سوچ کر کہ میرے ساتھ ابا کی عزت خاک ہوجائے گی، اس پر تیار ہوگیا۔ ہمارے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ اگر میں نے اس کی بہن سے کورٹ میرج کرلی تو وہ ویڈیو وائرل نہیں کرے گی، اس کے ضامن زرینہ کے بھائی بنے اور اس کے بعد ہم کورٹ گئے جہاں پہلے سے تمام انتظامات اور وکیل موجود تھے۔ نکاح کے بعد میں نے اجازت چاہی تو وہ بولی تصاویر تو لے لیں تاکہ سند رہے اور کوئی پریشانی نہ ہو۔ تصاویر بننے کے بعد میں نے اجازت مانگی اور بمشکل تمام اس ہال تک پہنچا جہاں اسد اور زینب کا نکاح تھا۔

اس وقت مجھے کچھ امید ...... بندھی جب تصاویر کھینچتے ہوئے زرینہ میرے قریب آئی اور اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''یہ تو تمہارے ساتھ ظلم ہوگیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اس میں تمہارا بھائی بھی شریک ہے۔''

اس نے کہا۔ ''جس ظلم میں بھائی شریک تھا، بہن اس کی تلافی ضرور کرے گی۔''

میں خاموش ہوگیا۔ اس کے چوتھے روز میں نے ابا کو کچھ حقائق چھپاتے ہوئے سب کچھ بتادیا اور ابا نے اپنی بھرپور ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا۔ ''میں اسے مرتے دم تک بہو تسلیم نہیں کروں گا۔''

یہ شکر ہے زینب اور اسد نکاح کے تین روز بعد ہی کینیڈا روانہ ہوگئے تھے۔ ابا نے جب ہمیں گھر سے بے دخل کردیا تھا تو زرینہ کے بھائی نے ہمیں اپنے گھر چلنے کے لیے کہا اور ہمارا نیا جوڑا ان کے یہاں منتقل ہوگیا۔ انہوں نے اپنے گھر کی اوپری منزل ہمارے حوالے کردی تھی۔ سال بھر اسی طرح گزر گیا پھر دسمبر آگیا۔ وہ انتیس دسمبر تھی جب میری بیوی نے کہا اسے بہت درد ہورہا ہے اور زرینہ کے والد نے ہمیں فوری طور پر اسپتال جانے کا مشورہ دیا۔ دو دن ہم نے وہاں گزارے۔ وہ اکتیس دسمبر تھی جب اس کے درد بہت بڑھ گئے اور ڈاکٹر اسے لیبر روم کی طرف لے گئے اور پھر کچھ دیر بعد ہی مجھے خوش خبری ملی کہ میں ایک بیٹے کا باپ بن گیا ہوں۔ اسے اسپتال کے کمرے میں منتقل کیا گیا تو اس نے کہا۔ ''کل کا دن میری زندگی کا پہلا روز ہوگا ہم اپنے بیٹے کو لے کر آپ کے گھر جائیں گے اور مجھے یقین ہے کہ پوتے کی شکل دیکھ کر تمہارے ابا مان جائیں گے اور ویسے بھی کل کا دن سال کا پہلا دن ہوگا اور ہماری نئی زندگی کا بھی۔''

اُس رات ہر جانب نئے سال کی آمد کا جشن منایا جارہا تھا اور میں اور وہ اسپتال کے ایک کمرے میں بند تھے۔ پھر وہیں مجھے فون آیا کہ فوری طور پر گھر پہنچو آپ کے والد کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور انہیں اسپتال لے جایا گیا ہے۔ اسپتال کا نام وہی بتایا گیا جہاں ہم موجود تھے پھر کچھ دیر بعد ایک ایمبولینس آئی جس میں ابا موجود تھے لیکن ایک لاش کی صورت میں۔

ابا کو اس حالت میں دیکھ کر میں بے ہوش ہوگیا لیکن میری بیوی اور رمیز پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا جبکہ رمیز تو بالکل ہی نارمل حالت میں رہا۔ خود میری بیوی کی حالت میں بھی کوئی فرق نہیں پڑا اور وہ نارمل ہی رہی۔ صرف اتنا کہا کہ ''جو کچھ سوچ رہے تھے ایسا نہیں ہوا۔'' پھر اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''نہ جانے کیوں میری خوشیوں کو ..... نظر لگ جاتی ہے۔''

ہوش میں آنے کے بعد میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کینیڈا فون کیا اور زینب اور اسد کو اطلاع دی جس پر زینب نے کہا۔ ''ہم پرسوں تک پہنچ رہے ہیں۔'' میں نے اس سے وعدہ کیا کہ جب تک وہ نہیں پہنچیں گے، تدفین نہیں ہوگی۔ ادھر پولیس نے اپنی تحقیقات شروع کردیں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی ان کی کوئی مدد نہیں کررہی تھی اور نہ ہی چوکیدار کے بیان نے قاتل کی کوئی نشاندہی کی تھی۔ اس نے صرف اتنا بتایا کہ ایک بڑی گاڑی میں دو لوگ آئے تھے اور کچھ دیر بعد ڈرائنگ روم سے چیخنے چلّانے کی آوازیں آئیں۔ میں جب ان آوازوں کو سن کر..... گھر کے اندر پہنچا تو صاحب خون میں لت پت زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے صاحب کے کہنے پر چھوٹے صاحب کو اطلاع دی

اور پھر ایمبولینس منگوائی جس میں آتے ہوئے ڈاکٹر نے وہیں صاحب کی موت کی اطلاع دے دی تھی۔

دو دن بعد زینب اور اس کے شوہر کی آمد پر ابا کی تدفین کر دی گئی لیکن اس کے بعد پولیس کی تفتیش تیزی سے آگے بڑھی کیونکہ زینب نے انکشاف کیا تھا کہ گھر کے گیٹ پر کیمرے تھے اور اس میں کار اور کار سے آنے والوں کی نشاندہی اچھی طرح سے ہو سکتی ہے تو پولیس نے مجھ سے کہا۔ ''آپ نے یہ بات ہم سے کیوں چھپائی؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہوتا تو میں بتاتا۔ اس گھر کی تعمیر میں میرا کوئی حصہ نہیں تھا۔''

زینب نے پولیس کے سوال کے جواب میں یہ انکشاف بھی کیا کہ ''ابا کی ایک ڈائری ہے جس میں وہ ہر چھوٹی بڑی بات لکھتے تھے اگر وہ ڈائری مل جائے تو بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔''

یوں اسی شام پولیس زینب کو لے کر ابا کے گھر گئی اور زینب نے وہ ڈائری تلاش کر کے انہیں فراہم کر دی وہیں پر پولیس چوکیدار کو لے کر آ گئی جو اس وقت تک زیرِ حراست تھا پھر وہ ویڈیو چلائی گئی اور اس میں جو کار نظر آئی پولیس نے اس کی تصدیق چوکیدار سے کرائی چوکیدار نے اثبات میں جواب دیا۔ کیمرے نے اس کار کی نمبر پلیٹ واضح کر دی تھی۔ پولیس والوں نے کہا۔ ''کار کی تلاش تو اب مشکل نہیں رہی لیکن اس کے مالک کو گرفتار کرنے کے بعد سہولت کاری کے جرم میں گرفتار بھی کیا جا سکتا ہے لیکن انہیں سزا دلوانا اب بھی مسئلہ ہے۔''

اس پر میرے وکیل نے کہا۔ ''اب مسئلہ نہیں رہا۔ اعترافِ جرم کروانا ہماری پولیس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

شام کو رمیز کے پارٹنر یعنی زرینہ کے بھائی کو گرفتار کر لیا گیا اور وہ کار بھی برآمد کر لی جو اس کے فارم ہاؤس پر موجود تھی۔ اس نے کچھ.... دُھلائی کے بعد اُگل دیا کہ وہ تو صرف اس گھر تک رمیز کو لے کر گیا تھا، قتل سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اس کے کہنے سے کوئی فرق نہ پڑا کیونکہ سہولت کاری کے جرم کا اقبال تو وہ کر چکا تھا اور ساتھ ہی قاتل کی نشاندہی بھی کر چکا تھا۔ رات سے پہلے رمیز کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس نے ان دونوں کے پرانے جرائم کی پرانی فائلیں بھی اپنے ریکارڈ سے نکلوالیں۔ میرا وکیل پُرامید تھا کہ انہیں سزا سے اب کوئی قانون اور وکیل نہیں بچا سکے گا۔ رمیز نے ہر مجرم کی طرح اپنی گرفتاری پر بہت شور مچایا۔ اس نے اپنے دفاع میں کہا کہ میں تو وہاں صرف انہیں ان کے پوتے کی پیدائش کی اطلاع دینے گیا تھا لیکن انہوں نے میرے جرائم گنوانے شروع کر دیے اور مجھے غصہ آ گیا جس کا اختتام ان کے قتل پر ہوا۔ پھر میں انہیں وہاں چھوڑ کر باہر آیا اور اپنے پارٹنر کو بتا دیا کہ میں نے قتل کر دیا ہے اور کار میں ہم وہاں سے نکل گئے۔ میں اسپتال اپنی بہن کے پاس چلا گیا اور یہ اپنے گھر گیا جس کے بعد ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ البتہ فون پر ہم رابطے میں تھے۔ میرے وکیل نے زرینہ کو بھی شاملِ تفتیش کرنے کی درخواست لگا دی اور پولیس جب اسے تھانے میں لائی تو اس نے بغیر کسی تشدد کے بتایا کہ جو کچھ رمیز کہہ رہا ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ تمام پلاننگ ہمارے گھر پر ہوئی جس میں میرا بھائی اور رمیز دونوں شریک تھے اور اس کے ثبوت میں دے سکتی ہوں۔ اگر آپ مجھے میرے گھر لے جائیں تو وہاں میں وہ ٹیپ دے سکتی ہوں جس میں یہ دونوں پلاننگ کر رہے تھے۔ تحقیقاتی افسر نے کہا، اس میں تو آپ کے بھائی کی سزا طویل بھی ہو سکتی ہے تو زرینہ نے کہا۔ میں نے ہمیشہ بھائی سے کہا تھا کہ اللہ کی رسی دراز ہوتی ہے جب وہ کھینچتا ہے تو اس سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا لیکن بھائی ہمیشہ اس کا مذاق اُڑاتا تھا مگر اب جب قدرت نے اپنی ڈھیل ختم کر دی تو پچھتا رہا ہے۔ زرینہ نے وہ ویڈیو تحقیقاتی ٹیم کے حوالے کر دی جس میں دونوں کے چہرے صاف دکھائی دے رہے تھے اور ان کی آواز بھی واضح تھی جس میں وہ دونوں پلاننگ کرتے ہوئے سنائی دے رہے تھے۔ زرینہ نے وہ ویڈیو حوالے کی تو وکیل نے کہا اب تو دونوں لمبے گئے تو میں نے کہا۔ ''آپ کو اسے وکیلِ صفائی کی جرح کے لیے تیار کرنا ہوگا۔''

انہوں نے کہا۔ ''یہ کام تو تم مجھ سے بہتر کر سکتے ہو بلکہ تم ہی کر سکتے ہو۔''

میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ ''میں کیسے کر سکتا ہوں؟''

وکیل نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے کہ اب تک جو اس نے کیا ہے وہ بھائی سے نفرت کی بنیاد پر کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اس نے یہ سب کچھ کس لیے کیا ہے؟''

انہوں نے کہا۔ ''وہ اب تمہاری بیوی بننا چاہتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا اندازہ آپ کو کیونکر ہوا؟''

انہوں نے کہا۔ ''میں وہ وکیل ہوں جو پہلی نظر میں

پہچان لیتا ہوں کہ جرم اس نے کیا ہے یا نہیں۔“

میں نے سوال کر دیا۔ ”اس کا زرینہ سے کیا تعلق؟“

انہوں نے کہا۔ ”جن نظروں سے وہ تمہیں دیکھتی رہی ہے اس میں سوائے تمہارے لیے چاہت کے اور کچھ نہیں، وہ تمہاری بیوی سے نفرت کرتی ہے اور اب جب اس کی راہ کی ہر دیوار گر رہی ہے وہ تمہیں اپنانا چاہتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ایک جرائم پیشہ کی بہن سے شادی کر کے میں نے باپ کھو دیا۔ اب میرے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں ہے اور زینب کو میں شکار بننے نہیں دوں گا۔“

اس پر وکیل بولا۔ ”میرے پاس تمہاری آئندہ زندگی کا بھی پروگرام ہے۔“

میں نے سوال کیا۔ ”وہ کیا ہے؟“

انہوں نے کہا۔ ”تمہیں پاکستان سے بیٹے کے ساتھ فرار ہونا ہے اور کینیڈا جانا ہے جہاں اس کی پھوپی موجود ہے اور وہ تمہارے بیٹے کی تربیت اچھی طرح کر سکتی ہے اس کے لیے تمہیں زرینہ کی مدد چاہیے ہوگی۔“

میں نے کہا۔ ”وہ کیا مدد کرے گی؟“

وکیل صاحب نے کہا۔ ”اس کے تعلقات اتنے تو ہوں گے کہ وہ تمہیں پاکستان سے نکلوا دے۔“

میرے شادی کے انکار کے باوجود زرینہ کی وجہ سے میں نے اسے پروپوز کر دیا ہر کام آسان ہوتا چلا گیا۔ وکیل صاحب نے کہا تھا کہ اس کے اتنے تو تعلقات ہوں گے کہ وہ تمہیں پاکستان سے نکل جانے میں مدد کر سکے بلکہ اس کے تعلقات اس سے بھی زیادہ تھے۔ جہاز کے ٹکٹ کے ساتھ کینیڈا کی رہائش سب مسئلے اس نے حل کر دیے۔ وہ جس آفس میں جاتی اس کا استقبال وی آئی پی انداز سے ہوتا بالآخر میں اپنے بیٹے کو لے کر کینیڈا پہنچ گیا جہاں زینب اور اسد نے ہمارا استقبال کیا۔ اسد نے پہلا کام یہ کیا کہ میرے فون کی سم ضائع کر دی اور اپنے نام پر میری نئی سم نکلوا دی۔

ابا کے قتل کا فیصلہ آیا تو رمیز کو پھانسی اور اس کے سہولت کار کو عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔ اس فیصلے کے اگلے روز زرینہ مجھے ائرپورٹ لے گئی۔ میں اور میرا بیٹا جہاز میں بیٹھ گئے۔

زینب نے ابا کی جو ڈائری نکلوائی تھی اس میں 29 دسمبر تک کی چھوٹی بڑی تفصیلات درج تھیں اسی ڈائری سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابا نے رمیز کے بارے میں بہت پہلے معلوم کر لیا تھا، انہوں نے ڈائری میں لکھا تھا کہ گیسٹ ہاؤس کے نام پر وہ بدکاری کے اڈے چلاتا ہے تو میں ایسے شخص کی بہن سے اپنے بیٹے کی شادی کس طرح کر سکتا ہوں۔ میں آخر تک یہی سمجھتا رہا کہ انہوں نے زینب کی رسم حنا والی رات سعدیہ کے ڈانس کی وجہ سے اسے بہو بنانے سے انکار کیا تھا۔

وہ مسائل تو حل ہو گئے اور پاکستان سے آنے کے بعد جو مسائل تھے، وہ زینب اور اسد کی مدد سے حل ہو گئے۔ اسکول میں داخلہ وغیرہ ابتدائی برسوں میں حل ہو گئے۔ تین برس بعد زینب نے مشورہ دیا کہ کب تک یوں زندگی بسر کرو گے تو میں نے کہا پہلی شادی میں باپ کھویا اب میرے پاس کھونے کے لیے تمہارے سوا کچھ نہیں تو زینب نے کہا۔

”بھائی بھروسا رکھو جسے تمہاری زندگی میں شامل کرنا چاہتی ہوں۔ اسے اسد مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔“

یوں میں تیار ہو گیا اور یوں میری دوسری شادی ہو گئی۔ زینب کا انتخاب بالکل صحیح ثابت ہوا اور مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ شایان کی ماں نہیں ہے۔ کینیڈا میں چھ برس گزرنے کے بعد اسے امریکا سے جاب کی آفر ہوئی اور ہم امریکا منتقل ہو گئے اور تب سے امریکا میں ہیں۔

شایان کو اسکول لے جانے اور لانے کی ذمے داری اس نے لے لی تھی اور ہمارا اختلاف تھا تو شایان کے جنم دن منانے پر ہوتا تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ ہر برس اس کی سالگرہ مناتی تھی اور اس معاملے میں زینب اور اسد اس کے حامی تھے۔ چونکہ جمہوریت کا زمانہ ہے تو میں اقلیت میں ہونے کی وجہ سے خاموش ہو جاتا ہوں۔ سالگرہ کا تحفہ بھی میری جانب سے وہی شایان کے لیے لاتی تھی۔ اب تو زینب کی بھی دو بیٹیاں ہیں اور وہ بھی کینیڈا سے تحفے بھجواتی ہیں جنہیں وہ اگلی سالگرہ تک سنبھال کر رکھتا ہے۔

زندگی آرام سے بسر ہو رہی ہے۔ میری اور میری ڈاکٹر بیوی کی...... پاکستان کے حساب سے ہم کروڑپتی ہو چکے ہیں۔ ہمارا اپنا ولا ہے اور گاڑیاں ہیں۔ میری ڈاکٹر بیوی ہر طرح کے پاکستانی کھانے بہت اچھے بناتی ہے صرف ایک کمی ہے میری زندگی میں اور وہ ابا کی کمی ہے لیکن اس کمی کو کسی حد تک پورا کرتا ہے لیکن کمی تو بہرحال رہتی ہے اب میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ دعا کریں کہ میری یہ کمی دور ہو جائے۔ یہ دعا کریں کہ میری زندگی ایک شکر ادا کرنے والے کی ہو۔

❖❖❖

قسط :19

دہر

حسام بٹ

کامیابی اسی کو ملتی ہے جو ثابت قدم اور مستقل مزاجی سے اپنی منزل کی جانب گامزن رہتا ہے۔ وقت کی ایک بے رحم، سفاک کروٹ نے اس کے جیون میں بھی زہر گھول دیا تھا۔ ناکردہ جرم کی پاداش میں اس کا لڑکپن اور جوانی قید و بند کی صعوبتوں کی نذر ہوگئیں۔ زمانۂ اسیری نے ایک طرف اس کے دل و دماغ پر صدمات کے ان مٹ نقوش چھوڑے تو دوسری جانب اس نے علم و ہنر کا بحرِ بے کنار اپنے وجود میں سمیٹ لیا۔ اس نے آزاد عملی میدان میں قدم رکھا تو نت نئے دشمنوں سے اس کا سابقہ پڑا۔ جلد ہی اس پر منکشف ہوا کہ خالق نے اسے زمینی خداؤں کی سرکوبی کے لیے تخلیق کیا ہے۔ مقصدِ حیات واضح ہوا تو اس نے خود کو منشائے قدرت کے سامنے سرنگوں کردیا۔ اس کارزارِ فنا و بقا کی آبلہ پا جدوجہد میں ایک دل نشیں مہ جبیں اس کی رفیقِ سفر ٹھہری۔ اپنے اطراف میں پھیلی شوریدہ لہروں کو برداشت کرتے ہوئے اس کا سفر جاری تھا جہاں یہودیوں کا سازشی ذہن دنیا پر حکمرانی کا اپنا خواب شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتا تھا۔

چند لمحوں میں زندگی بدل دینے والے عیار ذہنوں کی ہوش ربا حیلہ سازیاں

گزشتہ اقساط کا خلاصہ
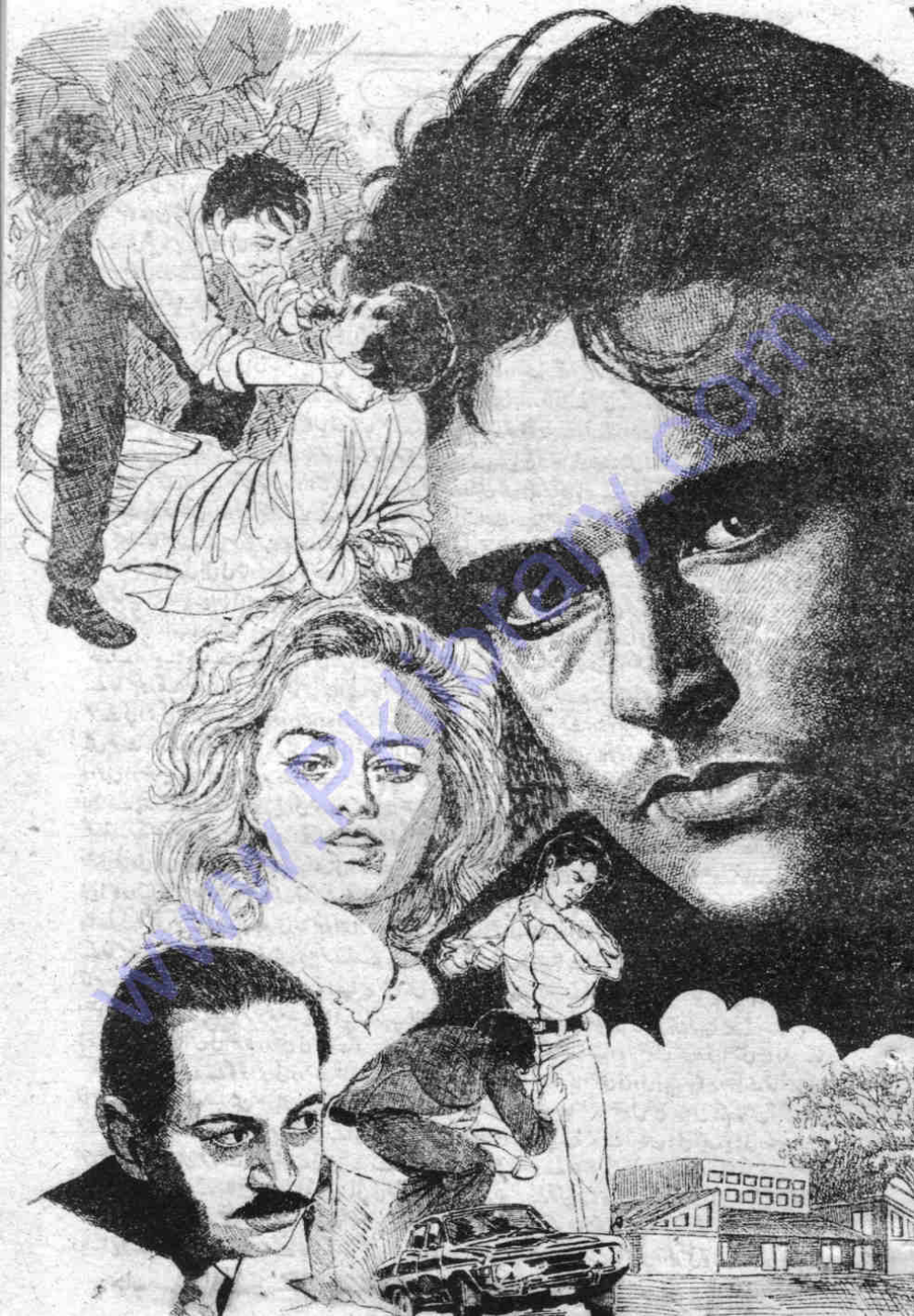
جاسم کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا۔ لڑکپن میں قدم رکھنا قیامت صغریٰ کا پیغام بر ثابت ہوا۔ اس کے والد قاسم باری نے مقامی غنڈوں کے خلاف پولیس کی مدد کی تو یہ چھوٹی سی فیملی طوفان کی زد میں آ گئی۔ ایک رات اسی گینگ کے چند لوگوں نے گھر میں گھس کر جاسم کی والدہ اور والد پر قاتلانہ حملہ کر دیا جس میں ماں ہلاک ہو گئی اور شدید زخمی باپ کو پرائیویٹ اسپتال پہنچا دیا گیا۔ قاسم کا علاج شروع کرنے کے لیے پانچ لاکھ کی ضرورت تھی۔ جاسم نے مدد کے لیے اپنے اکلوتے ماموں جلیل کی طرف دیکھا۔ جلیل نے اس شرط پر رقم کا انتظام کر دیا کہ جاسم کو ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں کچھ عرصے کے لیے جیل جانا پڑے گا۔ جاسم کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے ماموں کی بات مان لی۔ اپنے باپ کی زندگی بچانے کے لیے وہ تیرہ سال کی عمر میں آٹھ سال کے لیے جیل چلا گیا۔ قید و بند کی اس زندگی میں دو افراد نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے ایک چھٹا ہوا بدمعاش مراد علی تھا جسے سب دادا کہتے تھے۔ دوسرا کارل مارکس کا پیروکار ایک صحافی انور بیگ تھا جو کامریڈ کہلاتا تھا۔ دادا اور کامریڈ ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن دونوں ہی کی جاسم پر گہری نگاہ تھی۔ وہ جاسم کی بپتا سے واقف تھے اس لیے وہ اپنے اپنے نظریات کے مطابق اس کی ذہنی اور جسمانی تربیت میں لگ گئے۔ کامریڈ نے جاسم کی زبان کو تلوار اور دادا نے اس کے ہاتھ پاؤں کو موت کی للکار بنا دیا۔ دادا نے اپنے بندوں کے ذریعے پتا لگا لیا تھا کہ جاسم کے والدین کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے پیچھے راجو نامی ایک گینگسٹر کا ہاتھ ہے اور یہ بھی کہ جلیل ماموں نے جاسم کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ اس نے پانچ لاکھ اپنی جیب میں ڈالے اور قاسم باری کو مرنے کے لیے چھوڑ کر کہیں غائب ہو گیا تھا۔ دادا اتنا طاقتور بدمعاش تھا کہ وہ جیل میں بیٹھ کر بھی باہر کے معاملات کو چلاتا رہتا تھا۔ جلیل تو منظر سے ہٹ چکا تھا لیکن راجو تک پہنچنے کے لیے دادا نے جاسم کی مدد کی۔ اسے اپنے معتمد خاص کامل کے ساتھ چند گھنٹے کے لیے جیل سے باہر بھیجا۔ جاسم نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راجو کو زندگی بھر کے لیے وہیل چیئر کا محتاج بنا دیا۔ دادا کا جیل سے باہر جانا لگا رہتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے گیا تو اس کے ایک دیرینہ دشمن شعیب چاچا نے اسے اور اس کی بیٹی و بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دادا کی موت نے جاسم کو حد درجہ افسردہ کر دیا۔ بہرحال وہ اپنی سزا پوری کرنے کے بعد جیل سے باہر آیا تو دنیا بدل چکی تھی۔ اب وہ ایک تربیت یافتہ کڑیل جوان تھا اور اسے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا اور اسی آغاز پر ایک مہ جبیں سے اس کا تعارف ہو گیا۔ ناجیہ ایک پروڈکشن ہاؤس میں ایسوسی ایٹ پروڈیوسر تھی۔ وہ جاسم کی فائٹنگ اسکلز سے حد درجہ متاثر ہوئی اور اس نے جاسم کو رنگ و نور کی دنیا سے روشناس کرا دیا۔ جاسم کو پتا چلا کہ شعیب چاچا معاشرے میں ایک کامیاب ایکسپورٹر کی حیثیت سے عزت کی زندگی گزار رہا ہے لیکن درپردہ وہ ڈرگز، ناجائز اسلحہ، انسانی اعضا کی فروخت اور نوعمر لڑکیوں کے اغوا جیسے مذموم کاموں میں ملوث ہے۔ اس مکروہ کاروبار میں بعض بااثر افراد اس کے ساتھ ہیں اور اسے بین الاقوامی کارٹلز کا تعاون بھی حاصل ہے۔ دونوں دوستوں نے مضبوط منصوبہ بندی سے شعیب چاچا کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ دوسری سمت جاسم کا شوبز کا کام بھی جاری تھا اور اسے چند روز کے بعد ایک سیریل کی شوٹ کے لیے استنبول جانا تھا اس سے پہلے اس نے راجو کو بھی حسرت ناک موت سے ہمکنار کیا تھا۔ یہ سنسنی خیز ہنگامے چل رہے تھے کہ کسی ڈیوڈ نامی شخص نے بڑے پراسرار انداز میں جاسم سے رابطہ کیا اور اسے اپنے کسی ری ایلیٹی ٹی وی میں، بھاری معاوضے پر شرکت کی دعوت دی۔ یہ وہی وقت تھا جب جاسم اپنے یونٹ کے ساتھ استنبول جانے والا تھا۔ ڈیوڈ کا رویہ اتنا پراسرار اور خطرناک تھا کہ فوری طور پر یہی سمجھ میں آیا کہ کوئی مخالف پروڈیوسر ڈیوڈ بن کر جاسم کو اپنے ٹریک سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن جلد ہی جاسم کو اندازہ ہو گیا کہ ڈیوڈ ایک انتہائی طاقتور اور بااختیار شخص ہے۔ ڈیوڈ نے ناجیہ کو اغوا کر کے جاسم کو اپنے ری ایلیٹی ٹی وی میں کام کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ دونوں کی ملاقات استنبول میں طے ہو گئی۔ جاسم کا پروڈیوسر تمام حالات سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ اس نے اپنے سیریل میں جاسم کا رول ایک دوسرے کردار رحیم کو دیا اور جاسم کو یونٹ کے ساتھ استنبول روانہ کر دیا۔ پروڈیوسر سرمد صدیقی ناجیہ کے باپ غفار داؤد کا دوست تھا اس لیے صدیقی کی نظر میں اپنے سیریل سے زیادہ ناجیہ کی زندگی اور اس کی محفوظ واپسی کی اہمیت تھی۔ ڈیوڈ نے جاسم کو ہدایت کی تھی کہ جب وہ استنبول میں ری ایلیٹی ٹی وی کے کنٹریکٹ پر دستخط کر دے گا تو اس کی دوست نما محبوبہ کو رہا کر دیا جائے گا۔ ڈیوڈ کا وہ ری ایلیٹی ٹی وی ایک میگا پروجیکٹ تھا جس کی تمام تر شوٹنگ پراسرار سرزمین مصر میں ہونے والی تھی۔ ڈیوڈ کی ہدایت کے مطابق، جاسم کو استنبول پہنچ کر اس کے خاص آدمی بن عرفات سے ملاقات کرنا تھی۔ جاسم استنبول کے ایک معروف مقام گلاٹا برج کے نیچے بنے ہوئے زینان نامی ایک یونانی ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا جہاں بن عرفات ماسٹر شیف کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ بن عرفات نے جاسم کے خون سے مذکورہ کنٹریکٹ پر دستخط کرا لیے اور وعدے کے مطابق، اسے ناجیہ کی رہائی کی خوش خبری سنا دی۔ جاسم نے فون پر ناجیہ سے بات کر کے اس امر کی تسلی کر لی کہ وہ بہ حفاظت اپنے گھر پہنچ چکی ہے۔ اب وہ محفوظ سائڈ پر تھا لہٰذا اس نے ڈیوڈ کے پروجیکٹ میں کام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ڈیوڈ نے بن عرفات کے توسط سے جاسم کو انٹا غفیل کر کے ایک کروز شپ پر پہنچا دیا۔ جب جاسم کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک

بڑے بحری جہاز پر پایا۔ بعدازاں ڈیوڈ نے ایک مرتبہ پھر جاسم سے پراسرار انداز میں سیلولر رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ کروز شپ استنبول سے مصر کی بندرگاہ، پورٹ سعید تک جائے گا۔ پھر اس کے آدمی جاسم کو پورٹ سعید سے بہ ذریعہ جیپ قاہرہ پہنچا دیں گے جہاں پر اس ری ایلیٹی ٹی وی کی افتتاحی تقریب کا انعقاد کیا جائے گا۔ ڈیوڈ نے ری ایلیٹی ٹی وی کی شوٹنگ سے پہلے ہی جاسم کے ساتھ شکار اور شکاری کا جو کھیل شروع کر دیا تھا، جاسم اسے انجوائے کرنے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ ڈیوڈ کی ہوشیاری کے سبب جاسم اس کا کھیل سمجھنے سے قاصر تھا۔ ڈیوڈ نے ہر ٹیم کو بریف کر دیا تھا۔ مصر کے حرم سے انہیں ایک صندوق حاصل کرنا تھا۔ جاسم کی مدد ایک جن زادی کر رہی تھی۔ کچھ ممبران زندگی کی بازی ہار چکے تھے اور باقی ہارنے والے تھے۔ جاسم کا رخ استنبول کی جانب تھا۔ دورانِ سفر انکشاف ہوتا ہے کہ ان کا جہاز ہائی جیک کر لیا گیا ہے۔ جاسم اس صورتِ حال سے نمٹنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے اپنی خفیہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ہائی جیکرز کو زیر کرتے ہوئے صورتِ حال کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ ہائی جیکرز کا ٹارگٹ استنبول کے جسٹس طلال حسنی تھے۔ جن سے وہ اپنی مرضی کا فیصلہ لینا چاہتے تھے۔ استنبول میں جاسم کا جسٹس حسنی سے بہت گہرا تعلق بن گیا تھا۔ جاسم ان کے بیٹے کو بھی بازیاب کرا چکا تھا اور اپنے دشمنوں کو بھی ایسا سبق دیا تھا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھتے۔ سلورکوئین کی ہدایت پر ڈیوڈ کو اب جاسم کے خلاف حتمی کارروائی کرنی تھی کیونکہ جاسم ان لوگوں کے خلاف بہت کچھ کر چکا تھا۔ ڈیوڈ کے حواری اب جاسم کا تعاقب کرتے ہوئے جسٹس حسنی کے ولا تک پہنچ چکے تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

فریز کا حکم کوئی کھوکھلی دھمکی نہیں تھی۔ اس لفظ واحد میں گن بردار نے زمانے بھر کی سنگینی اور سفاکی بھر دی تھی۔ اس کے لہجے کے اعتماد سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی بھی حد سے گزرنے میں بخل یا کنجوسی سے کام نہیں لے گا، پھر جاسم کی کھوپڑی پر ٹکی ہوئی گن کی یخ بستہ نال بھی اس کے خطرناک عزائم کا ثبوت تھی......!

جاسم اِن لمحات میں کسی بھی قسم کی غیر نصابی سرگرمی کا رسک نہیں لے سکتا تھا لہٰذا فریز کا لفظ سنتے ہی جہاں تھا، وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ گویا اس نے گن بردار کے حکم کی تعمیل میں خود کو منجمد کر لیا تھا۔

''اس ہوٹل سے باہر نکلنے کے تمام زمینی اور آسمانی راستوں پر ہم نے کڑی نگرانی بٹھا رکھی ہے جے بی......!'' وہ شخص گن کی نال کو جاسم کی کھوپڑی سے ہٹاتے ہوئے معتدل انداز میں بولا۔ ''ہوٹل کی مین انٹرنس ہو یا ایمرجنسی فائر ایگزٹ، ہر جگہ تمہارا سامنا ہمارے ہی مسلح افراد سے ہو گا۔ تم کسی پیراشوٹ، ہیلی کاپٹر یا پھر ڈرین پائپ کے ذریعے بھی یہاں سے فرار نہیں ہو سکتے۔ اگر میری بات کا یقین نہ ہو تو اپنی جان کو داؤ پر لگا کر ایسی مہلک کوشش کر سکتے ہو......''

ادھر اس بندے کی بات ختم ہوئی، ادھر ہوٹل مینا کی چھت گویا روشنی میں نہا گئی۔ چھت کے مختلف مقامات پر نصب درجن بھر فلڈ لائٹس کو ایک ساتھ آن کر دیا گیا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آدھی رات کو کسی معجزے کے طفیل سورج نصف النہار پر چمک رہا ہو۔ اسی بے بہا روشنی میں

جاسم نے درجن کے قریب مسلح افراد کو اپنے انتہائی نزدیک پایا۔ ان سب کی گنز کا رخ جاسم کی جانب تھا اور ان کے چہروں کے تاثرات بہ زبانِ خاموشی یہ اعلان کر رہے تھے کہ جاسم کی ایک ذرا سی ''پھرتی'' بھی اس کے لیے کسی عظیم خسارے کا باعث بن سکتی ہے......

''اگر مجھے کسی ہنگامی کارکردگی کا مظاہرہ کرنا ہوتا تو میں تمہاری دھمکی کو اپنے جوتے کی نوک پر مار کر، اب تک اتنا کچھ کر چکا ہوتا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' جاسم، خود سے مخاطب شخص کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔ ''تم نے مجھے بتایا ہے کہ ہوٹل کے اندر اور باہر درجنوں بلکہ سیکڑوں افراد میرے فرار کی راہیں مسدود کرنے کے لیے ریڈ الرٹ کھڑے ہیں۔ کیا اب کی بار ڈیوڈ نے مجھے پکڑنے کے لیے اپنے نمک خواروں کی پوری بٹالین بھیج دی ہے؟''

اس شخص نے جب جاسم کی کھوپڑی سے گن کی نال ہٹانے کے بعد قدرے نرم لہجے میں بات کی تھی تو جاسم کو یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ جب تک وہ ان لوگوں کو فائرنگ پر مجبور نہیں کرے گا، وہ ایک دم محفوظ ہے کیونکہ جان لینے والے مکالمے بازی میں وقت برباد نہیں کیا کرتے......!

''ایسا ہی سمجھ لو کہ تمہیں پانے کے لیے ہماری پوری بٹالین یہاں موجود ہے اور مزید ضرورت پڑنے پر ہم بریگیڈ یا ڈویژن کو بھی آنِ واحد میں یہاں بلا سکتے ہیں......'' وہ بندہ پُرغرور لہجے میں بولا۔ ''ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہمارا کسی ڈیوڈ سے کچھ لینا دینا نہیں۔''

''تو پھر تم کون لوگ ہو......؟'' جاسم نے اُلجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''اور میرے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑے ہوئے ہو۔ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

''ہماری تم سے دوستی ہے اور نہ ہی دشمنی!'' وہ شخص جاسم کے چہرے پر نگاہ جما کر معتدل انداز میں بولا۔ ''ہم تو حکم کے غلام ہیں۔''

''کس کے حکم کے غلام......؟''

''ڈیوڈ کو تمہارے معاملے سے بالکل الگ کر دیا گیا ہے۔'' اس شخص نے جواب دیا۔ ''ہم ہائی کمان کے احکامات کی تعمیل کے لیے اس وقت یہاں تمہارے سامنے موجود ہیں۔''

''ہائی کمان...... مطلب سلور کوئین......؟''

''کیا تم میڈم سلور کوئین کو جانتے ہو؟''

''میں تمہاری میڈم اور اس کے سر...... اور ان سب کے سروں کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔'' جاسم نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میرا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو یروشلم اور بویریا میں بیٹھے ہیں......''

جاسم کے سامنے کھڑے شخص کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ جاسم کے انکشاف نے اسے ایک زبردست ذہنی جھٹکا دیا تھا اور جاسم نے یہ سب کچھ دانستہ کیا تھا تاکہ وہ ان لوگوں کے عزائم کی تہ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

''بہرحال......!'' وہ بندہ بڑے سلیقے سے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ''اگرچہ تم نے ہمارے دو بندوں کو ہوٹل کے کمرے میں اور تین کو کوریڈور میں لمبا لٹا دیا ہے لیکن ہم پھر بھی تمہارے خلاف کوئی سخت کارروائی نہیں کرنا چاہتے۔ اوپر سے اس کی اجازت نہیں ہے۔''

''جو دو بندے میرے کمرے میں، روم سروس کا بہانہ کر کے گھسے، وہ سائیلنسر لگی گنز سے لیس تھے اور کوریڈور میں مجھ سے ٹکرانے والے تین افراد بھی میرے خون کے پیاسے نظر آتے تھے۔'' جاسم نے تلخی بھرے لہجے میں کہا۔ ''اگر کوئی شخص آپ کی گردن کاٹنے کا ارادہ رکھتا ہو تو آپ کس طرح اسے پھولوں کا ہار پہنا سکتے ہیں؟ میں نے جو بھی کیا، وہ حفاظت خود اختیاری میں کیا ہے اور...... میں نے تمہارے کسی بندے کی جان نہیں لی۔ کوریڈور میں تم نے اپنے جس ساتھی کی خون اگلتی لاش دیکھی ہے، وہ تمہارے ہی ایک گماشتے کی گولی کا نشانہ بنا ہے۔''

''جو ہوا، اس پر مٹی ڈال دو جے بی......!'' وہ شخص مصلحت آمیز لہجے میں بولا۔ ''ہم تم سے کسی قسم کا حساب تو نہیں مانگ رہے۔''

''تو پھر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' جاسم نے سرسراتی آواز میں استفسار کیا۔ ''مجھ پر یہ لشکر کشی کس لیے......!''

''ہمیں تمہاری ضرورت ہے اور وہ بھی صحیح سلامت......!'' وہ حتمی لہجے میں بولا۔ ''تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا اور اس سے پہلے تم اپنا یہ پھولا ہوا بیگ میرے حوالے کرو گے!'' بات کے اختتام پر اس نے جاسم کے شانے پر لٹکے ہوئے بیگ کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

جاسم کے بیگ پر، کوریڈور میں ملنے والے گن بردار کی بھی نظر تھی اور اس نے جاسم کو ہینڈز اَپ کرانے کے بعد اپنے (آنجہانی) ساتھی کو حکم دیا تھا کہ وہ بیگ کو جاسم کے کندھے سے اتار لے اور...... اب چھت پر کھڑا یہ شخص بھی جاسم سے بیگ ہی کا مطالبہ کر رہا تھا اور اس نے بیگ کے لیے خاص طور پر ''پھولا ہوا'' کے الفاظ بھی ادا کیے تھے۔ گویا، جاسم کا بیگ ان لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بن گیا تھا۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں جاسم کے ذہن سے گزر گئے اور وہ اس کے ساتھ ہی ان کی خصوصی دلچسپی کی تہ میں اتر گیا۔

''مجھ سے زیادہ تم میرے بیگ کے لیے مرے جا رہے ہو۔'' جاسم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو، میں نے اپنے بیگ میں 'تابوتِ سکینہ' چھپا رکھا ہے؟''

''تابوتِ سکینہ ہمارے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے جے بی......!'' وہ بندہ جو اس لاؤ لشکر کا لیڈر لگتا تھا، خفگی بھرے لہجے میں بولا۔ ''ہم پچھلی کئی صدیوں سے اپنے اس مقدس صندوق کی تلاش میں ہیں۔ تمہیں اس کا نام احترام و ادب سے لینا چاہیے۔ بہرکیف......!'' لمحاتی توقف کے بعد اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''تابوتِ سکینہ کا سائز اتنا بڑا ہے کہ وہ تمہارے اس پھولے ہوئے سفری بیگ کے اندر سما نہیں سکتا۔ خیر، یہ بات تو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم تمہارے بیگ میں اتنی زیادہ دلچسپی کیوں لے رہے ہیں۔ تم ویلی آف دی کنگز کے عامنک پیرامڈ کے تہ خانے سے جو مقدس صندلیں باکس چُرا کر لائے ہو، اس پر صرف اور صرف ہمارا حق ہے۔ تم شرافت سے وہ منقش باکس میرے حوالے کر دو......''

''تو تم ایسا سمجھتے ہو کہ میں نے اس صندلیں باکس کو اپنے بیگ کے اندر چھپا رکھا ہے؟'' جاسم نے اپنے

انداز ے کی تصدیق کی غرض سے سوال کیا۔

''ہاں...... بالکل!'' وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔ ''ہم نے تمہارے کمرے کا چپّا چپّا کھوج لیا ہے۔ وہاں ہمیں وہ باکس کہیں بھی نہیں ملا۔ تم کمرے سے صرف یہ بیگ ہی لے کر نکلے ہو اور بیگ کا پھیلاؤ بھی اسی جانب اشارہ کررہا ہے کہ وہ، ہر طرف سے ایک فٹ سائز کا باکس تمہارے بیگ کے اندر موجود ہے۔''

اس شخص کی غلط فہمی کو استعمال میں نہ لانا، اس صدی کی سب سے بڑی حماقت ہوتی۔ جاسم کو کھیلنے کے لیے ایک زبردست وسیع میدان مل گیا تھا۔ اس نے اپنے مدِّمقابل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اکسانے والے انداز میں کہا۔

''اگر میں یہ بیگ تمہارے سپرد نہ کروں تو......؟''

اس دوران میں اس شخص کے درجن بھر ساتھی، جاسم کو اپنی گنز کے نشانے پر رکھے بالکل خاموش کھڑے رہے تھے۔ جاسم کے سوال نے اس لیڈر ٹائپ شخص کا چہرہ متغیر کر دیا۔ لمحاتی گڑبڑاہٹ کے بعد اس نے سنبھلے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''ہمارے لیے تم اور یہ باکس، دونوں ہی بہت قیمتی اور ضروری ہیں لیکن اگر تم نے ہٹ دھرمی سے کام لیا تو ہم تم دو میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے پر مجبور ہوجائیں گے اور یہ سن کر تمہیں دھچکا لگے گا کہ ہم اس صندلیس باکس کو ہر حال میں تم پر ترجیح دیں گے۔''

''دھمکی دے رہے ہو......؟'' جاسم نے بپھرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں...... میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کررہا ہوں۔''

''یا تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ نیچے صرف تمہارے ہی لوگ موجود ہیں......؟''

''اس کا کیا مطلب ہوا؟'' جاسم کے استفسار نے اس بندے کو اُلجھا دیا۔

''اگر نیچے تم نے اپنے بندوں کی پوری بٹالین یا بریگیڈ اور یا پھر ڈویژن تعینات کررکھی ہے تو کیا میرا کوئی ایک بھی ہمدرد وہاں موجود نہیں ہوسکتا......؟'' جاسم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چٹانی اعتماد سے سوال کیا۔

''کیا تم مجھے اتنا ہی لاچار اور بے سروسامان سمجھتے ہو......؟''

''آخر ان باتوں سے تم کیا ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہو جے بی؟'' اس بندے کی اُلجھن میں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔ ''جو بھی کہنا چاہ رہے ہو، صاف الفاظ میں کہو......!''

اب اس ڈرامے کے ڈراپ سین کا وقت آن پہنچا تھا۔ جاسم نے انگشتِ شہادت کو اپنے کان پر اس انداز میں رکھ کر دبایا جیسے وہاں پہلے سے کوئی ائرفون موجود ہو۔ یہ محض ایک جھانسا تھا۔ اپنی اس غیر متوقع حرکت کے دوران میں اس نے بیگ بھی کندھے سے اتار لیا تھا۔ جاسم کی وہ حرکت اس بندے کے لیے ضرور غیر متوقع تھی لیکن یہ جاسم کی ایک سوچی سمجھی چال تھی۔

''جہانگیر......!'' جاسم نے اپنے بیگ کو ہوا میں بلند کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''کیچ دی شپ منٹ......!''

اس سے پہلے کہ سلور کوئین کا وہ فرستادہ جاسم کی اس میکانکی ''حرکت'' کی توجیہہ تک رسائی حاصل کرپاتا، جاسم اپنے بیگ کو نیچے پھینک چکا تھا۔

یہ سب اتنا اچانک اور چشم زدن میں ہوگیا کہ جاسم کی سرکوبی کے لیے آنے والے شخص کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ دیدے پھاڑ کر جاسم کو گھورتا چلا گیا۔ ان لمحات میں جاسم کے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے مدِّمقابل کو دیکھتے ہوئے فاتحانہ انداز میں کندھے اچکا دیے۔

اس ٹیم لیڈر کو اپنے حواس میں آنے میں چند سیکنڈ ہی لگے ہوں گے۔ اس کی پہلی ترجیح (بیگ) ہوٹل مینا کی چھت سے ''ٹیک آف'' کرکے زمین کی طرف جاچکا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی دوسری ترجیح (جاسم) کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے حلق کی پوری قوت سے چیخا۔

''سب لوگ ابھی کے ابھی نیچے پہنچو...... وہ بیگ جے بی کے آدمی جہانگیر کے ہاتھ نہیں لگنا چاہیے۔ اس بیگ کو حاصل کرنے کے لیے خون کی ندیاں بھی بہانا پڑیں تو سوچنے میں ایک لمحہ بھی ضائع مت کرنا۔''

اس کے ہنگامی حکم پر وہ تمام مسلح افراد آندھی اور طوفان کی رفتار سے چھت کو الوداع کہہ کر نیچے کی جانب لپکے۔ اب چھت پر صرف جاسم اور ان کا گن بردار ٹیم لیڈر ہی رہ گیا تھا۔

انسان کی ذہانت اور دماغی مضبوطی کا اسی وقت پتا چلتا ہے جب وہ کسی ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو جہاں اس کے اعصاب پر ماؤنٹ ایوریسٹ لدا ہوا ہو۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے...... نو پریشر، نو ڈائمنڈ! ایک بے وقعت کوئلا سالوں سال تک ٹنوں وزن کے نیچے دبے رہنے کے بعد ہی

ڈائمنڈ کی شکل اختیار کرتا ہے۔ ماحول کے دباؤ کو اپنے اعصاب پر جھیلنا ہی اصل بہادری اور جواں مردی ہے لیکن جاسم کا مدِمقابل اس سچویشن کو خاطرخواہ ہینڈل نہیں کر پایا تھا۔ ان کشیدہ لمحات کے دباؤ نے اس کے اعصاب کو ''کچل'' ڈالا تھا اسی لیے وہ اتنا بھی سوچ اور سمجھ نہیں پایا تھا کہ اگر اس بیگ کے اندر واقعتا وہ مقدس طلسماتی باکس موجود تھا تو جاسم نے اتنی بے پروائی اور غیر ذمے داری سے اسے نیچے کیوں پھینک دیا تھا......؟

سلور کوئین کے اس ہرکارے نے بھی اس نقطے پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی اسی لیے اپنے تمام گماشتوں کو باکس یعنی بیگ کے حصول کی خاطر نیچے ''دوڑا'' دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں جاسم مکمل طور پر اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ اس کی چلی ہوئی ہنگامہ پرداز چال صدفیصد کامیاب رہی تھی۔ اس نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ فاتحانہ انداز میں اس گروپ لیڈر کی طرف دیکھا اور طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''تم نیچے نہیں جا رہے......؟''

''تمہیں اپنے ساتھ لیے بغیر بھلا کیسے جا سکتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا اور دوبارہ جاسم کو ''پوائنٹ بلینک رینج'' پر رکھتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں اضافہ کر دیا۔ ''چلو......!''

''کیا سلور کوئین نے اپنی نام نہاد فوج ظفرِ یاب میں کوئی مرد کا بچہ بھرتی نہیں کر رکھا؟'' جاسم نے طیش دلانے والے انداز میں سوال کیا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو......؟'' وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کیا میں تمہیں مرد کا بچہ نظر نہیں آ رہا؟''

''مجھے تمہاری مردانگی پر شک ہے......!''

''تم نے ابھی میرے ہاتھوں میں ہاتھ نہیں ڈالے اسی لیے بہت بول رہے ہو۔'' وہ حقارت بھری نظر سے جاسم کو دیکھتے ہوئے غصے سے بولا۔ ''تمہیں نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں ہے ورنہ میں ابھی تمہیں بتا دیتا کہ اصلی مرد کیا ہوتا ہے۔''

''تمہاری زبان سے ''اصلی مرد'' کے الفاظ کا خروج ایک دم بے معنی اور بکواس ہے۔'' جاسم نے بھڑکانے والے انداز میں کہا۔ ''جو واقعی اپنے باپ کے نطفے سے وجود پاتے ہیں، وہ کسی نہتے انسان پر مسلح لشکر کشی نہیں کرتے۔ پہلے تم نے درجن بھر گن بردار افراد کے ساتھ مجھے گھیر رکھا تھا اور اب بھی تم گن ہی کے بل بوتے پر مجھے ڈرانے، دھمکانے اور مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم لوگوں کی ڈکشنری میں کیا ''مردانگی'' کے یہی معنی درج ہیں......؟''

جاسم کی ''محنت'' بارآور ثابت ہوئی۔ اس شخص نے گن کو ایک طرف رکھا اور ایک خطرناک فائٹنگ پوز میں آتے ہوئے جارحانہ لہجے میں بولا۔

''میں تمہیں بتاتا ہوں کہ مردانگی کیا ہوتی ہے......!''

جاسم اس وقت چھت کے کنارے پر کھڑا تھا۔ وہ ہوٹل کی عقبی دیوار کے ساتھ نصب ڈرین پائپس کے ذریعے وہاں سے فرار ہونے ہی والا تھا کہ اس بدبخت گن بردار نے اسے ''فریز'' ہونے پر مجبور کر دیا تھا لیکن اب حالات کافی حد تک بدل چکے تھے۔ جاسم نے سچویشن کو اپنے حق میں ہموار کر لیا تھا۔ ان لمحات میں وہ اب درجنوں گنز کے نشانے پر نہیں تھا۔

اس نے اپنے مدِمقابل کو دھوکا دینے کے لیے ایک قدم اس کی جانب بڑھایا اور ایک محفوظ اسٹانس بنانے کے بعد، ہاتھ سے بلانے کا اشارہ کرتے ہوئے زبان سے للکارا۔

''آ جاؤ......''

مدِمقابل کی چونکہ عزت، غیرت اور مردانگی......سب کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا اس لیے حکمت، مصلحت اور فرزانگی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے خوں خوار لہجے میں جاسم سے کہا۔

''لو سنبھلو......میں آ رہا ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے دو بیک اسٹیپ لیے پھر رنگ کے انداز میں وہ دو اسٹیپ آگے آیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہوا میں اچھلا اور لگ بھگ چھ فٹ بلندی کی ایک فلائنگ کک جاسم کو رسید کرنے کی کوشش کی۔

کوشش ان معنوں میں کہ یہ ''ایکشن'' اس کی سوچ کا غماز نہیں تھا بلکہ اس نے تو جاسم کے اکسانے اور للکارنے پر یہ جارحانہ قدم اٹھایا تھا گویا، اس نے جاسم کے لکھے ہوئے اسکرپٹ کے مطابق ''پرفارم'' کیا تھا اور...... جاسم وہاں کسی ڈرامے کی شوٹ کرنے کے لیے موجود نہیں تھا۔ اس نے یہ ''اسکرپٹ'' اپنے مدِمقابل کو شکار کرنے کے لیے ہی ''لکھا'' تھا۔

اس بندے نے بڑی پھرتی سے ہوا میں اچھل کر جاسم کو فلائنگ کک ماری تھی اور جاسم اس کے کسی بھی خطرناک حملے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار کھڑا تھا۔ اس شخص کا پاؤں جیسے ہی جاسم کے چہرے کے قریب آیا،

اس نے پہلو میں جھک کر اپنے دونوں ہاتھوں کا ایک خوفناک پُش حملہ آور کی تشریف پر آزمایا۔

اس کی کک کی رفتار اور بلندی دو ایسے عوامل تھے کہ وہ اپنے اس فعل کو واپسی کا راستہ نہیں دکھا سکتا تھا۔ جب جاسم نے اپنے چہرے کو اس کی کک سے بچانے کے لیے پہلو میں جھکائی دی تھی، اس وقت وہ شخص جاسم کے اوپر سے گزر رہا تھا اور اس مقام سے چھت کی لگار محض ایک فٹ دور تھی لیکن اس کی ''ایمرجنسی لینڈنگ'' کی نوبت ہی نہیں آئی۔ جاسم نے پہلو میں جھکنے کے ساتھ ہی حملہ آور کے کولہوں پر ایک طوفانی پُش بھی ''ثبت'' کر دیا تھا۔

جاسم کی اس ''حرکت'' میں اتنی زیادہ ''برکت'' پیدا ہوگئی کہ اسے فلائنگ کک مارنے کی خواہش رکھنے والا وہ غصیلا فائٹر ایک بھیانک چیخ مارتے ہوئے اپنے ''دیوان خانے'' سمیت چھت سے زمین کی سمت ''روانہ'' ہوگیا۔

یہ ایک طرح سے ہالی ووڈ کی، ماضی کی ایک موی کا ''ایکشن ری پلے'' بھی تھا۔ ''مارلو'' نامی اس موی میں ''بروس لی'' نے ایک بھتا وصولی والے شخص کا کردار کیا تھا۔ جب وہ موی کے ہیرو کے آفس میں وصولی کے لیے پہنچتا ہے تو ہیرو اسے اکساتے ہوئے اپنے آفس کی بالکونی میں لے جاتا ہے اور پھر وہ بالکونی کی ریلنگ پر چڑھ کر بروس لی سے کہتا ہے کہ اگر تم میں ہمت ہے تو مجھے فلائنگ کک مار کر دکھاؤ۔ بروس لی جوشِ جذبات میں کچھ ایسی ہی حرکت کر بیٹھتا ہے جیسی ابھی جاسم کے مدِمقابل نے کی تھی۔

''ہوٹل مینا'' کی چھت سے، سول ایوی ایشن کے مروجہ قوانین کی دھجیاں اُڑاتے ہوئے، ٹیک آف کرنے والی اس ''فلائٹ'' کا کیا انجام ہوا، جاسم کو اس سے ذرا سی بھی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بغیر پروں کے پرواز کرنے والے اس سرپھرے ''پکھیرو'' کی، درد میں ڈوبی ہوئی آخری چیخ کو ''انجوائے'' کرتے ہوئے سب کی نظر بچا کر ہوٹل سے باہر نکل آیا۔

جاسم جب ''ابوجعفر المنصور'' اسٹریٹ سے دور ہو رہا تھا تو اس نے ہوٹل کے دروازے پر بڑی افراتفری دیکھی۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا تھا لہٰذا وہ کان لپیٹ کر چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔ ان سنگین اور ہلاکت خیز لمحات پر یہ لائن فٹ اِن تھی...... جان بچی تو لاکھوں پائے اور...... جان ہے تو جہان ہے......!

ابوجعفر المنصور اسٹریٹ کو چھوڑنے کے بعد وہ نسبتاً کم روشن راستے پر ہولیا تھا۔ اس راہ پر اس کے دیکھے جانے کے امکانات بہت کم تھے۔ ابھی وہ دو ڈھائی سو گز ہی آگے بڑھا ہوگا کہ ایک کار اس کے پہلو میں آکر رک گئی۔ وہ کار اس کی عقبی جانب یعنی ہوٹل مینا کی طرف سے آئی تھی۔ جب مذکورہ کار اس کے نزدیک رکی تو وہ ہر قسم کی عسکری کارروائی کے لیے تیار ہوگیا۔

کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے اپنی سائڈ کا شیشہ گرانے کے بعد عربی میں استفسار کیا۔ ''جے بی! تم اپنی ایک شے بھولے جا رہے ہو......!''

جاسم عربی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں رواں تھا۔ اسیری کے زمانے میں اگر مراد دادا نے اسے فنِ حرب و ضرب سے روشناس کرایا تھا تو کامریڈ انور بیگ نے اسے عربی اور انگریزی سے آراستہ کیا تھا۔ کامریڈ متعدد زبانوں کے استعمال میں مہارت رکھتا تھا۔

ایک اجنبی کی زبان سے اپنے نام کا مخفف (جے بی) سن کر جاسم کو اُلجھن آمیز حیرت ہوئی تاہم اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ عربی ہی میں جواب دیا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں۔ آپ کون ہیں اور میری کون سی شے کا ذکر کر رہے ہیں......؟''

''میرا نام جہانگیر ہے......!'' اس شخص نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہاں کھڑے ہو کر زیادہ دیر بات کرنا تمہارے لیے ٹھیک نہیں۔ گاڑی کے اندر آجاؤ......''

بات کے اختتام پر اس نے ہاتھ بڑھا کر پسنجرز سائڈ کا دروازہ کھول دیا۔ جاسم کو دیارِ غیر میں کسی اجنبی کی زبان سے اپنے ''جے بی'' پکارے جانے پر جو حیرت ہوئی تھی وہ اس وقت تشویش میں بدل گئی جب کار والے نے اپنا نام ''جہانگیر'' بتایا۔ یہ تو ایک فرضی نام تھا جو جاسم نے ہوٹل مینا کی چھت پر، اپنے مدِمقابل کو گمراہ کرنے کی غرض سے استعمال کیا تھا۔ خیر، ان نامساعد لمحات میں جہانگیر کی پیشکش کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھی چنانچہ ایک پل سوچے بغیر وہ پسنجرز سائڈ والا دروازہ کھول کر گاڑی کے اندر بیٹھ گیا۔

''چلیں......؟'' جہانگیر نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہاں رکنا مناسب نہیں ہوگا۔''

''گاڑی تمہاری ہے۔ مجھے لفٹ بھی تم نے ہی دی ہے لہٰذا چلنے یا نہ چلنے کا فیصلہ بھی تم ہی کو کرنا چاہیے......'' جاسم نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں نے تو اس لیے تمہاری آفر قبول کر لی ہے کہ تم مجھے ایک مخلص اور ہمدرد انسان لگے ہو اور پھر......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

''اور پھر تم میرا نام بھی جانتے ہو اور میری کوئی شے بھی تمہارے پاس ہے۔''

''میں ایک ٹورسٹ گائڈ ہوں۔'' وہ اپنی گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے رسان بھرے لہجے میں بولا۔ ''یہاں نزدیک ہی ایک فلیٹ میں رہتا ہوں۔ میں اپنے ایک کلائنٹ ٹورسٹ کو اس کے ہوٹل پہنچا کر واپس آرہا تھا کہ ہوٹل مینا کی عقبی سڑک سے میرا گزر ہوا اور اسی وقت ہوٹل مینا کی چھت پر سے کسی نے بہ آواز بلند پکارا ''جہانگیر! کیچ دی شپ منٹ......'' میں نے گاڑی روک دی۔ اگلے ہی لمحے ایک بیگ میرے قدموں میں آکر گرا۔ میں نے مذکورہ بیگ کو اٹھا کر اپنی گاڑی کی ڈکی میں رکھ لیا......''

جہانگیر نامی اس شخص کی سنائی ہوئی کہانی پر جاسم کو بالکل یقین نہیں آیا۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ معجزات اور اتفاقات پر یقین نہ رکھتا ہو۔ ایشتار کی معیت میں اس نے معجزات اور اتفاقات سے کہیں آگے کے معاملات بھی مشاہدہ کیے تھے بلکہ ان واقعات کے لیے ''تجربہ کیے'' کے الفاظ زیادہ موزوں تھے مگر اس وقت جہانگیر اسے جو رُوداد سنا رہا تھا، اس میں جابجا خلا موجود تھے۔

''تو تم نے میری جس شے کا ذکر کیا ہے......!'' جاسم نے اسے گھیرنے کے عمل کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ وہی بیگ ہے جو ہوٹل مینا کی چھت سے پرواز کرتے ہوئے تمہارے پاس پہنچا تھا اور تم نے اسے اٹھا کر اپنی کار کی ڈکی میں رکھ لیا تھا؟''

''بالکل، یہی حقیقت ہے!'' وہ ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے اٹل لہجے میں بولا۔

''تم نے میرے پاس گاڑی روکنے کے بعد مجھے میرے نام سے پکارا تھا۔'' جاسم نے اس کی بیان کردہ ''حقیقت'' کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا......؟''

''میں نے تمہارے بیگ کو کھول کر دیکھا تھا......'' اس کے پاس ریڈی میڈ جواب موجود تھا۔ ''بیگ کے اندر تمہارا آئی ڈی کارڈ اور پاسپورٹ بھی رکھا ہوا ہے۔ میں نے تمہارا نام اور فوٹو انہی دستاویزات میں دیکھتے ہوئے میں نے تمہاری شکل کو اپنے ذہن پر نقش کرلیا اور تمہاری تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ پھر تم مجھے اس سڑک پر مل گئے۔ میں نے تمہیں پہچان لیا اور تمہارے نزدیک گاڑی روک کر تمہیں پکارا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ اب یہ نہیں پوچھنا کہ میں نے اندھیرے میں تمہیں پہچان کیسے لیا...... میں ایک پیشہ ور گائڈ ہوں، بھانت بھانت کے ٹورسٹس سے میرا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ انسانوں کی شناخت کے حوالے سے مجھے خاصا وسیع تجربہ حاصل ہے......!''

وہ بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے جاسم کو ''مطمئن'' کرنے کی کوشش کررہا تھا مگر جاسم اس کی فنکاری کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا تاہم اس نے جہانگیر کو اپنی ''جان کاری'' کا مطلق احساس نہیں ہونے دیا اور معتدل انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے، میں تم سے وہ نہیں پوچھوں گا جس کا تم نے ذکر کیا لیکن اس سے وابستہ ایک سوال کا جواب تو تمہیں دینا ہی پڑے گا......!''

''کون سا سوال......؟'' وہ جاسم کی طرف دیکھے بغیر چونکے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''پاسپورٹ اور آئی ڈی کارڈ میں میرا نام ''جاسم باری'' درج ہے......'' جاسم نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اور تم نے مجھے ''جے بی'' کے نام سے پکارا تھا......؟''

''میرے ذہن نے خود بہ خود تمہارے نام کی ''شارٹ فارم'' بنالی تھی......'' وہ عیاری بھرے لہجے میں بولا۔ ''اگر تمہیں یہ مختصر نام پسند نہیں آیا تو میں معافی چاہتا ہوں......!''

''کیا واقعی تمہارا نام جہانگیر ہے؟'' جاسم نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

وہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اگر تمہیں کوئی شک ہے تو میں اپنا آئی ڈی کارڈ اور ڈرائیونگ لائسنس دکھا سکتا ہوں......!''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' جاسم نے بیزاری سے کہا۔

اس وقت رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور وہ پردیس میں تھا۔ رات کا باقی حصہ وہ مختلف سڑکوں پر سرگشتی کرتے نہیں گزار سکتا تھا اور اپنی آئی ڈی کے ساتھ کسی بھی ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس میں ''چیک ان'' کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اگر وہ ''جہانگیر'' اس پر اسی طرح مہربان رہتا تو اس کے فلیٹ میں شب بسری کا بندوبست ہوسکتا تھا۔

''کیا تم اپنے فلیٹ پر اکیلے ہی رہتے ہو یا......!'' جاسم نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''بالکل اکیلا!'' اس نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا پھر سوال کیا۔ ''تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو......؟''

''رات بہت زیادہ ہوگئی ہے......''

دبو

"لگتا ہے آج واقعی بڑی گرمی ہے"

"ہاں، میں جانتا ہوں۔" وہ جاسم کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی منحوس انداز میں بولا۔ "اسی لیے میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جارہا ہوں۔ تم بے فکری سے میرے فلیٹ پر رات گزار سکتے ہو۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ بھائی!" جاسم نے تہ دل سے کہا۔ "میں صبح ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔"

جہانگیر نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

جاسم کا دھیان کامل کی طرف چلا گیا۔ کامل سے آخری بار اس کی بات آج رات کے ابتدائی حصے میں ہوئی تھی اور اسی گفتگو کے بعد ہی جاسم پر یہ اُفتاد نازل ہوئی تھی۔ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کامل کی خیریت معلوم کرنا چاہیے۔ وہ ہوٹل کے کمرے سے نکلتے وقت اپنا سیل فون بیڈ سائڈ ٹیبل سے اٹھانا بھول گیا تھا۔

"میں اپنے ایک دوست کو کال کرنا چاہتا ہوں لیکن میرا سیل فون ہوٹل کے کمرے ہی میں رہ گیا ہے۔" جاسم نے اپنے پہلو میں موجود جہانگیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا میں تمہارے سیل فون سے ایک نمبر ڈائل کرسکتا ہوں؟"

جہانگیر نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ "میں کسی قسم کا کوئی بھی گیجٹ استعمال نہیں کرتا۔"

جاسم کے دماغ کو گیارہ ہزار وولٹ کا جھٹکا لگا اور ایشتار کی کہی ہوئی باتیں اس کی یادداشت میں طوفانی رفتار سے گردش کرنے لگیں......!

☆☆☆

"کاسل ٹاؤن" کے مقامی وقت کے مطابق، رات کے گیارہ بجے تھے۔ اس قدیم اور عظیم عالی شان قلعہ نما عمارت کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا تھا کہ ایک ہی تاریخ میں سلور کوئین کو دو بار میٹنگ کال کرنا پڑی ہو۔ آج یعنی یکم مارچ کی دوپہر میں گیارہ بجے وہ ایک اجلاس کی صدارت کر چکی تھی جس میں جاسم کی ذات کے حوالے سے بہت اہم فیصلے کیے گئے تھے اور اب...... ٹھیک بارہ گھنٹے کے بعد، رات گیارہ بجے ایک بار پھر میٹنگ بلانا پڑ گئی تھی اور اس افراتفری کا سبب تھا، جاسم باری عرف "جے بی" پاکستانی!

جاسم نے لگ بھگ تین گھنٹے پہلے (جب استنبول اور تبوک میں رات کے گیارہ، ساڑھے گیارہ کا وقت تھا) تبوک کے تھری اسٹار ہوٹل ”مینا“ کے مختلف حصوں میں وہ ”گل افشانی“ کی تھی کہ سلور کوئین اور اس کے اشاروں پر حرکت کرنے والے دجال کے خدمت گاروں کو ”بے بہا“ ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ بقول کسے، وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے کیونکہ جاسم کی جانب سے پھینکے جانے والے ”گلوں“ میں خوشبو تھی اور نہ ہی رعنائی۔ وہ صرف اور صرف تباہی اور بربادی کے پیامبر تھے کیونکہ ان کے اندر آگ اور بارود بھرا ہوا تھا۔ گویا...... جاسم نے استنبول کے بعد تبوک میں بھی دجال کے پیروکاروں کو وخت ڈال دیا تھا۔

سلور کوئین کی حالت دیدنی تھی۔ اس کے چہرے سے شکست خوردگی، غصے کی شکل میں عیاں تھی۔ تین معمر یہودی اکابرین اس کے سامنے گردنیں جھکائے خاموش بیٹھے تھے اور وہ آڈیو وڈیو لنک پر رائن نامی ایک پختہ عمر شخص کی کلاس لے رہی تھی......!

”مسٹر رائن! تنظیم میں آپ کا درجہ ڈیوڈ سے اوپر ہے اسی لیے ہم نے جے بی کا کیس آپ کے سپرد کیا تھا......“ وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی۔ ”لیکن تبوک میں جو کچھ ہوا، وہ افسوسناک ہی نہیں بلکہ انتہائی شرمناک بھی ہے۔ آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟“

”تھینک یو ویری مچ میم کہ آپ نے مجھے صفائی کا موقع دیا۔“ رائن نے مؤدب انداز میں جواب دیا۔ ”میرا پورا ریکارڈ آپ کے سامنے ہے۔ میں نے اپنی تنظیم کو ہمیشہ بیسٹ رزلٹس دیے ہیں لیکن مجھے کہنے دیجیے کہ آج سے پہلے ہمارا واسطہ انسانوں سے تھا اور اب......!“

وہ بولتے بولتے رکا تو سلور کوئین نے استعجابیہ لہجے میں استفسار کیا۔ ”مسٹر رائن! آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔ کیا جے بی کوئی انسان نہیں ہے؟“

”فی الحال میں اتنا ہی کہوں گا کہ یا تو جے بی زمینی مخلوق نہیں ہے اور یا پھر کوئی غیر زمینی مخلوق اس کی پشت پناہی کر رہی ہے۔“ رائن نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں چند ناقابلِ یقین زمینی حقائق آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ مجھے امید ہے، آپ کسی نتیجے کو بہ آسانی پالیں گی......!“

”میں سن رہی ہوں۔“ سلور کوئین نے تکدر آمیز لہجے میں کہا۔ ”آپ اپنا بیان جاری رکھیں۔“

”میتھیو میرا برسوں کا آزمایا ہوا تجربہ کار جنگجو، مارشل آرٹس کا ماہر اور شارپ شوٹر تھا۔ اس نے ہمیشہ مجھے کامیابی کی نوید سنائی ہے۔“ رائن گمبھیر انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تنظیم کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں، میتھیو کی سرکردگی میں اپنے بہترین بندوں کی ایک ہتھیار بند ٹیم ہوٹل مینا کی طرف بھیجی تھی۔ ان لوگوں نے ہوٹل کے اندر اور باہر تمام اہم پوزیشنز سنبھال لی تھیں۔ جے بی کے بچنے کے امکانات صفر سے زیادہ نہیں تھے لیکن ہوا کیا......!“ وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”جب دو بندے اس کے کمرے تک پہنچے تو جے بی نے ان سے بے سروپا اور احمقانہ باتیں کی تھیں جیسا کہ اس نے دروازہ کھولنے سے صاف انکار کرتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ خودکشی کرنے کے ارادے سے اس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ ہمارے بندوں نے فائر کر کے روم کے دروازے کا لاک اڑا دیا لیکن جب وہ کمرے کے اندر داخل ہوئے تو جے بی نے لائٹ آف کر دی جس کے نتیجے میں وہ بندے وقتی طور پر بے بس ہو کر رہ گئے اور اسی قلیل مدت میں جے بی نے ان کا دھڑن تختہ کر ڈالا۔ ان دونوں زخمی افراد کے بیان کے مطابق، جے بی تاریکی میں ان کی ایسے درگت بنا رہا تھا جیسے اسے اندھیرے میں بھی صاف نظر آ رہا ہو۔ وہ دعوے سے کہہ رہے ہیں کہ جے بی تاریکی میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔“

”ایسے ہی بعض شواہد ہمیں جانکایا (انقرہ) کی ایک ریسرچ لیبارٹری سے بھی ملے ہیں۔“ سلور کوئین نے کہا۔ ”بہرحال، آپ بات جاری رکھیں۔“

کسی انسان کا تاریکی میں دیکھ لینا ایک غیر معمولی صلاحیت ہے میم!“ رائن گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”ایسا ہی ماورائی معاملہ اس کے سیل فون کا بھی ہے۔ رات کے ابتدائی حصے میں جے بی نے اپنے پاکستانی دوست کامل سے بات کی تھی اور اسی کال کی وجہ سے ہم جے بی کی کرنٹ لوکیشن کو ٹریس کر پائے تھے۔ وہ ہڑبونگ میں اپنا سیل فون ہوٹل کے کمرے ہی میں چھوڑ گیا تھا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے سیل فون میں کوئی ٹیکسٹ یا کال ریکارڈ موجود ہے اور نہ ہی فون بک میں ایک بھی کانٹیکٹ نمبر۔ ایسا لگتا ہے، ہوٹل سے نکل جانے کے بعد اس نے کسی ماورائی طاقت سے اپنے سیل فون کا ہر قسم کا ریکارڈ صاف کر دیا ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ......“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

”ہوٹل مینا کی چھت پر اس نے ایک بالکل فلمی ہیرو

جیسا کردار ادا کیا ہے۔ اسے ہمارے درجن بھر لوگوں نے اپنے نشانے پر لے رکھا تھا مگر مجال ہے کہ اس کے چہرے پر ایک ذرا سی بھی پریشانی نظر آئی ہو۔ وہ میتھیو کے ساتھ ایسے مکالمے بازی کررہا تھا جیسے وہاں کسی فلم کی شوٹ چل رہی ہو اور میتھیو اس فلم کا ولن ہو۔ اس گفتگو کے آخر میں جے بی نے اپنا صندلیں مقدس باکس والا بیگ چھت سے نیچے پھینک دیا تھا جیسے اسے یقین ہو کہ کوئی نادیدہ طاقت بیگ کو زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی، ہوا میں اچک لے گی اور بالکل ہوا بھی یہی میم......!''

رائن ایک مرتبہ پھر تھما لیکن سلور کوئین نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میم! میتھیو کی ٹیم آن واحد میں ہوٹل کی چھت سے نیچے پہنچی اور ان لوگوں نے ہوٹل کے عقبی حصے کا چپا چپا چھان مارا مگر وہ بیگ کہیں نہیں ملا البتہ تھوڑی ہی دیر کے بعد میتھیو، ایک دل خراش چیخ کے ساتھ چھت سے نیچے آیا اور زمین پر گرتے ہی اس کی موت واقع ہوگئی۔ یہ ساری معلومات اس ٹیم میں شامل ''لوکس'' نامی ایک شخص نے فراہم کی ہیں اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے لوکس کے بیان کی تصدیق بھی کی ہے۔ میتھیو، جے بی کو اپنے ساتھ چھت سے نیچے لانا چاہتا تھا مگر جے بی نے کسی فٹ بال کے مانند اسے نیچے پھینک دیا۔ میتھیو اتنا گیا گزرا بھی نہیں تھا کہ وہ جے بی کے سامنے ٹک نہ پایا ہو۔ وہ بلیک بیلٹ سیون ڈان تھا اور کئی انٹرنیشنل ٹورنامنٹس کا ونر بھی۔ وہ کوئی روئی بھرا ہوا گڈا نہیں تھا جسے جے بی نے اٹھا کر چھت سے نیچے پھینک دیا...... اَن بلیو ایبل میم...... اور آخری بات......!'' وہ ایک مرتبہ پھر سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا۔ اس کے بعد اپنا بیان مکمل کردیا۔

''ہوٹل کے اندر اور باہر حساس سیکیورٹی کیمراز نصب ہیں لیکن ان کیمراز کی ریکارڈنگ میں جے بی کی ایک بھی فوٹیج موجود نہیں ہے۔ وہ کسی بھی ذریعے اور کسی بھی راستے سے ہوٹل سے باہر نکلتا تو کسی نہ کسی کیمرے کی آنکھ اسے ضرور دیکھ لیتی۔ ایسا لگتا ہے، وہ بھاپ بن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔''

''ٹھیک ہے مسٹر رائن......!'' اس کے خاموش ہونے پر سلور کوئین نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ اپنا روٹین کا کام جاری رکھیں۔ مسٹر جیکب آپ کو بتا دیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے۔''

قبل اس کے کہ رائن جواب میں کچھ کہتا، وہ صوتی اور بصری رابطہ اختتام پذیر ہوگیا۔ سلور کوئین نے اپنے تین معتمدین کھوسٹ یہودی اکابرین کی طرف دیکھتے ہوئے سوال اٹھایا۔

''ہم رائن کی بیان کردہ کہانی پر کس حد تک یقین کر سکتے ہیں......؟''

''ففٹی ففٹی میم!'' جیکب نے متحمل انداز میں جواب دیا۔ ''اس امر کی تو ہمارے پاس کئی مثالیں اکٹھا ہو چکی ہیں کہ کوئی نادیدہ اور پُراسرار قوت جے بی کا ساتھ دے رہی ہے جیسا کہ اس کا ٹریکنگ ڈیوائس سے چھٹکارا پانا، عامنک پیرامڈ کے تہ خانے سے منقش صندلیں باکس کا غائب ہوجانا اور ہابوٹیمپل سے عامنک پیرامڈ تک جانے والے زیرِزمین راستے کا خودبخود بند ہوجانا اور پھر طلال حسنی کے ولا میں پیش آنے والا ناقابلِ یقین واقعہ۔ جے بی نے نہ صرف جرمن شیفرڈ ڈاگز کو ورغلایا تھا بلکہ انہیں گھیر کر موت کے گھاٹ بھی اتار دیا اور...... ڈیوڈ کی بھیجی ہوئی ٹیم کا رونگٹے کھڑے کردینے والا خاتمہ...... اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو کوئی نادیدہ طلسماتی طاقت اس کی مدد کررہی ہے اور یا پھر اس نے خود کوئی پُراسرار جادوئی عمل سیکھ لیا ہے لیکن یہ سوچنا کہ وہ ہوا میں تحلیل ہونے کا ہنر جانتا ہے، ہضم ہونے والی بات نہیں کیوں کہ......'' اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی پھولی ہوئی سانس کو اعتدال پر لانے کے بعد گویا ہوا۔

''کیونکہ اگر اس کے اندر اچانک غائب ہوجانے کی صلاحیت ہوتی تو پھر اسے ''مینا'' کے کمرے میں ہمارے دو بندوں اور کوریڈور میں تین افراد کے ساتھ مار اماری کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی اور نہ ہی وہ زینے پھلانگتے ہوئے ہوٹل کی چھت پر پہنچتا اور پھر بیک وال پر نصب ڈرین پائپس کے ذریعے وہ وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ یہ سارے کام تو وہ ہوا میں تحلیل ہو کر بہ آسانی کرسکتا تھا......''

کھاپڑ بڈھا بہت دور کی کوڑی لایا تھا۔ نارمن نے جیکب کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ''میم، جیکب کی وضاحت میں وزن ہے۔ لگتا ہے، رائن جے بی سے کچھ زیادہ ہی متاثر بلکہ خوف زدہ ہوگیا ہے۔''

''کچھ بھی ہے مگر ہمیں جے بی کو ہلکا نہیں لینا چاہیے......'' اولیور نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''بہر حال، وہ کوئی عام انسان نہیں ہے۔ اس نے ڈیوڈ

اور دائن جیسے گھاگ اور تجربہ کار لوگوں کو جم کر نکر دی ہے۔ ہمیں جے بی کے لیے بنائی گئی پالیسیوں پر از سر نو غور کرنا ہو گا ورنہ ہم کبھی اس کی پرچھائیں کو بھی نہیں پاسکیں گے۔''

''ہوں!'' سلور کوئین نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جے بی کا معاملہ بڑا گمبھیر ہوتا جارہا ہے۔''

یادھر سلور کوئین کی بات مکمل ہوئی، اُدھر اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ڈسپلے پر نگاہ ڈالی اور ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے انداز و اطوار سے بے چینی اور اضطرار جھلک رہا تھا۔ اس نے اپنے خاص نائبین پر سرسری سی نگاہ ڈالی پھر یہ کہتے ہوئے وہ اس ہال سے نکل کر اپنے کمرائے خاص کی جانب بڑھ گئی۔

''میں ابھی آتی ہوں......!''

سلور کوئین کے جانے کے بعد وہ تینوں معمر یہودی اکابرین بے حس و حرکت بیٹھے اپنی لیڈی باس کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اہرام مصر میں متمکن حنوط شدہ ممیز ہوں یا پھر لندن کے ''مادام تساؤ'' میوزیم میں ایستادہ مومی مجسمے......!

سلور کوئین چند منٹ کے بعد ہی لوٹ آئی۔ وہ اپنی عالیشان اور آرام دہ کرسی پر براجمان ہونے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ہماری ہائی کمان نے جے بی کی پُراسراریت یا اس کے نادیدہ مددگار کا پتا لگا لیا ہے......'' اس کے چہرے پر سکون اور اطمینان کے تاثرات تھے۔ ''اور یہ کام ہمارے ''قبالہ'' کے ماہرین نے انجام دیا ہے، جے بی کی مدد کرنے والا کوئی اور نہیں، بلکہ وہ ہمارا ہی ایک باغی ہے۔ قبالہ کے ماہرین نے بڑے وثوق کے ساتھ بتایا ہے کہ جے بی کے حوالے سے ان تمام ناقابلِ یقین اور حیرت انگیز واقعات کے پیچھے کسی زمینی نہیں بلکہ کسی خلائی مخلوق کا ہاتھ ہے۔ یہ لیڈ مل جانے کے بعد ہائی کمان نے ''ایریا۔ ففٹی ون'' والے ریسرچ سینٹر والوں کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تو انہوں نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ وہ لوگ نر ریچھ اور مادہ انسان (عورت) کے جنسی ملاپ سے جو ''ایلینز'' تیار کر رہے ہیں، جے بی کا مددگار ان میں سے ایک ہو سکتا ہے۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے اس زیرِ ریگ ریسرچ سینٹر پر ''اختلاطِ غیر نفساں'' کے ذریعے ایک ایسی مخلوق (ایلینز) تیار کی جارہی ہے جو دیکھنے میں انسان اور جانور کی ملی جلی شکل ہو گی لیکن طاقت، ذہانت اور کارکردگی میں وہ انسان و حیوان سے ہزار گنا زیادہ ہو گی۔ پچھلے دنوں......!'' وہ لمحے بھر کو رکی پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی۔

''پچھلے دنوں ایریا۔ ففٹی ون والے ریسرچ سینٹر پر جن ایلینز کی ٹیسٹ ٹریننگ چل رہی تھی، ان میں سے ایک ایلین حد درجہ غصیلا اور خودسر تھا۔ اس نے ایک ڈاکٹر کو شدید نقصان پہنچایا اور سینٹر سے غائب ہو گیا۔ اس باغی ایلین کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ ریسرچ سینٹر کے منتظمین اور ہماری ہائی کمان کا خیال ہے کہ مذکورہ ایلین جے بی سے جاملا ہے اور ہمارے خلاف وہ جے بی کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے۔ اس قسم کے محیر العقول واقعات وقوع پذیر کرنا اس ایلین کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ مذکورہ ایلین کا نام ''ٹوناف'' ہے۔ ویسے تو تمام اصلی ایلینز ایک جیسے ہی نظر آتے ہیں لیکن ہم نے عورت اور ریچھ کے اختلاط سے جو تجربہ کیا ہے، وہ اصلی خلائی مخلوق سے قدرے مختلف ہے۔ اس کے اندر بہ یک وقت انسان اور حیوان کی جھلک نظر آئے گی۔ بہرحال، ایک دو روز میں ''ایریا۔ ففٹی ون'' والے ہمیں ''ٹوناف'' کی تصاویر مہیا کر دیں گے۔ اس کے بعد ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔''

سلور کوئین نے اپنی ہائی کمان اور ریسرچ سینٹر والوں کے باہمی خیالات کی جو تفصیل بیان کی تھی، اس میں گم رہی جس میں بکواسیات کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ البتہ...... قبالہ کے ماہرین کی علمی تحقیق صد فیصد درست تھی کہ جاسم کی مدد کرنے والا کوئی زمینی انسان نہیں بلکہ وہ کوئی خلائی مخلوق ہے اور یہ ''فتوئی'' ایشتار پرفٹ اِن تھا۔ باقی سب اندازے، مفروضے اور نتیجے...... لن ترانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

''قبالہ'' کی حقیقت اور اثر پذیری سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دنیا کا سب سے زیادہ خطرناک افسوں ہے۔ مشہور سامری جادوگر اسی سحر کا ماہر تھا۔

''ان حالات میں جے بی کے حوالے سے ہائی کمان نے کیا لائحہ عمل تیار کیا ہے میم؟'' سلور کوئین کے خاموش ہونے پر جیک نے مؤدب لہجے میں استفسار کیا۔

''یروشلم کی نئی پالیسی دوٹوک اور واضح ہے......!'' سلور کوئین نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''جاسم عرف جے بی کو اب دوست نہیں بنانا بلکہ اسے ختم کرنا ہے اور اس کے ساتھ ہی ٹوناف کو بھی......!''

''اور مقدس صندلیں باکس کا کیا میم؟'' نارمن پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''میرا خیال تھا اس نے فقط ایک سکہ نگلا ہے''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ اس نے صرف ماچس ہی مانگی تھی''

''ہائی کمان کو اس بات کا یقین ہے کہ وہ منقش طلسماتی اور کرشماتی باکس یا تو جے بی کے پاس ہے اور یا پھر اس کی مدد کرنے والے ٹوناف کے قبضے میں۔ انہیں نیست و نابود کرنے سے پہلے ہمیں وہ صندلیں باکس بھی حاصل کرنا ہو گا......''

''میم! میرے نمبر پر رائن کی کال آ رہی ہے......'' اولیور نے کہا۔

''کال اٹینڈ کریں اور فون کو اسپیکر پر ڈال دیں......'' سلور کوئین نے سپاٹ آواز میں کہا۔

اگلے ہی لمحے اولیور کے سیل فون سے رائن کی آواز اُبھری۔ ''سر! میتھیو کی ٹیم کے ایک رکن لوکس نے تبوک سے چند اہم باتیں بتائی ہیں۔ میں براہِ راست میم سے رابطہ نہیں کر سکتا۔ یہ معلومات آپ اُن تک پہنچا دیجیے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اولیور نے مختصر جواب دیا۔

''لوکس کے مطابق، اگرچہ ہوٹل مینا کے اندر، باہر اور سڑکوں کے مختلف مقامات پر نصب سیکیورٹی کیمراز نے جے بی کے فرار کو ریکارڈ نہیں کیا لیکن ایک شب بیدار راہ گیر نے جے بی کے قد کاٹھ اور حلیے والے ایک نوجوان کو ایک کار میں بیٹھتے اور کار کو تبوک کے مضافات کی طرف جاتے دیکھا تھا'' رائن نے رپورٹ پیش کرنے والے انداز میں بتایا۔ ''مذکورہ کار کا نمبر اتنا آسان تھا کہ اس راہ گیر کی یادداشت میں محفوظ ہو گیا۔ ہم نے متعلقہ محکمے کی مدد سے اس کار کے مالک کا نام اور پتا نکلوا لیا۔ اس شخص کا نام مکرم شیخ ہے اور وہ تبوک کے مضافات میں واقع ایک اوسط درجے کے فلیٹ میں رہتا ہے۔ میں نے لوکس کے ساتھ دو بندوں کو مکرم شیخ کی جانب دوڑایا اور ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ مکرم شیخ ایک ٹورسٹ گائیڈ ہے اور آج شام کے بعد اس نے اپنی گاڑی نکالی ہی نہیں کیونکہ ایک تو اسے تیز بخار تھا اور دوسرے پچھلے دوروز سے کوئی ٹورسٹ اس کا کلائنٹ نہیں بنا...... یعنی ایک بار پھر پُراسرار صورتِ حال سے سامنا......!''

''کیا لوکس مکرم شیخ کی کہانی سن کر واپس آ گیا تھا یا اس نے اس کے فلیٹ کے اندر بھی جھانکنے کی زحمت گوارا کی تھی؟'' اولیور نے ایک اہم سوال کیا۔

''سر! لوکس اور اس کے ساتھیوں نے مکرم شیخ کے بیان پر یقین نہیں کیا بلکہ اس کے فلیٹ کے ہر کونے کھدرے کو بھی اچھی طرح کھنگالا ہے۔'' رائن نے معتدل انداز میں بتایا۔ ''اس کے علاوہ اس کے پڑوسیوں سے بھی پوچھ تاچھ کی ہے۔ اس تحقیق اور تفتیش کے مطابق، مکرم شیخ شام کے

بعد اپنے فلیٹ سے باہر نہیں نکلا اور اس کی گاڑی بھی مسلسل کار پارکنگ میں موجود ہے......!"

"او کے...... آپ کی یہ رپورٹ میم تک پہنچا دی جائے گی۔" اولیور نے معتدل انداز میں کہا اور سیلولر رابطہ موقوف کر دیا۔

رائن کا بیان کردہ یہ واقعہ ان واقعات کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا جو جاسم کی ذات کے حوالے سے اب تک رونما ہو چکے تھے۔ سلور کوئین نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی پھر اپنے معتقدین کو باری باری مخاطب کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"مسٹر جیکب! جاسم، ناجیہ، طلال حسنی، نشا اور استنبول کے پولیس کمشنر قاموس ترک کی ذمے داری میں آپ کو سونپ رہی ہوں۔ یہ تو پتا چل چکا کہ جے بی اس وقت استنبول میں نہیں ہے لیکن جیسا کہ طلال حسنی اور قاموس ترک اسے ہر قسم کی آسانیاں فراہم کر رہے ہیں۔ لہٰذا جے بی اور بلیک کیٹ کے ان لوگوں سے رابطے کے امکانات روشن ہیں۔ اس کے علاوہ لیلیٰ حسینی اور راشد فیضی کو بھی آپ ہی نے ٹیکل کرنا ہے۔ وہ دونوں جے بی کے لیے اپنے دلوں میں بہت زیادہ نفرت اور عداوت رکھتے ہیں۔ جے بی کی تلاش کے لیے انہیں استعمال کیا جا سکتا ہے اور نشا صباحی کو بھی...... وہ ائر ہوسٹس جے بی کا ساتھ چاہتی ہے لہٰذا اگر آپ نے اس کی کڑی نگرانی کروائی تو وہ جب بھی جے بی کے نزدیک ہوگی، اس سے پہلے ہم جے بی کی گردن دبوچ لیں گے۔"

"میم! ہر حال میں آپ کے احکامات کی تعمیل ہوگی بلکہ میں سمجھتا ہوں، کل صبح سے ہمارا کام بہت آسان ہونے والا ہے......" جیکب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کل یعنی دو مارچ کی صبح استنبول، تبوک اور کراچی کے اخبارات میں جاسم کا "تلاشِ گمشدہ" والا اشتہار شائع ہو جائے گا۔ ون ملین امریکی ڈالرز کا انعام حاصل کرنے کے خواہش مند لوگ جاسم کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں، دو مارچ کا سورج غروب ہونے سے پہلے ہی ہم جے بی کی درست لوکیشن کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"آپ نے آج دن والی میٹنگ میں بھی یہ آئیڈیا دیا تھا اور میں نے اس کی منظوری بھی دے دی تھی......!" سلور کوئین نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ "لیکن تھوڑی دیر پہلے تبوک کے ہوٹل مینا میں جو واقعہ پیش آیا ہے، اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جے بی اور کامل کی سیلولر ٹاک سے ہم نے جے بی کی کرنٹ لوکیشن معلوم کر لی تھی لیکن ایک بار پھر وہ ہمیں ٹھینگا دکھا کر صاف بچ نکلا۔ اس سے یہ سیکھ ملتی ہے کہ صرف جے بی کی درست لوکیشن کا پتا چلا لینا کافی نہیں ہے اور جہاں تک اخبارات میں اس کے اشتہارات شائع ہونے کی بات ہے تو یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ وہ اشتہار لازماً جے بی کی نگاہ سے بھی گزرے گا جس کے بعد وہ یقیناً پہلے سے زیادہ ہوشیار اور محتاط ہو جائے گا۔ بہرکیف، اشتہار والے آئیڈیا کو آزمانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ عین ممکن ہے کہ جے بی کی اس اشتہار پر نظر پڑنے سے پہلے ہی کسی انعام کے متمنی کا فون آ جائے......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک طویل آسودہ سانس خارج کی پھر نارمن اور اولیور کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"میں نے استنبول مسٹر جیکب کے سپرد کیا ہے تو کراچی مسٹر نارمن کے حوالے ہے اور تبوک مسٹر اولیور کو دیا جاتا ہے۔ آپ تینوں میرے سالہا سال کے آزمائے ہوئے قابلِ بھروسا انسان ہیں۔ آپ اپنی ٹیموں کو فوراً موبیلائز کریں۔ میں آپ کو فری ہینڈ بہ الفاظ دیگر "لائسنس ٹو کِل" دے رہی ہوں۔ آپ کو جو بھی کرنا ہے، بے فکر ہو کر کریں۔ جب جے بی اور ٹو ناف کو ختم کرنے کا فیصلہ ہو چکا تو پھر کیسی مصلحت اندیشی اور کہاں کا دوستانہ رویہ...... جس بھی شخص کے دل اور دماغ میں جے بی کی ہمدردی بھری ہوئی ہے، اسے پہلی فرصت میں اٹھوا کر کڑی تفتیش سے گزاریں۔ کسی نہ کسی کی زبان تو کھلے گی اور ہمیں جے بی تک رسائی کا کوئی راستہ مل جائے گا۔ ہر آپشن ٹرائی کریں۔ ہمیں ہر حال میں اور ہر قیمت پر وہ مقدس منقش صندلیں باکس چاہیے اور اس باکس کے حصول کے راستے میں جو بھی آئے، اسے بیدردی سے کچل ڈالو......!"

"او کے میم......!" وہ تینوں معمر فتنہ پرداز اور کہن سال یہودی اکابرین اپنی مالکن اور دجال کی منظورِ نظر سلور کوئین کے احکاماتِ ابلیسی پر صاد کرتے ہوئے یک زبان ہو کر بولے۔ "ہم آپ کو مایوس کریں گے اور نہ ہی آپ کے سامنے خود کو شرمندہ۔ جے بی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے گا......!"

"یروشلم اور بویریا آپ لوگوں سے خوش ہوئے۔" سلور کوئین نے رعونت اور نخوت بھری آواز میں کہا۔ "جلد یا بہ دیر...... جیت ہماری ہی ہوگی......"

جیکب، اولیور اور نارمن نے اپنے سروں کی اثباتی

جنبشوں سے دجال کی واسی سلور کوئین کے عزائم مردودہ پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی......!

☆☆☆

طلال حسنی کی ہمیشہ سے یہ عادت تھی کہ وہ صبح ناشتے پر اُس روز کا تازہ اخبار ضرور دیکھتا تھا۔ دو مارچ کی صبح طلال اور اس کا بیٹا اسد حسنی ناشتے کی میز پر موجود تھے اور جج صاحب حسبِ معمول ناشتے کے ساتھ ہی اخبار کے مطالعے میں بھی مصروف تھے۔

اخبار کا فرنٹ پیج تو کل صبح والے خون ریز واقعے کی خبروں سے بھرا ہوا تھا اور اس واقعے کا تعلق حسنی کے اسی ولا سے تھا جہاں وہ اس وقت بیٹھا ناشتا کر رہا تھا۔ ان خبروں کے مطابق، عدنان طوسی کے غنڈوں نے طلال حسنی کے ولا پر چڑھائی کر دی تھی اور پولیس نے بروقت وہاں پہنچ کر اس معاملے کو بُردباری سے ''ہینڈل'' کر لیا تھا۔ گویا قاموس ترک نے طلال حسنی کے کہنے پر جاسم کی خواہش کو پورا کر دیا تھا۔ اس خوں چکاں واقعے کی حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ اس حقیقت سے صرف چار افراد واقف تھے یعنی جاسم، قاموس ترک، طلال حسنی اور اس کا بیٹا اسد حسنی یا پھر دجالی سیٹ اَپ کے وہ لوگ، جاسم نے جن کے مکروہ چہروں پر کالک پوت دی تھی۔

حسنی نے اخبار پلٹا تو بیک پیج پر چھپے ہوئے ایک اشتہار کو دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔ مذکورہ اشتہار باکس بنا کر بہت نمایاں شائع کیا گیا تھا۔ اس اشتہار کا مضمون کچھ اس طرح تھا:

''یہ ایک ارب پتی نوجوان جاسم باری عرف جے بی ہے۔ جے بی پچھلے ایک ہفتے سے لاپتا ہے۔ اس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔ اگر جے بی کسی بھی شخص کو نظر آئے تو درج ذیل نمبر پر رابطہ کرے۔ جے بی کی درست پن لوکیشن بتانے والے کو مبلغ ایک ملین امریکی ڈالرز بہ طور انعام دیے جائیں گے۔''

اشتہار کے آخر میں ایک سیل نمبر جلی ہندسوں میں چمک رہا تھا اور اشتہار کے اوپر جاسم کی حالیہ تصویر بھی موجود تھی۔

طلال حسنی نے جو پڑھا، وہ حد درجہ تشویشناک تھا مگر اس نے اپنے چہرے کے تاثرات سے اسد کو کچھ بھی محسوس نہیں ہونے دیا۔ ایک بات تو طے تھی کہ وہ اشتہار جاسم کے کسی خیر خواہ نے شائع نہیں کرایا تھا اور انعام کی مد میں جس خطیر رقم کی پیشکش کی گئی تھی، وہ جاسم کے دجالی دشمنوں کی جانب اشارہ کرتی تھی۔

اس نے اپنے اندرونی جذبات اور بیرونی تاثرات پر قابو رکھتے ہوئے ناشتا ختم کیا پھر ڈائننگ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے معتدل انداز میں اسد سے کہا۔

''مائی سن! میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ تم اطمینان سے ناشتا کرو۔ باقی باتیں بعد میں......!''

اسد حسنی نے مختصر جواب دیا۔ ''او کے!''

طلال حسنی اخبار کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں آ گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس ولا کی حالت دیکھ کر کوئی یقین کرنے کو تیار نہ ہوتا کہ اٹھائیس گھنٹے قبل وہاں پر آگ اور خون کا کھیل کھیلا گیا تھا۔ گزشتہ روز پولیس نے دوپہر سے پہلے اپنی کارروائی مکمل کر لی تھی اور شام سے پہلے حسنی کے ملازمین نے پولیس کے جوانوں کے ساتھ مل کر اس ولا کو ایک دم پہلے جیسا کر دیا تھا۔

بیڈ روم میں سیٹل ہونے کے بعد حسنی نے جاسم کو کال کرنے کی کوشش کی۔ کوشش ان معنوں میں کہ اس کے بار بار ٹرائی کرنے کے باوجود بھی دوسری جانب کامل خاموشی چھائی رہی۔ اس صورتِ حال نے حسنی کو پریشان کر دیا۔ جاسم نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک خاص الخاص مشن پر تبوک جا رہا ہے۔ اخبار والے اشتہار کو دیکھ کر یہی سمجھ میں آ رہا تھا کہ جاسم نے تبوک یا نیوم میں اپنے دشمنوں کے دانتوں پر وافر مقدار میں لیموں نچوڑ ڈالے تھے اور انہیں بھاری نقصان سے دوچار کر کے منظر سے غائب ہو گیا تھا اسی لیے دجال کے پیروکار اشتہار کے ذریعے تگڑی رقم کا لالچ دے کر جاسم کو تلاش کرنے کی مہم میں لگے ہوئے تھے۔

ایک طرف جاسم کے ''معرکہ جات'' کے بارے میں سوچ کر حسنی کا دل فخر سے معمور ہو رہا تھا تو دوسری جانب وہ اس کے لیے حد درجہ فکرمند بھی تھا۔ ایک فوری خیال کے تحت اس نے اپنا سیل فون اٹھا لیا اور اشتہار پر درج نمبر پر کال کر دی۔

پہلی ہی گھنٹی پر اس کی کال پک کر لی گئی، پھر ایک مخصوص کلک سنائی دی۔ حسنی کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت یا دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ فون اٹینڈ کرنے والے نے اس کی کال کو کہیں اور ٹرانسفر کر دیا تھا۔ چند سیکنڈ کے بعد ایک بھاری بھرکم آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''یور آنر! یہ اشتہار آپ کے لیے شائع نہیں کرایا گیا۔'' دوسری جانب بولنے والے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہاں البتہ، ہم آپ کو ایک ملین کے بجائے دس ملین ڈالرز

بھی دینے کے لیے تیار ہیں، اگر آپ ہمارا ایک چھوٹا سا کام کر دیں......!''

''کون سا کام؟'' بے ساختہ حسنی کے منہ سے نکلا۔ ''اور تم نے مجھے ''یور آنر'' کہہ کر کیوں مخاطب کیا ہے۔ آخر تم ہو کون......؟''

''استنبول ہائی کورٹ کے ایک سینئر جج کو ''یور آنر'' کہنے میں کوئی مضائقہ ہے اور نہ ہی کسی قسم کی قباحت!'' دوسری طرف موجود شخص نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''جاسم سے تعلق رکھنے والے ہر مرد و عورت کا کانٹیکٹ نمبر ہے ہمارے پاس لیکن ہم بلاوجہ کسی کو تنگ کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ ہم صرف جے بی کو چاہتے ہیں اور اسی غرض سے یہ اشتہار کراچی، تبوک اور استنبول کے مقامی اخبارات میں شائع کرایا ہے۔ آپ نے خود ہم سے کانٹیکٹ کیا ہے اس لیے آپ سے ہماری بات ہو رہی ہے...... آپ نے پوچھا، کون سا کام؟ تو اس کا جواب ہے، جاسم، جاسم اور جاسم...... اگر آپ جاسم کو ہمارے حوالے کر دیں تو ہم آپ کو ایک ملین ڈالرز نہیں بلکہ منہ مانگا انعام دیں گے۔ اتنی بڑی رقم کہ جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے اور اس کے ساتھ ہی آپ کی ساری خطائیں بھی معاف کر دی جائیں گی جن میں سب سے بڑا آپ کا گناہ یہ ہے کہ ایک روز پہلے جے بی نے آپ کے ولا کو مورچا بنا کر ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے اور اسی نوعیت کی ایک ناپسندیدہ حرکت وہ گزشتہ رات تبوک میں بھی کر چکا ہے اور آپ کا آخری سوال کہ ہم کون ہیں......؟'' وہ معنی خیز انداز میں متوقف ہوا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''یہ جاننا آپ کے لیے ضروری نہیں ہے۔ بس، ایک بات کو ذہن میں رکھیں کہ جاسم عرف جے بی کے لیے ہم نے ''شوٹ ایٹ سائٹ'' کے احکامات جاری کر دیے ہیں۔ جو بھی شخص اسے بچانے یا اس کی پشت پناہی کرنے کی غلطی کرے گا، اس کی موت بڑی عبرت ناک اور رونگٹے کھڑے کرنے والی ہوگی اور اس ذیل میں ہائی کورٹ کے کسی جج یا کمشنر پولیس کو بھی کوئی استثنا حاصل نہیں ہوگا۔ اگر آپ سنجیدہ ہیں تو اسے ''ڈیک۔ آپ کال'' سمجھ لیں......!''

قبل اس کے کہ جواب میں حسنی کچھ کہتا، لائن بے جان ہو گئی۔ اس نے دوبارہ فون لگانے کی کئی بار کوشش کی مگر ایک مرتبہ بھی اس کی یہ سعی بار آور نہیں ہو سکی۔ حسنی کے ذہن میں کوئی ابہام، کوئی شک نہیں تھا۔ وہ لوگ جاسم کے وہی دجالی دشمن تھے جن کے بارے میں جاسم اسے تفصیلات بتا چکا تھا۔

جس شخص کو لائن ٹرانسفر کی گئی تھی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صرف جاسم کے متعلقین ہی سے بات کرتا ہوگا۔ اس کے اعتماد اور رعب داب سے یہی لگتا تھا کہ وہ دجالی تنظیم میں کسی اعلیٰ اور بااختیار عہدے پر فائز ہوگا۔ جاسم کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں وہ شخص ''ڈیوڈ'' ہو سکتا تھا۔

یہ طلال حسنی کا اندازہ تھا اور نہ درحقیقت ڈیوڈ کو تو جاسم کے معاملے سے بالکل الگ کر دیا گیا تھا۔ حسنی سے بات کرنے والا جو کوئی بھی تھا اسے جیکب کا نائب کہا جا سکتا تھا کیونکہ سلور کوئین نے استنبول کی ذمے داری مسٹر جیکب کو سونپ دی تھی۔

ایک فوری خیال کے تحت طلال حسنی نے قاموس ترک کو فون کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس پُرغرور شخص نے ''جج اور کمشنر'' کے الفاظ کو ایک ساتھ ملا کر تحقیر آمیز انداز میں ادا کیا تھا۔ عین ممکن ہے کہ اس نے قاموس سے بھی رابطہ کیا ہو......

کئی بار کی کوشش کے بعد بھی قاموس کا نمبر آف ہی ملا تو حسنی اُلجھن میں مبتلا ہو گیا۔ یہ ایسا وقت نہیں تھا کہ قاموس اپنے سیل فون کو سوئچڈ آف رکھتا۔ وہ جاسم کے لیے تو پریشان تھا ہی، اب اسے قاموس کی بھی فکر ہونے لگی تھی۔ اسی غیر یقینی صورتِ حال میں اسے کامل کی یاد آئی اور اس نے کامل کو فون لگا دیا۔

''ہیلو سر......!'' کامل نے اس کی کال ریسیو کرتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''آپ کیسے ہیں جناب؟''

''میں تو بالکل ٹھیک ہوں لیکن جاسم کے لیے مختلف قسم کی پریشانیوں نے مجھے گھیر رکھا ہے۔''

''کیا ہوا جگر کو......؟'' کامل نے پوچھا۔

''اس کا کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے اور اس کی ذات کے حوالے سے حالات کافی بگڑ چکے ہیں۔'' حسنی نے بتایا۔

''ابھی کل رات ہی تو میری اس سے بات ہوئی تھی۔'' کامل نے معتدل انداز میں کہا۔ ''وہ ''نی یوم'' کے حوالے سے کوئی اہم کام کرنے تبوک گیا ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جاسم نے آپ کو اپنے بارے میں بہت کچھ بتا رکھا ہے اسی لیے میں نے ''نی یوم'' کا ذکر بے دھڑک کر دیا۔''

حسنی نے نہایت ہی مختصر مگر جامع انداز میں کامل کو موجودہ صورتِ حال کی سنگینی سے آگاہ کیا پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔

''میں نے تمہیں، میرے ولا میں پیش آنے والے خوں ریز واقعے کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا ہے۔ ایسا ہی

کوئی سنسنی خیز کارنامہ اس نے تبوک میں بھی انجام دے ڈالا ہے جس سے دجالی نظام کے رکھوالوں کو بہت نقصان پہنچا ہے اسی لیے اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ان لوگوں نے ون ملین ڈالرز انعام والا یہ اشتہار کراچی، تبوک اور استنبول کے مقامی اخبارات میں شائع کرایا ہے۔ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے جس بندے سے فون پر بات کی ہے، اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس دجالی تنظیم کی جانب سے جاسم کو دیکھتے ہی گولی مار دینے کا آرڈر پاس کر دیا گیا ہے۔''

''سر! آپ ریلیکس ہو جائیں۔'' جاسم کے برونے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''میں کافی عرصے سے جاسم کے ساتھ ہوں اور ڈیوڈ کے ابلیسی منصوبوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ جاسم اس سے پہلے بھی ان شیطانوں کو متعدد بار اس نوعیت کے جھٹکے دے چکا ہے۔ ڈیوڈ نے جب بھی میرے جگر کی طرف میلی آنکھ سے دیکھا، اسے ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اگر اس کا سیل نمبر نہیں لگ رہا تو اس میں پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ......'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر ان الفاظ میں اپنا بیان مکمل کر دیا۔

''مجھے یقین ہے کہ جاسم اس وقت جہاں بھی ہے، بہ خیر و عافیت ہے اور وہ خود نہیں چاہتا کہ ہم میں سے کوئی اس سے رابطہ کرے۔ وہ جب بھی مناسب سمجھے گا، خود ہم سے کانٹیکٹ کرے گا۔ ایک بات کی میں گارنٹی دیتا ہوں کہ وہ اس وقت کسی مصیبت میں مبتلا نہیں ہے ورنہ ''ڈیوڈ اینڈ کو'' کو اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ''تلاش گمشدہ'' کے اشتہارات نہ چھپوانا پڑتے۔ آپ نے اشتہار میں درج نمبر پر رابطہ کر کے دیکھ لیا ہے۔ اب میں نہ تو وہ اشتہار پڑھوں گا اور نہ ہی اس حوالے سے کسی سے کانٹیکٹ کروں گا۔ یہ سارا گیم میری سمجھ میں آ گیا ہے سر......!''

''میں بھی سمجھ چکا ہوں......!'' حسنی نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''میرا حوصلہ بڑھانے کا شکریہ مائی سن! تم بھی اپنا بہت خیال رکھنا۔ اس بندے نے واضح الفاظ میں کہا ہے، جاسم کے ہر تعلق دار پر ان کی گہری نظر ہے۔''

''ہمیں شیطان کے پیروکاروں کی نظر کی نہیں، اپنے پروردگار کی نگاہ کی ضرورت ہے سر، جس کے قبضے میں ہماری جان ہے۔'' کامل نے چٹانی لہجے میں کہا۔ ''اور پھر وہی بات کہ...... جو رات قبر میں، وہ باہر نہیں!''

''تمہارے عقائد بلکہ ایمان کی پختگی دیکھ کر مجھے دلی خوشی ہوئی ہے مائی سن!'' حسنی نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ ''اللہ تمہیں اور تمہارے جگر کو سلامت رکھے!''

''آمین!'' کامل نے تہِ دل سے کہا۔ ''اور اللہ ہمارے بھائی اسد حسنی کو بھی ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔''

''ثم آمین......!'' حسنی نے مرتعش آواز میں کہا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''میرے فون پر کمشنر صاحب کی کال آ رہی ہے۔ میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔''

''او کے سر...... اللہ حافظ!'' کامل نے کہا۔

''اللہ حافظ مائی سن......!''

ان لمحات میں بھی کامل کی کال ٹریس اینڈ ریکارڈ کی جا رہی تھی لیکن کامل اتنا زیادہ محتاط اور بیدار مغز انسان تھا کہ اس نے حسنی سے ایسی کوئی بات کی ہی نہیں جس پر دشمن کی پکڑ ہو......!

حسنی نے کامل سے غلط بیانی نہیں کی تھی۔ اس وقت واقعتاً قاموس اسے کال کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ خود کئی بار قاموس کا نمبر ٹرائی کر چکا تھا جو کہ مسلسل سوئچڈ آف مل رہا تھا چنانچہ اس نے فوراً سے پیشتر اپنے ہونے والے سمدھی کی کال پک کر لی۔

''حسنی! میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔'' قاموس نے حسنی کے ''ہیلو'' کے جواب میں کہا۔ ''بہت ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

''میں نے تمہارا نمبر لگانے کی کئی بار کوشش کی مگر ہر بار نمبر آف ملا......'' حسنی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''سب خیریت تو ہے نا؟''

''آ کر بتاتا ہوں۔'' قاموس نے مختصر جواب دیا۔

پندرہ منٹ کے بعد قاموس ترک حسنی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس دوران میں اسد حسنی ناشتا مکمل کر کے اپنے کمرے میں جا چکا تھا لہٰذا وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے تھے۔ قاموس نے حسنی کو مختصر الفاظ میں بتایا۔

''آج علی الصباح پولیس کی ہنگامی میٹنگ بلائی گئی تھی جس میں سب سے کم رینک کا میں ہی تھا۔ باقی سب مجھ سے اوپر کے اعلیٰ آفیسرز تھے۔ بات جاسم کے ''تلاشِ گمشدہ'' والے اشتہار سے شروع ہوئی تھی۔''

''تو کیا تم نے وہ اشتہار دیکھا ہے؟'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی حسنی پوچھ بیٹھا۔

''میں نے نہیں دیکھا بلکہ مجھے اس میٹنگ میں دکھایا گیا ہے کیونکہ یہ میٹنگ جاسم ہی کے بارے میں تھی۔''

قاموس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ’’مجھ سے سختی کے ساتھ کہا گیا ہے کہ اب تک جو بھی ہوا اسے بھول جائیں اور آئندہ جاسم سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھنا، اس کی بھی کوئی مدد نہیں کرنا۔ ہم پر اعلیٰ سطح کا دباؤ ہے......!‘‘

’’ایک منٹ!‘‘ حسنی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ ’’پہلے میری سن لو قاموس!‘‘ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ’’پھر ہم آگے بات کریں گے۔‘‘

قاموس سوالیہ نظر سے اسے تکنے لگا۔

’’آئندہ پانچ منٹ میں حسنی نے مختصر مگر جامع الفاظ میں قاموس کو اپنی ڈیوڈ (اس کے اندازے کے مطابق) کے بندے سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا دیا تاہم اس نے کہیں بھی ’’ڈیوڈ‘‘ کا نام استعمال نہیں کیا کیونکہ یہ جاسم کا ایک سیکرٹ تھا۔ اس کے بجائے حسنی نے اشتہار کو مرکز بنا کر قاموس کو بتایا تھا کہ اس نے جاسم کی ’’گمشدگی‘‘ سے متعلق پڑھ کر اس نمبر پر فون کر دیا تھا اور دوسری جانب موجود شخص نے اسے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دی تھیں اور ہمیشہ جاسم سے دوری بنائے رکھنے کی تاکید کی تھی۔ اس کے علاوہ یہ پیشکش بھی کی کہ اگر میں جاسم کو پکڑنے یا پکڑانے میں ان کی مدد کروں تو وہ لوگ مجھے منہ مانگا انعام دیں گے......وغیرہ ....

’’ایسی ہی صورت حال سے ابھی میں بھی نمٹ کر آرہا ہوں۔‘‘ قاموس نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ’’ان لوگوں نے پولیس کی ہائی کمان کو تمہارے والا والے واقعے کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ وہ انقرہ کے ریسرچ سینٹر میں کی جانے والی کارروائی سے بھی بہ خوبی آگاہ ہیں۔ ان تمام واقعات میں جاسم کا ہاتھ ہے اور ترکی کی پولیس جاسم کا ساتھ دے رہی ہے، گویا یہاں کی پولیس انہیں نقصان پہنچانے میں جاسم کے ہاتھ مضبوط کر رہی ہے جو کسی بھی طور برداشت نہیں کیا جائے گا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ جاسم کے یہ دشمن آخر ہیں کون لوگ جو ہمارے اعلیٰ حکام کو بھی ڈکٹیٹ کروا رہے ہیں......!‘‘

’’اس بات کو لے کر میں بھی بہت حیران اور پریشان ہوں قاموس!‘‘ حسنی نے معتدل انداز میں کہا۔ ’’میں جو سمجھ پایا ہوں، وہ تمہیں بتاتا ہوں لیکن پہلے ناشتا......!‘‘ اس نے رک کر ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ’’تم منہ اندھیرے گھر سے نکلے ہوئے ہو اس لیے ناشتا ضروری ہے۔ باقی باتیں بعد میں......؟‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ قاموس ترک نے جواب دیا۔

حسنی نے اپنے ملازمین سے کہہ کر قاموس کے لیے ناشتا لگوا دیا۔ اس دوران میں حسنی نے سوچ لیا تھا کہ قاموس کو کس حد تک حقیقت سے روشناس کراتا ہے۔ وہ ’’حد‘‘ جہاں نہ تو جاسم سے کیے ہوئے عہد کی خلاف ورزی ہو اور نہ ہی قاموس سے کسی قسم کی پردہ پوشی کا احتمال یا امکان پیدا ہو۔

’’میری معلومات کے مطابق، جاسم پچھلے کچھ عرصے سے اس کرۂ ارض کی کسی طاقتور تنظیم سے نبرد آزما ہے۔ وہ لوگ جاسم کو اپنے سسٹم کا حصہ بنانا چاہتے تھے اسی لیے انہوں نے اسے کراچی سے استنبول اور استنبول سے مصر پہنچا دیا تھا لیکن وہ موقع ملتے ہی ان کی گرفت سے نکل آیا۔‘‘ حسنی نے قاموس کو بتایا۔ ’’کائرو سے استنبول آتے ہوئے اس نے میری مدد کی اور مجھے ہائی جیکرز کے چنگل سے نکال کر بہ خیریت گھر پہنچا دیا۔ یہی نہیں بلکہ چند روز بعد ہی اس پاکستانی جوان نے میرے گمشدہ بیٹے کو بھی بازیاب کر لیا۔ اس نے اپنے دوست کامل کے ساتھ مل کر بلغارین کارٹل مسٹر برانڈو کو پکڑوانے میں بھی ہماری بھرپور مدد کی ہے۔ دیکھا جائے تو جاسم صرف ہمارے ہی نہیں، بلکہ ہمارے ملک کے بھی بہت کام آیا ہے۔ اگر ہم نے اس کی تھوڑی بہت مدد کر دی تو اس میں کیا غلط ہے قاموس......؟‘‘

’’میں نے کب کہا کہ جاسم غلط ہے یا ہم نے کچھ غلط کیا ہے۔‘‘ قاموس وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ’’میں نے جاسم کے سارے مثبت کارنامے آج کی میٹنگ میں رکھے ہیں لیکن ہمارے چیف کے ریکارڈ کی سوئی ایک ہی مقام پر رکی ہوئی ہے اور وہ یہ کہ...... ہمیں کسی بھی حال میں جاسم کی ذرا سی بھی مدد نہیں کرنا......‘‘

’’کیا ہماری پولیس اتنی ہی زیادہ مجبور اور بے بس ہو گئی ہے کہ ہمیں غیروں کی ڈکٹیشن پر چلنا پڑے گا؟‘‘ حسنی نے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

’’تم غلط سمجھ رہے ہو حسنی......!‘‘ قاموس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’بات ہماری پولیس کی بے بسی یا لاچاری کی نہیں ہے۔ تم ایک بہت بڑے قانون داں ہو۔ یہ بات تمہیں بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ پولیس ڈپارٹمنٹ بھی کسی قوت کے تابع ہوتا ہے۔ ہمیں بھی ان لوگوں کے فرامین کی تعمیل اور پاسداری کرنا ہوتی ہے جو ملک کے نظام کی باگ ڈور کو اپنے ہاتھ میں تھامے ہوتے ہیں۔ میں تمہیں

بتا رہا ہوں حسنی......!'' لحاتی توقف کے بعد سنسنی خیز لہجے میں کہا۔

''جاسم والے معاملے میں ہمارے ملک کی وزارتِ داخلہ اور وزارتِ خارجہ یعنی دونوں اہم منسٹریز کو ایک پیج پر آنا پڑا ہے کیونکہ جاسم کے دشمنوں کو ایک ایسی سُپر پاور کی حمایت حاصل ہے جس کے ساتھ ہمارے بہت اچھے تعلقات ہیں اور مستقبل کے کئی ایک اہم منصوبہ جات میں ترکی اس سُپر پاور کے ساتھ مل کر کام کر رہا ہے۔ ہمارا بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے حسنی! ہم ملکی سطح پر جاسم کی حمایت کا کھلم کھلا اعلان کر کے مذکورہ سُپر پاور کو خفا نہیں کر سکتے۔ تم جانتے ہو، انٹرنیشنل ڈپلومیسی بھی معنی رکھتی ہے......!''

''ہاں، مجھے معلوم ہے......!'' حسنی نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''ہم اپنے ملک کی پالیسی کے خلاف نہیں جا سکتے۔ یہ ہماری مجبوری اور قانون پسندی ہے کیونکہ ہر ملک قوانین کی روشنی ہی میں اپنی پالیسیز مرتب کرتا ہے، چاہے وہ خارجی پالیسی ہو یا داخلی پالیسی۔ جب ہماری یہ دونوں وزارتیں جاسم کے ایشو پر سیم پیج پر ہیں تو ہمیں بھی ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ باقی جہاں تک جاسم کا معاملہ ہے تو......!'' وہ ایک مرتبہ پھر رکا اور ایک گہری سانس چھوڑنے کے بعد اپنی بات مکمل کر دی۔

''وہ ہمارا بیٹا...... ہمارا ہیرو ہے...... ہم اپنے ملک کی پالیسیز کو فالو کرتے ہوئے اپنی ذاتی حیثیت میں اس کی جو بھی انسانی اور اخلاقی مدد کر سکتے ہیں، وہ ضرور کریں گے۔''

''مگر بڑی احتیاط کے ساتھ......!'' قاموس نے تاکیدی انداز میں کہا۔

''ضرور...... بے شک!'' حسنی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''اسد کیسا ہے؟'' قاموس نے حسنی سے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔ ابھی ناشتا کرنے کے بعد اپنے کمرے میں گیا ہے۔'' حسنی نے بتایا۔ ''کل صبح والے جاسم کے کارنامے نے اسے بہت متاثر کیا ہے۔ وہ جاسم کے حوصلے اور بہادری کا گرویدہ ہو گیا ہے۔ کئی بار پوچھ چکا ہے کہ بھائی کب واپس آئے گا۔ بھائی...... مطلب، جاسم!''

''وہ تو مجھے بھی بے طرح یاد آ رہا ہے۔'' قاموس نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ ''میں نے اپنی پولیس کی پوری سروس میں اتنا جی دار نوجوان نہیں دیکھا۔ وہ جہاں بھی ہے، اللہ اسے سلامت رکھے!''

''آمین......!'' حسنی نے تہ دل سے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ وہ عافیت سے ہوگا۔ جیسے ہی اس کی طرف حالات نارمل ہوں گے، وہ خود ہم سے رابطہ کرے گا......''

قاموس ترک نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ''وہ خود ہم سے رابطہ کرے گا، یہ بات تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہے ہو حسنی......؟''

طلال حسنی ایک لمحے کے لیے تو گڑبڑا کر رہ گیا مگر اس نے سنبھلنے میں اتنا وقت نہیں لگایا کہ قاموس اس کی اندرونی کیفیت کو بھانپ سکے۔ قاموس اگر کمشنر پولیس تھا تو حسنی ہائی کورٹ کا ایک سینئر جج اور وہ دونوں ہی پروفیشنل تھے مگر اس کے ساتھ ہی وہ بڑے گہرے دوست بھی تھے اور عنقریب وہ سند یافتہ سمدھی بھی بننے والے تھے۔

''تھوڑی دیر پہلے میری، جاسم کے دوست کامل سے فون پر بات ہوئی تھی۔'' حسنی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اس نے مجھے جاسم کی کئی ایک عادات کے بارے میں بتایا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جاسم جب بھی اپنے دشمن کو کوئی جھٹکا پہنچاتا ہے تو پھر کچھ عرصے کے لیے وہ منظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ اس دوران میں وہ اپنوں سے کانٹیکٹ نہیں کرتا لہٰذا اس کے غیاب کو لے کر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب حالات سازگار ہو جاتے ہیں تو پھر وہ خود ہی جس سے چاہتا ہے، رابطہ کر لیتا ہے۔ بس، اتنی سی بات ہے......!''

''اوہ...... یہ تو تم نے بہت اچھی خبر سنائی ہے۔'' حسنی کے جواب پر قاموس سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ''جاسم نے کامل سے آخری بار کب بات کی تھی اور اس وقت جاسم کہاں تھا؟ اس میٹنگ کی صدارت کرنے والے ہمارے چیف صاحب نے ہمیں بتایا ہے کہ جو لوگ جاسم کی مخالفت میں کھڑے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ جاسم نے تمہارے اس ولا والی خوں ریز کارروائی کے بعد سعودی عرب کے صوبے تبوک میں بھی گزشتہ رات انہیں بھاری جانی اور مالی نقصان پہنچایا ہے۔ کیا کامل نے اس بارے میں تمہیں کچھ بتایا ہے۔ میں تو دراصل......'' لحاتی توقف کر کے اس نے ایک معتدل سانس لی پھر پُرسوچ انداز میں بولا۔

''میں یہ سمجھنا اور جاننا چاہتا ہوں کہ وہ بااختیار اور اونچی پہنچ رکھنے والے لوگ کون ہیں جن کے سامنے دنیا کی حکومتیں اپنی مرضی کے فیصلے کرنے کے لیے آزاد نہیں رہتیں اور جاسم جیسا اکلوتا نوجوان انہیں ناکوں چنے چبوا رہا ہے......!''

''قاموس! جاسم کی اگر انتہائی مختصر اور جامع تعریف کی جائے تو اسے ''ون مین آرمی'' کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔'' حسنی نے ٹھوس انداز میں جواب دیا۔'' کامل نے کل رات کے ابتدائی حصے میں فون پر جب جاسم سے بات کی اس وقت جاسم تبوک کے ایک تھری اسٹار ہوٹل ''مینا'' میں ٹھہرا ہوا تھا اور اس نے کامل کو صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ ''نی یوم'' میں کوئی خاص کام کرنے آیا ہوا ہے......!''

''نی یوم!'' حسنی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی قاموس بول اٹھا۔ ''اگر جاسم نے ''نی یوم'' کے حوالے سے اپنے دشمنوں کو کوئی تگڑا نقصان پہنچایا ہے تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ جاسم کا ٹکراؤ کسی دجالی ٹولے سے ہے اور وہ اسلام کی راہ میں ایک عظیم جہاد کر رہا ہے۔ واہ جاسم...... واہ!''

''میرا ذہن بھی اسی طرف جا رہا ہے۔'' حسنی نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ''تم نے ابھی صبح والی ہنگامی میٹنگ کا جو احوال سنایا ہے، وہ بھی اسی جانب اشارہ کر رہا ہے۔ آلِ یہود، آلِ سعود کے ساتھ مل کر تبوک کے ویرانوں میں دنیا کا سب سے جدید اور حیرت انگیز شہر ''نی یوم'' بسانے جا رہے ہیں۔''

''میری ایک بات نوٹ کر لو حسنی...... اگر ''نی یوم'' بن گیا تو یہ جزیرہ عرب فحاشی، عریانی اور عیاشی کا ایک بڑا مرکز بن جائے گا۔'' قانوس نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

''میں نے تمہاری بات نوٹ کر لی ہے قاموس!'' حسنی نے گفتگو کے موضوع کو دوسرے رخ پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''دنیا اپنے اختتام کی جانب گامزن ہے۔ فتنوں کے اس دور میں کچھ بھی نارمل نہیں اور جو بھی ہوگا، اسے بہر حال قبول تو کرنا پڑے گا۔ انسان اگر اپنی آنکھیں بند کر لے تو اس سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔ سچ یہ ہے کہ ہم نے جتنی پُرامن اور بھرپور زندگی گزاری ہے وہ ہماری اولاد اور ان کی اولادوں کو نصیب نہیں ہوگی۔ فی الحال تو میں اپنی اکلوتی اولاد اسد کے لیے فکر مند ہو رہا ہوں۔''

''کیا ہوا اسد کو......؟'' قاموس نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''تھوڑی دیر پہلے تو تم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ٹھیک ہے۔''

''وہ ٹھیک ہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہ جلد از جلد مکمل طور پر صحت یاب ہو جائے۔'' حسنی نے قاموس کے چہرے پر نظر جما کر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور یہ کام دیر یا سے زیادہ بہتر انداز میں کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ تم نے پچھلی ملاقات میں اس کے خوشگوار اثرات دیکھے تھے۔''

''میں سمجھ گیا!'' قاموس اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں سہ پہر میں مسلح گارڈز کے ساتھ ایک جیپ یہاں بھیج دوں گا۔ وہ لوگ اسد کو اپنے ساتھ میرے گھر لے جائیں گے۔''

حسنی کے چہرے پر اطمینان بھری تشکرانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ قاموس اس سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

اگرچہ کامل نے آج دوپہر میں ٹیلی فون پر طلال حسنی سے بات کرتے ہوئے یہی کہا تھا کہ وہ جاسم کی ''گمشدگی'' والا اشتہار نہیں دیکھے گا لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی خود کو اشتہار دیکھنے سے باز نہ رکھ سکا۔

وہ بڑا منفرد اور معنی خیز اشتہار تھا۔ آج سے پہلے جاسم کو ڈیوڈ اور دوسرے دشمنوں کی جانب سے ایک سے ایک بڑھ کر مختلف نوعیت کی سنگین نتائج پر مبنی دھمکیاں ملتی رہی تھیں لیکن اس اشتہار کی بات ہی جدا تھی۔ بادی النظر میں اس اشتہار میں جاسم یا اس کے کسی تعلق دار کے لیے دھمکی جیسی کوئی شے نہیں تھی لیکن کامل نے بڑی اچھی طرح یہ محسوس کر لیا تھا کہ جاسم کو اپنے دام میں لانے کے لیے اس کے دشمن نے بڑی موثر چال چلی ہے مگر شاید وہ بدذات یہ بھول گیا ہے کہ یہ اشتہار جاسم کی نگاہ سے بھی گزرے گا۔ ظاہر ہے، وہ ان کی طرف سے، پہلے سے زیادہ محتاط ہو جائے گا۔ ون ملین یو ایس ڈی انعام پانے کے خواہش مند مہم جو جاسم کو کراچی، استنبول اور تبوک میں تلاش کرتے رہیں گے اور وہ اپنے دشمنوں اور دوستوں کی نظروں سے اوجھل پتا نہیں کہاں ہوگا۔

کامل کو جاسم کی اتنی زیادہ فکر نہیں تھی جتنا کہ حسنی پریشان ہو رہا تھا۔ بہر حال، اس نے حسنی کو تسلی دے دی تھی۔ کامل کو یقین تھا کہ جاسم جہاں بھی ہوگا، امن اور سلامتی کے گہوارے میں سانس لے رہا ہوگا لیکن اسی شام اس کے یقین اور سکون کو کسی بدخواہ کی نظر لگ گئی اور وہ خود ایک بڑی مصیبت میں گھر گیا۔

ان دنوں کامل نے اپنے قیام کے لیے شادمان ٹاؤن کا ایک بنگلا مختص کر رکھا تھا۔ وہ اپنے ضروری کام نمٹانے کے بعد واپس آیا تو اعجاز اور عتیق بھی اس کے ساتھ تھے۔ یہ دونوں کامل کے وہی وفادار تھے جنہوں نے غفار داؤد کی موت کے بعد، ناجیہ کی حفاظت کے لیے اس کے کلفٹن والے اپارٹمنٹ کے اندر اور باہر پہرا دیا تھا۔

"بھائی! آپ فریش ہو جائیں، پھر میں کھانے کے لیے کچھ آرڈر کرتا ہوں۔" اعجاز نے کامل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آج تو دن بھر پیٹ پوجا کا وقت ہی نہیں ملا......!"

کامل کو بھی کافی کھل کر بھوک محسوس ہو رہی تھی چنانچہ اعجاز کی بات اسے پسند آئی۔ "کیا تم لوگ فریش نہیں ہو گے......؟" اس نے اپنے جاں نثاروں سے استفسار کیا۔

"ہم سب ایک جیسے ہی تھکے ہوئے ہیں۔"

"ہم بھی باری باری فریش ہو لیں گے بھائی۔" عتیق نے جواب دیا۔ "آپ ہماری فکر نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے!" یہ کہتے ہوئے کامل واش روم میں گھس گیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ تینوں ڈائننگ روم میں بیٹھے فاسٹ فوڈ اور باربی کیو سے انصاف کر رہے تھے۔ اس دوران میں حالات حاضرہ پر بات چیت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ وہ تینوں بہت سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے۔ ان کا تناول جاری و ساری تھا کہ اطلاعی گھنٹی کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

"یہ کون ہو سکتا ہے؟" عتیق نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "ہم سے ملنے یہاں پر کوئی بھی نہیں آتا پھر گھنٹی کس لیے......؟"

"اگر گھنٹی بجی ہے تو گیٹ پر جا کر دیکھنا پڑے گا کہ کون راستہ بھول کر ہمارے دروازے پر آ گیا ہے۔" کامل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اب اندھیرا ہو چکا ہے اور اس بنگلے میں کئی ایک لائٹس آن ہیں۔ گھنٹی کی آواز پر خاموشی اختیار کیے رہنا، باہر موجود شخص کو کسی شک میں بھی ڈال سکتا ہے۔"

"میں دیکھتا ہوں بھائی!" عتیق کھانے کی میز پر سے اٹھتے ہوئے بولا۔

عتیق نے بھی مارشل آرٹس کی ٹریننگ لے رکھی تھی اور اعجاز بھی لڑائی بھڑائی کا ماہر تھا لیکن وہ دونوں کامل کے پائے کے فائٹرز بہرحال نہیں تھے۔ کامل کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے پاس کوئی ہتھیار نہیں رکھتا تھا حالانکہ وہ ہر چھوٹی بڑی گن چلانے کا تجربہ رکھتا تھا جبکہ اس کے یہ دونوں ساتھی ضرورت پڑنے پر آتشیں اسلحے کا استعمال کرتے تھے۔ اس وقت بھی جب عتیق اٹھ کر باہر گیا تو وہ گن لگائے ہوئے تھا۔

عتیق کے اٹھتے ہی کامل نے بھی کھانے سے ہاتھ

ڈش

ایک سردار چینی زبان سے قطعاً نابلد تھا۔ مینیو کی آخری سطر پر انگلی رکھتے ہوئے بیرے سے کہا۔

"سنو، یہ ڈش لاؤ۔"

بیرے نے جو انگریزی جانتا تھا، مسکرا کر کہا۔ "معاف کیجیے گا جناب، آپ کے حکم کی تعمیل نہ ہو سکے گی کیونکہ یہ ہمارے ہوٹل کی مالکہ کا نام ہے۔"

کراچی سے امتیاز احمد کی خواہش

روک دیا تھا اور ظاہر ہے، اس کے بعد اعجاز کا تناول جاری رکھنا بنتا نہیں تھا لہٰذا وہ بھی تھم گیا۔ عتیق کی واپسی سے پہلے ہی ایک غیر انسانی آواز اعجاز اور کامل کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ چونکنا نظروں سے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔

وہ کامل کے پالتو کتے رستم کے بھونکنے کی آواز تھی جو بنگلے کے عقبی حصے میں ابھری تھی۔ "رستم" بنگلے کے مختلف اندرونی حصوں میں گھوم پھر کر "پہرا" دیا کرتا تھا اور وہ بلاوجہ بھونکنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔

"اعجاز! مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔" کامل نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "تمہیں بنگلے کے پچھلے حصے میں جا کر رستم کے بھونکنے کا سبب جاننا ہوگا۔"

"جاتا ہوں بھائی!" اعجاز پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر الجھن زدہ نظر سے کامل کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ "بھائی! رستم ایک بار بھونکنے کے بعد خاموش کیوں ہو گیا ہے؟"

"جا کر دیکھو، وہ خود خاموش ہوا ہے یا کسی نے اسے خاموش کرا دیا ہے۔" کامل نے اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ "مجھے کچھ اچھا محسوس نہیں ہو رہا۔"

اعجاز نے اپنی گن ہاتھ میں لی اور یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ "جی بھائی، جاتا ہوں......!"

کامل کا ذہن ان لحات میں شانت رہتے ہوئے بھی گولی کی رفتار سے سوچ رہا تھا اور اس کی سوچ کو امن و آشتی کے خانے میں فٹ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی چھٹی حس بہ زبان خاموشی اعلان جنگ کر رہی تھی۔ اس نوعیت کی صورت حال میں وہ معمول سے زیادہ مستعد، فعال اور اپنے دشمنوں کے لیے وبال بن جایا کرتا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی ساتھ

نہیں تھے لہٰذا وہ کچھ زیادہ ہی الرٹ ہو گیا۔

عتیق نے گیٹ کھولنے سے پہلے، گیٹ کے بالائی حصے میں بنی ہوئی ایک آٹھ بائی آٹھ انچ کی ننھی سی کھڑکی کو وا کر کے باہر جھانکا تو اپنے سامنے ایک باوردی شخص، ایک بڑا سا پیکٹ اٹھائے کھڑا نظر آیا۔ اس بندے کے عقب میں کسی کوریئر کمپنی کی وین بھی کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔

''کون ہو تم اور یہاں کیوں آئے ہو؟'' عتیق نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

''کامل صاحب کے لیے دبئی سے ایک پارسل آیا ہے۔'' اس بندے نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ ''اگر آپ کامل ہیں تو گیٹ کھول کر اپنا پارسل وصول کر لیں پلیز......!''

اس دوران میں عتیق نے اپنی گن کو ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس باوردی شخص کی وضاحت کے جواب میں اس نے خشک لہجے میں کہا۔

''یہاں پر کوئی کامل نہیں رہتا۔ شاید آپ غلط جگہ پر آگئے ہیں۔''

''مگر اس پیکٹ پر تو اسی بنگلے کا ایڈریس لکھا ہوا ہے۔'' وردی پوش شخص نے پیکٹ پر نظر ڈالنے کے بعد الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''لیں، آپ خود بھی دیکھ لیں۔''

بات کے اختتام پر وہ شخص پیکٹ کے ساتھ گیٹ کی جانب بڑھا۔ ایک لمحے کے لیے عتیق کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ہو سکتا ہے، بھائی کے لیے واقعتاً کسی نے دبئی سے کچھ بھیجا ہو۔ وہ گیٹ کھولنے کا ارادہ کر ہی چکا تھا کہ بنگلے کے عقبی حصے سے ایک انسانی چیخ کی آواز سنائی دی۔

اب گیٹ پر کھڑے ہو کر اس کوریئر کمپنی کے نمائندے سے بحث و تکرار کرنا عتیق کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ اس نے گیٹ کی اس ننھی سی کھڑکی کو بند کیا اور بنگلے کی عقبی سمت دوڑ گیا۔ اسے حالات کی سنگینی کا اندازہ ہو چکا تھا۔ بنگلے کے سامنے کھڑی کوریئر کمپنی کی وین اور اس دل خراش چیخ میں کوئی نہ کوئی تعلق تو تھا۔

کامل نے لاؤنج کی کھڑکی کے توسط سے بنگلے کے گیٹ کی اندرونی جانب کھڑے عتیق کو باہر موجود شخص سے بات کرتے دیکھ لیا تھا۔ مرد مذکور پوری طرح کامل کو نظر نہیں آیا تھا تاہم بنگلے کے سامنے کھڑی وہ کوریئر وین کامل نے بڑے واضح طور پر دیکھ لی تھی۔ اگرچہ وہ عتیق اور اس بندے کے بیچ ہونے والی گفتگو کو سن نہیں سکا تھا مگر اس کا اندازہ یہی تھا کہ وہ وین وہاں کچھ ڈیلیور کرنے آئی تھی۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ عتیق واپس آ کر اسے بیرونی صورتِ حال سے آگاہ کرے کہ اسی وقت بنگلے کے عقبی حصے سے ایک انسانی چیخ سنائی دی تھی اور اس کے ساتھ ہی عتیق بنگلے کے پچھلے حصے کی طرف دوڑ گیا تھا۔

وہ درد میں ڈوبی ہوئی چیخ کامل نے بھی سنی کی تھی۔ اس چیخ کو سن کر ایسا محسوس ہوا تھا کہ جیسے کسی سفاک شخص نے تیز دھار آلے کی مدد سے کسی انسان کو بیدردی سے ذبح کر ڈالا ہو۔ کامل نے ذرا پہلے ہی اپنے ساتھی اعجاز کو عقبی جانب بھیجا تھا تا کہ وہ رستم کو پیش آنے والے کسی غیر متوقع ناخوشگوار واقعے کی چھان بین کر سکے۔

کامل کی عقابی نگاہ بنگلے کے گیٹ پر ہی ٹکی ہوئی تھی۔ اس نے ایک باوردی شخص کو بنگلے کے باہر ایک پیکٹ اٹھائے کوریئر وین کی طرف جاتے اور پھر وین کے اندر بیٹھتے دیکھا۔ شاید چند لمحے پہلے عتیق کی اسی بندے سے بات چیت ہوئی تھی۔ اصولی طور پر اب اس وین کو وہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے تھا لیکن یہ دیکھ کر کامل ریڈ الرٹ ہو گیا کہ مذکورہ کوریئر وین میں سے دو افراد باہر نکل کر بنگلے کے گیٹ کی سمت سبک قدموں سے بڑھنے لگے تھے۔ ان کے ہاتھ میں سائیلنسر لگی گنز تھیں اور چہروں پر خطرناک تاثرات جھلک رہے تھے۔ کامل کو یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ کوریئر کمپنی کے بھیس میں اس کے بنگلے پر کسی دشمن نے مسلح اٹیک کیا تھا۔ وہ فوراً سے پیشتر حرکت میں آ گیا۔

بنگلے کا گیٹ اندر سے لاک تھا۔ اس بات کے امکانات پوری طرح روشن تھے کہ وہ دونوں گن بردار بنگلے کی دیوار پھلانگ کر ہی اندر داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ اتنی مہلت اس کے لیے کافی سے زیادہ تھی۔

اس نے لاؤنج کے سائڈ ڈور کو کھولا اور اس چھ فٹ چوڑے پختہ راستے پر آ گیا جو بنگلے کے اندر باؤنڈری وال کے ساتھ بنا ہوا تھا۔ وہ دبے مگر تیز قدموں سے چلتے ہوئے بنگلے کے عقب میں پہنچ گیا۔ اس طرف دیوار کے ساتھ ایک مختصر سا لان تھا۔ اس کے بعد بنگلے کا تعمیر شدہ حصہ شروع ہو جاتا تھا۔ جب وہ اس گراسی لان پر پہنچا تو اسے حیرت کا ایک ڈبل ڈیوٹی جھٹکا لگا۔ ڈبل ڈیوٹی اس لیے کہ اس کی آنکھوں نے گھاس پر دو لاشوں کو پڑے دیکھا تھا۔

ایک لاش کامل کے پالتو کتے رستم کی تھی اور دوسرا بے حس و حرکت جسم اس کے ساتھی اعجاز کا تھا جسے تھوڑی دیر پہلے کامل نے رستم کا احوال معلوم کرنے کی غرض سے بنگلے

کے عقبی حصے میں بھیجا تھا۔

دونوں لاشوں کو ایک نظر دیکھتے ہی کامل کو اندازہ ہو گیا کہ رستم کو سر میں گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا اسی لیے کسی اجنبی کو بنگلے میں گھستے دیکھ کر اس نے اپنی زندگی میں آخری بار بھونکا تھا۔ اس کے بعد دائمی خاموشی اختیار کر لی تھی اور...... اعجاز کو گردن کاٹ کر موت کے گھاٹ اتار اگیا تھا۔ گویا ان پر یلغار کرنے والے دشمن سائیلنسر لگی گنز کے علاوہ تیز دھار آلاتِ حرب و ضرب سے بھی پوری طرح لیس تھے۔

کامل کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اپنے دو وفاداروں کی لاشوں پر آنسو بہانے کے لیے وہیں کھڑا رہتا۔ ابھی تک عتیق اسے کہیں نظر نہیں آیا تھا اور اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ بنگلے کی عقبی سمت سے شب خون مارنے والے درندہ صفت افراد کے گن بردار ساتھی بھی بنگلے کے سامنے والی سائڈ سے اندر داخل ہونے ہی والے تھے۔

سوچ بچار میں ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر وہ کسی چیتے کے مانند جست بھر کر کچن میں داخل ہو گیا جس کو بنگلے کے آخری عقبی حصے میں بنایا گیا تھا تاکہ دھوئیں وغیرہ کو نکاسی کے لیے کھلی فضا میسر آجائے۔

کچن ایک دم خالی تھا۔ کامل کے قدم اس بنگلے کے چپے چپے سے گہری آشنائی رکھتے تھے۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھنے لگا پھر اسے لاؤنج کی جانب سے چند افراد کے جھگڑنے کی آوازیں آنے لگیں اور اس میں نمایاں جھنجلائی ہوئی آواز عتیق کی تھی۔ وہ ان لوگوں پر بری طرح بگڑ رہا تھا۔

”تم لوگوں نے میرے ایک ساتھی اور ہمارے پالتو کتے کو مار ڈالا ہے اور اب مجھ پر گنز تانے کھڑے ہو۔ یہ کس قسم کی مردانگی ہے۔ اگر تم نے اپنی ماؤں کا دودھ پی رکھا ہے تو اپنی گنز کو ایک طرف رکھ کر مجھ سے مقابلہ کرو۔ میں نے تم چاروں کی ہڈی پسلی ایک نہ کر دی تو میرا نام بھی عتیق نہیں ہے......!“

کامل سمجھ گیا کہ دو افراد بنگلے کی عقبی جانب سے اندر کودے تھے اور دو سامنے والے حصے سے دیوار پھلانگ کر بنگلے میں پہنچے تھے۔ آخر الذکر دو گن بردار افراد کو تو اس نے بھی دیکھا تھا۔ اس وقت وہ لوگ کامل کو نظر نہیں آرہے تھے مگر ان کی آوازیں برابر اس کی سماعت تک رسائی حاصل کر رہی تھیں۔

”تمہارا کیا نام ہے، اس سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ ان میں سے ایک نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ آج کل بچے اپنے ماؤں کا نہیں، ڈبوں کا دودھ پیتے ہیں۔ باقی جہاں تک تمہارے ساتھی اور اس کتے کے انجام کی بات ہے تو اگر تم نے ہمیں کامل کے بارے میں نہیں بتایا تو سمجھ لو، تمہارا حشر ان دونوں سے بھی زیادہ عبرت ناک ہوگا۔ ہمیں کامل چاہیے اور اس کے حصول کے راستے میں جو بھی آئے گا، اسے گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا جائے گا۔“

وہاں کی صورتِ حال کامل پر واضح ہو گئی۔ وہ لوگ صرف اسے لینے آئے تھے اور وہ بھی زندہ...... وہ یا تو کامل کے دشمن شعیب چاچا کے لوگ تھے اور یا پھر جاسم کے دشمن ڈیوڈ کے بھیجے ہوئے موت کے ہرکارے......! زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ ان کا تعلق جاسم کے دشمنوں سے ہو گا۔ جاسم... شیطانی دجالی تنظیم کو استنبول اور تبوک میں زبردست نقصان پہنچا کر اڑن چھو ہو گیا تھا۔ اب وہ لوگ کامل کو اپنی کسٹڈی میں لے کر جاسم تک پہنچنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں کامل کے ذہن سے گزر گئے۔ اگلے ہی لمحے عتیق کا جواب اس کی سماعت تک پہنچا۔

”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہاں پر کامل نام کا کوئی شخص نہیں رہتا۔ تم خواہ مخواہ اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔“

”ہم کافی دنوں سے کامل کی نگرانی کر رہے ہیں اور ایک گھنٹا پہلے وہ تم دونوں کے ساتھ اس بنگلے میں آیا تھا۔“ ایک لیڈر ٹائپ گن بردار نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”وہ اسی بنگلے میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ تم اپنی زبان نہیں بھی کھولو گے تو بھی ہم اسے ڈھونڈ ہی نکالیں گے۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو بتا دو، وہ کہاں ہے؟“

”مجھے اگر کامل بھائی کا پتا ہوتا بھی تو میں تم لوگوں کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتاتا۔“ عتیق نے چٹانی لہجے میں کہا۔ ”تم مجھے گولی مار دو، اگر تم میں مردوں کی طرح دو، دو ہاتھ کرنے کی جرأت اور حوصلہ نہیں ہے اور...... میری موت کے بعد تم اس بنگلے کی تلاشی لے کر کامل کو کھوج نکالنا......!“

”ہمیں تم سے فائٹ کر کے کوئی میڈل نہیں جیتنا احمق انسان......“ چوتھے گن بردار نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔ ”ویسے ضرورت پڑنے پر تمہاری یہ خواہش پوری کر دوں گا...... تمہارے سر میں ہوا دان بنا کر!“

''اس گدھے کے ساتھ وقت برباد کرنے کے بجائے تم کامل کو بنگلے میں تلاش کرو۔'' لیڈر نظر آنے والے گن بردار نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''باس! اس کا کیا کرنا ہے؟'' ایک گن بردار نے عتیق کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا اس کو بھی اس کے ساتھی کے پاس پہنچا دیا جائے؟''

''تم فی الحال اس چغد کو میرے پاس ہی رہنے دو۔'' باس نے برہمی سے کہا۔ ''اور تم لوگ کامل کی تلاش میں لگ جاؤ...... ہری اَپ!''

کامل ان لوگوں کو دیکھ تو نہیں پا رہا تھا تاہم ان کی گفتگو سے بہ خوبی سمجھ گیا تھا کہ سرِدست عتیق کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ اعجاز اور رستم کو تو واپس نہیں لا سکتا تھا مگر اپنی اور عتیق کی حفاظت کرنا ابھی اس کے اختیار میں تھا۔ اب وہاں پر موجود رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کسی بھی وقت وہ لوگ اسے تلاش کرتے ہوئے لاؤنج سے باہر آسکتے تھے لہٰذا کامل نے اپنی عارضی پناہ گاہ کو خیر باد کہا اور بلی کے مانند بے آواز قدموں سے دوڑتے ہوئے بنگلے کی چھت کی جانب بڑھ گیا۔

اس بنگلے کا کوئی بھی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں کسی خفیہ مقام پر کوئی آتشیں اسلحہ چھپا کر نہ رکھا گیا ہو اور سب سے خوفناک ہتھیار ''ہیکلر اینڈ کاک'' اسنائپر رائفل تو چھت پر تھی اسی لیے کامل نے چھت کا رخ کیا تھا۔ بنگلے میں آنے والے چار گن بردار دشمنوں سے نمٹنا تو ضروری تھا ہی مگر اس سے بھی زیادہ اہم کام ان کے فرار کی راہ اور ذریعے کو ''ٹیکل'' کرنا تھا۔ موجودہ صورتِ حال کے مطابق وہ لوگ اسی کوریئر وین پر سوار ہو کر وہاں پہنچے تھے جو اس وقت کامل کے بنگلے کے سامنے کھڑی تھی اور اس وین میں ان کے چند دیگر ساتھی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ کامل نے پہلی فرصت میں اس کوریئر وین کو اڑانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جاسم اور کامل نے ایک ہی ٹریننگ سینٹر سے فنِ حرب و ضرب سیکھا تھا اور اس تربیت گاہ کا نام تھا ''مراد دادا''۔ مراد علی عرف مراد دادا اب اس دنیا میں باقی نہیں تھا مگر اس کا سکھایا ہوا ہنر جاسم اور کامل کی شکل میں اس معاشرے اور دوسرے معاشرہ جات میں بسنے والے ناسوروں پر ''شافی'' کام کر رہا تھا۔ ایک ساتھ جیل کے اندر اور باہر ماہ و سال بتاتے ہوئے ان دونوں کی سوچ اور عمل میں بھی گہری ہم آہنگی اور مطابقت پیدا ہو گئی تھی۔ بعض اوقات تو ایسا محسوس ہونے لگتا تھا کہ وہ یک جان، یک دماغ اور دو قالب ہوں

اور...... یہ بھی بالکل ویسا ہی وقت تھا۔

ایک، دو روز پہلے جاسم نے طلال حسنی کے وِلا کی چھت پر مورچا بنا کر ''نوزلر لبرٹی'' ہنٹنگ رائفل کی مدد سے ڈیوڈ کی بھیجی ہوئی ٹیم اور ان کی گاڑیوں کے ساتھ جو ''سلوک'' کیا تھا، کچھ ایسا ہی 'چمتکار' ان لمحات میں کامل ''ہیکلر اینڈ کاک'' نامی اسنائپر رائفل کے ذریعے دکھانے کے موڈ میں تھا۔

اسنائپر رائفل کو خفیہ مقام سے ''برآمد'' کرنے سے پہلے اس نے چھت پر ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں سے، بنگلے کے سامنے کھڑی کوریئر وین کو ٹارگٹ کیا جا سکتا ہو اور وہ جگہ چھت پر آنے والے کسی شخص کو آسانی سے نظر بھی نہ آئے۔ ویسے بھی اب رات نے اپنے سفر کا آغاز کر دیا تھا اور بنگلے کی چھت مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کامل کے مشن کے لیے یہ ایک آئیڈیل موقع تھا۔

کامل نے ایچ کے (ہیکلر اینڈ کاک) کو ایک مناسب جگہ پر ایڈجسٹ کیا اور اس کے اسکوپ (ویو فائنڈر) کے توسط سے کوریئر وین کے فیول ٹینک کو نشانے پر رکھ لیا۔ مذکورہ وین گلی میں ایسے زاویے سے پارک کی گئی تھی کہ اس کا فیول ٹینک کامل کی سمت تھا لہٰذا ایندھن کے اس ذخیرے کو نشانہ بنانا بہت آسان ہو گیا تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت وین کے اندر کم از کم دو افراد موجود تھے۔ ایک وین کا ڈرائیور اور دوسرا وہ شخص جو ایک پارسل کے حوالے سے، تھوڑی دیر پہلے گیٹ پر عتیق کے ساتھ متھا ماری کر چکا تھا۔ ویسے وین میں دو افراد کی جگہ اگر دو درجن افراد بھی بھرے ہوتے تو کامل اپنا ارادہ بدلنے والا نہیں تھا۔ وہ کم تھے یا زیادہ، ہر حال میں ان کا شمار دشمنوں کی فہرست میں ہوتا تھا۔

کامل نے اسکوپ میں ایک بار پھر اپنے ٹارگٹ کا جائزہ لیا۔ وین کا فیول ٹینک عین دائرے اور کراس کے مرکز پر تھا۔ ٹریگر دبانے کا اس سے زیادہ مناسب موقع اور کوئی ہو نہیں سکتا تھا۔ کامل نے سانس روک کر بڑے اعتماد سے گولی چلا دی۔

کامل نے ان لمحات میں کسی انسان کی پیشانی یا سینے کو نشانہ نہیں بنایا تھا کہ ایک ہلکی سی ''ٹھک'' کی آواز سنائی دیتی اور ٹارگٹ اِس دنیا سے اُس دنیا میں منتقل...... !

کامل کی چلائی ہوئی گولی نے کوریئر وین کے فیول ٹینک کو پھاڑ کر رکھ دیا تھا جس کے نتیجے میں ایک دل دوز دھماکا ہوا اور وہ وین آگ کے ایک مستطیل جسم کی شکل

اختیار کر کے کئی فٹ فضا میں ''اچھلی'' پھر قیامت خیز آواز پیدا کرتے ہوئے زمین سے ٹکرا گئی۔ پھر یہ آتشی کھیل دیکھتے ہی دیکھتے آغاز سے انجام تک پہنچ گیا، وہ بھیانک انجام جس کی توقع اس وین میں بیٹھے لقمہ اجل بننے والے افراد نے کبھی خواب وخیال میں بھی نہیں کی ہوگی۔

جلتی ہوئی کوریئر وین سے اٹھنے والی آگ کی شوریدہ سر لپٹیں آسمان کو چھونے کی تمنائی دکھائی دیتی تھیں مگر اس کے اندر موجود نذرِ آتش انسان نما درندوں کی سوختہ ساماں چیخیں ان کے ''پاؤں'' کی ''زنجیر'' بن جاتی تھیں۔

اس خوف ناک دھماکے کی آواز بنگلے کے اندر موجود حملہ آوروں تک بھی پہنچ چکی تھی چنانچہ کامل نے ''ایچ کے'' اسنائپر رائفل کو واپس اس کی خفیہ ''پناہ گاہ'' میں پہنچایا اور اپنے بِن بلائے ''مہمانوں'' کی ''خاطر داری'' کے لیے تیار ہو گیا۔

یہ بنگلا درحقیقت کامل کے روزمرہ استعمال میں نہیں تھا۔ یہ تو اس نے نشا صباحی کے قیام کے لیے کرائے پر حاصل کیا تھا اور اعجاز، عتیق و رستم وغیرہ کو اس نے نشا کی حفاظت کے خیال سے وہاں ''تعینات'' کر دیا تھا لیکن نشا زیادہ دن وہاں ٹھہری نہیں تھی۔ اس کے واپس استنبول چلے جانے کے بعد وہ بنگلا خالی ہو گیا تھا اور اب ''کامل اینڈ کو'' کا وہاں اکثر آنا جانا ہوتا تھا۔ کامل کی مستقل رہائش گاہ کسی اور علاقے میں تھی۔ یہ بنگلا خالی کرنا تھا اسی لیے آج وہ لوگ وہاں سے اپنا ضروری ''سامان'' وغیرہ سمیٹنے آئے تھے جو انہوں نے بنگلے کے مختلف خفیہ مقامات پر چھپا رکھا تھا۔ وہ کھانے کے بعد یہی کام کرنے والے تھے کہ کوریئر وین میں آنے والے مسلح دشمنوں نے انہیں ''کام'' ڈال دیا تھا۔ یہی سب سوچتے ہوئے کامل قدم قدم چھت سے نیچے آ رہا تھا۔

عتیق جب انسانی چیخ کی آواز سن کر بنگلے کے بی حصے میں پہنچا تھا تو اعجاز اور رستم کو موت کی نیند سلانے والے حملہ آوروں نے تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے اپنے قابو میں کر کے اس کی گن پر قبضہ کر لیا تھا پھر اسے گن پوائنٹ پر رکھ کر بنگلے کے اندرونی حصے میں لے آئے تھے۔

....دو مسلح دشمن اور دوسرا تیغہ بہ دست تھا۔ اسی تیغہ زن نے ایک مہلک وار کر کے اعجاز کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا جبکہ گن بردار نے رستم کے سر میں گولی مار کر اسے ٹھنڈا کر دیا تھا۔

اس وقت لیڈر ٹائپ گن بردار نے عتیق کو لاؤنج میں ایک صوفے تک محدود کر کے اسے اپنے نشانے پر رکھا ہوا تھا جبکہ اس کے حکم پر باقی تین افراد کامل کو بنگلے کے مختلف حصوں میں تلاش کر رہے تھے۔ عین اسی لمحے بنگلے کے باہر ایک سماعت شکن دھماکا سنائی دیا اور وہ تینوں دوڑتے قدموں کے ساتھ واپس لاؤنج میں آ گئے۔

اُن کے چہروں سے حد درجہ پریشانی جھلک رہی تھی۔ وہ تینوں اگرچہ ہتھیار بند تھے تاہم ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جہنمی بلائیں ان کے تعاقب میں ہوں اور یہ کیفیت اس ولدوز دھماکے کی رہینِ منت تھی جو انہوں نے نہ صرف سنا تھا بلکہ ان میں سے ایک نے باؤنڈری وال کے اوپر سے جھانک کر اپنی وین کا، رونگٹے کھڑے کر دینے والا حشر بھی دیکھ لیا تھا۔

''باس!'' تیغہ بردار اضطراری لہجے میں اپنے ٹیم لیڈر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا ''وہ شیطان اس بنگلے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے اور جاتے ہوئے اس نے ہماری وین کو بھی اُڑا دیا ہے۔''

''دھماکے کی آواز میں نے بھی سنی ہے۔'' باس نے تشویش بھری جھنجلاہٹ کے ساتھ کہا پھر باری باری ان تینوں کو گھورتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیا تم لوگوں نے اپنے شکار کو بنگلے کی چھت پر بھی تلاش کیا ہے؟''

''نہیں باس!'' ایک گن بردار نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہم بنگلے کو کھنگالنے کے بعد چھت کی طرف جانے ہی والے تھے کہ باہر قیامت خیز دھماکا ہو گیا اور ہم آپ کو رپورٹ دینے یہاں آ گئے۔''

''ٹھیک ہے۔'' باس نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''تم میں سے ایک یہاں رک جائے اور باقی دو چھت پر جا کر اسے تلاش کریں۔''

اس کے حکم کی فوراً تعمیل کر دی گئی۔ تیغہ بردار اور ایک گن بہ دست نے چھت کا رخ کیا اور ایک گن مین اِدھر لاؤنج ہی میں ٹھہر گیا۔ باس نے اپنے سیل فون سے کسی کو کال لگائی اور رابطہ ہونے پر اس نے سپاٹ آواز میں کہا۔

''ہمیں بیک اَپ چاہیے۔ کامل نے ہماری وین کو دھماکے سے اُڑا دیا ہے۔''

دوسری جانب موجود شخص مرتبے میں یقیناً اس سے اونچا تھا اسی لیے اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''کامل اس وقت کہاں ہے؟''

وہ اپنے سینئر کو یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ اُن کا ٹارگٹ ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ یہ سراسر اپنی نالائقی کا اعتراف ہوتا چنانچہ اس نے موقع محل کی مناسبت سے گول مول جواب دیا

جواس کے سینئر کے لیے قابلِ ہضم تھا۔
"سر! کامل کو چھت کی طرف جاتے دیکھا گیا ہے۔ میں نے دو بندے اس کے پیچھے بھیجے ہیں۔ وہ بچ نہیں پائے گا سر......!"
"یقیناً اس نے بنگلے کی چھت پر سے ہی کورئیر وین کو نشانہ بنایا ہے!" دوسری طرف بولنے والے شخص نے گمبھیر آواز میں کہا پھر تحکمانہ انداز میں اضافہ کر دیا۔ "ہمیں ہر حال میں کامل چاہیے اور وہ بھی زندہ سلامت...... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"
"سمجھ گیا سر!" اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ ہم اسے پکڑ لیں گے۔"
"او کے...... تمہارے لیے بیک اَپ روانہ کیا جا رہا ہے۔" اس سینئر نے ٹھوس انداز میں کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔
جس دوران میں وہ باس ٹائپ شخص، سیل فون پر اپنے کسی سینئر سے گفتگو میں مصروف تھا، عتیق نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اپنے لیے ایک سلم پسٹل کا "بندوبست" کر لیا تھا۔ اسے حملہ آوروں نے لاؤنج کے جس صوفے تک محدود کر رکھا تھا، اس کی نشست گاہ والی گدی کے پہلو میں مذکورہ پسٹل کو اس طرح گھسا کر اندر رکھا گیا تھا کہ اوپر سے وہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہر صوفے کے دائیں بائیں اور عقب میں، بیٹھنے والی گدی کی بغل میں ہاتھ گھسانے کی اتنی گنجائش موجود ہوتی ہے کہ کسی چھوٹی موٹی شے کو بہ آسانی چھپایا جا سکتا ہے۔
وہ سلم پسٹل پوری طرح لوڈ تھا۔ گن ہاتھ میں آتے ہی عتیق نے کسی خودکار مشین کے مانند حرکت کی اور چشم زدن میں دو گولیاں چلا دیں۔ اس نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ان دونوں بدمعاشوں کو بہ یک وقت نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ ان گھس بیٹھیوں کے درمیان چھ فٹ کا فاصلہ تھا لہٰذا عتیق کو جزوی کامیابی حاصل ہوئی مگر اس ہوشیاری کی اسے بھاری قیمت بھی چکانا پڑی......
عتیق کی چلائی ہوئی پہلی گولی باس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ دوسری گولی گن بردار کے پہلو سے گزر گئی کیونکہ عتیق کے ہاتھ میں پسٹل دیکھتے ہی اس نے سائڈ میں جھکتے ہوئے عتیق کی کھوپڑی کو نشانہ بنا ڈالا تھا۔ یہ وہی گن بردار تھا جس نے تھوڑی دیر پہلے عتیق کو دھمکی دی تھی کہ ضرورت پڑنے پر وہ اس کی کھوپڑی میں ہوادان بنا ڈالے گا اور اس نے واقعتاً ایسا کر دکھایا تھا۔
فائرنگ کی آواز کامل تک بھی پہنچی تھی۔ وہ جان چکا تھا کہ چار حملہ آوروں میں سے تین کے ہاتھوں میں سائیلنسر لگی گنز تھیں جبکہ چوتھا کسی تیز دھار آلے سے "لیس" تھا۔ ایسے میں جو دو آواز دار گولیاں چلائی گئی تھیں، وہ ان دشمنوں کا کام تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ...... اپنی ہی چھپائی ہوئی گن عتیق کے ہاتھ لگ گئی تھی۔
یہ ایک اطمینان بخش صورتِ حال تھی۔ اگر کامل کا اندازہ درست تھا تو پھر عتیق نے دو دشمنوں کو لازمی پھڑکا ڈالا تھا۔ وہ عتیق کی مدد کے لیے اس زینے کی جانب بڑھا جو چھت کو زیریں منزل سے ملا دیتا تھا۔ ابھی اس نے زینے پر دو قدم ہی طے کیے تھے کہ اسے دو دشمن نظر آ گئے۔
ان میں سے ایک کے ہاتھ میں سائیلنسر لگی گن اور دوسرے کے ہاتھ میں دو دم تیغہ تھا۔ وہ بندہ اس دو دم (دو دھاری) چھوٹی تلوار (تیغہ) کو وار کرنے والے انداز میں اٹھائے ہوئے تھا اور گن بردار بھی خاصا چوکنا دکھائی دیتا تھا۔ کامل نے لاؤنج کے باہر کھڑے ہو کر ان حملہ آوروں کو عتیق سے بات کرتے سنا تھا۔ وہ کامل کو لینے آئے تھے اور ظاہر ہے، وہ اسے صحیح و سالم کہیں پہنچانے کا عزم رکھتے تھے۔ گویا، وہ اسے گولی سے اُڑاتے اور نہ ہی اس تیغے سے اس کا قیمہ بنانے کی غلطی کرتے۔ اس سوچ نے کامل کو مزید حوصلہ دیا۔ وہ عتیق کو مخاطب کرتے ہوئے پُراعتماد اور بے فکرے انداز میں زینے اترنے لگا۔
"عتیق! میں زینے پر ہوں۔ تم بھی سامنے آ جاؤ۔ یہ لوگ میرے لیے براُت لے کر آئے ہیں لہٰذا مجھے ان کے ساتھ جانا ہوگا۔ میں نے سرینڈر ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"
دوسری جانب مکمل خاموشی رہی۔ اس کے سامنے موجود دونوں حملہ آوروں نے سوالیہ نظر سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اسی وقت ان کا تیسرا ساتھی گن بہ دست وہاں پہنچ گیا، اس نے کامل کی پکار کے جواب میں کہا۔
"تم جس عتیق نامی اپنے ساتھی کو آواز دے کر یہاں بلانے کی کوشش کر رہے ہو اسے میں نے ایک ایسی جگہ پہنچا دیا ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا کرتا۔ اس کمینے کے پاس پتا نہیں، کہاں سے ایک پسٹل آ گیا تھا۔ اس نے مجھ پر اور باس پر بہ یک وقت گولی چلا دی تھی۔ میں تو جھکائی دے کر گولی کے راستے سے ہٹ گیا مگر باس اپنا بچاؤ نہیں کر سکا۔ جواباً فائر کر کے میں نے تمہارے ساتھی کی کھوپڑی کو اُڑا ڈالا ہے۔ ان دونوں کی لاشیں ادھر لاؤنج میں پڑی خون اُگل رہی ہیں......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک

گہری سانس خارج کی پھر پُرغرور لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''باس کے بعد ہم تینوں میں سے میں ہی سینئر ہوں۔ سو، اب میں ہی ان دو کا باس ہوں۔ ابھی میں نے سنا کہ تم نے ہمارے سامنے سرینڈر ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ تم نے عقل مندی کا کام کیا ہے۔ تمہارے دونوں ساتھی اور پالتو کتا اس دنیا میں باقی نہیں رہے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہوگا کہ چپ چاپ ہمارے ساتھ چلو۔ تمہیں موت کے گھاٹ اتارنے کی ہمیں اجازت نہیں ہے لیکن اگر تم نے زیادہ ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو ہم تمہارے جسم کے زیریں حصے کو نشانہ بنا کر تمہیں چلنے کے قابل بھی نہیں چھوڑیں گے، بھاگ کر فرار ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔''

''میں ایسی کوئی کوشش کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں جس میں میرے زخمی ہونے کا صفر فیصد بھی امکان ہو۔'' کامل نے ایک ٹھہری ہوئی سانس لینے کے بعد اطمینان سے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ بتاؤ، جانا کہاں ہے؟''

''تم نے ہماری وین کو خوفناک دھماکے سے اُڑا دیا ہے۔ اس وین کے اندر ہمارے چند ساتھی بھی موجود تھے۔ بہرحال...... ہمارے لیے بیک اپ آرہا ہے۔ ہم اگلے دس منٹ میں یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔''

اس گن بردار کی بات ختم ہوتے ہی اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ دراصل ان کے سابق جہنم مکانی باس کا سیل فون تھا جس کی موت کے بعد اس گن بردار کے پاس آگیا تھا جو ابھی اپنے باس ہونے کا اعلان کر چکا تھا۔ کامل کو اعجاز، عتیق اور رستم کی اموات کا دلی صدمہ تھا لیکن فی الحال پیشِ نظر صورتِ حال سے نمٹنا بھی ضروری تھا۔ سو، وہ پوری بیدار مغزی کے ساتھ اپنے واہیات ماحول میں حاضر ہوگیا۔ کوئی بھی ہنگامی قدم اٹھانے سے پہلے، اس گن بردار کی سیلولر گفتگو کو سننا لازم تھا۔

''سر! ہم ایک سچویشن میں ہیں......'' گن بردار نے کال ریسیو کرنے کے بعد رپورٹ پیش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''بدقسمتی سے باس کو گولی لگ گئی ہے اس لیے یہاں کا چارج میں نے سنبھال لیا ہے۔ خوش خبری یہ ہے کہ کامل اس وقت ہماری کسٹڈی میں ہے۔ ہمیں فوری بیک اپ چاہیے تاکہ ہم کامل کو جلد از جلد آپ تک پہنچا سکیں۔''

اس کے بعد وہ پندرہ سے بیس سیکنڈ تک دوسری طرف بولنے والے کی بات سنتا رہا پھر ''اوکے سر!'' کہتے ہوئے

کمالاتِ فن

بس میں ایک بڑھیا نے پیر کچل دیا پھر سنبھل کر کہا۔
''بیٹا چوٹ تو نہیں لگی۔''
''بالکل نہیں...... آپ دو تین مرتبہ پھر ایسا ہی کریں۔ بہت مزہ آیا تھا۔''

☆☆☆

رات ڈھائی بجے فون کی گھنٹی بجی اور بجتی ہی رہی۔ جھلا کر فون کان سے لگایا تو دوست کی آواز آئی۔ ''یار! سو رہے تھے۔''
''بالکل نہیں۔ ایک پیڑ پر بیٹھا دنیا کی بے ثباتی پر غور کر رہا ہوں۔''

☆☆☆

پی ٹی سی ایل پر کال آئی۔ ریسیور اٹھانے پر دوست بولا۔ ''گھر پر ہو؟''
''نہیں، دریائے سندھ کی تہ میں شارک مچھلیاں تلاش کر رہا ہوں اور فون میرے گلے میں لٹکا ہوا ہے۔''

☆☆☆

''کل تم سُنار کی دکان میں تھے...... کیا کوئی زیور بنوا رہے ہو؟''
''نہیں، جوتے کی ایڑی لگوانے گیا تھا۔''

کراچی سے ڈاکٹر سبا ارشد کی حسِ مزاح

اس نے سیل فون کو جیب میں رکھا اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے ٹھوس انداز میں بولا۔

''مدد آرہی ہے۔ بس، ہمیں آٹھ منٹ انتظار کرنا ہو گا۔''

''ہم انتظار کر لیں گے۔'' تیغہ بردار نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

دوسرے گن بردار نے پوچھا۔ ''ہمارے لیے کس قسم کا بیک اپ بھیجا جارہا ہے؟''

''دو بڑی ایمبولینس، ہارن اور سائرن بجاتی ہوئی......!'' نئے باس نے بڑے فخر سے بتایا۔ ''جن میں نصف درجن ہمارے تربیت یافتہ افراد ڈاکٹرز کے بھیس میں موجود ہوں گے۔ وہ یہاں پہنچ کر جو بھی کارروائی کریں گے، اس پر علاقے کے لوگوں کو کسی قسم کا شک نہیں ہوگا۔ جہاں بھی کوئی سنگین دھماکا ہوتا ہے، وہاں ایمبولینس وغیرہ کا پہنچنا ایک عام سی بات ہے۔ ہمیں کامل کو ان لوگوں کے حوالے

کرنا ہے۔ اس کے بعد ہماری چھٹی ......!''

''آٹھ منٹ تو اچھا خاصا وقت ہوتا ہے دوستو ......!'' کامل نے ٹھہرے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''اتفاق سے ہم کُل چار افراد ہیں۔ کیوں نا تاش کی ایک آدھی بازی لگالی جائے۔ اس طرح ہم انتظار کی کوفت سے بچ جائیں گے۔ پتا ہی نہیں چلے گا کہ آٹھ منٹ کیسے گزر گئے......!''

''تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔'' تیغہ بردار نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟''

''اگلے پل کیا ہوگا، یہ صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ میں کبھی آنے والے وقت کو لے کر فکرمند نہیں ہوا......'' کامل نے چٹانی لہجے میں کہا۔ ''میں ہمیشہ اپنے موجودہ حالات پر فوکس رکھتا ہوں اور ...... یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ میرا دماغ خراب ہو چکا ہے۔ میں نے پچھلے آدھے گھنٹے میں اپنے تین جاں نثاروں کو کھودیا ہے۔ اس کے بعد میرا دماغ کیا خاک ٹھکانے پر رہے گا۔''

بات کے اختتام پر کامل نے اُچھل کر ہوا میں ایک ہائی بیک جمپ لگائی اور زینے کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ چھت کی راہ لے چکا تھا۔ گن بردار نے آٹھ منٹ کے بعد بیک اَپ کے وہاں پہنچنے کی بات کی تھی اور اسے پانچ منٹ سے بھی پہلے انہیں نمٹا کر وہاں سے نکل جانا تھا لیکن اس سے قبل ایک اہم کام کرنا تھا۔

چھت پر گہری تاریکی کا راج تھا۔ کامل نے اپنی جیب سے سیل فون نکال کر اپنے کسی بندے کو ایک وائس میسج کیا۔ ''کسی اجنبی کالر کی حیثیت سے متعلقہ تھانے فون کر کے انہیں شادمان ٹاؤن والے بنگلے پر پہنچنے کو کہو۔ ہم پر ایک خوف ناک حملہ ہوا ہے۔ رستم، عتیق اور اعجاز مارے گئے ہیں۔ میں بھی اپنے دشمنوں سے نمٹ کر یہاں سے نکل رہا ہوں۔ یہ بنگلا ہم نے کرائے پر لے رکھا ہے۔ اس طرح بعد میں ہمیں اپنی پوزیشن صاف کرنے میں آسانی رہے گی۔ کوشش کرو کہ پولیس جلد از جلد یہاں پہنچ جائے۔''

دوسری جانب سے فوراً جواب آگیا۔ ''او کے بھائی...... آپ بے فکر ہو جائیں۔ دس منٹ میں پولیس بنگلے پر ہوگی۔''

کامل نے سیل فون کو اپنی جیب میں رکھا ہی تھا کہ وہ تینوں آگے پیچھے زینے کے آخری حصے پر دکھائی دیے۔ ان میں تیغہ بردار سب سے آگے تھا۔ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''کامل ہم تمہیں بھاگنے نہیں دیں گے۔ چپ چاپ خود کو ہمارے حوالے کر دو۔''

نئے باس نے دھمکی آمیز لہجے میں تیغہ بردار کی بات کو آگے بڑھا دیا۔ ''امید ہے، تم ہمیں کسی ہنگامی کارروائی پر مجبور نہیں کرو گے۔ کم از کم ہم تمہاری ٹانگوں کو تو چھلنی کر ہی سکتے ہیں۔''

''میرا فرار کا ارادہ تھا اور نہ ہی میں یہاں سے بھاگنے میں کوئی دلچسپی رکھتا ہوں۔'' کامل نے ان کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں تو خود تمہارے ساتھ جانے کا خواہش مند ہوں۔''

''وہ کس لیے......؟'' ہنگامی طور پر باس بننے والے نے اُلجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''کافی عرصے سے میں تم لوگوں کے ''سر'' سے بالمشافہ ملاقات کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن مصروفیت نے مہلت نہیں دی......'' کامل نے پیش قدمی جاری رکھتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''اتفاق سے یہ موقع نکل آیا ہے۔ چلو، نیچے بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں۔''

''تم ہمیں کوئی چکر دینے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہو؟'' تیغہ بردار نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

''تم تینوں پوری طرح مسلح ہو اور میں ایک دم نہتا!'' کامل نے تیغہ بردار سے چار فٹ کی دوری پر پہنچنے کے بعد سرسری انداز میں کہا۔ ''میں بھلا تم لوگوں کو کیسے چکر دے سکتا ہوں۔ ہاں، البتہ......!''

کامل نے معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑی تو گن بردار باس نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''البتہ کیا......؟''

''البتہ یہ......!'' کامل نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''سنبھالو اس البتہ کو......''

بات کو مکمل کرنے سے پہلے ہی کامل ہوا میں بلند ہو کر تیغہ بردار کے سینے پر ایک طوفانی فلائنگ کک رسید کر چکا تھا۔ تیغہ بردار، توپ میں سے نکلے ہوئے گولے کے مانند ریورس گیئر میں اپنے گن بردار ساتھی سے جا ٹکرایا اور اس تصادم کے نتیجے میں مذکورہ گن بردار اپنے نئے نویلے گن بہ دست باس پر الٹ گیا۔

وہ تینوں بے ڈھنگے انداز میں لڑھکتے ہوئے جب زینے کے نچلے حصے میں پہنچے تو کامل کو اپنے سامنے کھڑے پایا۔ اس میکانگی مڈبھیڑ میں خود کو سنبھالتے ہوئے وہ اپنے

ہتھیاروں سے خالی ہو چکے تھے۔ دونوں گنز اور دو دم تیغہ زیادہ دور نہیں گرے تھے لیکن کامل نے انہیں اپنے ہتھیاروں تک رسائی حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اب اُس کا وقت تھا۔

سب سے نزدیک دو دھاری تیغہ ہی پڑا ہوا تھا۔ اس کے ''مالک'' نے جیسے ہی اپنے تیغے کی جانب ہاتھ بڑھایا، کامل نے اس کی ٹھوڑی پر اپنے گھٹنے سے ایک زوردار ضرب لگائی۔ وہ شخص اذیت ناک آواز خارج کرتے ہوئے پیچھے کو الٹ گیا۔ کامل نے فوراً اس کے تیغے کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

اس دوران میں نیا باس کامل کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ وہ کامل کو جن جپھا ڈالنے کے موڈ میں دکھائی دیتا تھا لیکن کامل نے اس کے موڈ کی ایسی کم تیسی کر کے رکھ دی۔ وہ بندہ جیسے ہی کامل کی کِک کی رینج میں آیا، اس نے ایک فولادی ریئر (بیک) کِک اس کے تھوبڑے پر جڑ دی۔ نیا باس نہایت ہی ''شاندار'' طریقے سے بے حرمتی کراتے ہوئے اپنے اس ساتھی سے جا ٹکرایا جو گمشدہ گن کی تلاش میں ''سرگرداں'' تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو لیتے ہوئے ایک بھاری بھرکم ''دھپ'' کے ساتھ زمین بوس ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے حلق سے کراہیں خارج ہونے لگیں۔

کامل نے پہلی فرصت میں دونوں گنز اٹھا کر چھت کی سمت اچھال دیں، دوسری فرصت میں وہ تیغہ سونتے اس کے ''مالک'' کے سر پہنچ گیا اور تیسری فرصت میں اس نے دہاڑ سے مشابہ آواز میں اس مضروب بندے سے استفسار کیا۔

''تم نے اسی تیغے سے میرے ساتھی اعجاز کی گردن کاٹی تھی نا......؟''

اس بندے کی ڈھٹائی قابلِ لعنت وملامت تھی۔ اس نے بپھرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''ہاں، بالکل کاٹی تھی اور...... موقع ملتے ہی میں تمہارے بھی ٹکڑے کر ڈالوں گا۔''

''یہ موقع تمہیں ضرور ملے گا مگر یہاں نہیں، جہنم میں......'' کامل نے سنگین لہجے میں کہا۔ ''اس بنگلے میں تو خون کا بدلہ خون ہے۔ نہ کوئی دِیت اور نہ کوئی بلڈ منی...... قصاص کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

بات کے اختتام پر کامل نے تیغے کا ایک کاری وار کر کے اس قاتل کا سر تن سے جدا کر دیا۔ کٹا ہوا سر کسی فٹ بال کے مانند لڑھکتے ہوئے ان دو افراد کے پاس جا پہنچا جو تھوڑی دیر پہلے گن بردار تھے اور اب نہتے اور گھائل......!

اس بدلتی ہوئی ناقابلِ یقین صورتِ حال نے انہیں حد درجہ خوف زدہ کر دیا۔ اپنے ساتھی کی کٹی ہوئی گردن کی طرف دیکھتے ہوئے وہ چیختے چلاتے اٹھ کر کھڑے ہوئے پھر ہراساں قدموں سے ایک جانب دوڑ لگا دی۔

کامل نے اس تیغے کو گھما کر ایسی تکنیک سے ان کی طرف پھینکا کہ اس کا نشانہ خطا نہیں گیا۔ وہ تیغہ سیدھا جا کر نئے باس کے کندھے پر لگا اور اس کے تیز دھار پھل نے اپنے ٹارگٹ کے شانے کو گہرائی تک چیر ڈالا جس کے نتیجے میں وہ ایک دل خراش چیخ مار کر اوندھے منہ فرش پر گرا اور ذبح کیے ہوئے جانور کے مانند تڑپنے لگا۔ فوری طور پر اس کے اٹھنے کا امکان باقی نہیں رہا تھا لہٰذا کامل نے دوسرے بندے پر ''توجہ'' دی اور اس سے رستم کی موت کا حساب کرنے میں مصروف ہو گیا۔

اپنے دو ساتھیوں کا عبرت ناک انجام دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ اس پر مستزاد وہ بڑے بے ڈھنگے انداز میں کامل پر حملہ آور ہوا۔ وہ کم بخت کسی ڈھنگ سے بھی اٹیک کرتا تو کامل اس کے ساتھ کوئی رُو رعایت کرنے والا نہیں تھا۔ چند ہی سیکنڈ میں کامل نے اپنے ہاتھ پاؤں کی طوفانی ضربات سے اس کا چہرہ لہولہان کر دیا۔ وہ فرش پر گر کر دردناک انداز میں کراہنے لگا۔

کامل کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ان کے ساتھ مزید ''دل داری'' کرتا۔ گھائل کندھے والے نئے باس نے بتایا تھا کہ ان کا بیک اَپ آٹھ منٹ میں وہاں پہنچ جائے گا اور اس مدت میں سے تین منٹ گزر چکے تھے۔ کامل ان لوگوں کی آمد سے پہلے اپنا ''کام'' نمٹا کر وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا لہٰذا اس نے خون آلود چہرے والے اس زمین بوس شخص کی گردن کو اپنے فولادی ہاتھوں کی گرفت میں لے کر ایک زوردار جھٹکا دیا اور اس کی اذیت کا باب بند کرتے ہوئے اسے عدم آباد روانہ کر دیا۔

اب چرے ہوئے شانے والا دشمن باقی بچا تھا۔ کامل تیغہ بہ دست اس کے پاس پہنچا پھر خوں خوار لہجے میں پوچھا۔ ''تم کس قسم کی موت پسند کرو گے۔ تمہاری بھی مُنڈی کاٹوں یا پھر گردن کا منکا تڑوانے کا ارادہ ہے؟''

''کک...... کیا تم مجھے...... معاف نہیں کر سکتے......؟'' وہ اذیت میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔ ''پلیز، مجھے زندہ چھوڑ دو......''

قبل اس کے کہ کامل اسے کوئی بھی اچھا یا بُرا جواب

دیتا، فضا ایمبولینس کے سائرن سے گونج اٹھی۔ وہ دو ایمبولینس تھیں جو طوفانی رفتار سے اس بنگلے کے قریب پہنچ رہی تھیں۔ کامل نے سوالیہ نظر سے، ''کندھا کٹے'' اپنے دشمن کی طرف دیکھا۔

''میں نے تم سے غلط کہا تھا......'' بے پناہ تکلیف کے باوجود بھی وہ اپنے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ سجاتے ہوئے مکروہ لہجے میں بولا۔ ''ہمارا بیک اپ آٹھ نہیں، چار منٹ میں یہاں پہنچنے والا تھا اور...... وہ لوگ آ گئے ہیں۔ اب تمہارا یہاں سے بچ کر نکلنا ناممکن ہے......!''

''تم نے میرا کام آسان کر دیا ہے غلیظ انسان......'' کامل نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دوں لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا۔''

اِدھر کامل کی بات مکمل ہوئی، اُدھر اس کا تیغہ بردار ہاتھ ہوا میں بلند ہوا۔ زمین پر زخمی حالت میں پڑے ہوئے اس نامراد کو چیخنے کا موقع ملا اور نہ ہی چلّانے کی مہلت...... کامل کے جلّادانہ وار نے اس کی گردن کو زخمی کندھے سے الگ کر دیا...... خس کم جہاں پاک!

☆☆☆

جاسم کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک مسطح چٹان پر پایا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور چاروں جانب نگاہ دوڑائی۔ اس کے گرد و نواح میں سرخی مائل نارنجی پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ وہ پہاڑ پھیلاؤ میں کم اور بلندی میں زیادہ تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا، برتھ ڈے والی مخروطی ٹوپیوں کو پہلو بہ پہلو رکھ دیا گیا ہے۔ مطلب ان پہاڑیوں کی ساخت اور شکل اس نوعیت کی تھی۔ اسی کوہی سلسلے کے قدموں میں ایک سرسبز و شاداب وادی بھی تھی جس کے قلب میں شفاف پانی کی جھیل بھی نظر آ رہی تھی۔ جاسم جس مسطح چٹان پر موجود تھا، وہ اسی جھیل کے کنارے پر مناسب بلندی کے ساتھ اِستادہ تھی۔

جاسم کے لیے وہ سب کچھ نیا، اجنبی اور حیران کن تھا۔ اس کی حیرت کا سبب یہ تھا کہ وہ وہاں پہنچ کیسے......؟ وہ تو ایک ٹورسٹ گائیڈ جہانگیر کی گاڑی میں ہوٹل ''مینا'' سے اس کی رہائش گاہ کی طرف جا رہا تھا اور وہ آدھی رات کے بعد کا وقت تھا اور اب سورج طلوع ہو چکا تھا۔ اس کے فلکی زاویے سے جاسم نے اندازہ لگا لیا کہ اسے طلوع ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ وہ لگ بھگ صبح سات بجے کا وقت ہوگا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے ماحول پر گہری نظر ڈالی اور خود کو وہاں تنہا ذی روح پایا۔ اس کے نزدیک یا دور کوئی بھی دوسرا جاندار دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس صورتِ حال نے جاسم کے ذہن کو اُلجھا دیا۔ وہ اس علاقے سے واقف نہیں تھا لیکن یہ ناواقفیت اس کی پریشانی کا باعث نہیں تھی۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ وہاں کیوں ہے اور اسے کس نے وہاں پہنچایا ہے اور...... اور اس کا سفری بیگ کہاں ہے......؟

اپنے ذہن کو فکر انگیز خیالات میں اُلجھانے کے بجائے اس نے اپنے حالات پر غور و فکر شروع کر دیا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ سلور کوئین کے نمک خواروں کو شکست فاش سے ہمکنار کرنے کے بعد وہ تبوک کے ہوٹل ''مینا'' سے بہ خیر و خوبی نکل آیا تھا پھر جہانگیر نامی ایک شخص نے اسے لفٹ دی تھی۔ وہ جاسم کو اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا۔ جہانگیر کے دوستانہ رویے اور پُر اخلاص گفتگو میں کچھ ایسا تھا کہ جاسم نے آنکھیں کھلی رکھتے ہوئے اس پر بھروسا کر لیا تھا۔ ویسے بھی ان لمحات میں اس کے پاس کوئی دوسرا آپشن تھا بھی نہیں۔ وہ ہوٹل مینا میں مار اماری کر کے سلور کوئین کے گماشتوں کو جس قدر اپنے خلاف کر چکا تھا اس کے بعد تبوک کا کوئی بھی ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس اس کے لیے محفوظ نہیں تھا۔ ایسے میں اس ''نائٹ رائیڈر'' جہانگیر کا فلیٹ شب بسری کے لیے ایک آئیڈیل پناہ گاہ تھی اسی لیے وہ اس اجنبی کی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا لیکن دورانِ سفر جہانگیر نے کچھ ایسی انوکھی باتیں کیں کہ جاسم کو لگا، ایشتار کی روح اس کے اندر حلول کر گئی ہو...... بس، اسے یہیں تک یاد تھا۔ اس کے بعد اس کے ساتھ کیا واقعات پیش آئے، وہ ان سے مطلق بے خبر تھا اور...... اب وہ اس اجنبی علاقے میں ایک اکلوتے فرد کی حیثیت سے موجود تھا۔

ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ جہانگیر نے کہیں لوٹ کھسوٹ کی نیت سے اسے بے ہوش کر کے یہاں تو نہیں پھینک دیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے خود ہی اپنے اس خیال کی تردید کر دی۔ اس کے پاس ایسی کوئی بھی قیمتی شے نہیں تھی جس کے حصول کی خاطر جہانگیر نے اسے اس کوہی ویرانے میں لا کر چھوڑ دیا ہو اور وہ بھی اتنا غفلتی حالت میں......

اس کا سفری بیگ غائب تھا اور کلائی والی گھڑی بھی ندارد...... وہ اس مسطح چٹان سے نیچے اتر کر متلاشی نظر سے دور و نزدیک کا جائزہ لینے لگا۔ ایسی کوشش وہ دوبار پہلے بھی کر چکا تھا مگر ناکام رہا تھا لیکن اب کی مرتبہ اسے مایوسی نہیں

ہوئی۔ اسے سامنے والی پہاڑی کی طرف سے کوئی آتا دکھائی دیا تھا۔

اتنے فاصلے سے وہ اس انسان کی شکل کو تو نہیں دیکھ سکتا تھا تاہم یہ اندازہ لگانے میں اسے کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ کوئی عورت تھی اور...... اس کے ساتھ چند جانور بھی تھے جیسا کہ بکریاں اور بھیڑیں وغیرہ......

جلد ہی ان جانوروں کی مخصوص ''میں، میں'' اور ''بیں، بیں'' اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس کا لگایا ہوا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ بھیڑیں اور بکریاں ہی تھیں۔ جاسم نے اپنی توجہ ان پر مرکوز کردی۔

کم و بیش پانچ منٹ کے بعد پیش منظر واضح ہو گیا۔ اب وہ عورت اور اس کی بھیڑ بکریاں جاسم کو صاف دکھائی دینے لگی تھیں۔ وہ سب اسی کی جانب آرہی تھیں۔ جاسم دلچسپی بھری حیرت کے ساتھ یک ٹک انہیں دیکھتا چلا گیا۔ وہ اس کے سامنے پہنچ کر رک گئیں۔ جاسم جسے کوئی عورت سمجھا تھا، وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ اس نے قدیم طرز کا عربی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ بڑے گھیر والے عبایہ اور حجاب نے اس کے چہرے اور ہاتھوں کے سوا باقی پورے بدن کو مکمل طور پر ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کی عمر بیس کے آس پاس رہی ہوگی۔

جاسم نے اپنی زندگی میں اتنی خوب صورت لڑکی، اس سے پہلے کبھی اور کہیں نہیں دیکھی تھی۔ وہ جاسم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زیرلب مسکراتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''تم جاگ گئے......؟''

اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے جاسم نے معتدل انداز میں پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''

اس دلکش نقوش والی جاذبِ نظر حسینہ نے عربی میں جاسم سے سوال کیا تھا۔ جاسم اس زبان میں رواں تھا لہٰذا اس نے بھی جواباً عربی ہی کا استعمال کیا تھا۔

''میرا نام لینا ہے......'' وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں اپنے دادا کے ساتھ اس پہاڑی کے اندر رہتی ہوں۔'' بات کے اختتام پر لینا نے ایک سرخی مائل نارنجی پہاڑی کی جانب اشارہ بھی کردیا۔

''پہاڑی کے اندر......؟'' جاسم نے شک زدہ نظر سے اسے دیکھا۔

''ہاں، اس پہاڑی کے بیچوں بیچ ایک کشادہ غار ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں اور دادا ابوریان اسی غار میں رہتے ہیں۔ بابا نے تمہیں بلایا ہے......!''

''کون بابا؟'' بے ساختہ جاسم کے منہ سے نکلا۔

''میں اپنے دادا کو 'بابا' کہتی ہوں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''ان کے سوا میرا اس دنیا میں اور کوئی نہیں ہے......'' لحاتی توقف کر کے لینا نے جاسم کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''میں تمہیں ہی لینے یہاں آئی ہوں۔ تم پچھلے تیس گھنٹے سے اس چٹان پر بے ہوش پڑے تھے۔ بابا نے کہا تھا، جب تک تم خود بیدار نہ ہو جاؤ، میں تمہارے قریب بھی نہ آؤں......''

''تیس یا تین......؟'' جاسم کا حلق خشک ہونے لگا۔ ''مجھے بتاؤ، میں کتنے گھنٹے سے یہاں سو رہا تھا......؟''

''میں بتا چکی ہوں۔'' اس نے اٹل لہجے میں جواب دیا۔ ''دو مارچ لگ بھگ رات دو بجے سے تین مارچ کی صبح کم و بیش آٹھ بجے تک۔''

''کیا تم مجھ سے کوئی مذاق کر رہی ہو......'' جاسم نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی طویل نیند نہیں لی اور وہ بھی ایسی بے خبر نیند کہ مجھے کسی بات کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہے......''

لینا نے اس کی حیرت کو توجہ سے سنا اور اس کے خاموش ہونے پر قطعی لہجے میں کہا۔ ''میں واقعی کوئی مذاق نہیں کر رہی۔ تمہیں میرے ساتھ جانا ہوگا اور یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ آج مارچ کی تین تاریخ ہے اور اس وقت صبح کے سوا آٹھ بج رہے ہیں۔''

لینا ٹائم اور ڈیٹ کا جو حساب بتا رہی تھی اس کے مطابق تو واقعتاً اس کی نیند کا دورانیہ تیس گھنٹے ہی بنتا تھا۔ جب وہ جہانگیر کے پہلو میں پسنجر سیٹ پر بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا، وہ کم و بیش رات دو بجے کا وقت تھا یعنی یکم مارچ، دو مارچ میں بدل چکی تھی اور لینا بتا رہی تھی کہ اس وقت تین مارچ کی صبح تھی مگر یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی کہ وہ تیس گھنٹے تک بے خبر سوتا رہا تھا اور وہ بھی ایک چٹان پر......!

یہ تمام تر الجھن زدہ خیالات سیکنڈ کے سوویں حصے میں جاسم کے ذہن سے گزر گئے۔ اگلے ہی لمحے لینا کی مدھر آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''تمہاری نیند پر بعد میں بھی بات ہو سکتی ہے۔ فی الحال ہمیں بابا کے پاس جانا چاہیے۔ وہاں کوئی تمہارا انتظار کر رہا ہے......!''

''مطلب اس پہاڑی غار کے اندر تمہارے دادا کے علاوہ اور بھی کوئی موجود ہے......!''

''ہاں!'' لینا نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

جاسم نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''کون؟''

''ہم وہاں چل رہے ہیں نا......'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ''تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔''

''مجھے یہاں کون لے کر آیا ہے؟'' لینا کا پُراسرار رویّہ جاسم کے اندرونی تجسس کو بھڑکا رہا تھا۔ ''بتاؤ، میں تبوک سٹی سے اس کوہی ویرانے میں کیسے پہنچا ہوں......؟''

''تم اس وقت بھی تبوک ہی میں ہو جے بی......!''

لینا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ تبوک کا ریموٹ ایریا (مضافاتی علاقہ) ''الزیتا'' ہے جو ''الزیتا ماؤنٹین'' بھی کہلاتا ہے اور سادہ الفاظ میں اسے صرف ''زیتا'' بھی کہتے ہیں۔ تمہارے باقی کے سوالات کے جواب بابا خود دیں گے۔''

''تمہیں کیسے معلوم کہ میرے نام کی شارٹ فارم ''جے بی'' ہے؟'' جاسم نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ''میں نے تو تمہیں ابھی تک اپنا کوئی بھی نام نہیں بتایا......!''

''میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولی۔ ''اب چلو یہاں سے۔ کسی کو انتظار کرانا اچھی بات نہیں ہے......''

جاسم کے سر پر بھی ضد سوار ہوگئی۔ اس نے لینا کے صبیح چہرے پر نگاہ گاڑ کر قدرے خشک لہجے میں سوال کیا۔ ''اگر میں تمہارے ساتھ جانے سے انکار کردوں تو......؟''

''میں ں ں ں......'' لینا کے جواب دینے سے پہلے ہی اس کے پالتو جانور بول اٹھے۔ ''بیں ں ں......''

لینا نے تحکمانہ نظر سے ان بھیڑ بکریوں کو گھورا۔ اگلے ہی لمحے وہ سب ''میں، میں اور بیں بیں'' کرتے ہوئے اس سرخی مائل نارنجی پہاڑی کی جانب بڑھ گئیں جس کے اندر لینا اور اس کے دادا ابوریان کی رہائش تھی۔

وہ دوبارہ جاسم کی طرف متوجہ ہوئی اور دونوں ہاتھ اپنے پہلوؤں میں ٹکا کر غیر متزلزل لہجے میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''تب مجھے تمہارے ساتھ زبردستی کرنا پڑے گی جے بی......!''

''زبردستی......!'' جاسم نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''مجھے ہنسی نہیں آئی لینا کیا تم کوئی اچھا سا لطیفہ سنا سکتی......''

وہ اس سے آگے کچھ بھی نہ بول سکا۔ اس کے دماغ کو ایک جھٹکا لگا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کر آنکھیں بند کرلیں۔ اگلے ہی لمحے اس نے لینا کو کہتے ہوئے سنا۔

''جے بی! آنکھیں کھول دو۔ ہم غار کے سامنے پہنچ گئے ہیں اور یہ کوئی مذاق یا لطیفہ نہیں ہے......''

جاسم نے غیر ارادی طور پر آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا تو خود کو ایک دیوہیکل پتھر کے سامنے کھڑے پایا۔ اس نے لینا سے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ وہ بول اٹھی۔

''یہ پتھر ہمارے ''گھر'' کا دروازہ ہے۔ اسے ہٹائے بغیر ہم غار کے اندر داخل نہیں ہوسکتے۔ اب یہ نہیں پوچھنا کہ یہ کس قسم کا دروازہ ہے۔ اگر ہم اتنے بڑے پہاڑ کے اندر قیام پذیر ہیں تو اس رہائش کا داخلی دروازہ ایسا ہی ہوگا نا......!''

''ٹھیک ہے، مگر یہ تو بتادو کہ تمہارا یہ دیوقامت سنگی دروازہ اپنی جگہ سے سرکے گا کیسے؟'' جاسم نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اگر میں غلط نہیں ہوں تو اس پتھر کا وزن کم ازکم ستر سے اسّی ٹن تو ہوگا۔ ایسے وزنی اور دیوہیکل پتھر اہرام مصر کی تعمیر میں استعمال ہوئے تھے۔''

''تمہارے سوال کا سادہ سا جواب یہ ہے...... کتاب کا علم ہر ذی روح کے لیے مشکل ترین کاموں کو بھی آسان بنادیتا ہے۔''

''کتاب کا علم!'' بے ساختہ جاسم کے منہ سے نکلا۔ ''تمہارا اشارہ کہیں آصف بن برخیا رحمتہ اللہ علیہ کی جانب تو نہیں ہے؟ اس اللہ کے بندے نے بھی کتاب کے علم کی مدد سے ملکۂ سبا کے تخت کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں، پلک جھپکنے جتنی مدت میں حاضر کردیا تھا۔''

''ہاں، تم ٹھیک سمجھے۔'' لینا نے اثبات میں جواب دیا۔ ''ایسا معجز نما علم انسان کی لکھی ہوئی سائنس، ٹیکنالوجی اور معاشیات کی کسی کتاب سے نہیں بلکہ آخری آسمانی مقدس کتاب قرآن مجید ہی سے حاصل کیا جاسکتا ہے......''

بات کے اختتام پر لینا نے انگلی سے ایک اشارہ کیا اور وہ دیوپیکر پتھر، ابر کے ایک ٹکڑے کے مانند تیرتے ہوئے، غار کے منہ سے ہٹ گیا......!

حیرت و تجسس کی تہ میں چھپی اس داستان کے باقی واقعات اگلے ماہ پڑھیے
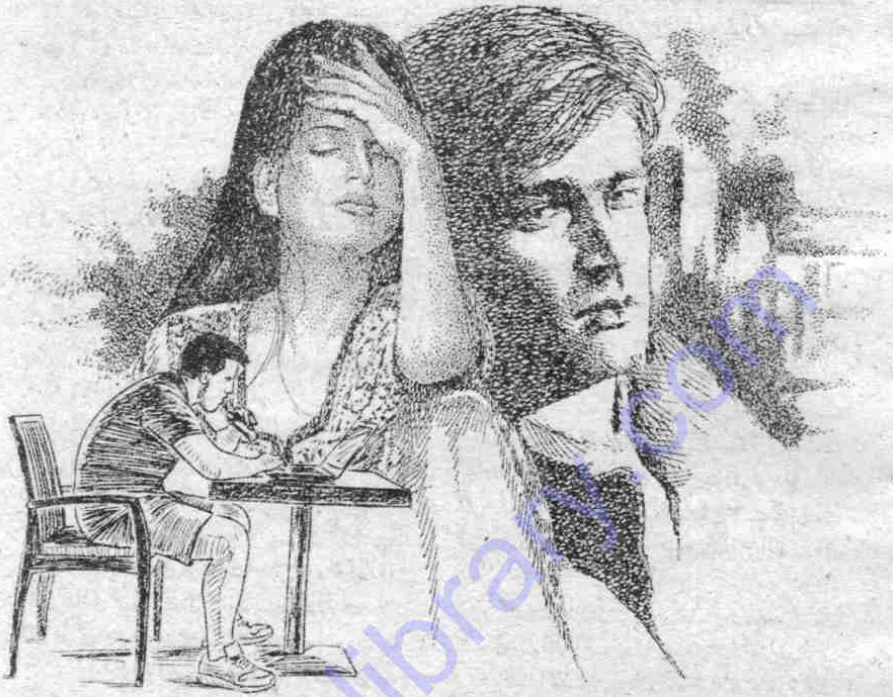
گھاؤ

عمران قریشی

”

محبت شعار دل کو ہمیشہ شفقت اور گرم جوش ساتھی کی تلاش رہتی ہے... مگر ان کی قسمت میں آنسو... ماتم اور دل شکستگی لکھی ہوتی ہے... احساسات کی لرزشوں اور اپنے دل کی جنبشوں کے زیرِ نگیں رہنے والے مقروضوں کی زندگی کے مدّوجزر...

جان لیوا حالات کی یکسانیت کا شکار ہو
جانے والے پروانوں کا دل دوز ماجرا

”

رات گیارہ بجے اُس نے لیپ ٹاپ کھولا اور میسج ٹائپ کیا۔ ”میرا نام عمیر ملک ہے۔ عمر پینتیس سال، قد ساڑھے پانچ فٹ اور جسم دُبلا پتلا ہے۔ میں نے چند سال قبل ایم بی اے کیا اور پھر اپنے باپ کا چلتا ہوا ریسٹورنٹ سنبھال لیا۔ کچھ عرصہ قبل والد صاحب وفات پا گئے۔ ماں کو میں نے آنکھیں کھولنے کے بعد نہیں دیکھا۔ گزشتہ سال میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ اس لیے بالکل تنہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا دوست ہو جس کے ساتھ دکھ سکھ بانٹ سکوں۔ فیس بُک پر آدھی سے زیادہ آئی ڈی جھوٹی ہوتی ہیں لیکن چونکہ تمہارے فرینڈز کی تعداد کم ہے اس لیے تمہیں ریکویسٹ بھیج رہا ہوں۔ اگر اعتراض نہ ہو تو بات چیت کر لینا۔ تمہارے جواب کا منتظر رہوں گا۔“ اس نے میسج سینڈ کر دیا۔ جواب کافی دیر کے بعد موصول ہوا۔

”تمہاری تصویر مجھے پسند آئی۔ اس لیے جواب دے رہی ہوں۔ آئی ڈی پر تم میرا نام پڑھ چکے ہو گے۔

ثانیہ احمد عرف سنی۔ مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔ اس لیے کوشش کرتا کہ جھوٹ نہ بولنا۔ اس نفرت کی وجہ سے میرے فرینڈز کی تعداد بہت کم ہے۔ تم نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کی بات کی لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس کی وجہ کیا تھی؟''

عمیر نے جواب ٹائپ کرنا شروع کیا۔ ''وہ بے غیرتی کی حد تک بے وفا تھی۔ میں نے اُسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اور موقع پر ہی طلاق دے دی۔ جن حالات سے گزر چکا ہوں، ان کے بارے میں سوچ کر ہی وحشت ہوتی ہے۔ میں تم سے کچھ بھی چھپاؤں گا نہیں۔ ابھی چند دن پہلے میرا علاج مکمل ہوا ہے۔ بیوی کی بے وفائی نے مجھے نفسیاتی مریض بنا دیا۔ میرے دل میں صنفِ نازک کے لیے نفرت پیدا ہوگئی اور میں نے کوٹھی میں کام کرنے والی دونوکرانیوں کو قتل کرنے کی کوشش کی اور مجھے ملک کے مشہور و معروف ڈاکٹر کے حوالے کر دیا گیا۔ وہاں سے چند دن پہلے صحت یاب ہونے کے بعد واپس آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے اس کڑدے سچ کی بدولت تم اپنا ارادہ ملتوی کردو گی لیکن تمہاری طرح مجھے بھی جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔''

اس نے میسج سینڈ کر دیا۔ جواب موصول ہوا۔

''تمہاری سچائی نے میرا دل موہ لیا ہے لیکن جہاں تک عورتوں سے نفرت کرنے کی بات ہے تو میرا یہ ماننا ہے کہ اگر شوہر باہر منہ ماری نہ کرے تو بیوی کبھی بھی بے وفائی کی مرتکب نہیں ہوتی۔ اگر تمہیں مکافاتِ عمل پر یقین ہے تو تم بہ آسانی میری بات کی گہرائی تک پہنچ جاؤ گے۔''

عمیر نے میسج ترتیب دیا۔ ''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ان دنوں ریسٹورنٹ میں میری بہت سی گرل فرینڈز تھیں۔ ہمارے تعلقات صرف دوستی کی حد تک محدود تھے۔ لیکن میری بیوی نے تو حد ہی کر دی تھی۔ وہ غیر مردوں کے ساتھ ہوٹلوں میں راتیں گزارتی تھی۔ تم سوچ سکتی ہو اگر مرد بے وفائی کا مرتکب ہو تو عزت میں کمی نہیں آتی۔ لیکن اگر عورت بے وفائی کرے تو شوہر کی عزت نیلام ہو کر رہ جاتی ہے۔''

اس نے تحریر سینڈ کر دی۔ پانچ منٹ کے بعد اسے غصے سے بھرا ہوا جواب موصول ہوا۔

''عورت بے وفائی کرے تو عزت نیلام ہو جاتی ہے اور مرد بے وفائی کرے تو عزت بڑھ جاتی ہے۔ تمہاری اس منطق نے مجھے آپے سے باہر کر دیا ہے۔ تم نے جن عورتوں کے ساتھ وقت گزارا وہ بھی تو کسی کی بیویاں ہوں گی۔ کیا تم نے اُن کے شوہروں کی عزت نیلام نہیں کی؟ اسی کو تو مکافاتِ عمل کہتے ہیں، اگر تم ایسا نہ کرتے تو تمہارے ساتھ بھی ایسا نہ ہوتا۔''

عمیر نے جھنجلائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ''میں اس موضوع پر مزید بات چیت نہیں کرنا چاہتا۔ وہ بہت اذیت ناک لمحات تھے۔ تم نے سچائی کی بات کی اس لیے میں نے ان واقعات کے متعلق بتا دیا ورنہ میں ان کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتا ہوں۔''

اس دفعہ جواب جلدی موصول ہوا۔ ''ٹھیک ہے میں خود بھی اس موضوع پر بات چیت نہیں کرنا چاہتی اس لیے موضوع بدلتی ہوں۔ میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کر رہی ہوں۔ رات کو دیر سے فارغ ہوتی ہوں۔ اس لیے گیارہ سے بارہ بجے کا وقت تمہیں دے سکتی ہوں۔ کیونکہ پورے بارہ بجے مجھے سونا ہوتا ہے۔ میں صبح آٹھ بجے آفس کے لیے نکلتی ہوں اور تمہاری طرح میرے فلیٹ میں نوکر چاکر کام نہیں کرتے۔ مجھے سب کچھ خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے کل تک کے لیے خدا حافظ...... گیارہ بجے تمہارا انتظار کروں گی۔''

عمیر نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ پونے بارہ بج رہے تھے۔ سنی نے لائن آف کر دی تھی۔ اس نے بھی لیپ ٹاپ بند کر دیا اور سائڈ ٹیبل پر رکھنے کے بعد ٹانگیں پسار کر لیٹ گیا۔ لڑکی کی کھری باتوں نے اس کے دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسے ڈاکٹر نے سختی کے ساتھ منع کیا تھا کہ وہ گزرے ہوئے واقعات کے متعلق بالکل بھی بات چیت نہ کرے لیکن کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو ہی جاتی تھی جو اسے گزرے ہوئے لمحات کو یاد کرنے پر مجبور کر دیا کرتی تھی۔ اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ تھوڑی سی بات چیت نے اسے سدرہ کی یاد دلا دی تھی۔ وہ اگر پاگل ہو جاتا تو شاید بہتر ہوتا۔ لیکن سدرہ کے طرزِ عمل نے اسے پاگل کرنے کے بجائے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ عورتوں کے لیے اس کے دل میں نرم گوشہ ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ بات غیر معمولی نہیں تھی۔ کتنے ہی مردوں کی عورتوں نے بے وفائی کی ہوگی اور کتنے ہی مرد بے وفائی کے مرتکب ہوئے ہوں گے۔ بات تو صرف اتنی سی تھی کہ جو بھی ہوا تھا، وہ غیر متوقع طور پر بالکل ہی اچانک ہوا تھا۔ جس نے اس کے دماغ پر بہت بُرا اثر ڈالا تھا۔ وہ اس دھچکے کو برداشت نہیں کر سکا تھا۔ اسے سدرہ سے اس اقدام کی توقع نہیں تھی۔ ان دونوں نے محبت کی شادی کی تھی۔ سدرہ کے والد شادی کے خلاف تھے۔ انہوں نے رشتے سے صاف انکار کر دیا۔ تب سدرہ نے بھاگ کر اسے شادی کرنے کے

لیے ورغلایا۔ لیکن عمیر نے صاف انکار کر دیا۔ وہ سب کچھ ماں باپ کی مرضی سے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کو سدرہ کے اگلے اقدام کی توقع نہیں تھی۔ ورنہ شاید وہ اسے انکار نہ کرتا۔ اس نے اگلے دن زہر کھا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ بروقت طبی امداد مل جانے کی وجہ سے وہ مرنے سے بچ گئی اور اس کے باپ نے اسپتال میں ہی ان دونوں کی بات چیت طے کر دی۔ یوں ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

کچھ دن گزرنے کے بعد عمیر کو معلوم ہو گیا کہ وہ بہت ضدی اور اکھڑ مزاج لڑکی تھی۔ ہنس کر بات کرنا اس کی گھٹی میں شامل نہیں تھا۔ وہ رات کو جب ریسٹورنٹ سے تھکا ہارا گھر آتا تو وہ گلے شکوے اور شکایتیں لیے بیٹھی ہوتی جن کا کوئی بھی حل اس کے پاس نہیں تھا۔ اتوار کا دن عمیر کے لیے قیامت کا دن بن کر رہ جاتا تھا۔ تاہم جب سدرہ کا باپ فوت ہوا تب اس نے نوکری کر لی اور یوں عمیر کی جان خلاصی ہو گئی۔ لیکن اتوار کا دن اب بھی اس کے لیے سوہانِ روح بن جایا کرتا تھا اور اس کا حل اس نے یوں نکالا کہ اتوار کو چھٹی کرنا بھی ترک کر دی۔ اس کے ریسٹورنٹ میں چند لڑکیاں کام کرتی تھیں۔ وہ جلد ہی اُن کی جانب راغب ہو گیا۔ یوں اس کا وقت اچھا گزرنے لگا۔

ریسٹورنٹ اچھا خاصا چل رہا تھا لیکن کورونا کے دنوں میں کام تباہ ہو گیا۔ تب اس نے آن لائن ڈیلیوری کا کام شروع کر دیا۔ کسٹمر اسے فون پر اپنا آرڈر لکھوا دیتے اور وہ انہیں اپنے مختصر اسٹاف کے ذریعے مطلوبہ مقام پر ڈیلیور کر دیا کرتا تھا۔ اس کے چند ایسے مخصوص کسٹمر تھے جو روزانہ آرڈر دیا کرتے تھے۔ ان میں سرفہرست منیر حقانی صاحب تھے۔ وہ نہایت عیاش طبیعت کے مالک تھے۔ ہوٹل شاہ جہان میں ان کے نام پر ایک کمرا مخصوص تھا۔ جہاں وہ روزانہ کسی عورت کے ساتھ رات گزارتے تھے اور رات کا کھانا انہیں عمیر کے ریسٹورنٹ سے ڈیلیور کیا جاتا تھا۔ ایسی ہی ایک طوفانی رات کو جب ریسٹورنٹ میں کام کرنے والے تمام لڑکے باہر جا چکے تھے۔ تب منیر حقانی کا فون موصول ہوا۔ انہوں نے حسبِ معمول لمبا چوڑا آرڈر لکھوا دیا۔ اب مسئلہ یہ ہوا کہ آرڈر کو ڈیلیور کرنے کے لیے وہاں کوئی لڑکا موجود نہیں تھا۔ منیر حقانی کا آرڈر دس ہزار کے لگ بھگ تھا۔ اس لیے اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عمیر نے چند لمحے انتظار کیا پھر آرڈر کو پیک کروانے کے بعد گاڑی میں رکھ کر ہوٹل شاہ جہان کی طرف آ گیا۔ بارش متواتر ہو رہی تھی اور گھڑی نو بجے کا وقت دے رہی تھی۔ وہ عموماً بارہ بجے کے بعد ریسٹورنٹ بند کیا کرتا تھا۔ لیکن کورونا کے دنوں میں ٹائمنگ بدل گئی۔ اب وہ دس بجے ریسٹورنٹ کو بند کر دیا کرتا تھا۔ سدرہ آفس سے بہت لیٹ آتی تھی۔ اس طرح اسے سکون کے چند لمحات میسر آ جایا کرتے تھے۔

ہوٹل شاہ جہان کی لابی سنسان پڑی تھی۔ وہ لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پر آ گیا۔ کمرا نمبر پچاسی منیر حقانی صاحب کے نام پر مختص تھا اور مخصوص حلقے میں یہ افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ ہوٹل شاہ جہاں ایک فائیو اسٹار ہوٹل تھا اور منیر حقانی صاحب کے نام تھا۔ اس بات میں کتنی صداقت تھی، اس کے متعلق عمیر کو کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا۔ لیکن یہ مہنگا آرڈر وہ کم و بیش روزانہ ہی دیا کرتے تھے اور یہ کھانا وہ اپنی منظورِ نظر عورت کے ساتھ تناول کرتے تھے۔

کمرا نمبر پچاسی کے سامنے پہنچنے کے بعد اس نے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور عمیر کے دماغ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس کے سامنے تولیا لپیٹے ہوئے سدرہ کھڑی تھی۔ جس کے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ وہ غسل کر کے دروازے پر آئی تھی۔ عمیر کو سامنے کھڑا دیکھ کر اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ اس نے عمیر کے ہاتھوں سے پیک شدہ ڈبے لیے اور پھر جھٹکے کے ساتھ دروازہ کو بند کر دیا۔ عمیر کتنی ہی دیر دروازے کے پاس بُت بنا کھڑا رہا۔ پھر گاڑی میں بیٹھ کر گھر آ گیا۔ اس کا دماغ اس جھٹکے کی وجہ سے ماؤف ہو گیا تھا اور محبت بھرے وہ دن اس کے دل و دماغ پر بجلی بن کر گر رہے تھے جب سدرہ نے اس کی محبت میں مجبور ہو کر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی اور آج اتنا بڑا گھاؤ لگا کر اس نے عمیر کے دل کو مجروح کر کے رکھ دیا تھا۔ جسے اگر وہ نظرانداز کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا۔

وہ تمام رات جاگتا رہا۔ سدرہ واپس نہیں آئی۔ اس کے بعد وہ کتنی ہی راتیں سو نہیں سکا۔ وہ آنکھیں بند کرتا تو وہ اسے تولیے میں لپٹی کمرا نمبر پچاسی کے دروازے پر کھڑی دکھائی دیتی تھی اور وہ ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیتا تھا۔ تین راتیں جاگنے کے بعد اس نے نیند کی گولیاں کھانا شروع کر دیں۔ ان گولیوں سے اسے وقتی طور پر نیند آ جاتی تھی لیکن دماغ فریش نہیں ہو پاتا تھا۔ اسے عورتوں سے نفرت ہو گئی اور بالآخر اس نے کوٹھی میں کام کرنے والی دو لڑکیوں کو چاقو مار کر ہلاک کرنے کی کوشش کی لیکن دوسرے نوکروں نے بروقت دخل اندازی کر کے اسے ارادے میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ تب اس نے ڈاکٹر عرفان احمد سے علاج کروانا

شروع کیا۔ اس کے علاج سے عمیر کو افاقہ ہوا۔ لیکن عورتوں کے خلاف نفرت اب بھی قائم تھی۔ تب عرفان احمد نے اسے فیس بک پر دوست بنانے کی ترغیب دی اور اسے سمجھایا کہ اس دوستی کو اپنے حواسوں پر طاری نہ کرے۔ کوئی بھی دوست رابطہ کرنے کے بعد معاملے سے پیچھے ہٹ سکتا ہے۔ اسے نظرانداز کرنا آسان کام نہیں لیکن حواسوں پر طاری کر لینے کی نسبت بہتر ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تعلقات کی شروعات میں اپنے آپ کو ایک مخصوص حد تک متعین کرلیا جائے اور اس حد سے آگے بڑھنے سے پرہیز کیا جائے۔

عمیر ڈاکٹر کی ہدایات پر بخوبی عمل کررہا تھا۔ حد سے تجاوز کرنے کی بات اسے سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ تو عورتوں سے بات چیت کرنے کا بھی روادار نہیں تھا۔ سنی سے چیٹنگ بھی صرف اس کی ہدایات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کررہا تھا۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیسی شخصیت کی مالک تھی۔ ایک ہلکی سی شبیہ اس کے دل و دماغ میں غیر محسوس طور پر نمایاں ہونے لگی تھی جس کے مطابق وہ نہ ہی زیادہ خوب صورت تھی اور نہ ہی اتنی گئی گزری کہ اسے نظرانداز کیا جاسکتا۔ تاہم وہ اب محتاط تھا اور اس نے جلد ہی اس شبیہ کو نظرانداز کردیا۔ اب اس کے لیے یہ سب ایک خوب صورت کھیل سے کم نہیں تھا اور اس کھیل میں اس نے اپنے نام کو پوشیدہ رکھا تھا۔ عمیر ایک فرضی نام تھا۔

☆☆☆

اگلے دن اس نے ڈاکٹر عرفان احمد سے ملاقات کی۔ اس کی عمر پچاس سال سے کچھ اوپر تھی۔ چہرے پر موٹے شیشوں والی عینک لگی ہوئی تھی اور وہ گرین شرٹ اور سیاہ پینٹ میں ملبوس تھا۔ چہرے پر کوئی خاص تاثرات نہیں تھے۔ وہ سنجیدہ طبیعت کا مالک دکھائی دیتا تھا۔ اسے دیکھ کر بہ آسانی سوچا جاسکتا تھا کہ وہ اپنی اب تک کی زندگی میں شاید ہی کبھی کھل کر ہنسا ہوگا۔

عمیر نے اسے بتایا۔ ہماری بات چیت کم و بیش آدھے گھنٹے تک جاری رہی۔ اس نے اپنے متعلق بہت کم بتایا اور میرے متعلق زیادہ پوچھا۔ اسے جھوٹ سے نفرت ہے اور مردوں سے لگاؤ نہیں ہے۔ وہ بہت آہستہ آگے بڑھ رہی ہے۔ میں نے اپنی تصویر اسے سینڈ کردی۔ جس پر اس نے اعتراض نہیں کیا۔

ڈاکٹر بولا۔ ”تو پھر اس بات کو ذہن نشین کرلینا کہ وہ عورت کے لبادے میں چھپا ہوا کوئی مرد بھی ہوسکتا ہے۔ تم خوب صورت لڑکی ہونے کی توقع میں امید ٹوٹ جانے کے بعد دوبارہ گھائل نہ ہو جانا اور وہ جیسا کہتی ہے، ویسا ہی کرتے جانا۔“

عمیر بولا۔ ”لیکن میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا ہوں بلکہ اس سے ہی نہیں، میں کسی بھی عورت سے شادی نہیں کرنا چاہتا ہوں تو فضول میں ٹائم ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

ڈاکٹر مسکرایا۔ ”شادی کرنا یا نہ کرنا تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن عورتوں سے بات چیت کرنے کے لیے تمہیں اپنے دل سے نفرت کو نکالنا ہوگا۔ تم ایک چلتے ہوئے ریسٹورنٹ کے مالک ہو جس میں کم و بیش روزانہ ہی تمہارا واسطہ عورتوں سے پڑتا ہے۔ اگر ان سے روکھے انداز میں بات چیت کرو گے تو تمہارے کاروبار کی ساکھ بھی متاثر ہو سکتی ہے۔ ان سے بات چیت کرو اور اپنے دل سے نفرت کو نکال دو اور ہاں کیا تم نے اس سے پوچھا کہ وہ شادی شدہ ہے یا نہیں؟“

”نہیں، اس نے مجھے اپنے بارے میں بہت کم بتایا ہے اور مجھے پوچھنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ ٹھیک ہے۔ میں اس سے آج رات پوچھوں گا۔ مجھے شادی شدہ عورتوں سے بات چیت کرنا قطعی پسند نہیں۔“

ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”یہ بہت ضروری ہے۔ تمہیں ایک ایسے ساتھی کی اشد ضرورت ہے جسے تم اپنے اچھے اور بُرے حالات کے متعلق بتا سکو۔ اس سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ اگر وہ ساتھی تمہاری بیوی کی طرح مفاد پرست اور دھوکے باز ہو تو پھر جو میں نے بتایا ہے اس پر عمل کرنا۔ کسی بھی انسان کو اپنے دماغ سے ڈیلیٹ کردینا اب تمہیں آجانا چاہیے۔ سدرہ کے ساتھ دنیا ختم نہیں ہوگئی اور بھی بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو تمہارے التفات کے منتظر ہیں۔ ان کے ساتھ رجوع کرو۔“

عمیر اٹھ کر کمرے سے باہر آگیا اور ڈاکٹر عرفان احمد سوچنے لگا کہ اس کا علاج اس وقت مکمل ہوگا جب عمیر شادی کرے گا۔ ورنہ کچھ عرصے کے بعد اس کے دل میں صنفِ نازک کے لیے نفرت اس حد تک بڑھ جائے گی کہ وہ ایک دفعہ پھر قتل کرنے کے متعلق سوچنے لگے گا۔ اس دفعہ یہ سوچ اتنی شدت سے نمودار ہوگی کہ وہ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا قتل کرتا چلا جائے گا۔ اب یہ سنی کے رویے پر منحصر تھا کہ وہ عمیر کو کیسے ہینڈل کرتی ہے۔ چند دن پہلے وہ عرفان احمد کے کلینک آئی تھی۔ اسے تقریباً وہی بیماری لاحق تھی جس کا شکار عمیر تھا۔ اس نے زندگی میں اتنے

دعوے کھائے تھے کہ اسے مردوں سے نفرت ہوگئی تھی۔ تاہم عمیر کی طرح اس نے کسی کو قتل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کا مرض ابھی ابتدائی مراحل میں تھا اس لیے اسے جلد ہی افاقہ ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر نے اس سے فیس بک کی آئی ڈی لے لی تھی جو فرضی نام سے تھی۔ ڈاکٹر نے عمیر کو سنی سے رجوع کرنے کے لیے کہا تھا۔ دوسری جانب اس نے سنی کو بھی بات چیت کرنے کے لیے اکسایا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی یہ کاوش ان دونوں کے حق میں سعد ثابت ہوگی۔

☆☆☆

عمیر کی بیوی سدرہ ایک حساس طبیعت کی جذباتی عورت تھی۔ وہ جو سوچتی تھی، اس پر عمل کر کے دم لیتی تھی۔ تاہم یہ سب کرنے کے لیے اسے عمیر کے رویّے نے مجبور کیا تھا۔ وہ اس کی خاطر اپنے باپ کو چھوڑ کر آئی تھی اور اسے اپنے شوہر سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ جن پر عمیر پورا نہیں اترا تھا اسی لیے اس نے نوکری کر لی تھی۔ آفس میں اس کے ساتھ ایک ایسی لڑکی کام کرتی تھی جس کے موبائل میں ایسے لاتعداد مردوں کی تصاویر موجود تھیں جنہیں عورتوں کی ضرورت کم و بیش پڑھتی رہتی تھی۔ ان سب مردوں کے موبائل نمبر اس کے پاس موجود تھے۔ وہ ان کے ساتھ تعلقات رکھتی تھی اور ان سے ماہانہ معاوضہ وصول کیا کرتی تھی۔ اسے نوکری کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ نوکری تعلقات بڑھانے کے لیے کرتی تھی۔ آفس کے آدھے سے زیادہ مرد اس کے گرویدہ تھے۔ وہ ان سے اچھی خاصی رقم وصول کیا کرتی تھی۔ اس لڑکی کا نام نیلم تھا۔ جلد ہی اس کی سدرہ کے ساتھ دوستی ہو گی اور وہ دونوں دوپہر کا کھانا قریبی ریسٹورنٹ میں کھانے لگیں۔

ایک دن کھانے کے دوران اسے کسی کی کال موصول ہوئی اور اس نے چند لمحے بات چیت کے بعد اسے اتوار کے دن ساحلِ سمندر پر آنے کا وقت دے دیا۔ موبائل سے آتی مرد کی ہلکی آواز سدرہ نے سن لی تھی۔ اسے فوراً معلوم ہوگیا کہ وہ عمیر تھا۔ تاہم تصدیق کرنے کے لیے اس نے نیلم کا موبائل اٹھایا اور نمبر پر نگاہ ڈالی۔ نمبر عمیر کا ہی تھا۔ تب اس نے نیلم سے اس کے متعلق دریافت کیا تو نیلم نے بتایا کہ عمیر ایک ریسٹورنٹ کا تنہا مالک ہے۔ وہ کچھ عرصہ قبل اس کے ریسٹورنٹ میں کام کر چکی ہے۔ عمیر نے ساحلِ سمندر پر ایک کاٹیج اسی نیت سے مخصوص کر رکھا ہے۔ وہ عورتوں کو وہاں لے جایا کرتا ہے اور معاوضہ دینے میں بہت فیاضی سے کام لیتا ہے۔ سدرہ کو شک پہلے ہی تھا۔ اب یہ شک یقین

میں بدل گیا اور اس کا دل ٹوٹ کر رہ گیا۔ اس نے عمیر کی محبت پانے کے لیے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ عمیر نے اس کی اس قربانی کا بھی لحاظ نہیں کیا تھا۔

وہ کوٹھی میں آ کر تمام رات روتی رہی اور صبح اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ عمیر سے بدلہ ضرور لے گی۔ دوپہر کو کھانے کے دوران اس نے نیلم کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا اور اس کے ہاتھ پر رقم رکھتے ہوئے اسے مجبور کیا کہ وہ اتوار کو ہونے والی ملاقات کی تمام ویڈیو بنا کر اس کے حوالے کر دے۔ نیلم نے اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے رقم واپس کر دی اور اتوار کو عمیر کی مووی بنانے کے بعد اسے سدرہ کے نمبر سینڈ کر دیا۔ اس رات مووی دیکھ کر سدرہ کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے اس کی موت واقع ہوگئی ہو۔ دل ٹوٹنے کے بعد باقی صرف مٹی کا جسم بچ جاتا ہے۔ جس کی کوئی اوقات نہیں ہوتی۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ عمیر کو قتل کر دے گی اور جب اس نے اپنے ارادے سے نیلم کو آگاہ کیا تو نیلم استہزائیہ لہجے میں بولی۔

”اس کو قتل کرنے کے بعد تم اپنے آپ کو پولیس والوں کی نگاہوں سے کیسے پوشیدہ رکھو گی۔ وہ تمہیں گرفتار کر کے پھانسی پر چڑھا دیں گے۔ میری بات مانو اور اسے ایسی سزا دو کہ وہ اسے جیتے جی یاد رکھے۔“

سدرہ نے پوچھا۔ ”تو پھر تم بتاؤ، میں کیا کروں۔ مجھے تو قتل کے سوا اور کچھ سجھائی نہیں دے رہا؟“

نیلم نے بتایا۔ ”اس نے تمہاری محبت کا قتل کیا ہے۔ تم بھی اس کی محبت کو قتل کرو۔ طریقہ میں تمہیں بتا دیتی ہوں۔ میں منیر حقانی کی منظورِ نظر ہوں۔ وہ مجھ پر فدا ہو چکا۔ اس لیے اس نے مجھے مستقل طور پر خدمات کے لیے رکھ لیا ہے۔ ہوٹل شاہ جہان میں کمرا نمبر پچاسی اس کے نام پر بک ہے۔ وہ مجھے ہفتے کی رات وہاں بلاتا ہے۔ کمرے کی چابی میرے پاس ہے۔ تمہیں بس اتنا کرنا ہے کہ ہفتے کی رات کمرا نمبر پچاسی میں آجانا۔ میں تمہارے شوہر کو کھانے کا آرڈر دوں گی۔ اس کے ریسٹورنٹ کے تمام ورکرز سے میرے تعلقات ہیں۔ میں انہیں یہ بات ذہن نشین کروا دوں گی کہ نو بجے سے پہلے ریسٹورنٹ سے باہر چلے جائیں۔ چونکہ آرڈر دس ہزار کے قریب ہوگا اس لیے مجبوراً اسے ڈیلیور کرنے کے لیے عمیر کمرا نمبر پچاسی میں آئے گا اور تم بالوں کو گیلا کرنے کے بعد وہ آرڈر وصول کرو گی۔ میرے خیال میں اس دھچکے کے بعد عمیر اگر خودکشی نہیں کرے گا تو تمہیں طلاق ضرور دے دے گا۔ اس کے ساتھ مزید رہنے

سے بہتر ہے کہ تم اس سے علیٰحدہ ہو جاؤ لیکن اگر علیٰحدہ ہونے کا فیصلہ وہ کرے تو زیادہ بہتر ہوگا۔"

سدرہ نے پوچھا۔ "لیکن منیر حقانی مجھے کمرے میں گھسنے کیوں دے گا۔ اگر گھسنے بھی دے تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ میرے گلے نہیں پڑے گا؟"

نیلم نے بتایا۔ "وہ ہوٹل کے کمرے میں رات دس گیارہ بجے کے بعد آتا ہے۔ تم اس وقت تک فارغ ہو کر واپس جا چکی ہوگی۔ چونکہ عمیر میری آواز پہچانتا ہے اس لیے ہم آرڈر کسی ویٹر کے ذریعے لکھوائیں گے۔"

سدرہ نے اثبات میں سر ہلایا اور بعد میں جیسا نیلم نے کہا، اس نے ویسا ہی کیا۔ اس کے دل میں اس وقت ٹھنڈ پڑ گئی۔ جب عمیر نے کمرا نمبر پچاسی کے دروازے پر آرڈر وصول کرتے ہوئے اسے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر جو تاثرات تھے وہی تاثرات اس وقت سدرہ کے چہرے پر بھی تھے جب اس نے نیلم کی طرف سے بھجوائی جانے والی وہ فلم دیکھی تھی جس میں وہ نیلم کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ اگلے ہفتے ہی ان دونوں کے درمیان طلاق ہوگئی اور سدرہ نے دل میں تہیہ کر لیا کہ اب وہ دوبارہ نارمل زندگی گزارنے کی کوشش کرے گی اور عمیر کو اپنے دل و دماغ سے باہر نکال دے گی۔ اس کے پاس نہ صرف اچھی نوکری موجود تھی بلکہ باپ کا چھوڑا ہوا فلیٹ بھی تھا۔ وہ طلاق کے بعد اس فلیٹ میں منتقل ہوگئی۔

☆☆☆

اگلے دن گیارہ بجے عمیر نے سنی سے رابطہ کیا۔ رسمی بات چیت کے بعد سنی نے اسے اپنے متعلق یوں بتایا۔

"میرا شوہر آوارہ، بدمزاج اور عیاش انسان تھا۔ اس لیے ہماری شادی صرف ایک ہفتہ ہی چل سکی۔ اس سے پہلے پندرہ سال کی عمر میں مجھے اپنے ٹیچر سے محبت ہوئی۔ اس نے مجھے اسٹاف روم میں بلا کر زیادتی کی اور مجھے ڈرا دھمکا کر ماں باپ کو بتانے سے منع کر دیا۔ اگلے سال میں نے اسکول کو چھوڑ دیا۔ کالج میں جس لڑکے کے ساتھ میری فرینڈ شپ ہوئی، اس نے میری تصاویر انٹرنیٹ پر دے کر اچھی خاصی رقم حاصل کر لی اور مجھے ماں باپ کی نظروں میں گرا کر خود شہر سے فرار ہو گیا۔ ان واقعات کے بعد مردوں کے اوپر سے میرا اعتماد اٹھ گیا پر میں نے تہیہ کر لیا کہ آئندہ کسی بھی مرد کو اپنی زندگی میں داخل نہیں ہونے دوں گی۔"

عمیر نے تحریر ٹائپ کی۔ "جو واقعات تم نے مردوں کے خلاف بیان کیے ہیں...... ایسے بہت سے واقعات سے میری زندگی بھری ہوئی ہے۔ میری بیوی نے مجھے نہ صرف دھوکا دیا بلکہ غیر مردوں کے بستر بھی گرم کرتی رہی۔ میں نے اسے طلاق دے دی۔ تمہاری طرح مجھے بھی عورتوں سے نفرت ہوگئی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دنیا میں سے خلوص اور وفاداری کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ اچھے اور مخلص ساتھی اب بھی موجود ہیں۔ میری سیکریٹری جو مجھ سے عمر میں دس سال بڑی ہے، میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ میری ہر ضرورت کو پورا کرنا اس نے اپنے فرائض میں شامل کر لیا ہے۔ وہ میرے کھانے پینے کے بارے میں فکرمند رہتی ہے۔ میری چند گولیاں ایسی ہیں جو مجھے وقتاً فوقتاً کھانی ہوتی ہیں۔ ان کا خیال رکھتی ہے۔ اتوار کو چھٹی ہونے کے باوجود بھی وہ میری کوٹھی میں آ کر ہفتے بھر کے کپڑے استری کرنے کے بعد ہینگر میں لٹکا دیتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے مجھ سے کوئی توقعات وابستہ ہیں۔ اسے مخصوص تنخواہ ملتی ہے۔ جس میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ سب اپنی خوشی کے لیے کرتی ہے۔"

جواب موصول ہوا۔ "تو پھر تم اُس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ کیا صرف اس وجہ سے کہ وہ تم سے دس سال بڑی ہے یا پھر چونکہ وہ تمہاری سیکریٹری ہے اور اس سے شادی کرنے کی وجہ سے تمہاری حیثیت میں فرق آ سکتا ہے یا پھر وہ ہی ایسا نہیں چاہتی۔"

عمیر نے جواب دیا۔ "وہ مجھ سے بڑی ہونے کے علاوہ تین بچوں کی ماں بھی ہے۔ اس کا شوہر دو سال قبل ٹریفک حادثے میں ہلاک ہوگیا اس لیے مجبوراً کام کر رہی ہے۔ ورنہ باپردہ گھریلو عورت ہے اور میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

تحریر موصول ہوئی۔ "تو تمہیں اعتراض تین بچوں کی ماں ہونے پر ہے۔ اگر بچے نہ ہوتے تو شاید تم اب تک اس سے شادی کر چکے ہوتے۔ سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کتّوں کی طرح دم ہلا کر عورتوں کے پیچھے پھرنا ان کی فطرت میں شامل ہوتا ہے۔"

عمیر نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے جواب تحریر کیا۔ "مرد ہمیشہ اس عورت کے پیچھے جاتا ہے جس کی نیت خراب ہو۔ تم نے بھی کسی شریف عورت کے پیچھے اوباش مردوں کو جاتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔ بہرکیف اس خشک موضوع پر بہت بات چیت ہوگئی۔ اب یہ بتاؤ کہ اپنی تصویر کب سینڈ کرو گی؟ میں بھی تو دیکھوں کہ مجھ سے بات

چیت کرنے والی کتنی خوب صورت ہے۔"
جواب موصول ہوا۔ جب تم نے شادی ہی نہیں کرنی تو خوب صورتی اور بدصورتی سے تمہیں کیا سروکار۔ پونے بارہ بجے میں نیٹ کے آگے سے اٹھ جاؤں گی۔ اس لیے اگر کوئی ڈھنگ کا سوال پوچھنا ہے تو فوراً پوچھ لو۔"
عمیر نے تحریر ٹائپ کی۔ "مجھے عورتوں سے نفرت ہے اور تمہیں مردوں سے...... اس لیے میرے خیال میں ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے موزوں ہیں۔ کیونکہ ہمارے درمیان مفاد پرستی کا رشتہ موجود نہیں اس لیے دھوکا کھانے کا خدشہ بھی لاحق نہیں۔ تم مجھے چھوڑ کر کسی مرد کی جانب راغب نہیں ہوگی اور میں تمہارے ساتھ بے وفائی نہیں کروں گا۔ کیونکہ ہم دونوں ایک ہی سانپ کے ڈسے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ پنپ سکتا ہے۔"
جواب جلد ہی موصول ہوا۔ "ٹھیک ہے لیکن تم میری ذاتیات میں دخل اندازی نہیں کرو گے۔ میں گزشتہ ہونے والے واقعات کو بھلا دینا چاہتی ہوں اس لیے آئندہ ہم ان پر بات چیت نہیں کریں گے۔ اب میں سونے جا رہی ہوں، شب بخیر!"
عمیر نے لیپ ٹاپ بند کر دیا اور سوچنے لگا۔ بالفرض اگر اسے شادی کرنے کے لیے بہتر ساتھی کو تلاش کرنا پڑا تو سنی بہترین انتخاب ثابت ہوسکتی ہے لیکن وہ شادی کے لیے کبھی بھی رضامند نہیں ہوگی۔ اسے کوشش کر کے منانا ہوگا۔
اس نے سر جھٹک کر خیالات کو منتشر کر دیا۔ ایک دو ملاقاتوں کے دوران ہی سنی نے اس کے خیالات کو تبدیل کر دیا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں سے نفرت کم ہونے لگی تھی۔ شادی نہ سہی لیکن ایک مخلص ساتھی کی ضرورت بہرحال اسے تھی۔ اس کی عمر ہی کتنی تھی صرف پینتیس سال۔ وہ جوان اور خودمختار تھا۔ تنہائی اب اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ وہ کسی سے بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنے دل کا حال بتا کر حوصلے کی تلقین سننا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اگلے دن ڈاکٹر سے مشورہ لینے کا سوچا کیا اور آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے دل و دماغ سے نفرت کی کیفیت ختم ہونے لگی تھی اور اس کی جگہ محبت کے لطیف جذبات نے لے لی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن ڈاکٹر عرفان احمد نے سنی کو کلینک بلایا۔ وہ اٹھائیس سے تیس سال کی دُبلی پتلی اور نہایت خوب صورت عورت تھی۔ تاہم اس کے چہرے کے عضلات کرخت

تھے۔ غصہ تو جیسے اس کی ناک پر دھرا ہوا تھا۔ وہ بہت کم بات چیت کرتی تھی۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے دوران اس سے دریافت کیا کہ ”کیا اس نے کوئی دوست بنایا؟“ تو اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بتایا۔

”شاید میں حتمی طور پر کچھ کہہ نہیں سکتی ہوں۔ دو تین مزید ملاقاتوں کے بعد آپ کو اس کے متعلق بتاؤں گی۔“

ڈاکٹر نے وجہ پوچھی تو وہ بولی۔

”میں اس کے کردار سے مطمئن نہیں ہوں۔ وہ اپنی سیکریٹری میں دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ اس کے کھانے پینے کا انتظام کرتی ہے اور چھٹی والے دن اس کی کوٹھی میں آ کر کپڑے بھی استری کر دیتی ہے۔ آپ خود سوچ سکتے کہ ایک شریف عورت کیا ایسا کر سکتی ہے؟“

ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”کیا اس نے تمہیں ان تعلقات کے متعلق کھل کر بتایا؟“

”نہیں۔“ سنی نے انکار میں سر ہلایا۔ ”وہ بھلا کیوں بتانے لگا۔ اس نے صرف اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ میرا شوہر بھی ایسا ہی کیا کرتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے بہت سی لڑکیوں کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے۔“

ڈاکٹر بولا۔ ”لیکن تمہارے شوہر کی طرح اس نے اظہار نہیں کیا۔ اس لیے تم قبل از وقت اس کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کر سکتی ہو۔ کچھ دن اور اس کے ساتھ بات چیت کرو۔ گھومنے پھرنے کے لیے باہر جاؤ۔ پھر دوستی کے لیے نیک نیتی کے ساتھ اس کی جانب ہاتھ بڑھاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ ان چند ملاقاتوں اور بات چیت کے دوران تمہارے اور مثبت نتائج پیدا ہوں گے۔“

سنی بولی۔ ”ہمارے درمیان دو راتوں سے بات چیت ہو رہی ہے۔ میں اس کے حق میں بھی نہیں تھی لیکن آپ کی ہدایات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اسے موقع دیا۔ تاہم ملاقات کرنے کے متعلق میں نے نہیں سوچا اور میرے خیال میں اس کی ضرورت بھی نہیں اس لیے میں مزید آگے نہیں بڑھوں گی۔“

ڈاکٹر سوچ میں پڑ گیا۔ بات کو آگے بڑھانا یا پھر ختم کر دینا بعد کی بات تھی لیکن خیالات کو تبدیل کرنے کے لیے ملاقات نہایت ضروری تھی اور وہ اس کے لیے تیار نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد وہ ہم کلام ہوا۔

”تمہیں میری خاطر اس سے ایک ملاقات ضرور کرنا ہوگی، یوں سمجھ لو کہ یہ میرے علاج کا ایک حصہ ہے۔ تم اسے امتحان بھی کہہ سکتی ہو اور میں ہر حال میں اس امتحان میں کامیاب ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اب بھی مردوں سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی چند دن پہلے تھی لیکن میری خاطر ایک ملاقات کر لو، چاہے اس کے بعد آئندہ نہ کرنا۔“

سنی شش و پنج میں پڑ گئی۔ اسے ڈاکٹر کے علاج سے بہت افاقہ ہوا تھا۔ علاج سے پہلے وہ تمام رات جاگتی رہتی تھی لیکن اب پُرسکون نیند سو جایا کرتی تھی۔ اس نے دو دفعہ عمیر کو چیٹ کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ کسی بھی مرد سے بات چیت کی روادار نہیں تھی۔ اس لیے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے، میں اس سے بات چیت کرتی رہوں گی۔ اگر اس نے ملاقات کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نہ نہیں کہوں گی۔ لیکن اگر اس نے مزید آگے بڑھنے کی کوشش کی تو میں چیٹنگ سے بھی انکار کر دوں گی۔ مجھے اب بھی ہر مرد کی شکل میں اپنے شوہر کی عیاش فطرت دکھائی دیتی ہے۔“

ڈاکٹر مطمئن لہجے میں بولا۔ ”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ حد سے تجاوز نہیں کرے گا اور جو بھی بات چیت تم دونوں کے درمیان ہو۔ تم مجھے اس سے مطلع کرتی رہنا۔ تاکہ مجھے معلوم ہوتا رہے کہ معاملہ کس ڈگر کی طرف جا رہا ہے۔“ سنی نے اثبات میں سر ہلایا اور کمرے سے باہر آ گئی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا۔ کونین کی یہ گولی تو اسے نگلنا ہی ہوگی۔ اسے واجد بیگ کی عیار فطرت یاد آنے لگی۔ وہ اس کے فلیٹ کے قریب ہی رہتا تھا۔ عمر پینتیس سال کے قریب تھی۔ انتہائی خوب صورت شخصیت کا پڑھا لکھا انسان تھا۔ اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے باوجود بھی فلیٹ میں رہتا تھا۔ چند ہی ملاقاتوں کے بعد اس نے اپنا رشتہ بھجوا دیا۔ سنی کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اس لیے جب واجد بیگ کی ماں نے اس سے شادی کے متعلق دریافت کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اگلے ماہ ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ نکاح نامے پر جب اس نے دستخط کیے تو وہاں واجد بیگ کے نام کے علاوہ گواہوں کے دستخط موجود تھے۔ اس نے اپنا اطمینان کر لیا۔ شادی سے قبل ایک مختصر ملاقات کے دوران واجد بیگ نے اسے بتایا تھا کہ سہاگ رات کا انتظام شہر سے باہر بنے ہوئے وسیع و عریض بنگلے میں کیا گیا ہے۔ وہ دونوں ایک ہفتہ وہاں گزاریں گے اور اس کے بعد ہنی مون کے لیے کسی ہل اسٹیشن چلے جائیں گے۔ سنی مطمئن ہو گئی۔ اسے پہلی ملاقات میں ہی واجد بیگ بھا گیا تھا۔ شادی بہت سادگی کے ساتھ ہوئی۔ واجد بیگ نے بہت زور دیا کہ کچھ تو دھوم

دھڑکا ہونا چاہیے۔ لیکن سنی کو شور شرابا پسند نہیں تھا۔ اس لیے چند عورتوں نے اسے بیوٹی پارلر لے جاکر تیار کیا اور فلیٹ والوں کی معیت میں نکاح پڑھا دیا گیا پھر سیاہ رنگ کی بڑی سی کار میں بیٹھ کر وہ بنگلے کی طرف چل دیے۔

واجد بیگ اگلی سیٹ پر سہرا باندھے بیٹھا تھا اور پچھلی سیٹ پر سنی کے ہمراہ دو عورتیں براجمان تھیں جن میں سے ایک واجد بیگ کی ماں تھی جس بنگلے کا انتخاب کیا گیا تھا، اس کے اردگرد آبادی نہیں تھی۔ گاڑی کو پورچ میں کھڑا کرنے کے بعد ان دونوں عورتوں نے دلہن بنی ہوئی سنی کو بیڈ روم میں بنی ہوئی سیج کے درمیان بٹھا دیا۔ کمرے میں مدھم روشنی تھی۔ پہلی دفعہ اس کا دل گھبرایا۔ وہ وہاں تنہا تھی اور اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ رات بارہ بجے تک دونوں عورتیں اس کے ساتھ بیٹھ کر بات چیت کرتی رہیں پھر اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ایک بجے کے قریب دروازہ کھلا اور کوئی سہرا باندھے اندر داخل ہوا۔ کمرے میں روشنی بہت کم تھی۔ اس لیے سنی کو کچھ زیادہ دکھائی نہیں دیا۔ اسے شک ہوا کہ سہرے کے پیچھے موجود شخص واجد بیگ نہیں ہے۔ اس کا پیٹ باہر نکلا ہوا تھا اور وہ سر سے گنجا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں شراب کی بوتل تھی جسے اس نے کمرے میں داخل ہونے کے فوراً بعد قریب ہی رکھی ہوئی تپائی پر رکھ دیا پھر کرخت آواز میں کسی کو پکارا۔ فوراً ہی کمرے کا دروازہ کھول کر دو لڑکیاں ہاتھوں میں ٹرے تھامے اندر داخل ہوئیں۔ ٹرے میں مزید شراب کی بوتلیں اور چھوٹا سا کولر موجود تھا جس کے اندر برف کے ٹکڑے بھرے ہوئے تھے۔ ان دونوں لڑکیوں نے ٹرے کو میز پر رکھا اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ان کے باہر جانے کے بعد مرد جھومتا ہوا بیڈ کے کنارے آکر بیٹھ گیا پھر اس نے سہرا نوچ کر ایک جانب پھینک دیا۔ سنی کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ وہ انتہائی بدصورت تھا۔ اس کی آنکھیں بھینگی، ہونٹ بھدے اور ناک چپٹی تھی۔ جسم سے شراب کی گندی بُو آرہی تھی۔ سنی نے گھبرا کر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن اس نے دھکا دے کر اسے بیڈ کے کنارے گرا دیا اور تلخ لہجے میں بولا۔

''بھاگ کر کہاں جارہی ہو، تمہاری میرے ساتھ شادی ہوئی ہے۔ میرے پاس نکاح نامہ موجود ہے جس پر ہم دونوں کے دستخط ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے قبول نہیں کروگی۔ اس لیے صرف ایک ہفتہ تمہیں اپنے پاس رکھوں گا۔ اس کے بعد طلاق دے دوں گا۔ تاہم اس ایک ہفتے کے دوران تمہیں میرا دل خوش کرنا ہوگا اگر تم نے انکار کیا۔ تو میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔''

سنی نے اٹھ کر اس کے چہرے پر تھپڑ مارنے کی کوشش کی لیکن اس نے اسے کلائی سے تھام کر اپنے جسم کے ساتھ بھینچ لیا۔ بدبو کے بھبکے نے سنی کا سانس سینے میں روک دیا اور اسے متلی آنے لگی۔

واجد بیگ سرد لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ مجھے زور زبردستی کرنا ہی ہوگی۔ تاہم میں خوب صورت تتلیوں کا دل سے احترام کرتا ہوں اس لیے کوشش کروں گا کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ اس نے دھکا دے کر سنی کو بیڈ پر گرا دیا۔ پھر دوبارہ لڑکیوں کو مختلف ناموں سے پکارنے لگا۔ کمرے کا دروازہ جھٹکے کے ساتھ کھلا اور اس دفعہ پانچ لڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔ سنی نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن لڑکیوں نے اسے چاروں جانب سے گھیرے میں لے لیا اور بیڈ پر لٹا دیا۔ پھر ان میں سے ایک نے اس کا گلا دبانا شروع کیا۔ سنی کا منہ چڑیا کے بھوکے بچے کے مانند کھل گیا اور واجد بیگ نے آگے بڑھ کر شراب کی بوتل اس کے حلق میں انڈیل دی۔ تیز سیال نے اس کے گلے کو چیر کر رکھ دیا۔ اس نے سیال کو باہر اگلنے کی کوشش کی اور کافی حد تک باہر اگل دیا۔ لیکن واجد بیگ نے مزید شراب اس کے حلق میں ڈال دی۔ یہ شراب خالص نہیں تھی۔ ورنہ اس کے حلق میں سوراخ کر دیتی۔ اس میں سوڈے کی آمیزش زیادہ تھی۔ کچھ ہی دیر میں سنی کے حواس جواب دینے لگے اور اس نے بے سدھ ہو کر ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اسے ایک دھندلے خواب کی طرح ہمیشہ یاد رہے گا۔ وہ ایک ہفتہ اس پر جس قیامت کے دوران گزرا وہ اسے بیان نہیں کرسکتی۔ اس دوران جب اسے شراب نہیں دی جاتی تھی تو وہ وہاں سے فرار ہونے کے لیے سوچتی تھی لیکن کمرے سے باہر پندرہ کے قریب لڑکیاں موجود تھیں۔ جو اسے واپس کمرے میں دھکیل دیا کرتی تھیں۔

ایک ہفتہ واجد بیگ نے اس کے ساتھ خوب رنگ رلیاں منائیں پھر اسے لے کر عدالت آگیا۔ وہاں سب اس کے جاننے والے تھے۔ ان کی موجودگی میں اس نے سنی کو طلاق دے دی اور اسے اس کے فلیٹ میں چھوڑ کر چلا گیا۔

ایک ہفتے کی شراب نوشی نے اس کے گردے تباہ کر دیے تھے۔ اس لیے اسپتال میں ایڈمٹ ہوگئی۔ صحت مند ہونے کے فوراً بعد اس نے پولیس اسٹیشن جاکر واجد بیگ کے خلاف رپورٹ درج کروا دی اور اسے گرفتار کرلیا گیا۔ پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع ہوا۔ واجد بیگ نے نکاح نامہ پولیس والوں کے سامنے رکھ دیا۔ اس کی جانچ پڑتال ہوئی وہ اصلی تھے۔ اس

میں گواہوں کے دستخط اور ایڈریس موجود تھے۔ انہیں بلایا گیا۔ ان سب نے اقرار کیا کہ سنی کی رضامندی کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے ان دونوں کا نکاح ہوا تھا۔ بعد میں ان دونوں کے درمیان طلاق کیوں ہوئی، اس کے متعلق انہیں معلوم نہیں ہے۔

اگلے دن واجد بیگ کو باعزت طور پر بری کر دیا گیا۔ بہت کچھ بہت سوچ سمجھ کر ترتیب دیا گیا تھا۔ اس دوران اس لڑکے کا کچھ پتا نہیں چلا جس نے واجد بیگ کے نام کو استعمال کر کے اسے اپنے جال میں پھنسایا تھا لیکن فلیٹ والوں کے سامنے جس واجد بیگ کو پیش کیا گیا تھا۔ وہ وہی تھا جس نے سنی کے ساتھ ایک ہفتہ بنگلے میں گزارا تھا اور جسے سنی نے پسند کیا تھا وہ کوئی اور تھا جو بعد میں پس پردہ چلا گیا تھا۔ دورانِ تفتیش واجد بیگ کے شناختی کارڈ کو بھی چیک کیا گیا تھا۔ وہ اسی بھینگے شخص کا تھا جس نے سنی کی زندگی کو برباد کیا تھا۔ اب اسے اس لڑکے کو تلاش کرنا تھا جس نے اس کی زندگی کو برباد کرنے میں بھینگے شخص کا ساتھ دیا تھا اور یہ زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ وہ جس فلیٹ میں مقیم تھا اس کے مالک سے پوچھ گچھ کے دوران سنی کو اس کے شناختی کارڈ کی کاپی مل گئی۔ شناختی کارڈ میں اس کا نام دانیال بیگ تحریر تھا۔ اس نے چند دنوں کے لیے فلیٹ کرائے پر لیا تھا پھر اسے چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا۔ سنی کو حیرت کا جھٹکا تب لگا جب اس نے شناختی کارڈ پر تحریر ایڈریس کو پڑھا۔ وہ اسی بنگلے کا تھا جہاں اسے شادی کے بعد لے جایا گیا تھا۔ اس نے ٹیکسی پکڑی اور بنگلے کی طرف آ گئی۔ گھنٹی بجانے پر دروازہ دانیال بیگ نے کھولا۔ اسے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''مجھے تمہارا ہی انتظار تھا اور مجھے معلوم تھا کہ تم یہاں ضرور آؤ گی، اندر آ جاؤ ہم بیٹھ کر بات چیت کر لیتے ہیں۔''

وہ خاموشی سے چلتی ہوئی سٹنگ روم میں آ گئی اور پھر جو کچھ دانیال بیگ نے اسے بتایا، اسے سن کر سنی کو اپنے دل میں نفرت کا طوفان اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ لیکن وہ ان دونوں کے خلاف کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں تھی اس لیے چپ ہو کر سنتی رہی۔

دانیال بیگ نے اسے بتایا۔ ''واجد بیگ میرا باپ ہے۔ لڑکیوں کو استعمال کرنا اس کی کمزوری میں شامل ہے لیکن شکل وصورت کی وجہ سے کوئی بھی لڑکی اسے منہ نہیں لگاتی۔ اس لیے وہ انہیں اپنے جال میں پھنسانے کے لیے مجھے استعمال کرتا ہے۔ میں لڑکیوں کو اپنے دامِ الفت میں پھنسانے کے بعد اس کے حوالے کر دیتا ہوں اور ان سے شادی کرنے کے بعد اپنے دل کے ارمان پورے کرتا ہے۔ ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ جس لڑکی کو استعمال کیا جائے، اس کے آگے پیچھے رشتے داروں کی تعداد کم ہو۔ اگر وہ لاوارث ہو تو زیادہ بہتر رہتا ہے۔ اس صورت میں ہمیں زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور بہ آسانی طلاق ہونے کے بعد ہماری جان خلاصی ہو جاتی ہے۔''

سنی نے پوچھا۔ ''کیا اس تمام گھناؤنے کھیل میں تمہاری ماں بھی تم دونوں کا ساتھ دیتی ہے؟''

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''نہیں، جس عورت کو میری ماں کے روپ میں تمہارے سامنے پیش کیا گیا تھا، وہ میرے باپ کی نوکرانی ہے۔ جس کو ہم حسبِ ضرورت کوئی بھی رول دے دیا کرتے ہیں۔ دراصل یہ سب ایک ڈرامے سے کم نہیں ہے۔ جسے ہم دونوں حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ترتیب دیتے ہیں۔ مقصد صرف عیاشی کرنا ہے۔ تم نشے میں دھت تھیں۔ اس لیے شاید تمہیں معلوم نہیں ہوا میرے باپ کے علاوہ میں نے بھی تمہیں ہوس کا نشانہ بنایا۔''

سنی چیختے چلاتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی لیکن دانیال بیگ نے اسے دھکا دے کر واپس صوفے پر بٹھا دیا اور سرد لہجے میں بولا۔ ''دوبارہ یہاں آنے کی کوشش نہ کرنا۔ پولیس میں رپورٹ کر کے تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ نتیجہ کیا نکلا۔ اب اگر ہم نے تمہارے خلاف رپورٹ درج کروائی تو تمہیں حوالات میں بھی بند کیا جا سکتا ہے۔'' وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس ملاقات کے بعد سنی نے بہت سے وکیلوں سے مشورہ کیا لیکن کوئی مثبت حل سامنے نہیں آ سکا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس رقم بھی کم تھی اس لیے پیچ وتاب کھانے کے بعد چپ ہو کر بیٹھ گئی۔ بھڑاس نہ نکلنے کی وجہ سے دل میں غبار بڑھتا چلا گیا۔ جس نے بعد میں نفرت کی صورت اختیار کر لی۔ وہ ہر اس شخص پر ٹوٹ پڑتی تھی جو اس کے ساتھ فلرٹ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ دو تین دفعہ ہاتھا پائی کرنے کے بعد آخرکار مجبور ولاچار ہو کر ڈاکٹر عرفان احمد کے پاس علاج کے لیے چلی آئی۔ ڈاکٹر نے اس کا علاج بہت اچھے طریقے سے کیا۔ اسے رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ وہ آنکھیں بند کرتی تھی تو مندمل ہونے والے زخم تازہ ہونے لگتے تھے۔ واجد بیگ اور دانیال بیگ کے مکروہ چہرے استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے اس کا مذاق اُڑانے لگتے تھے اور وہ ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیتی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے نیند کی گولیاں دیں اور جب اس کی طبیعت کچھ بحال ہوئی تو اس کا علاج شروع کیا۔ اب نیا جنجال عمیر کی

صورت میں اس کے گلے میں پڑ گیا تھا۔ تاہم اسے حیرت اس بات پر محسوس ہو رہی تھی کہ اس نے عمیر کے ساتھ بہت اچھے طریقے سے بات چیت کی تھی۔ شاید ایسا اس وجہ سے ہوا تھا کہ عمیر نے ابھی تک اس سے کوئی معیوب بات نہیں کی تھی تو پھر اس کا مطلب یہ تھا کہ علاج کامیاب ہوا تھا۔ تاہم شادی کرنے سے اسے اب بھی نفرت تھی کیونکہ وہ دو شادیاں کر چکی تھی اور وہ دونوں اسے راس نہیں آئی تھیں، وہ فلیٹ میں آ گئی۔

☆☆☆

رات کو پورے گیارہ بجے عمیر نے میسج ٹائپ کیا۔ ''تو تم ڈاکٹر عرفان احمد سے علاج کروا رہی ہو۔ میں بھی اس کا پیشنٹ ہوں۔ وہ اچھا ڈاکٹر ہے۔ اس نے مجھے تمہارے متعلق بتایا' تمہارے حالات اور میرے حالات ملتے جلتے ہیں۔ علاج سے قبل میں دو نوکرانیوں کو زخمی کر چکا ہوں لیکن اب دیکھ لو میں تمہارے ساتھ کتنے نرم انداز میں گفتگو کر رہا ہوں۔ میرے دل سے صنفِ نازک کے لیے نفرت ختم ہو گئی ہے۔ تم بھی اپنے دل سے نفرت کو نکال دو۔'' اس نے میسج سینڈ کر دیا۔

کچھ دیر بعد جواب موصول ہوا۔ ''مجھے پہلے ہی شک تھا کہ ڈاکٹر عرفان احمد نے تمہیں میری جانب پیش قدمی کے لیے اکسایا ہے لیکن چونکہ وہ اچھا معالج ہونے کی وجہ سے میرے لیے قابلِ احترام ہے، اس لیے میں اس کی اس جسارت کو درگزر کر دیتی ہوں۔ اس کے علاج کی وجہ سے میں بھی قدرے مطمئن انداز میں تم سے بات چیت کر رہی ہوں۔ ورنہ اس سے پہلے میں نے کسی بھی مرد کو اتنا آگے نہیں بڑھنے دیا۔''

عمیر نے مسکراتے ہوئے میسج ٹائپ کرنا شروع کیا۔ ''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے غلط نہ سمجھنا۔ یہ ملاقات صرف اس احساس کو دور کرنے کی ایک کاوش ہے کہ تمام مرد ایک جیسے نہیں ہوتے، مجھے یقین ہے کہ ایک دوست ہونے کے ناتے تم انکار نہیں کرو گی۔''

جواب موصول ہوا۔ ''میرے احساسات کو یہ ملاقات تبدیل نہیں کر سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آج بھی میں تمہیں اپنی جانب بڑھنے کا موقع دوں تو تم وہی سب کچھ کرو گے جو آج سے پہلے دوسرے مرد کر چکے ہیں۔ رہی ملاقات کی بات...... تو میں اس کے حق میں نہیں ہوں لیکن ڈاکٹر عرفان کو ناراض نہیں کرنا چاہتی ہوں اس لیے جہاں کہو گے وہاں آ جاؤں گی۔''

عمیر نے ٹائپ کیا۔ ''بلیو اسکائی ریسٹورنٹ کے کیبن نمبر آٹھ میں صبح بارہ بجے آ جانا۔ ہم دوپہر کا کھانا اکٹھے کھائیں گے۔''

جواب موصول ہوا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں آ جاؤں گی۔ تاہم حد سے تجاوز کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ ہماری ملاقات آخری ملاقات بھی ہو سکتی ہے۔'' اس نے لائن آف کر دی اور عمیر اپنے دماغ میں سنی کی شبیہ کو ترتیب دینے لگا۔ شولڈر کٹ براؤن کلر کے بال، چپٹی ناک، اسے یہی ناک پسند نہیں تھی کیونکہ سدرہ کی ناک لمبی تھی۔ قد درمیانہ، آنکھیں شربتی اور ماتھا کشادہ...... وہ بلاوجہ کی ضد نہ کرے اور عمیر کی ہاں میں ہاں ملاتی چلی جائے۔ یہ سب وہ باتیں تھیں جو سدرہ میں موجود نہیں تھیں۔ عمیر کو یقین تھا کہ سنی ایسی نہیں ہو گی۔ اب تک ان دونوں کے درمیان جو بات چیت ہوئی تھی اسے مدِنظر رکھتے ہوئے یہ سوچا جا سکتا تھا کہ ہر چند وہ حالات سے سمجھوتا کرنے والی عورت نہیں تھی۔ تاہم ضدی بھی نہیں تھی۔ اس لیے اس نے ملاقات کے لیے ہامی بھر لی تھی۔

عمیر نے آخری میسج ٹائپ کیا۔ ''میں تمہارا انتظار کروں گا۔ اچھی طرح تیار ہو کر آنا۔ مجھے شولڈر کٹ بال پسند ہیں۔ زیادہ میک اَپ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اگر سفید شلوار قمیص کے ساتھ چوڑی دار پاجامہ پہن کر آؤ تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔ مجھے غلط نہ سمجھنا اگر ماحول اچھا ہو تو بات چیت کرنے میں لطف آتا ہے ورنہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی صورت میں ملاقات دماغی تشنگی کا باعث بن کر رہ جاتی ہے۔'' اس نے میسج سینڈ کر دیا۔ دوسری جانب لائن آف تھی۔ لیکن عمیر جانتا تھا کہ صبح جب وہ فیس بک کھولے گی تو اسے میسج مل جائے گا۔ اب اسے ملاقات کی تیاری کرنا تھی۔ اس نے اپنا بہترین تھری پیس سوٹ نکالا اور اس پر یوڈی کلون کی پوری شیشی انڈیل دی۔ سوٹ کو اس کی سیکریٹری نے پریس کر کے ہینگر میں لٹکا دیا تھا۔ خاص جوتے پالش نہیں تھے۔ اس نے انہیں پالش کیا۔ شیو وہ صبح کر سکتا تھا۔ اس لیے سونے کے لیے لیٹ گیا۔ کافی دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔ سدرہ دوبارہ اس کے حواسوں پر طاری ہونے لگی تھی۔ وہ آنکھیں بند کرتا تو اس کا چہرہ نمودار ہو جاتا۔ وہ اسے دیکھ کر طنزیہ انداز میں قہقہے لگاتی۔ اس کے بڑے بڑے دانت کسی آدم خور شیرنی کی طرح اسے اپنی گردن کے قریب دکھائی دیتے تھے اور اس سے پہلے کہ وہ اسے بھنبھوڑنے کی کوشش کرتی عمیر ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیتا تھا۔ تمام رات اسی کشمکش کے دوران گزر گئی اور صبح کے قریب اس کی جو آنکھ لگی تو بمشکل تمام گیارہ بجے کے قریب کھلی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ

بیٹھا۔ ناشتا کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے عجلت کے عالم میں ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور تھری پیس سوٹ زیب تن کر کے کارپورچ میں آگیا۔ جہاں اس کی سیاہ کرولا کھڑی تھی۔ اس نے گاڑی کو کوٹھی سے باہر نکالا اور بلیو اسکائی ریسٹورنٹ کی طرف چل دیا۔ سڑکوں پر رش نہیں تھا لیکن ریسٹورنٹ میں کافی بھیڑ تھی۔ وہ رات کو کیبن بک کروا چکا تھا۔ اس لیے اسے فکر نہیں تھی۔ تاہم وہ پورے وقت پر کیبن تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس کا دماغ دو حصوں میں بٹ کر رہ گیا تھا۔ ایک حصے پر سدرہ کا قبضہ تھا جبکہ دوسرے پر سنی قابض تھی۔ سدرہ کا وجود جب اس کے دماغ پر حاوی ہوتا تھا تب اسے صنفِ نازک سے نفرت محسوس ہونے لگتی تھی اور جب سنی کی خود ساختہ شبیہ نمودار ہوتی تو بے اختیار اس کا دل موم ہونے لگتا۔ اس کی عمر ابھی پینتیس سال تھی اور وہ باقی کی زندگی تنہا نہیں گزار سکتا تھا۔ کسی کا ساتھ ہونا ضروری تھا۔ تاہم سنی کو قائل کرنا مشکل تھا۔ اس کے دل میں اب بھی نفرت کا سمندر موجزن تھا۔

عمیر نے دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ آج کی ملاقات میں کوئی بھی ناز یا حرکت کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ دو تین مزید ملاقاتوں کے بعد اس کے ردِعمل کو چیک کر کے اگلے لائحہ عمل کے متعلق سوچے گا۔ وہ کیبن کے اندر آگیا۔ کیبن خالی پڑا تھا۔ یعنی وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اسے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے صبح ناشتا بھی نہیں کیا تھا لیکن سنی کے آنے سے قبل وہ آرڈر نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لیے خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے انتظار کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ سدرہ سے شادی کرنے سے قبل جب بھی ان دونوں کی ملاقات کسی پارک یا پھر ریسٹورنٹ میں ہوتی تھی تب وہ ہمیشہ دیر سے آتی تھی اور ان ملاقاتوں کے دوران عمیر کا موڈ ہمیشہ خراب ہی رہتا تھا۔ آج تو وہ بھوکا بھی تھا۔

ساڑھے بارہ بج گئے وہ نہیں آئی۔ غصے کی بدولت عمیر کا دماغ گھومنے لگا اس پر ستم کہ اس کا بھوک سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ پونے ایک بجے کے قریب اس نے تگڑے ناشتے کا آرڈر دے دیا اور دل میں پکا تہیہ کر لیا کہ آئندہ وہ سنی سے بات چیت نہیں کرے گا۔ کچھ ہی دیر بعد ویٹر نے ناشتا میز پر لگانا شروع کر دیا۔ اس نے تمام غصہ ناشتے پر نکالا اور اس پر ٹوٹ پڑا۔ ابھی وہ ناشتا کر ہی رہا تھا کہ کیبن کا دروازہ جھٹکے کے ساتھ کھلا اور وہ اندر داخل ہوئی۔ عمیر نے اس کی جانب دیکھا۔ وہ سفید قمیص اور چست پاجامہ پہنے ہوئے تھی۔ اس کے جسم کے نشیب و فراز تنگ کپڑوں میں سے نمایاں ہو رہے تھے۔ چہرے کی طرف دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آسکی۔ اسے اس کے چلّانے کی آواز سنائی دی۔

''تم......؟ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

عمیر کے ماؤف ہوتے ہوئے دماغ میں نفرت کی لہر اُبھری۔ وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''مجھے پہلے ہی شک تھا کہ وہ تم ہی ہو گی۔ دراصل تمہارے دماغ میں بے وفائی کا تاسف موجود تھا اور در پردہ تم مجھ سے دوبارہ رابطہ کرنا چاہتی تھیں۔''

سدرہ نے جواب دینے کے بجائے اُس کے چہرے پر تھوک دیا اور پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی۔ ''میں تم پر تھوکنا نہیں چاہتی تھی لیکن تم نے اس کے لیے مجھے مجبور کر دیا۔ اب اپنی شکل کو لے کر یہاں سے گم ہو جاؤ۔ ورنہ اب کی دفعہ میں تمہیں قتل کر دوں گی۔''

عمیر کا ہاتھ اچانک ہی اٹھا اور اس نے پوری طاقت کے ساتھ سدرہ کے چہرے پر تھپڑ مار دیا۔ اس کا چہرہ دوسری جانب گھوم گیا۔ اس کے بعد عمیر پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا اور اسے کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس نے سدرہ پر کتنا تشدد کیا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ حوالات میں بند تھا۔ اس کے دماغ میں اب بھی بھونچال جیسی کیفیت موجود تھی اور منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ حوالات کے دوسرے کمرے میں پولیس انسپکٹر کے سامنے ڈاکٹر عرفان احمد بیٹھا تھا۔ اُس کے چہرے پر تاسف بھرے تاثرات تھے اور وہ مایوسانہ انداز میں انسپکٹر کو بتا رہا تھا۔

''مجھ سے غلطی یہ سرزد ہوئی کہ میں نے سدرہ سے اس کی پچھلی شادی کے متعلق دریافت نہیں کیا۔ عمیر ملک سے طلاق لینے کے بعد اس نے واجد بیگ سے شادی کی تھی۔ اگر وہ مجھے عمیر ملک کے متعلق بتا دیتی تو میں کبھی بھی ان دونوں کو ملاقات کے لیے مجبور نہیں کرتا۔''

انسپکٹر بولا۔ ''سدرہ کی طبیعت بہت ناساز تھی۔ اگر وہ ہلاک ہونے سے بچ بھی گئی۔ تب بھی عمیر ملک پر گھناؤنے تشدد کا مقدمہ ضرور دائر ہو گا۔ اس کے لیے بچنا ممکن نہیں۔''

ڈاکٹر نے انکار میں سر ہلایا۔ ''اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ وہ دونوں اب نفسیاتی مریض نہیں رہے بلکہ دماغی توازن کھو دینے کے بعد پاگل ہو چکے ہیں۔ آپ تھانے کے ڈاکٹر کو چیک اپ کے لیے کہہ دیجیے۔ ان دونوں کو پاگل خانے بھجوانے کا فیصلہ ڈاکٹر کی رپورٹ کو مدِنظر رکھتے ہوئے کیا جائے گا۔''

انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا اور ڈاکٹر عرفان احمد کرسی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

❖❖❖

اعتراف

عائشہ نصیر

اسٹیج کی دنیا سے تعلق رکھنے والے فن کی باریکیوں کو بخوبی سمجھتے ہیں... اُن کا ہر کھیل سنسنی خیز اور جاندار ہوتا ہے... تھیٹر سے منسلک ایسے ہی دوستوں کی ڈرامائی زندگی کے سہانے موڑ... وہ باصلاحیت تھے اور سب سے بڑھ کر ایک دوسرے کے مخلص دوست تھے... جاسوسی مزاج رکھنے والے قارئین کے لیے مغرب سے موصول تازہ بہ تازہ سالِ نو کا تحفۂ خاص...

آخری دموں پر منکشف ہونے والے

ایک پُراسرار جرم کا اعترافنامہ

واوڈویل اپنے آخری دموں پر تھا، اور بلی گجر بھی۔ جس دن بلی کی موت ہوئی، ادارے کے پاس اب بھی ایک سال یا اس سے زیادہ کا وقت باقی تھا۔ بہرحال، نیویارک پیلس، جو کہ واوڈ تھیٹرز کا مرکز تھا، تب تک دن میں دو شوز کی میزبانی کر رہا تھا۔ بدمزاج ڈبلیو سی فیلڈز نے اعلانیہ کہا تھا کہ جس دن تھیٹر نے اپنے دو شوز بھی کینسل کر دیے وہ باضابطہ طور پر اپنے تھیٹر کو ایک سینما ہال میں بدل دے گا۔ لیکن جس دن کی میں بات کر رہا ہوں، یہ کوئی راز کی

بات نہیں تھی کہ امریکا میں واوڈویل زوال پذیر تھا۔

بالکل اسی طرح جیسے میں جانتا تھا کہ بلی کا آخری وقت آچکا ہے۔ یہ میرے لیے بڑی بات تھی کیونکہ میں اس سے پیار کرتا تھا، شاید اس میں کہیں مجھے اپنے باپ کی جھلک نظر آتی تھی۔ بلی کیجر کی پیدائش اس لیے ہوئی تھی کہ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ وہ نرم گفتار اور رحم دل ہونے کے ساتھ ساتھ سب کے لیے ایک آسان شکار تھا، خاص طور پر اس کے دو پارٹنرز کے لیے اور ظاہر ہے اس میں بھی اس کی اسی نرم مزاجی کا عمل دخل تھا۔ ایلمر پولک جو خود تو بہت غصیلا تھا مگر بلی کا کافی سفاکی سے مذاق اڑاتا۔ اگر بلی اس کے زہریلے الفاظ کا اثر لیتا بھی تو کندھے اچکاتے ہوئے صرف ایک اُداس سی مسکراہٹ پیش کرتا اور کہتا، ٹھیک ہے، کم از کم میری ماں مجھ سے پیار کرتی ہے۔

یہ اس پر کیے جانے والے تمام زبانی حملوں کا واحد جواب تھا۔ پھر ایک دن مجھے پتا چلا کہ بلی ایک یتیم تھا اور اسے شاید اپنی ماں کی شکل بھی یاد نہیں۔ اور اس دن کے بعد سے بلی کا یہ جواب میرے دل میں اور زیادہ گہرائی میں اُترنے لگا۔

جبکہ بلی کا دوسرا پارٹنر پٹس جو جسمانی طور پر کافی مضبوط تھا اور جس کے ہموار سفید دانت بے حد چمک دار تھے ہمیشہ مسکراہٹ کے ساتھ بات کی شروعات کرتا۔ اس کا انداز پولک کی طرح تند نہ ہوتا مگر اس کے نکیلے طعنے مزاح کا رنگ لیے ہوئے ہوتے۔ اور بیچارے بلی کے پاس اس کی باتوں پر ہنسنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ پولک اور پٹس کو بلی سے پیار نہیں تھا مگر شاید بلی کے لیے ان کا پیار اس قسم کا تھا جو سطح کے نیچے چھپا ہوا ہو، جو خود کو ظاہر کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا جب تک کہ شدید ضرورت نہ آپڑے۔

میں جانتا ہوں کہ انہوں نے بلی کے کام کو ہمیشہ سراہا، اسٹیج پر بلی جو کردار ادا کرتا تھا اس کے لیے وہ بالکل موزوں تھا۔ وہ جسمانی طور پر نہ تو پولک جیسا موٹا تھا اور نہ ہی پٹس جتنا پتلا۔

پندرہ سال کی عمر میں، ایک پریشان کن گھریلو زندگی سے بھاگنے کے بعد، میں نے کچھ مہینے سڑکوں پر بھیک مانگتے ہوئے گزارے جب تک کہ مٹھی بھر سکوں نے مجھے ڈیس موئنز میں سنڈے میٹنی میں نہ پہنچا دیا۔ وہیں میں نے پہلی بار بلی اور اس کے پارٹنرز کو دیکھا۔ یہ ایک چھوٹا سا پنڈال تھا، اور وہ ہیڈ لائنر نہیں تھے۔ ان کا مزاحیہ ایکٹ چھوٹا سا تھا مگر اس کے باوجود یہ پولک، پٹس اور بلی ہی تھے جنہوں نے واقعی میری توجہ حاصل کی۔ تین افراد پر مشتمل ان کا یہ چھوٹا کامیڈی گروپ اگرچہ مارکس برادران کی طرح شاندار نہیں تھا، لیکن میرے جیسے چھوٹے شہر کے نوعمر لڑکے کے لیے تو آسمان کے ستاروں جیسے تھے۔

انہوں نے اس دوپہر کو ''دی سلائی سیلز مین'' کیا جو شاید ان کے مطابق تھا۔ انہوں نے آڈیئنس سے خوب داد اور قہقہے سمیٹے جن میں سب سے اونچے قہقہے میرے تھے۔

شو کے بعد، میں بیک اسٹیج گیا اور میں نے نہایت جوشیلے انداز میں پولک، پٹس، اور بلی کی تعریفوں کے پُل باندھ دیے۔

پولک نے مجھے نظر انداز کیا، پٹس نے صرف ایک مسکراہٹ پر اکتفا کیا، لیکن بلی نے نہ صرف میری تعریف کو توجہ سے سنا بلکہ مجھ سے بات بھی کی۔

انہوں نے ڈیس موئنز میں تین دن گزارے اور میں نے ان کا ہر ایک شو دیکھا۔

آخری شو کے بعد، میں ڈرتے ڈرتے ان کے پاس گیا تھا۔ میں نے بڑی ہمت کر کے ان کے سامنے اپنی عاجزانہ درخواست پیش کی۔

''میں ان کے اسسٹنٹ کے طور پر خدمات انجام دینا چاہتا ہوں۔ ان کا سامان رکھنے یا اٹھانے یا جو بھی کام وہ مجھے دیں گے، میں خوشی خوشی کروں گا، کچھ بھی کھا لوں گا۔ انہیں میرے قیام یا سفر کی ادائیگی کے بارے میں فکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں، کیونکہ میں کھردرے فرش پر سونے کا عادی ہوں اور بنا ٹکٹ کے کسی بھی طرح ٹرین میں چپکے سے سوار ہو سکتا ہوں۔ میں صرف اسٹیج کے اس گریٹ گروپ کا حصہ بننا چاہتا ہوں۔''

اس آخری تبصرے پر پٹس نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور پولک نے کوئی بے ہودہ سی بات کی۔ صرف بلی ہی میری پیشکش کو سنجیدگی سے لے رہا تھا۔ دونوں کی مخالفت کے پیشِ نظر، اس نے میرے حق میں دلیلیں دینا شروع کر دیں۔ میں نے اسے دوبارہ کبھی پٹس اور پولک کے سامنے یوں ڈٹ کر کھڑے ہوتے نہیں دیکھا، لیکن اس دن ڈیس موئنز میں، بلی کیجر نے اپنے پارٹنرز کے سخت اعتراضات کے باوجود اپنی بات منوائی اور آخر کار انہیں راضی کیا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے دیں۔

جب میں ان سے پہلی بار ملا تھا تو پٹس پچاس کے قریب تھا، جب کہ بلی اور پولک دونوں ساٹھ کے قریب

تھے۔ جوڑوں کے درد اور دیگر ڈھلتی عمر کے امراض نے انہیں گھیر رکھا تھا (عجیب بات یہ ہے کہ پولک اب تک ان تمام بیماریوں سے محفوظ تھا۔ حالانکہ اس کے موٹاپے کو دیکھتے ہوئے اسے کم از کم دل کا مسئلہ تو ہونا ہی چاہیے تھا) پٹس اور پولک دونوں کئی بار کے شادی شدہ اور طلاق یافتہ تھے۔ لیکن بلی نے کبھی شادی نہیں کی تھی۔ میں نے ان کی دنیا کی شان و شوکت سے بھرپور لطف اٹھایا۔ اسپاٹ لائٹس، آڈینس، بیک اسٹیج...... واوڈویل کی زندگی کے ہر ایک حصے نے مجھے مسحور کیا۔ اسٹیج پر ہم جن اداکاروں کو دیکھتے تھے، وہ حقیقت میں ایک خاندان کی طرح تھے۔

جس دن بلی کی موت ہوئی، ہمیں فلی میں بک کیا گیا تھا۔ مس نیلی فیل ایک سرخ بالوں والی سابق اسٹرپیر جو اب ادھیڑ عمری میں گائیکی کے ذریعے اپنی جگہ برقرار رکھے ہوئے تھی۔ وہی تھی جس نے بلی کو اسٹیج کے دروازے کے بالکل باہر فٹ پاتھ پر گرا ہوا پایا۔

اس نے فوراً تین فٹ کے سائمن ڈیویلی کی مدد سے، بلی کو اندر گھسیٹ لیا، اور اسٹیج ہینڈ ڈاکٹر کو ڈھونڈنے کے لیے بھاگا۔ یہ سب شو کے دوران ہوا، اس وقت پٹس اور پولک دونوں ہی اسٹیج پر تھے۔ مس نیلی، سائمن، اور میں بلی کے آخری لمحات کے واحد گواہ تھے۔

بلی، مس نیلی کے تنگ ڈریسنگ روم میں ایک صوفے پر لیٹ گیا، اس کی آنکھیں آدھی بند تھیں اور اس کی ابھی سانسیں چل رہی تھیں۔ نیلی نے اس کی شرٹ کے اوپری بٹن ڈھیلے کیے اور ماتھے پر نم تولیا رکھا۔ چہرے پر تفکر لیے وہ اس پر جھکی ہوئی تھی۔

سائمن نے کونے میں پڑا اسٹول کھینچ کر صوفے کے قریب کیا اور اس پر چڑھ کر بیٹھتے ہوئے سگریٹ سلگا لیا۔

''یہ اس کا آخری وقت ہے، میں شرط لگا سکتا ہوں۔ ذرا اس کی حالت دیکھو۔ میں نے اپنے باپ کو اسی طرح مرتے دیکھا ہے۔ وہی سرخ چہرہ، وہی اوپر کو چڑھی آنکھیں۔''

''خدا کے لیے سائمن!'' مس نیلی نے جھرجھری لی۔ ''اس طرح کی باتیں مت کرو۔ بلی ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے پاس ابھی بھی بہت سارے شوز ہیں۔ ہے ..... بلی؟''

بلی کی پلکیں پھڑپھڑانے لگیں، لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

سائمن نے دھواں اڑایا۔ ''میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ یہ مر ہی جائے گا۔ صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ دل کے دورے کی علامات ہیں۔ مجھے یقین ہے ڈاکٹر کے آنے تک یہ خود کو سنبھال لے گا۔''

پتا نہیں بلی خود کو سنبھال پاتا یا نہیں لیکن اس نے اس بات کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

میں ایک طرف کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ سترہ سال کی عمر میں، میں پہلی بار کسی کو مرتے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی ایسے شخص کو جس سے میں پیار کرتا تھا۔

''میں تمہیں ایک گلاس پانی لا دیتی ہوں، بلی۔'' مس نیلی نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

میں نے اندازہ لگایا کہ یہ صرف اس کا ایک بہانہ تھا کہ وہ اسے مرتے ہوئے دیکھنے سے بچ جائے۔

سائمن نے فرش پر سگریٹ کی کچھ راکھ جھاڑی اور میری طرف دیکھا۔ ''اچھا نہیں لگ رہا بچہ۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

ایک یا دو منٹ کے بعد بلی نے کمزوری سے ایک ہاتھ اٹھایا اور مجھے اشارہ کیا۔ میں اس کے پہلو میں چلا گیا۔ وہ بولا، لیکن اس کے الفاظ بمشکل سنائی دے رہے تھے۔ میں قریب جھکا، تقریباً اپنے کان کو اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا، یہ سننے کہ وہ کیا کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ہم نے بُرا کیا۔'' بلی نے سرگوشی کی۔ ''ایک بُری چیز۔ بہت بری۔''

''کیا بُرا کیا تھا؟'' میں نے اپنی آواز دھیمی رکھتے ہوئے پوچھا تاکہ سائمن سن نہ سکے۔ میں نے محسوس کیا کہ بلی مجھے اپنے اعتماد میں لے رہا ہے۔ ''تمہارا مطلب ہے باہر گرنے سے پہلے؟''

''نہیں، نہیں، برسوں پہلے۔ ہم نے یہ کیا تھا۔''

''ہم کون ہیں؟'' مجھے سمجھ نہیں آئی، کیا وہ اپنے پارٹنرز کی بات کر رہا تھا۔

''ہمیں سینڈ پائپر پر بک کیا گیا تھا۔'' بلی نے آہستہ سے کراہتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا...... ہمارا شو ختم ہوا اور ہم اس کے ساتھ پینے کے لیے باہر چلے گئے۔''

''کس کے ساتھ؟ بلی، میں سمجھا نہیں۔''

''اینجل کے ساتھ۔''

''اینجل کیا وہ کوئی عورت تھی؟''

''ہاں۔'' وہ ہانپ رہا تھا۔

''تو تم لوگ باہر گئے۔ ایک عورت کے ساتھ شراب پینے کے لیے۔ پھر کیا ہوا؟''

''اسے...... اسے مار ڈالا۔''
میں نے سانس روک لی۔ ''کیا؟ تم نے کیا کیا تھا؟''
''اسے مار کر دفن کر دیا، پٹریوں کے نیچے۔''
''بلی، چپ ہو جاؤ، تمہیں نہیں پتا تم کیا بول رہے ہو۔'' متوحش ہو کر کہتے ہوئے میری آواز لاشعوری طور پر بلند ہو گئی۔
''برسوں بعد، جب بھی...... جب بھی میں ٹرین پر سوار ہوتا، اور کھڑکی سے باہر دیکھتا تو......''
''رک جاؤ بلی...... اپنی طاقت بچاؤ۔''
''تو...... تو وہ دن یاد کرتا اور خود سے اور زیادہ نفرت ہونے لگتی۔'' وہ رو رہا تھا۔ شاید یہ چند اعترافی جملے اس کی ساری توانائی نچوڑ گئے تھے۔ اس نے اپنے رعشہ زدہ ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
میں اس کے کچھ اور کہنے کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ خاموش رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اس کی انگلیاں سخت ہو گئی تھیں۔ میں نے اپنا ہاتھ کھینچنے کی کوشش کی، مگر اس کی گرفت فولادی تھی۔
میں نے بار ہا بلی کا نام پکارا۔ اس کا وجود ساکت تھا۔ اگلے ہی لمحے سائمن بھی اسٹول سے اتر کر میرے برابر آ گیا اور بلی کا ہاتھ میرے ہاتھ سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔
''آہ...... بلی چلا گیا بچے۔'' سائمن اس کا ہاتھ اس کے سینے پر رکھتے ہوئے تاسف زدہ انداز میں پیچھے ہٹا۔
تھوڑی ہی دیر میں کمرا اچانک بھر گیا تھا۔ مس نیلی واپس آ چکی تھی، اس نے بلی کی حالت کی بات ضرور پھیلائی ہو گی جب ہی پانچ یا چھ دوسرے فنکار اس تنگ سی جگہ میں جمع ہو گئے تھے۔ ان میں ایک ٹرمبون بجانے والا یونی سائیکل سوار بھی شامل تھا جو اپنا سامان اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور اسٹیج ہینڈ ایک گنجے ڈاکٹر کے ساتھ پہنچا تھا۔
ڈاکٹر نے سائمن اور مجھے ایک طرف دھکیل دیا... اور بلی کا جائزہ لینے لگا۔
''یہ مر چکا ہے۔'' اس نے بہ آوازِ بلند یہ اعلان کرنے میں دیر نہیں کی۔
مس نیلی رونے لگی۔ سائمن نے اپنے ''بلی چلا گیا'' کے اعلان کو دہرایا اور اپنا سگریٹ فرش پر پھینک دیا۔
یونی سائیکلسٹ، زکیے بنڈل نے اپنی فلسفیانہ رائے پیش کی: ''گھر کی ڈائننگ ٹیبل پر مرنے سے بہتر ہے کہ آپ تھیٹر کے کسی کمرے میں مر جائیں۔''
''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' سائمن نے اتفاق کیا۔ ''مجھے امید ہے کہ جب میرا وقت آئے گا تو میں بھی تھیٹر کے کسی کمرے میں ملوں گا۔''
''کیا اس نے اپنے آخری وقت میں کچھ کہا؟'' مس نیلی نے روتے ہوئے پوچھا۔
میں نے اپنا گلا صاف کیا۔ ''اس نے اینجل نامی عورت کے بارے میں کچھ کہا۔ اس نے کہا کہ......'' میں نے کہتے کہتے بروقت خود کو روک لیا۔
یہ میں کیا کر رہا تھا؟ مجھے بلی کے آخری اعتراف کے بارے میں اپنا منہ بند رکھنا چاہیے۔ میرے خدا، اس نے ایک عورت کو مارنے کا دعویٰ کیا تھا۔
''کون ہے اینجل؟'' سائمن نے پوچھا۔ ''میں نے تو اسے اینجل کے بارے میں کچھ کہتے نہیں سنا۔''
''وہ سرگوشی کر رہا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں خاموش رہوں گا۔
''تو اس نے اینجل کے بارے میں کیا کہا؟''
''کچھ نہیں، میں نے جھوٹ بولا۔'' اس نے صرف اس کا نام بتایا۔ اور کچھ نہیں۔''
''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' زکیے بنڈل نے کہا۔ ''بلی کا کوئی قریبی رشتے دار نہیں تھا، کوئی بھی ایسا نہیں جسے ہم اس کی موت کی اطلاع دے سکیں۔''
''مجھے ایسا نہیں لگتا۔'' مس نیلی نے رومال سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ ''ہم ایک دوسرے کے رشتے دار ہیں، ہم میں سے بہت سے لوگوں کی ایک ہی کہانی ہے۔ روشنیوں سے آگے کوئی زندگی نہیں۔ خدا اس کی روح کو آرام دے۔'' پھر وہ میری طرف مڑی۔ ''پٹس اور پولک کہاں ہیں؟ انہیں بتایا جانا ضروری ہے۔ انہیں آج رات کا شو چھوڑنا پڑے گا۔''
''پہلے مجھے بتاؤ، میری فیس کون دینے والا ہے؟'' وہ بدمزاج ڈاکٹر میرے پیچھے کھڑا اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے بولا۔
''کیا مذاق ہے۔'' سائمن نے منہ بنایا۔ ''تم نے صرف اس پر ایک نظر ڈالی اور ہمیں بتایا کہ وہ مر گیا ہے۔ یہ کام تو میں مفت میں کر سکتا تھا۔''
ڈاکٹر نے ایک طنزیہ نگاہ اس پر ڈالی۔ ''اچھا، تم کیا موت کے فرشتے ہو؟'' اگر اس ڈاکٹر کو معلوم ہوتا کہ سائمن ایک ماہر چاقو باز ہے، تو وہ ایسے طنز سے باز رہتا۔
پٹس اور پولک تقریباً بیس منٹ بعد ایک ساتھ آئے۔ سرخ آنکھوں والی مس نیلی انہیں اپنے ڈریسنگ

روم میں لائی تھی۔ میں اب بھی وہاں اکیلا تھا، ایک طرح سے بلی کی ڈیڈ باڈی کی نگرانی کر رہا تھا، حالانکہ میری کوشش یہی تھی کہ میں اس کی سمت دیکھنے سے گریز کروں۔

پولک نے اکڑتے ہوئے جسم پر ایک نظر ڈالی..اور منہ پھیر لیا۔

پٹس آہستہ سے کچھ بڑبڑایا تھا۔

''آج رات کے شو کا کیا ہوگا؟'' پولک نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' پٹس نے کہا۔ ''لگتا ہے ہمارا گروپ ٹوٹ گیا۔''

''کون کہتا ہے؟'' پولک نے اپنی جیکٹ سے سگار نکال کر جلایا اور اس مردہ وجود کا جائزہ لیا جو کبھی بلی تھا۔

''ہمیں صرف اس ایکٹ کو ایک نیا نام دینے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم اب پولک، پٹس اور کیجر نہیں بن سکتے تو ہمیں سوچنا ہوگا۔''

مس نیلی نے ایک گہری سانس بھری تھی۔ میں نے دیکھا کہ پٹس اور پولک کی آنکھیں تھوڑی نم ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

پٹس اور پولک نے صرف ایک شو چھوڑا تھا۔ اگلے دن انہوں نے بلی کے متبادل کو ڈھونڈنے میں لگاتار پانچ گھنٹے گزارے۔ ایکٹ کا نام تبدیل کر دیا گیا تھا۔

اس شام کو پولک، پٹس اور کڈ کی پہلی نمائش ہوئی۔ کیا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بچہ کون تھا۔ اس پہلی رات کی پرفارمنس مجھے آج بھی یاد ہے۔ ہم نے تین یا چار اسکٹس کیے، جن میں ''کلیوپیٹرا کے سوئٹرز'' بھی شامل تھے۔ میں نے وہ کردار ادا کیا جو بلی کیا کرتا تھا۔ بعد میں پولک نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے بتایا کہ میں نے وہ کردار بلی سے بھی زیادہ خوب صورتی سے نبھایا تھا۔

میرے اسٹیج ڈیبیو کے اگلے ہی دن، جنازے کی ایک چھوٹی سی بھیڑ میں ہم نے اپنے ساتھی کو سپرد خاک کیا۔

اس کی قبر پر، مس نیلی فیل نے ''ریڈ ہینڈ، اینڈ دی پرائس آف بلڈ'' گایا، یہ ایک پرانا گیت تھا لیکن اس کے الفاظ نے مجھے جھنجوڑ دیا۔

خون کی قیمت کیا تھی؟ خاص طور پر، اینجل نامی مردہ عورت کا خون؟ اپنے آخری لمحات میں، بلی کیجر نے مجھے یہ لرزہ خیز راز بتایا تھا کہ اس نے ایک انسانی زندگی لی تھی۔

میں نے بلی کے سابق ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ دونوں آدمی کافی پریشان نظر آئے۔ ان کے سیاہ اوور کوٹ موسم خزاں کی تیز ہوا میں لہرا رہے تھے، وہ دونوں ایک ساتھ کھڑے مجھے قبر کے کتبوں پر بیٹھے کووں کے جوڑے کی طرح نظر آئے۔

بلی کی موت کے بعد... ڈیڑھ دن کے دوران، اگلے دن کی ریہرسل، میری پرفارمنس ڈیبیو نے میرے ذہن کو اتنا مصروف ضرور کر دیا تھا کہ بلی کے بستر مرگ کا انکشاف وقتی طور پر میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔ مگر اب پٹس اور پولک کو دیکھتے ہوئے میرے پیٹ میں پھر سے گرہیں پڑنے لگیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ماضی کے ان خوفناک واقعات میں پٹس اور پولک نے کیا کردار ادا کیا ہوگا۔

''ہم نے بُرا کام کیا۔ ہمیں سینڈ پائپر پر بک کیا گیا تھا۔ شو ختم ہونے کے بعد ہم پینے باہر گئے۔''

بلی نے ہر بات میں ''ہم'' کا صیغہ استعمال کیا تھا۔ ظاہر ہے، بلی اس ایکٹ کے بارے میں بات کر رہا تھا جو وہ، پولک اور پٹس کیا کرتے تھے۔ میں نے سینڈ پائپر کے بارے میں کبھی نہیں سنا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس نام کا کوئی تھیٹر نہ ہو۔ اور پھر اس کا یہ کہنا کہ ہم نے اسے مار کر پٹریوں کے نیچے دفن کر دیا۔

میں کانپ گیا۔ میرے پاس کھڑے سائمن نے ضرور دیکھا ہوگا۔ اس نے میرے اشک زدہ چہرے کی طرف دیکھا۔

''صبر کرو، بچے، بلی اس دنیا سے بہتر جگہ پر ہے۔''

''لیکن کیا وہ واقعی بہتر جگہ پر تھا؟ مطلب کیا جہنم کے شعلوں سے دہکتے غار کو بہتر جگہ کہنا ٹھیک تھا؟ کیونکہ میں نے سنا تھا کہ تمام قاتل وہیں جائیں گے۔

میں بلی کے آخری الفاظ کس کو بتاؤں؟ کسی قانون نافذ کرنے والے کو؟ یا کسی پادری کو ویسے یہ خیال مضحکہ خیز تھا کیونکہ میں کیتھولک بھی نہیں تھا۔

اگلی بار جب ہم اسٹیج پر جائیں تو کیا مجھے سچائی کو بلند آواز سے پکارنا چاہیے اور دنیا کو بڑے پیمانے پر فیصلہ کرنے دینا چاہیے کہ کیا کرنا ہے؟

میں نے دو انسانی کووں کی طرف دیکھا جو اپنے مردہ ساتھی کی قبر کو گھور رہے تھے۔ نہیں، ان معاملات پر خاموش رہنا بہتر ہے جن کے بارے میں، میں واقعی کچھ نہیں جانتا۔ یہ شاید ایک مرتے ہوئے آدمی کے خراب دماغ کے خیالات تھے۔ ایک بڑبڑاہٹ اور کچھ نہیں اس لیے، میں نے بلی کیجر کے مرتے وقت کہے ہوئے الفاظ کو اپنے دماغ

سے نکال دیا اور شوز پر توجہ مرکوز کی۔

☆☆☆

دو سال سوٹ کیسوں کو گھسیٹنے میں گزارنے کے بعد مجھے آخر کار ایک ایکٹ میں حصہ ملا تھا، چاہے یہ غریب بلی کی قیمت پر ہی کیوں نہ ہو۔ مجھے یہ سوچنا پسند ہے کہ ایک شوقین نوجوان کے اضافے نے ٹیم کو ایک نئی زندگی دی۔ پولک، پٹس اور کڈ بکنگ حاصل کرتے رہے۔ میرے نئے کیریئر کے سات ماہ بعد ہم نیو ہیون میں تھے جب بلی کے اعتراف کے حوالے سے میری جبری بھولنے کی بیماری اچانک ختم ہوگئی۔

میں پٹس اور پولک کے ساتھ ایک چھوٹے ڈائنر میں بیٹھا ہوا تھا، اپنی معمولی تنخواہ کا کچھ حصہ .... سینڈوچ پر خرچ کر رہا تھا، جب میں نے بوتھ میں ایک درمیانی عمر کے جوڑے کو کچھ مقامی خبروں کے بارے میں بات کرتے ہوئے سُنا۔

”ہاں، انہیں مڈویل میں کسی عورت کا ڈھانچا ملا ہے۔“ آدمی کہہ رہا تھا۔ ”جسے ٹرین کی پٹریوں کے قریب دفن کیا گیا تھا۔“ میں نے ہاتھ روکتے ہوئے کان لگائے۔

”انہیں کیسے پتا چلا کہ وہ کسی عورت کا تھا؟“ عورت نے پوچھا۔

”اس کی ہڈیوں کے پاس جو چیزیں ملیں اس سے، کورونرز اور پولیس کے لوگ۔ اس کے علاوہ، انہیں اس کے ساتھ ایک پن بھی ملی ہے۔ تم جانتی تو ہو، ایک زنانہ قسم کی پن۔“

”یعنی ایک بروچ؟“ عورت نے تصدیق چاہی۔

”ہاں، وہی، ایک بروچ۔ اس پر ایک شبیہ بنی ہوئی تھی جیسے کوئی تتلی یا پھر اینجل۔“

میرا دل جھٹکا کھا کے جیسے کسی کھائی میں گرا۔ کانٹا میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

”میں نے اپنے کزن لینی سے یہی سنا ہے۔ وہ اور اس کی بیوی دونوں فورس میں ہیں اس لیے اسے ہر تفصیل معلوم ہے۔“

”مگر میں نے تو اخبار میں ایسا کچھ نہیں دیکھا۔“

”تم جلد ہی دیکھو گی، میں شرط لگاتا ہوں۔“

”کیا ڈھانچا کافی عرصے سے وہاں دفن تھا؟“

”ظاہر ہے، میرا مطلب ہے اگر صرف ہڈیاں بچی ہیں، تو اسے وہاں دفن ہوئے کافی عرصہ ہوا ہوگا۔ اگر یہ کل پرسوں دفن ہوتا تو یہ لاش ہوتی ڈھانچا نہیں۔“

میں نے اپنا آدھا کھایا ہوا سینڈوچ پلیٹ میں واپس رکھ دیا، میری بھوک ختم ہوگئی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے پٹس اور پولک پر نظر ڈالی، یہ سوچ کر کہ کیا انہوں نے بھی اس جوڑے کی بات کو سنا ہوگا۔

مجھے محسوس ہوا جیسے انہوں نے آپس میں معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا ہو۔ یہ میرا وہم بھی ہوسکتا تھا۔

پولک نے بھی اپنا سینڈوچ آدھا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے سگریٹ جلایا، اور بے چین نظر آیا۔

پٹس نے اپنا لنچ ختم کیا، لیکن غیر معمولی خاموشی میں۔

وہ جوڑا اب گیری کوپر کی کسی نئی فلم پر تبصرہ کر رہا تھا۔

میں اور میرے پارٹنرز نے اپنا بل ادا کیا اور وہاں سے چلے آئے۔

سترہ سال کی عمر میں مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ کوئی بھی انسان اپنے سائے سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ بلی کے الفاظ کو ایک مرتے ہوئے آدمی کا ہذیان سمجھ کر نظر انداز کر دوں لیکن اسے قسمت کہیں، اتفاق یا خدا کی مرضی کہ وہ طویل عرصے سے دفن ہوئی ہڈیاں اس کی موت کے سات ماہ بعد نکالی گئی تھیں۔ یہ ہڈیاں شاید میرے سامنے آنے کے لیے اپنی بے سکون قبر سے نکلی تھیں، میرے اعتراف کا مطالبہ کر رہی تھیں...... یا پھر میں غلط بھی ہوسکتا تھا۔ یہ ہڈیاں کسی اور کی ہوسکتی تھیں۔ ممکنہ طور پر کوئی ایسا جو ٹرین کے نیچے آمرا ہو یا ریلوے پولیس کے ہاتھوں مارا گیا ہو۔

اور وہ بروچ تو کوئی بھی لگا سکتا ہے۔ کسی پروں والی شبیہ کی بروچ لگانے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اسے صرف اینجل نامی لڑکی ہی لگا سکتی ہے۔

میں ہر صبح مقامی اخبار دیکھتا تھا اس امید پر کہ شاید اس میں ٹرین کی پٹریوں سے کسی ڈھانچے کے دریافت ہونے کا ذکر ہو۔ تیسرے دن کونے پر چھپی اس چھوٹی سی خبر نے میری توجہ کھینچی۔ ٹرین کی پٹریوں سے انسانی ہڈیاں برآمد۔ دی گئی خبر کے مطابق یہ ہڈیاں کسی عورت کی تھیں اور انہیں حالیہ ٹریک کی مرمت کے دوران نکالا گیا تھا اور لگتا تھا کہ اسے دو دہائیوں سے زیادہ پہلے دفن کیا گیا تھا۔ کھوپڑی پر ضربوں کے آثار ملے، جس کے نتیجے میں موت واقع ہوئی۔ ڈھانچے کی عمر کو دیکھتے ہوئے مقامی پولیس نے اس کی شناخت کے بارے میں زیادہ امید نہیں رکھی۔

خبر پڑھنے کے بعد میں مقامی تھیٹر میں چلا گیا جہاں ہم نے ابھی پرفارم کیا تھا۔ اگرچہ ہم نے اپنی انگیج منٹ

وہاں ختم کر لی تھی، لیکن میں ایک پرانے اسٹیج ہینڈ کی تلاش میں تھا جو میرے ساتھ دوستانہ انداز میں پیش آئے۔

میں نے بوڑھے بوچ کو اسٹیج کے پیچھے رسیوں کو لپیٹتے اور تمباکو چباتے ہوئے پایا جس سے اس کے گال پھولے ہوئے نظر آرہے تھے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس نے کبھی سینڈ پائپر نامی تھیٹر کے بارے میں سنا ہے۔

”بالکل سنا ہے۔“ اس نے تمباکو فرش کے تختوں پر تھوکا اور اسے اپنے جوتے سے رگڑ دیا۔ ”اگرچہ اسے بند ہوئے بارہ سال سے زائد کا عرصہ بیت گیا لیکن یہ ریلوے ٹریک کے بالکل پاس تھا۔ یہاں آنے سے پہلے میں سینڈ پائپر میں کام کیا کرتا تھا۔“

”کیا پولک، پٹس اور بلی نے بھی وہاں شوز کیے تھے؟“

”آف کورس۔ وہ سب تھے وہاں۔ تم اپنے ساتھیوں سے اس بارے میں کیوں نہیں پوچھتے؟“

میں نے اس کا جواب نہیں دیا۔ ”کیا تم نے کبھی اینجل نام سنا؟ میرا مطلب تھیٹر میں؟“

”اینجل؟“ اس نے پُرسوچ انداز میں اپنا پھولا ہوا گال سہلایا۔ ”ہاں یاد آیا، ایک اینجل میک فارلی تھی جو ایک میجک ایکٹ کا حصہ تھی۔“

”کیا وہ غائب ہوگئی؟“

”غائب ہوگئی؟ نہیں...... نہیں، وہ ریٹائر ہوگئی، اگر تمہارا مطلب اس کے اب شو نہ کرنے سے ہے۔ وہ اب ہارٹ فورڈ میں ایک بورڈنگ ہاؤس چلاتی ہے۔ میں نے اسے کچھ سال پہلے دیکھا تھا۔“

”اور کوئی اور اینجل نام کا؟“

”تھیٹر میں؟ ایک اور جوئی اینجل تھا، کنٹریشنسٹ۔ وہ اب بھی کام کر رہا ہے۔ پچھلی گرمیوں میں یہاں آیا بھی تھا۔“

”نہیں، میرا مطلب کسی عورت سے ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”بیس، تیس سال پہلے؟ ایک خاتون؟“

”ہوسکتا ہے، اگر ہوگی بھی تو مجھے یاد نہیں۔ میں عورتوں کو ذہن پر سوار نہیں کرتا......“ بوچ ہنسا اور دوبارہ تھوک دیا۔

میں نے بوڑھے بوچ کو اس کے کام کے ساتھ چھوڑا اور وہاں سے نکل آیا۔

میں سوچ رہا تھا وہ ہڈیاں بلی کی اینجل کے علاوہ اور کس کی ہوسکتی ہیں؟ ٹھیک ہے کہ بوچ کو وہ یاد نہیں تھی مگر ہوسکتا ہے وہ تھیٹر کی باقاعدہ ایکٹرنہ ہو جبھی بوچ اسے بھول گیا تھا۔ لیکن اس کی تصدیق تو ہو ہی گئی تھی کہ سینڈ پائپر تھیٹر اسی شہر میں تھا اور ریلوے ٹریک کے بالکل قریب جہاں اینجل کو دفن کیا گیا تھا۔

اب میں اس یقین پر قائم نہیں رہ سکتا تھا کہ بلی کا بیان ایک مرتے ہوئے آدمی کی بڑبڑاہٹ تھی۔ میں نے آخرکار ان بلائنڈرز کو ہٹا دیا جو میں نے آدھے سال سے اپنی آنکھوں پر چڑھا رکھے تھے۔ زمین پر چلنے والے تمام انسانوں میں، میں اور صرف میں ہی اس عورت کی موت کی حقیقت جانتا تھا اور اس حقیقت کو بھی کہ بلی کیجر واقعی کون تھا۔ سرکٹ پر موجود ہر ایک کے لیے بلی ایک شریف آدمی، ایک قابلِ اعتماد دوست اور قابلِ قدر ساتھی تھا۔ میرے لیے بھی تھا۔ اس کی مہربانی اور فکرمندی نے میری اپنی فیملی کی طرف سے چھوڑا ہوا خلا پُر کر دیا تھا۔ لیکن اب اس کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی میرے سامنے آچکا تھا۔

دراصل، یہ کہنا بالکل ٹھیک نہیں تھا کہ میں اکیلا ہی اینجل کے قتل کے بارے میں جانتا تھا۔ دو اور لوگ بھی یہ راز جانتے تھے۔

ہاں، اب بلائنڈرز ہٹ چکے تھے، اور میں پولک اور پٹس کی طرف بلا جھجک دیکھنے پر مجبور تھا۔ جرائم کے ساتھ ساتھ اسٹیج میں اس کے شراکت دار۔ اب جب کہ میں پوری طرح سے بلی کی بات کو سچ مان چکا تھا، میں نے اپنے ساتھیوں کو ایک نئے نظریے سے دیکھنا شروع کیا۔

پولک کا غصہ اب مجھے اس کا شارٹ ٹمپر نہیں بلکہ اس کی پُرتشدد طبیعت کی عکاس نظر آئی۔ اور پٹس اپنی پُرکشش شخصیت کے باعث کسی شکاری کی طرح نظر آنے لگا۔ کون جانے اینجل کو بہلا پھسلا کر باہر لے جانے والا بھی وہی ہو۔ اور بلی نے صرف ان کا ساتھ دیا ہو۔

☆☆☆

میری اسٹیج پرفارمنس متاثر ہونے لگی تھی۔ اس رات ہم نے اسٹیج پر ”دی بنگلنگ بلگینیئرز“ کا ڈراما کیا، جس میں مجھے صرف جولی راجر کا جھنڈا لہرانا تھا اور یوہو ہو کے نعرے لگاتے ہوئے مارچ کرنا تھا۔ داخل ہوتے وقت، فلیگ اسٹاف لے جانے کے بجائے میں نے غلطی سے ایک بند چھتری پکڑ لی جسے کسی نے اسٹیج کے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اس نے سامعین کو پریشان کر دیا اور میرے ساتھیوں کو مشتعل۔ میں پولک اور پٹس کی آنکھوں میں آگ دیکھ سکتا تھا، جو تب

شدت اختیار کر گئی جب میں نے گھبرا کر یو ہو ہو کو ہو ہو ہو سے بدل دیا۔

''یہ کرسمس شو نہیں تھا جو تم سانتا کلاز بنے ہو ہو ہو کر رہے تھے۔''

ہمارے باہر نکلنے کے بعد پولک نے منہ سے گالیوں کا ایک طوفان چھوڑ دیا۔

پٹس نے اپنے مخصوص انداز میں طنز کرتے ہوئے کہا۔ ''آہ...... آج بلی کچر کی بہت یاد آئی۔ وہ قابلِ اعتماد تو تھا۔''

''ٹھیک ہے، شاید میں قابلِ اعتماد نہیں ہوں۔'' میں نے دل میں سوچا۔ ''لیکن کم از کم میں قاتل بھی نہیں ہوں۔''

اگلے دو ہفتوں تک میں نے بھاری دل سے اپنی اسٹیج کی ذمے داریاں پوری کیں۔

میں خود کو اعلیٰ درجے کا بزدل محسوس کر رہا تھا۔ ایک جرأت مند شخص فوراً اپنے ساتھیوں کا سامنا کرے گا اور انہیں بتائے گا کہ وہ ان کے پچھلے گناہوں سے واقف ہے۔ وہ قاتلوں کی صحبت میں کام کرنے سے انکار کرے گا۔

لیکن میں کچھ بھی نہیں کر رہا تھا، کم از کم میں پولیس کے پاس تو جا ہی سکتا تھا، انہیں وہ سب کچھ بتا دیتا جو میں جانتا تھا۔ میری خاموشی مجھے ایک طرح سے ان کا ساتھی بنا رہی تھی۔

شاید میری عمر اتنی نہیں تھی کہ میں یہ بھاری سچائی اکیلے اپنے دل پر جھیل پاتا۔ مجھے ڈراؤنے خواب آنے لگے، میری نیندیں بے چین ہونے لگیں۔

تین ہفتے بعد، ہم ملواکی کے ایک تھیٹر میں بُک تھے۔ اور میں نے فیصلہ کیا کہ میں مس نیلی سے بات کروں گا۔ میرے دل میں گانا گانے والی سابق سٹرایپر کے لیے ہمیشہ سے ایک نرم جگہ تھی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ مجھے مس نیلی سے کیا حاصل کرنے کی امید تھی۔ میں صرف اتنا جانتا تھا کہ میں اپنے راز کو ہمیشہ کے لیے نہیں رکھ سکتا، اس لرزہ خیز انکشاف سے جنم لینے والے ڈراؤنے خوابوں کے لامتناہی سلسلے کا سامنا نہیں کر سکتا۔ نیلی ایک عمر سے سرکٹ کے اردگرد رہی تھی، شاید وہ گناہ یا نجات کے بارے میں کچھ جانتی ہو جو میرے ڈوبتے دل کو سہارا دے سکے۔ شاید وہ میرا اعتراف سُن سکتی۔

میں نے اسے اپنے چھوٹے سے ڈریسنگ روم میں اکیلا بیٹھا ہوا پایا، جو اسٹیج پر جانے کی تیاری میں اپنے گالوں پر غازہ مل رہی تھی۔ پولک، پٹس اور کڈ کو اس کے فوراً بعد جانا تھا۔

میں نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا، یہ سوچ کر کہ اگر میں ہمت ہاروں تو جلدی سے وہاں سے بھاگ سکوں۔

اس کے پاس کھڑے ہو کر میں نے سوال کیا۔ ''تم بلی کچر کو کب سے جانتی ہو؟''

''بیچارہ بلی!'' اس نے ایک آہ بھری۔ ''وہ اور میں شاید پچیس سال سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔'' نیلی نے اپنی بات پر خود ہی بے یقینی سے سر ہلایا۔ ''ایک چوتھائی صدی! یقین نہیں آتا۔''

''کیا اس نے کبھی کسی ایسی چیز کے بارے میں بات کی ہے جو اس وقت ہوئی تھی؟ مڈویل میں؟''

''مڈویل؟'' اس نے اپنی کراہت کو روکا۔ ''وہاں ایک تھیٹر ہوا کرتا تھا دی سینگل، نام کا۔''

''دی سینڈ پائپر۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''ہاں، یہی۔'' اس نے سر ہلایا۔

''کیا بلی نے کبھی تم سے مڈویل میں اپنے گزارے گئے وقت کے بارے میں کچھ کہا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' نیلی ہنس دی۔ ''تم...... تم مجھ سے ہیں، پچیس سال پہلے کی بات چیت یاد کرنے کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ یہ بوڑھا دماغ اب اتنا تیز نہیں رہا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے دھیرے سے سر ہلایا۔

''تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''صرف تجسس۔ میں جانتا ہوں کہ اس نے اور پٹس اور پولک نے اس وقت سینڈ پائپر میں شوز کیے تھے اور میں نے سوچا۔'' میں نے مزید کچھ کہنے کے بجائے ہچکچاتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''اگر تم بلی کے بارے میں پچیس سال پرانی بات کر رہے ہو تو وہ اس وقت پولک اور پٹس کے گروپ کا حصہ نہیں تھا۔ ان دنوں، وہ ایک جوڑی، جوکس اور اسپوکس کا ایک حصہ تھا۔''

''رکو، کیا وہ اس وقت پولک اور پٹس کے ساتھ نہیں تھا؟'' میرا دماغ یہ بات سنتے ہی سنسنا گیا۔

''ہاں۔ ابتدائی طور پر، جیسا کہ مجھے یاد ہے، اس کے بعد اس نے شاید پانچ سال کے لیے تھیٹر سے وقفہ لیا اور گھر گھر بائبل بیچنے کی کوشش کی۔ مجھے لگتا ہے اسے اس کام میں مزہ نہیں آیا ہوگا، ویسے بھی جو ایک بار تھیٹر کر لے وہ پھر کوئی اور کام نہیں کر سکتا۔ اسی لیے وہ دوبارہ واپس آیا اور تب اس نے پٹس اور پولک کے ساتھ شمولیت اختیار کی۔''

میرا دماغ اب گھوم رہا تھا، یہ نئی معلومات ہضم ہونا مشکل تھا۔ تو پولک اور پٹس صرف پچھلے دس سالوں سے بلی کے شراکت دار تھے؟ تب نہیں جب اینجل کا قتل ہوا؟

مجھے ہال میں قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ اس وقت جو میری حالت تھی، وہ مجھے کسی ڈھول کی طرح کانوں میں گونجتی محسوس ہوئیں۔

''تم...... ہنی؟'' مس نیلی مجھے گھور رہی تھی، بلاشبہ میرے جسم کا سارا خون میرے چہرے میں سمٹ آیا تھا۔ ''تم ٹھیک محسوس کر رہے ہو؟''

''ہاں، میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے تھوک نگلا۔

''مجھے نہیں لگتا۔ میں اپنی پرفارمنس دینے کے بعد کچھ اسپرین لینے جارہی ہوں۔ سر میں درد ہے۔ تمہارے لیے بھی لیتی آؤں گی۔''

میں نے ہاتھ ہلایا۔ ''نہیں، واقعی میں ٹھیک ہوں، میں صرف شو کا انتظار کر رہا ہوں۔'' یہ ایک مضحکہ خیز جواب تھا۔ میں اپنے سوالات جاری رکھنا چاہتا تھا، لیکن اسی لمحے اسٹیج منیجر نے کمرے میں جھانک کر اعلان کیا کہ اگلی باری نیلی کی تھی۔

وہ اچھل پڑی، میرے کندھے پر تھپکی دی، اور جلدی سے باہر نکل گئی۔

اگلا ایکٹ ہمارا تھا اس لیے میرے پاس سوچنے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں بیک اسٹیج پر آیا جہاں پٹس اور پولک پہلے سے موجود تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو نئی اور حیران کن نظروں سے دیکھا۔ کیا اب وہ پرانے قتل سے بری ہو گئے تھے؟ مجھے یقین نہیں تھا۔

اسٹیج کے اگلے بیس منٹ ہمارے تھے، اور میرا ذہن اس دوران مسلسل مصروف تھا۔ مجھے یاد نہیں میں نے پرفارمنس کیسی دی۔ مجھے بس لوگوں کے قہقہے یاد تھے۔ ایکٹ کے فوراً بعد میں اپنی پوچھ گچھ جاری رکھنے کے ارادے سے مس نیلی کے ڈریسنگ روم کی طرف آیا۔ کمرا خالی پا کر میں نے ایک گزرتے ہوئے ٹیپ ڈانسر کو گھیر لیا اور معلوم ہوا کہ نیلی اسپرین خریدنے گلی میں گئی تھی۔ شاید وہ جلد ہی واپس آجاتی، لیکن میں اس وقت انتظار کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

میں تھیٹر سے نکلا اور کچھ بلاکس دور ایک قریب ترین ڈرگ اسٹور کی سمت قدم بڑھائے۔ یہ نومبر کی ایک سرد شام تھی اور میں نے اپنا کوٹ نہیں پہنا تھا۔ خزاں کی ٹھنڈ نے مجھے حوصلہ بخشا۔ میں ایک گلی کا کونا مڑنے ہی لگا تھا جب پیچھے سے کسی نے میرا کالر پکڑا اور مجھے پیچھے کی طرف گھسیٹ کر ایک تنگ گلی میں لے گیا۔

میں نے گھوم کر دیکھا تو ایک آدمی کا ہیولا نظر آیا، اس کے ہاتھ میں کوئی لمبی اور پتلی سی چیز تھی۔ وہ تھوڑا آگے بڑھا تو سڑک پار کی اسٹریٹ لائٹ کی روشنی اس کے ہاتھ پر پڑی اور تب مجھے نظر آیا کہ وہ لوہے کی ایک راڈ تھی۔ بازو تیزی سے نیچے آیا۔ اگر میں اتنا چست نہ ہوتا تو اس کا وار میری کھوپڑی کھولنے کے لیے کافی تھا۔ خوش قسمتی سے میں ایک طرف ہوا اور لڑکھڑاتے ہوئے نیچے گر گیا۔

میرے حملہ آور نے ایک قدم آگے بڑھایا، اسٹریٹ لائٹ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی تھی، میں بھونچکا رہ گیا۔

زیکے بنڈل چہرے پر خونخوار تاثرات لیے مجھے گھور رہا تھا۔

مجھے لگا میں ایک اور انکشاف کی زد میں ہوں۔

جوکس اور اسپوکس یہ بلی کی پہلی ٹیم تھی تو اس کا دوسرا ساتھی زیکے تھا؟ زیکے یونی سائیکلسٹ۔

مجھے گھورتے ہوئے بنڈل نے بولنا شروع کیا۔ ''میں تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا ہوں، ٹموتھی۔ اب سے نہیں کئی مہینوں سے، جس دن سے بلی کی موت ہوئی تھی۔ لعنتی، بیوقوف یہ راز اپنے ساتھ قبر میں نہیں لے جا سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس نے تمہیں اس کے نام سے زیادہ بتایا ہے۔ میں تمہارے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ سکتا تھا۔''

''اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا، میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں ہراساں ہو کر چلایا، حالانکہ یہ جھوٹ تھا۔ اس وقت میں ایک بات یقینی طور پر جانتا تھا کہ زیکے بنڈل کسی انسان کو اس لوہے کی راڈ سے مارنے سے بالکل نہیں ہچکچائے گا۔

''میں موقع کی تلاش میں تھا۔'' اس کی آنکھیں اور چوڑی ہو گئیں۔ ''لیکن اس میں اتنے مہینے لگ گئے۔ میں پہلے تم سے بات کرنا چاہتا تھا کہ دیکھوں تمہیں کتنا معلوم ہے اور یہ کہ تم اینجل کے قتل کے بارے میں کتنا جانتے ہو لیکن ابھی کچھ دیر پہلے میں نیلی کے ڈریسنگ کے باہر کھڑا تھا۔''

میں نے ہال میں قدموں کی آوازیں سنی تھیں...... اور میں نے فرض کیا کہ یہ اسٹیج منیجر تھا۔

بنڈل تیزی سے آگے بڑھا۔ ''میں نے تمہیں نیلی سے مڈویل کے بارے میں پوچھتے ہوئے سنا۔ تم اس سے یہ پوچھ رہے تھے کہ وہاں کیا ہوا ہوگا اور میں سمجھ گیا کہ اب مجھے تمہیں خاموش کرنا پڑے گا۔'' اس نے ایک بار پھر لوہے کی

راڈ بلند کی۔ ''بس، یہ آخری بار ہے۔''
اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ سب میرے ذہن میں ایک تاریک دھند میں لپٹا ہوا ہے۔
میرے پیچھے سے، اچانک ایک چیخ ابھری، اور پھر ایک بڑا سا ہیولا جانے کہاں سے آ کر بنڈل پر پل پڑا۔
میں نے راڈ کے زمین سے ٹکرانے کی آواز سنی، اس کے بعد ایک غصیلی دہاڑ اور گالیوں کا ایک طوفان۔
میں نے فوراً ہی ان گالیوں کو پہچان لیا۔
زیکے بنڈل زمین پر ڈھیر ہو چکا تھا اور پولک لاتوں اور گھونسوں سے اس کی تواضع کر رہا تھا۔
کسی نے مجھے پیچھے سے اٹھایا تھا، میں نے پلٹ کر دیکھا تو پٹس کو مسکراتے ہوئے پایا۔
''شکر کرو، ہم وقت پر پہنچ گئے۔''
''یہاں کیسے آئے؟ تمہیں کیسے پتا چلا......'' ہانپ کر کہتے ہوئے مجھے اپنا دل اپنی پسلیوں کے نیچے ایک ہتھوڑے کی طرح محسوس ہوا۔
پٹس نے اپنی مونچھیں ہموار کیں۔ ''پولک اور میں نے بنڈل کو تھیٹر سے باہر تمہارے پیچھے آتے دیکھا۔ اس کا انداز جارحانہ تھا اور ہاتھ میں لوہے کی راڈ تھی۔ ہمیں لگا کوئی گڑبڑ ہے۔ اس لیے ہم نے اس کا پیچھا کیا۔''
''جب ہم نے دیکھا کہ اس نے تم پر حملہ کر دیا ہے تو ہمیں مداخلت کرنی پڑی۔'' پولک نے اب بنڈل کو گردن سے پکڑ لیا تھا۔
''ہاں ہم ایک اور ساتھی کو کھونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔'' پٹس ہنسا۔
پولک اور پٹس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں نے مختصراً انہیں اینجل کے بارے میں بتا دیا۔
ہم گلی سے نکلے۔ پولیس اسٹیشن یہاں سے چند منٹ کی مسافت پر تھا، لیکن پٹس اور پولک پہلے مجھے تھیٹر لے گئے۔ میرے سر پر چوٹ لگی تھی۔ مس نیلی فیل نے مجھ پر غصہ کیا اور میرے سر پر پٹی باندھ دی۔
اس نے تصدیق کی کہ، ہاں، جوکس اور اسپوکس کی جوڑی بلی اور زیکے پر مشتمل تھی۔
اگلی صبح میں مس نیلی کے ساتھ پولیس اسٹیشن گیا اور بلی کی موت کے اعتراف سے لے کر بنڈل کے مجھ پر جان لیوا حملے اور پٹریوں سے ہڈیوں کی برآمدگی تک جو کچھ میں جانتا تھا وہ سب بتا دیا۔ میں نے کسی قسم کے حلف نامے پر دستخط کیے۔ پولیس نے ہمیں بتایا کہ وہ زیکے بنڈل کو حراست میں رکھیں گے اور معلومات کے تبادلے کے لیے مڈویل پولیس سے رابطہ کریں گے۔
اسٹیشن سے نکلنے کے بعد مس نیلی نے میرے کندھے پر بازو پھیلاتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ لگایا۔ ''تم نے اچھا کیا، ٹم۔'' اس نے کہا۔
ہاں، بنڈل کو حراست میں رکھنے میں مدد کرنا صحیح کام تھا، لیکن اینجل کا قتل اس نے اور بلی نے مل کر کیا تھا، سزا صرف زیکے کو ملی۔ اور بلی کے لیے صرف اتنا ہوا کہ جب یہ بات سرکٹ میں پھیلی، تو لوگوں کے ذہنوں میں بلی کے حوالے سے جو بھی دلکش یادیں تھیں، ان کی جگہ ایک حیرت آمیز تاسف نے لے لی اور وہ قاتل کہلایا جانے لگا۔
لیکن مجھے تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہی انصاف تھا۔ بلی مر چکا تھا اس سے زیادہ اس کے ساتھ اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔
اس سارے واقعے کے بعد میں بمشکل ایک مہینے تک پٹس اور پولک کے ساتھ رہا اور پھر انہیں الوداع کہہ دیا۔ اور مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی جب میں نے ان دو بدمزاج بوڑھوں کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔
مجھے توقع تھی کہ زیکے بنڈل کے خلاف گواہی دینے کے لیے مجھے بلایا جائے گا، مگر سمن کبھی نہیں آیا۔ میں نے کچھ عرصے بعد سنا کہ اس نے مکمل اعتراف کر لیا ہے، اسے جو طویل قید کی سزا سنائی گئی وہ اتنی ضرور تھی کہ وہ دوبارہ کبھی آزاد ہوا میں سانس نہ لے پاتا۔

☆☆☆

ایک بار جب میں نے شوبزنس چھوڑ دیا تو میں نے پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں نے اپنے پرانے ساتھیوں میں سے کسی پر نظر رکھنے کی زحمت نہیں کی اور اپنی زندگی کے اس حصے کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا۔
میں سیلز مین بن گیا اور ڈور ٹو ڈور انسائیکلوپیڈیا بیچنے لگا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں یہ کام زیادہ اچھا کر سکتا ہوں۔ پھر مجھے وہ لڑکی ملی جس سے میں نے شادی کی۔ میری زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی تھی اور میں خوش تھا کہ اسٹیج چھوڑنے کے نو سال بعد میں نے سائمن ڈیویلی کو دیکھا۔
میں کھلونوں کی دکان کی کھڑکی کے سامنے کھڑا سامان دیکھ رہا تھا جب میں نے سنا کہ کسی نے مجھے آواز دی۔
''ہے بچے!''
اتنے سالوں بعد میں کسی کے منہ سے اپنے لیے یہ لفظ سُن رہا تھا، میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔

سائمن گلی میں لنگڑاتا ہوا، مسکراتا ہوا آرہا تھا۔ اس کے بال برفیلے ہو چکے تھے، اور وہ چھڑی کے سہارے چل رہا تھا۔ (بہت سے بونوں کی طرح، اس کے جوڑوں نے اسے ہمیشہ تکلیف دی تھی۔) وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوا، جیسا کہ میں اسے دیکھ کر ہو رہا تھا۔

اس شام کو ہم ایک قریبی بار میں ملے جس کی سائمن نے سفارش کی تھی۔ میں نے سائمن کو ایک کونے کی میز پر سگریٹ نوشی کرتے اور ڈیلی گزٹ پڑھتے ہوئے پایا۔ اس کے سامنے میز پر بیئر کی دو بوتلیں ہمارے انتظار میں تھیں۔

کچھ دیر حالاتِ حاضرہ اور ہٹلر کی چھڑی جنگ پر تبصرہ کرنے کے بعد ہم پرانے وقتوں میں لوٹ گئے۔ سائمن نے انیس سو چھتیس میں تھیٹر چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس کی چاقو پھینکنے کی مہارتیں کم ہو رہی تھیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا اس نے میرے پرانے ساتھیوں کے بارے میں کچھ سنا ہے۔

اس نے بتایا کہ پولک چار سال پہلے چل بسا اور پٹس اس کے ایک سال بعد دل کے دورے کا شکار ہوا تھا۔ اور مس نیلی فلم دیکھنے کے لیے جاتے ہوئے ٹیکسی سے ٹکرا گئی۔

''سب چلے گئے۔ آخر کار سب کو ہی جانا ہے۔'' سائمن نے کہا اور اپنی بیئر کا ایک بڑا گھونٹ لیا۔

چند لمحے خاموشی کی نذر کرنے کے بعد میں نے اپنی بوتل اٹھائی اور ہم نے اپنے گزرے ہوئے ساتھیوں کے لیے ٹوسٹ کیا۔

''میں تمہیں دکھانے کے لیے کچھ لے کر آیا ہوں۔'' ساتھ والی خالی سیٹ سے سائمن نے ایک بڑی سی اسکریپ بک اٹھائی اور اسے ٹیبل ٹاپ پر رکھ دیا۔ ''میرا شوق ہے۔ مجھے پرانے دنوں کے ٹکڑے جمع کرنا پسند ہے۔''

اس نے اسکریپ بک کو میری طرف دھکیل دیا۔ یہ کتاب اخبارات اور میگزین کے تراشوں، پوسٹرز، پلے بلز، ٹکٹ سٹبس، اور واوڈویل کی زندگی کی دیگر یادگاروں سے بھری ہوئی تھی۔

''خاص طور پر ایک چیز جس میں، میں نے سوچا کہ تم ضرور دلچسپی لو گے۔'' سائمن نے کئی صفحات پلٹے یہاں تک کہ اسے اپنی مطلوبہ چیز مل گئی۔ اس نے ہاتھ سے لکھے ہوئے دو تراشوں کی طرف اشارہ کیا، جو ساتھ ساتھ چسپاں تھے۔ پہلے ایک کے اوپری حصے میں الفاظ تھے، زیک بنڈل کا اعتراف۔

''اوہ خدایا!'' میں نے کہا۔

''زیک جیل میں ہی مر گیا تھا مگر مرنے سے پہلے اس نے ساری باتیں تفصیلاً بتائیں۔ یہ اس کا اعتراف نامہ ہے۔''

''یہ تمہیں کیسے ملا؟'' میں نے پوچھا۔

''طویل کہانی ہے، لیکن میں اس پولیس آفیسر کو جانتا ہوں جو اس کیس کو ہینڈل کر رہا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں یادداشتیں اکٹھی کر رہا ہوں، تو اس نے مجھے یہ پانچ ڈالر میں بیچ دیا۔ جس دن زیک نے تم پر جان لیوا حملہ کیا میں وہاں نہیں تھا۔ مجھے اس بارے میں بعد میں پتا چلا، اسی لیے میں جانتا تھا تم زیک کا یہ اعتراف ضرور دیکھنا چاہو گے۔''

میں نے دو ورق پڑھے۔ (بعد میں، سائمن کی اجازت سے، اس کی ایک کاپی بنا کر اپنے پاس رکھ لی) زیک نے لکھا تھا۔

''میں زیک اچ بنڈل قسم کھاتا ہوں کہ جو کچھ میں یہاں پیش کر رہا ہوں وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ میرے خلاف بڑھتے ہوئے ثبوتوں کو دیکھتے ہوئے، مجھے اپنے بیس سال پہلے کے اعمال کو جھٹلانے کی اب کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

''اپریل 1907ء میں، مہینے کی بارہ اور چودہ تاریخ کے درمیان، میں نے اور اس وقت کے میرے ساتھی، بلی کجر، نے مڈویل کے سینڈ پائپر تھیٹر میں اپنے شوز ختم کیے تھے۔ جب ہم بیک اسٹیج پر گئے تو وہاں ایک نوجوان عورت تھی۔ اینجل نام کی وہ عورت فنکاروں سے ملنے آئی تھی۔ میں اس سے بات چیت میں مشغول ہو گیا جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وہ دوسرے شہر سے آئی تھی اور اسٹیج پر اپنا کیریئر بنانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

''میں نے اسے ایک ڈرنک آفر کی اور وہ مان گئی، بلی بھی ہمارے ساتھ تھا جب ہم ایک مقامی بار روم میں گئے۔ اس رات ہم نے کافی زیادہ پی لی تھی، بلی تو مکمل نشے میں تھا۔ ہم گھنٹا دو گھنٹا وہاں گزار کر باہر نکلے تھے۔ ہم ٹرین کی پٹریوں کے ساتھ ساتھ ٹہلتے رہے، بلی کچھ دیر ہمارے ساتھ رہا پھر وہ لڑکھڑا کر ٹیلی فون کے کھمبے کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''اب اینجل کے ساتھ میں اکیلا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ تھیٹر میں میرے کافی کنکشن ہیں، میں اس کے کیریئر کو آگے بڑھانے میں مدد کر سکتا ہوں۔ بدلے میں، اسے بس میرے ساتھ تھوڑا وقت گزارنا ہوگا۔ مگر اس نے یہ کہتے ہوئے میری پیشکش کو ٹھکرا دیا کہ وہ اپنا راستہ خود بنائے گی۔ اس نے دیانتداری اور عزتِ نفس پر کچھ احمقانہ تبصرہ بھی کیا جس پر میں ہنس پڑا۔ میں نے بات بدلنے کی کوشش کی مگر وہ میری آفر پر اتنی چراغ پا تھی کہ

مسلسل میری بے عزتی کرتی رہی۔ اور پھر نجانے مجھے کیا ہوا، میں نے اسے دھکیل کر زمین پر گرا دیا، وہاں پڑے ایک بڑے سے پتھر کو کھینچ کر اٹھاتے ہوئے میں نے پوری قوت سے اس کے سر پر مارا تھا۔ ایک بار، دو بار اور نجانے کتنی بار، رکا تب جب مجھے احساس ہوا کہ خون میں لت پت اس کا وجود بے حس وحرکت ہو چکا ہے۔

"اسے مارنے کے بعد کچھ دیر کے لیے میرا ذہن ماؤف ہو چلا تھا، شاید میں یونہی بھاگ کھڑا ہوتا لیکن بر وقت مجھے ہوش آیا اور ساتھ ہی خیال بھی کہ اگر میں نے اس کی لاش ٹھکانے نہ لگائی تو میں پھنس سکتا ہوں، مجھے اس سے چھٹکارا پانا ہوگا۔ میں یہ اکیلے نہیں کر سکتا تھا، اور یہیں پر بلی کارآمد ثابت ہوا۔ میں نے اسے جھنجوڑ کر جگایا اور اس وقت تک تھپڑ مارتا رہا جب تک کہ وہ ہوش میں نہ آ گیا۔ پھر میں نے ایک کہانی گھڑ لی جس میں اس نے اور میں نے مل کر اینجل کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی تھی۔ مزید برآں، میں نے نہیں بلکہ اس نے اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ بلی نے اتنی پی رکھی تھی کہ اس کے پاس میرے جھوٹ پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

"میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ لاش کو پٹریوں سے متصل اونچی گھاس میں کھینچ لے جبکہ میں دو بیلچے چرانے کے لیے قریبی ٹول شیڈ پر پہنچا۔ ہم نے ایک گھنٹے سے زیادہ محنت کی، بلی اس دوران مسلسل روتا رہا۔

"جب ہم فارغ ہو گئے تو میں نے اپنے ساتھی کو سختی سے خبردار کیا کہ ہم اس رات کے بارے میں کبھی کسی سے کوئی ذکر نہیں کریں گے ورنہ ہماری زندگی ختم ہو جائے گی۔ اینجل کوئی مقامی لڑکی نہیں تھی، اس لیے اس کی غیر موجودگی کا اس علاقے میں پتا نہ چلتا اور ہم نے اسے کافی گہرائی میں دفن کیا تھا۔

"اس کے کچھ دن بعد ہم نے اپنی شراکت ختم کر دی، پھر کبھی ساتھ کام نہیں کیا۔ وقتاً فوقتاً، اگر کبھی ہمارا آمنا سامنا ہوا بھی تو ہم نے فاصلہ رکھا اور کبھی بات نہیں کی۔

"یہی وہ گھناؤنا سچ ہے جو اس بہار کی رات میں ہوا تھا۔"

میں نے پڑھنا ختم کیا اور سائمن کی طرف دیکھا۔

"میرے خدا! بلی کا اینجل کو مارنے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔"

"ہاں۔" سائمن نے کہا۔ "لیکن اس نے جرم کی پردہ پوشی کی اور اسے ساری زندگی راز میں رکھا......"

"یہ سوچ کر کہ وہ اپنے راز کی حفاظت کر رہا ہے۔"

"جانتے ہو، بلی مجھے ہمیشہ سے ایک اُداس قسم کا آدمی لگتا تھا۔ جیسے وہ اپنے دل پر کوئی بوجھ لیے گھوم رہا ہو۔" سائمن نے ایک گزرتی ہوئی ویٹریس کو مزید دو بیئر لانے کا اشارہ کیا۔ "یقیناً، وہ کسی بھی وقت پولیس والوں کے پاس جا سکتا تھا اور وہ سب کچھ بتا سکتا تھا جو وہ جانتا تھا۔ پھر کون جانے؟ شاید زیکے تب خود ہی اعتراف کر لیتا کہ قتل اس نے کیا تھا۔"

"اور بلی کا ضمیر یہ جان کر ہلکا ہو سکتا تھا، وہ سکون سے مر سکتا تھا کہ وہ قاتل نہیں۔" میرا دل تاسف سے بھر چکا تھا۔

"ہاں، بلی کچھ مجرم تھا بھی اور نہیں بھی۔ وہ تقریباً ایک چوتھائی صدی تک جھوٹ کو دبانے کے لیے جیتا رہا۔ خود کو اس جرم کی سزا سے بچانے کے لیے جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔"

ہمارے بیئر آئے، اور میں نے بوتل ایک ہی سانس میں خالی کر دی۔

سائمن نے ایک گھونٹ لیا اور اپنے ہاتھ بوتل کے گرد لپیٹ لیے۔ "میں نے سنا ہے، انہیں کبھی پتا نہیں چلا کہ وہ لڑکی کون تھی۔ بیچاری اینجل۔ یہ شاید اس کا اصل نام بھی نہیں تھا۔ بہرحال، خدا اس کی روح کو سکون دے۔"

ہم نے اپنے بیئر ختم کیے اور ایک دوسرے کو الوداع کہا۔

میں نے پھر کبھی سائمن کو نہیں دیکھا۔ اس کے کچھ سال بعد میں اپنی بیٹی کو بچوں کی ایک فلم دکھانے لایا تھا، جب میں اینجل فیس نامی آنے والے ڈرامے کے پوسٹر کے سامنے لابی میں رکا۔ نمایاں تصویر اداکارہ کا چہرہ تھا، جس نے پینٹ کیے ہوئے پوسٹر کا تقریباً آدھا حصہ لے لیا تھا۔ چہرہ سامنے کی طرف تھا۔ ہونٹ سنجیدہ تھے، اداس کالی آنکھیں، کیمرے کی آنکھ کو گھور رہی تھیں۔

مجھے اپنے اندر کچھ ہلچل محسوس ہوئی، کچھ دیر تک میں یونہی اسے تکتا رہا۔

میری بیٹی آئی اور میرا ہاتھ تھام لیا۔ "کیا آپ رو رہے ہیں، ڈیڈی؟"

"نہیں ڈیئر، چلو اندر چلیں۔" میں بمشکل ان سیاہ آنکھوں سے نظریں چراتا بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔

❖❖❖

کیس نمبر 313

نوریہ مدثر

”شہر سویا پڑا تھا... مکین منتظر تھے کہ کوئی اس شہر کی وحشتوں کو کھول دے... ایک آسیبی زنجیر برسوں سے دل پر پڑی ہے... اسے کوئی کھول دے... ایک پُراسرار کردار کی نشست و برخاست...

خوف زدہ اور دہشت پسندانہ کہانیاں پڑھنے کے شائق قارئین کے لیے ایک مختصر کتھا......“

”یہ لیجیے صاحب جی۔ آپ کی منزل بھی آگئی۔“ کوچوان نے تانگا روکتے ہوئے کہا تو میں نے کسمسا کے آنکھیں کھولیں۔ ابھی رات کے گہرے ہونے میں کچھ ساعتیں باقی تھیں مگر سیاہ بادلوں نے سے پہلے ہی ہرسُو اندھیرا کر دیا تھا۔ سڑک کے ایک طرف لگے اسٹریٹ لیمپ پوری طرح روشن تھے، جو خستہ گھروں سے بنے اس ویران علاقے کو مزید ہولناک بنا رہے تھے۔

میں نے ہیٹ اتارے بنا اپنا سامان باہر نکالنا شروع کیا جو چند مضبوط بکسوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ تبھی کوچوان کی آواز آئی۔ ”صاحب جی، چُھٹا نہیں ہے ہمارے پاس۔“

”ارے کوئی بات نہیں۔ پھر سہی۔ تمہارا تو آنا جانا لگا رہے گا۔“ میں نے مسکرا کے کہا۔

”نن...... نہیں...... صاحب جی۔ آج تو ہماری مجبوری تھی۔ تبھی ہم یہاں چلے آئے۔ ورنہ ہم کبھی اس جگہ اپنے ڈیوڈ کو نہ لاتے۔“ یہ کہتے ہوئے کوچوان نے اپنے گھوڑے ڈیوڈ

کی پیٹھ سہلائی۔

''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں؟'' مجھے کوچوان پریشان دکھائی دے دیا۔

''کچھ نہیں۔ صاحب جی آپ اپنا دھیان رکھیے گا۔ چل ڈیوڈ، تیز چل۔ ہمیں جلدی گھر پہنچنا ہے۔'' کوچوان نے مزید کوئی جواب دیے اپنا تانگا واپس موڑ لیا تھا۔ میں نے مکان کا تالا کھولا اور سامان اندر رکھنے لگا۔ دفعتاً میری نظر اس بنجر پیڑ پر پڑی اور مجھے اپنا لہو جمتا سا محسوس ہوا۔ کیونکہ پیڑ کی ٹنڈ منڈ شاخوں پر اک عقاب بیٹھا تھا۔ جس کی بھیانک چونچ اس تاریکی میں اور بھیانک لگ رہی تھی۔ میں نے اس منظر کو سر سے جھٹکا اور جلدی سے اپنا کام مکمل کرنے لگا۔ ابھی مجھے گھر کی صفائی بھی دیکھنی تھی اور صبح اپنے کام کی جگہ بھی جانا تھا۔ میں جوزف پارکر بطور سب انسپکٹر یہاں تعینات ہوا تھا، جسے اس جگہ پے در پے ہونے والی اموات کے کیس کی تفتیش کے لیے بھیجا گیا تھا۔ میرے پاس موجود فائل میں ساری معلومات کیس نمبر 312 کے نام سے محفوظ تھیں۔ یہ علاقہ میرے لیے نیا تھا اور آنے سے پہلے مجھے صرف اتنی معلومات دی گئی تھیں کہ ان تمام اموات میں انسانی ہاتھ ہرگز ہرگز ملوث نہیں۔

صبح ہونے سے پہلے ہی میرے نہ ختم ہونے والے کاموں کی ایک لمبی فہرست تیار تھی۔ میں نے اپنی تیاری پر آخری نظر ڈالی اور اس علاقے کے واحد اسپتال کا رخ کیا جہاں سرد خانے میں ایک ہفتہ پہلے قتل ہونے والے بچے کی لاش موجود تھی۔ چونکہ یہ علاقہ پسماندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا تھا، سو اسپتال میں پوسٹ مارٹم کی سہولت موجود ہی نہ تھی۔

میں یوں تو توہم پرست ہرگز نہ تھا مگر جب اس بچے کی لاش دیکھی تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کیونکہ اس کا جسم بری طرح اُدھڑا ہوا تھا اور ہر حصے پر تیز دھار پنجوں کے نشان واضح تھے۔ یوں جیسے لہو کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا گیا ہو۔ صرف وہی نہیں بلکہ سبھی مرنے والوں کے جسموں پر ایک سے نشان تھے۔ میں نے اپنے خوف پر قابو پایا اور تفتیش کا باقاعدہ آغاز شروع کیا۔ میں جوں جوں ورثا سے ملتا گیا توں توں مزید الجھتا گیا۔ کیونکہ قتل ہونے والے آخری بار اسٹیشن کے آس پاس دیکھے گئے تھے پھر آخر ان کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ آخر کون تھا جو یوں بیدردی سے انسانی جسم نوچ رہا تھا؟ پھر طرح طرح کے اندیشوں سے لپٹا ذہن لیے میں چرچ کے پادری کے پاس پہنچا۔

''پر فادر! میں جوزف پارکر ہوں۔ مجھے دوسری مخلوق پر اعتبار نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے چائے کا کپ واپس میز پر رکھا۔

فادر بہت نرمی سے بولے۔ ''پیارے بیٹے، یہ دنیا صرف انہی چیزوں پر قائم نہیں جو ہمیں دکھتی ہیں بلکہ یہاں ان سب مخلوقات کا بھی اتنا ہی مقام ہے، جنہیں ہم آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے۔''

مگر میری پریشانی بجا تھی۔ مجھے یہ کیس ہر صورت حل کرنا تھا۔ سو میں کسی ان دیکھی شے پر اعتماد کر کے مزید بے گناہوں کو مرنے نہیں دے سکتا تھا۔ سو میں نے اپنے سوال پھر سے شروع کیے۔

''تو فادر پھر ان سب اموات کا مقصد کیا ہے؟ میرا مطلب ہے اگر یہ سب کیا دھرا کسی بلا کا ہے تو وہ آخر ایسا کیوں کر رہی ہے؟''

فادر نے مجھے وہ بتایا جسے سن کے میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

فادر کے مطابق کئی سال پہلے یہ علاقہ اتنا ویران نہیں تھا جتنا کہ اب دکھ رہا تھا۔ یہاں بھی لوگ خوش حال تھے، زندگی روشن تھی مگر پھر یکا یک قسمت کا پانسا پلٹا اور ہنستی بستی ماتم میں مبتلا ہو گئی۔ ہوا یوں کہ سالوں پہلے معمولی تلخ کلامی پر دو دوستوں میں ہاتھا پائی ہوئی اور ایک دوست نے دوسرے کو مار دیا۔ قاتل موقع سے ہی فرار ہو گیا۔ مقتول کے گھر والے بھی کچھ عرصے بعد یہ جگہ چھوڑ گئے مگر ان کے اس جگہ سے جاتے ہی اموات ہونے لگیں۔ مرنے والوں میں ایک انسپکٹر، ٹکٹ ماسٹر اور ایک اسپتال کا ملازم تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان سب کے جسموں پر بھی ہو بہو وہی نشان تھے۔ دھیرے دھیرے خبر پھیلنے لگی کہ یہ سب مرے ہوئے کوچوان کی روح نے کیا ہے جو سب سے اپنا انتقام لے رہی ہے۔ خوف کے سائے تلے سانس لینا دوبھر ہوتا جا رہا تھا۔ سو دھیرے دھیرے کر کے لوگ یہاں سے جانے لگے۔ اب یہاں صرف وہی بس رہے تھے جن کے معاشی وسائل محدود تھے۔ لیکن موجودہ حالات میں ان کا رہنا بھی مشکل نظر آ رہا تھا۔ مگر سوچنے کی بات یہ تھی کہ اگر کسی روح نے اپنا بدلہ لینا تھا تو وہ تو پہلے ہی لے چکی تھی۔ تو پھر یوں عرصے بعد دوبارہ بستی والوں کو کیوں مارا جا رہا تھا؟ اسی سوال کی گتھی سلجھاتے سلجھاتے میں اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔

''ارے صاحب جی آپ گئے نہیں؟'' کانوں میں اِک شناسا سا آواز پڑی تو پیچھے مڑنے پر مجھے وہی کوچوان دکھائی دیا جو اُس دن مجھے گھر تک لایا تھا۔

''ارے صاحب جی، ہم آپ سے پوچھ رہے ہیں۔''

کوچوان نے دوبارہ کہا تو میں سوچوں کے بھنور سے باہر آیا۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ بستی سے پرے ایک پرانا کھنڈر ہے جہاں سے اکثر رات میں چیخنے کی آوازیں آتی ہیں۔گاہے گاہے عجیب وغریب سائے بھی دکھتے رہتے ہیں۔ میں نے وہ کھنڈر دیکھنے کا فیصلہ کیا اور رات ہوتے ہی اپنی ٹیم لیے وہاں جا پہنچا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ ساری کہانی یہیں پر کھلے گی۔ اور ایسا ہی ہوا۔ جونہی کھنڈر سے چیخ بلند ہوئی، تو میں اور میری ٹیم اندر گئے تو سامنے کا منظر ہوش اڑا دینے والا تھا۔

اگلی صبح ساری بستی علاقے کے چوراہے پر جمع تھی اور ان کے سامنے ہتھکڑیوں میں جکڑے تین چار مجرم تھے۔ طرح طرح کی سرگوشیاں ابھرنے لگی تھیں۔

''یہ تو وہی ہے جو سالوں پہلے بھاگ گیا تھا۔''

''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔''

''یقین نہیں آتا، یہ وہی ہے۔''

میں نے اپنا ہیٹ درست کیا اور گویا ہوا۔

''یہ قصہ آج سے چند سال پہلے کا ہے۔ جب ایک قاتل دنیا کی نظر میں کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ کہنے کو اس نے اپنے دوست کا قتل کیا تھا مگر وہ اس سے کہیں زیادہ سفاک تھا۔ وہ یوں کہ اس کا ارادہ انسانی اعضاء کی اسمگلنگ کا تھا۔ مگر جب دوست کو بھنک پڑی تو اس نے اپنے دوست کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اس گھناؤنے فعل میں شریک انسپکٹر، اسپتال کے ملازم اور اس ٹکٹ ماسٹر کا بھی قتل کیا جنھوں نے اس کی مدد کی تھی۔ یہاں تک تو روح والی افواہ نے اس قاتل کی خاصی مدد کی مگر سالوں بعد جب یہ قبیح کھیل دوبارہ شروع کیا گیا تو کسی کو بھی سمجھ نہیں آیا کہ عرصے بعد اس خونی سلسلے کا مقصد کیا ہے؟ تو بستی والو! اس خونی سلسلے کا مقصد بھی انسانی اسمگلنگ ہی تھی۔ اس بار بھی بستی کے چند بے ضمیر انسانوں نے یہ کھیل شروع کیا مگر وہ بھول گئے تھے کہ جوزف پارکر کسی بھوت پریت کو نہیں مانتا۔''

میرا قہقہہ بلند ہوا۔ بستی والے مطمئن تھے کہ ان کی جانیں اب محفوظ ہیں۔ ساری ضروری کارروائی کے بعد میں نے واپسی کا ارادہ کیا۔ کیونکہ کیس حل ہو چکا تھا۔ جانے سے پہلے میں الوداعی کلمات کہنے فادر کے پاس گیا۔

''فادر میں نے کہا تھا نا کہ جیسا سب سمجھ رہے ہیں ویسا کچھ نہیں ہوگا۔'' میرا انداز فاتحانہ تھا۔

''میرے بچے جیتے رہو۔'' فادر نے مجھے ماتھے پر بوسہ دیا۔

میں واپس جانے کے لیے پلٹا ہی تھا کہ فادر نے کہا۔

''اپنے ریڈیو کی آواز آہستہ رکھیے تاکہ آپ کے پڑوسیوں کے آرام میں خلل نہ پڑے۔''

''ویسے جوزف تمہیں اس کھنڈر کا پتا کیسے چلا تھا؟''

''مجھے اسی کوچوان نے بتایا تھا جو اسٹیشن کے پاس ہی گھومتا رہتا ہے۔''

''کیا؟''

فادر کا چہرہ بتا رہا تھا کہ میں نے شاید کچھ غلط کہا ہے۔

''تمہیں یاد ہے میں نے کہا تھا کہ اس دنیا کا نظام ان مخلوقات سے بھی قائم ہے جو ہمیں دکھائی نہیں دیتیں۔''

مجھے حیرت ہوئی کہ اس موقع پر وہ اتنے دن پہلے کی بات کیوں دہرا رہے تھے؟

''فادر آپ اب بھی ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟''

مجھے فادر کی مسکراہٹ پُراسرار معلوم ہوئی۔

''پیارے بیٹے جوزف! شاید تمہیں معلوم نہیں کہ برسوں پہلے یہاں جس کا قتل ہوا تھا، وہ ایک کوچوان تھا اور اس کے بعد کسی اور نے تانگا جوتنے کی ہمت کی ہی نہیں۔''

فادر جانے کیا کچھ کہتے جا رہے تھے۔ میں یعنی جوزف پارکر جسے آج تک توہم پرستی پر یقین نہ تھا مگر اس کی مدد جس نے کی تھی وہ...... وہ مخلوق سانسوں سے آزاد تھی۔ بھلے ہی کیس نمبر 312 حل ہو چکا تھا مگر میرے لیے وہ ہمیشہ کے لیے ایک اسرار بن کے رہ گیا۔

❖❖❖

دوسری قسط

قاتل مسیحا

طاہر جاوید مغل

بدلتے حالات و اطوار کے موجودہ سنگم پر یہی کہانی کہنے کا وقت ہے... ایسی گھڑیوں میں وہی کہانی کار کہانی لکھ سکتا ہے جس کا کہانی میں گہرا ایمان ہو... یہ ایمان کہ راہِ نجات ہے تو کہانی میں ہے... یہ ایمان آج کا کہانی کار کہاں سے لائے... آج کا زمانہ تو ایمان سے خالی ہے... اس کڑے وقت میں انسانیت گردو پیش سے دور کھڑی ہو کے لوگوں کی قیامت خیز چالوں کو دیکھتی ہے... طاہر جاوید مغل کے قلم سے شادابیاں ہی نہیں تلخیاں بھی صفحۂ قرطاس پر بکھرتی ہیں... خصوصاً عمران اور تابش یکجا ہوں تو ہوش اڑا دینے والی ہنگامہ خیزیاں رونما ہوتی ہیں کہ رگوں میں دوڑتا خون منجمد ہو جائے...

طلبِ ہوس میں مبتلا ایک وحشی مسیحا کی قاتلانہ جرّاحی

اسی دوران میں ہما واپس آگئی۔ اس کے آنے سے پہلے ہی میں کھڑکی سے ہٹ کر دوبارہ کرسی پر آبیٹھا تھا۔ میرے گھٹنے سے خون رِس رہا تھا اور اس کے کچھ نشانات لباس پر بھی نظر آرہے تھے۔

میری چوٹیں دیکھ کر ہما کے چہرے پر تاسف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے انٹرکام اٹھا کر کہا۔ ”فرزانہ! ذرا میرے پاس آؤ۔“

چند لمحے بعد وہی عورت نمودار ہوئی‘ جسے میں نے کچھ دیر پہلے نابینا لڑکی کو بناتے سنوارتے دیکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ششدر ہوئی۔ ہما عروج نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ”فرزانہ! میرے اور تمہارے سوا ان کی یہاں موجودگی کا کسی کو پتا نہیں اور نہ ہی ہونا چاہیے، کسی بھی صورت۔“

فرزانہ نامی اس عورت نے اثبات میں سر ہلایا۔

ہما عروج نے اسے میڈیسن اور بینڈیج وغیرہ لانے کو کہا۔ وہ جلدی سے یہ چیزیں لے آئی اور گھٹنے کے علاوہ دوا اور چوٹوں کی ڈریسنگ کرنے میں مدد کی۔ وہ ہما کو بڑے ادب سے ہما باجی کہہ کر بلا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد یہی فرزانہ نامی عورت ہمارے لیے چائے اور اسنیکس وغیرہ لے کر آگئی۔ میں نے وال کلاک دیکھا۔ اب صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔

ہما نے بے تکلفی سے چائے کا کپ میرے ہونٹوں کی طرف بڑھایا۔ میں نے ایک چسکی لی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ میرے پشت پر بندھے ہاتھ نہیں کھولے گی۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ رہی ہوگی۔
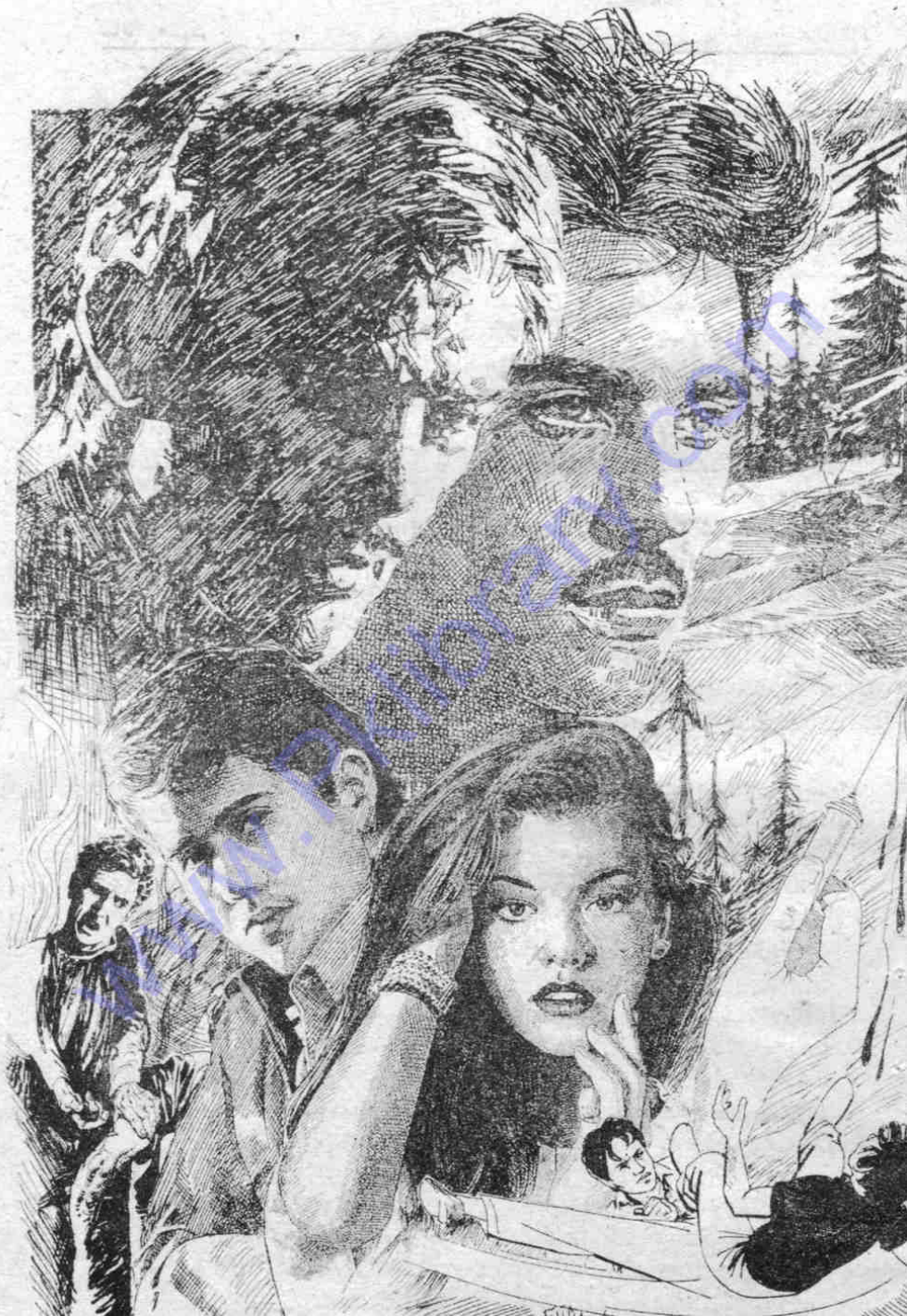
میں نے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ رائے صاحب بے حد غصے میں ہوں گے۔ تم میری مدد کر کے کسی مصیبت میں نہ پھنس جانا۔“

”کوئی گل نہیں...... دیکھا جائے گا۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔ میرے منع کرنے کے باوجود مجھے کیک پیسٹری کا ایک بائٹ دیا اور گویا ہوئی۔ ”اس باندری جاذبہ نے جو کچھ کیا ہے، اس کا جواب بھی تو اسے دینا پڑے گا رائے صاحب کو۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں، یہ بغیر کسی اجازت کے تمہیں اسپتال سے اپنے چیمبر میں لے کر گئی ہے۔ اب کہے گی یہی کہ کوئی ٹیسٹ وغیرہ کرنا تھا تمہارا۔ مگر اصل میں تو اس کے اندر بھانبھڑ شانبھڑ مچا ہوا تھا۔“

”ظاہر ہے کہ اپنی اس حرکت کے لیے وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنالے گی۔“ میں نے کہا۔

”ہاں ہاں، ایک نمبر کی فتے کٹنی ہے۔ کہے گی کہ تم نے بھاگنے کی کوشش کی اور جو تازہ چوٹیں تمہیں لگیں وہ اسی وجہ سے تھیں۔ بعد میں تم بھاگ گئے...... لیکن وڈا ڈاکٹر تو پوچھے گا نا کہ تم کس کی اجازت سے اتنے خاص مریض کو ٹیسٹوں کے لیے لے کر گئی تھیں...... اور کون سے ٹیسٹ تھے؟“

اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ ہما عروج دل گردے والی عورت ہے اور اسے یقین ہے کہ وہ رائے کے غصے کو کافی حد تک ٹھنڈا کر لے گی۔ اسی اثنا میں ہما کے سیل فون پر میوزک ابھرا۔ طرز غالباً پنجابی گانے کی تھی...... اِک پھل موتیے دا مار کے جگا سوہنی ایں۔

ہما نے اپنے سرخ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور تھوڑا سا رخ پھیر کر بیٹھ گئی۔ پتا چلا کہ یہ ویڈیو کال ہے۔ چند سیکنڈ بعد جادو رائے کی بارعب آواز میرے کانوں میں پڑی اور میں چونک گیا۔ اس کی صورت بے شک دل میں کراہیت ابھارتی تھی مگر آواز ٹھیک ہی تھی بلکہ کسی وقت تو آواز پر کسی ریڈیو اناؤنسر کی آواز جیسا گمان ہوتا تھا۔ میں نے گردن کو ذرا لمبا کر کے دیکھا۔ پان سے رنگے ہونٹوں والا اس کا بالکل گول سیاہ چہرہ پوری فون اسکرین پر نظر آ رہا تھا۔

”ہاں بھئی، کیا بنا پھر؟“ اس نے ہما سے پوچھا۔

”جو تمہارا حکم رائے جی...... ! سب تیار ہے...... کتنے بجے بھیجنا ہے؟“

”ابھی ٹھیک سے پتا نہیں۔ شام کو بتا دوں گا۔“

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ہما نے کہا۔ ”وہ تین چار بجے کیا بھگدڑ سی مچ گئی تھی؟ ایک دو گولیوں کی آواز بھی آئی تھی۔

جواب میں رائے نے روکھے لہجے میں اسے مختصراً بتایا کہ جو پولیس والا یہاں پکڑا گیا تھا، اس نے ڈاکٹر جاذبہ کو زخمی کیا ہے اور بلڈنگ کے اندر ہی کہیں چھپ گیا ہے۔ اسے پکڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

رائے سے بات ختم ہوئی تو ہما معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگی، بولی۔ ”مجھے لگ رہا ہے کہ رائے صاحب سے تمہاری پرانی یاد اللہ ہے۔ پرسوں تمہارے ساتھ مار کٹائی سے پہلے رائے صاحب تم سے کہہ رہا تھا کہ میرے اوپر تمہارا قرض ہے جو میں بہت اچھی طرح اتاروں گا۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے تو خود بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی۔ لگتا ہے شاید ہر پولیس والے نے ہی تمہارے رائے صاحب پر قرض چڑھا رکھا ہے۔“

وہ بدستور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ ”اب رائے صاحب کیا فرما رہے تھے؟“ میں نے پوچھا۔ ”کس کو ان کے پاس بھیجنے کی بات ہو رہی تھی؟“

وہ ایک دم دوسرے موڈ میں آگئی۔ ذرا مسکرا کر بولی۔ ”پولیس والے ہو۔ یہ تو تمہیں پتا ہی ہوگا کہ رائے صاحب عورتوں کا کتنا شوقین ہے۔“

”تھوڑا بہت پتا ہے۔“

”شاید تم جانتے ہو یا نہیں...... چند ہفتے پہلے رائے صاحب کا جو خطرناک ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ اس میں ایک ایسی کڑی ماری گئی تھی جس پر رائے صاحب سو جان سے بلکہ سوا سو جان سے فدا ہو چکا تھا۔ اس کی موت کے بعد سے وہ بہت...... بہت زیادہ اپ سیٹ ہے۔ اس کا دکھ مٹانے کے لیے بڑے بڑے پاپڑ ویل رہا ہے۔ اتنا تیز پان کھا رہا ہے کہ منہ اندر سے چیرو چیر ہو گیا ہے۔ دوسری طرح کی دل پشوری بھی کر رہا ہے پر گل (بات) نہیں بن رہی۔“

”کیا مطلب؟“

”وہی لڑکی شڑکی والا شغل۔ کل ایک بڑی سوہنی کڑی بھیجی تھی اس کے پاس۔ دس پندرہ منٹ میں ہی اس کو دھکے مار کر نکال دیا بیڈ روم سے۔ کہتا ہے مجھے چمڑی شمڑی نہیں چاہیے۔ چمڑی شمڑی بہت ورت (برت) لی ہے میں نے۔ مجھے محبت چاہیے۔ ویسی ہی محبت جو مرن والی مجھ سے کرتی تھی۔ وہ مجھے بالکل بدل گئی ہے۔“

”مرن والی کون؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”وہی جو ایکسیڈنٹ میں اللہ بیلی ہو گئی تھی۔ چاندنی نام تھا اُس کا۔ کہتا ہے وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔“

''کیا واقعی کرتی تھی؟''
''کوئی بڑی بات نہیں کہ کرتی بھی ہو۔ اس بے چاری کو کون سا نظر آتا تھا۔''
میں نے کہا۔ ''تو پھر کسی نابینا کو ہی بھیج دو اُس کے پاس۔''
اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''واہ بھئی واہ...... پولیس والے ہو پھر بھی دماغ چنگا کام کرتا ہے تمہارا۔''
''کیا مطلب؟ مذاق کر رہی ہو؟''
''نہیں نہیں۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ کل رامے صاحب نے بھی اس سے ملتی جلتی بات ہی کی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہر طرح کی گل بات کر لیتا ہے۔ جب اس لڑکی کو دھکے مار کر نکال دیا تو خود ہی کہنے لگا...... کوئی چاندنی جیسی لاڈو جو مجھے نہ دیکھے۔ میرے اندر کے پیار کرنے والے مرد کو دیکھے۔ شاید وہ میرے زخم پر مرہم رکھ سکے۔''
''تو پھر؟''
''تو پھر مزے کی بات یہ ہے کہ پندرہ بیس گھنٹے میں ہم نے ایک ایسی لڑکی ڈھونڈ بھی لی ہے۔ روپے پیسے سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ایک ہفتے میں چار پانچ لاکھ کمانے کا موقع مل جائے تو دل اوپر نیچے ہو ہی جاتا ہے۔ یہ لڑکی بھی اپنی مرضی سے آئی ہے۔ اب دیکھیں رامے جی کو پسند آتی ہے یا نہیں۔''
''نابینا ہے؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔
''ہاں...... ابھی جو فرزانہ میرے ساتھ تمہاری مرہم پٹی کروا رہی تھی، یہ میک اَپ آرٹسٹ بھی ہے۔ یہی اسے کل تیار کرے گی رامے صاحب کے لیے۔''
میں نے کہا۔ ''بُرا نہ منانا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے تم رامے صاحب کے لیے عیش و عشرت کا انتظام کرتی ہو۔''
اس نے چہرہ چھت کی طرف اٹھا کر ایک پُرلطف قہقہہ لگایا۔ ''سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ...... کیا میں رامے کے لیے نائیکہ کا کام کر رہی ہوں......؟ ہاں، میں کر رہی ہوں یہی کام...... اب میں یہی کر سکتی ہوں۔ جو سپنے شپنے الھڑ جوانی میں دیکھے تھے، وہ تو سارے سڑ کر سواہ ہو گئے اور میرے جیسی آرٹسٹوں کی جوانی ہوتی بھی کتنی دیر کی ہے؟ بس یہی کوئی چار پانچ سال۔ ان چار پانچ سالوں میں ہی نئی نئی تتلیاں میدان میں آ چکی ہوتی ہیں۔ میرے جیسیاں ان خبیث پروڈیوسروں، ڈائریکٹروں کو ادھیڑ عمر لگنے لگتی ہیں پھر کہا جاتا ہے کہ ہیروئن کو بھول جاؤ۔ بہن یا بھابی کا رول کر لو۔ دو سال اور گزر جائیں تو ماں کے رول پیش ہونے لگتے ہیں۔ تھو...... تھو، ان فلموں، ڈراموں پر۔''
اس نے نفرت سے ایک جانب خیالی تھوک پھینکا۔ میں تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا۔
کچھ دیر خاموشی رہی۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر اندرونی دکھ جھلک رہا تھا۔ ذرا مسکرا کر بولی۔ ''ذرا دھیان سے دیکھو میری طرف...... اور بالکل خدا لگتی کی بات کرنا۔ کیا میں واقعی وڈی عمر کی لگتی ہوں؟''
میں نے اُس کے بھرے بھرے لیکن نہایت متناسب جسم اور چہرے کی طرف دیکھا۔ حقیقت یہی تھی کہ وہ ایک جواں سال دلکش عورت تھی۔ اگر ذرا سی رعایت برت لی جاتی تو وہ ایک فلمی ہیروئن یا ڈرامے کے لیڈ کیریکٹر کے لیے بالکل موزوں تھی مگر جو بات وہ بتا رہی تھی، وہ بھی بالکل حقیقت تھی۔ شوبز میں ایک سے بڑھ کر ایک نوخیز لڑکیاں وارد ہوتی رہتی ہیں۔ مقابلہ غالباً اتنا سخت ہوتا ہے کہ چند برسوں میں ہی ہیروئن کے رتبے پر فائز اداکارہ کو گھسیٹ کر ایک طرف کر دیا جاتا ہے۔
''میں تمہاری باتوں سے مکمل اتفاق کرتا ہوں ہما!'' میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

☆☆☆

اگلے تقریباً سولہ گھنٹے بھی میں نے اسی اپارٹمنٹ میں گزار دیے۔ ہما اور فرزانہ کی باتوں سے پتا چلا تھا کہ کمر کی چوٹ کی وجہ سے ڈاکٹر جاذبہ اسپتال میں تھی۔ میری تلاش بھی عمارت کے طول و عرض میں مسلسل جاری تھی۔
ہما عروج ایک مختلف عورت تھی۔ اس کا تعلق وسطی پنجاب سے تھا۔ وہ چند برس پہلے لاہور پہنچی تھی۔ فلموں اور ڈراموں میں کام حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کی تھی۔ ایک پنجابی فلم میں اسے سیکنڈ ہیروئن کا رول بھی ملا تھا مگر وہ اس سے آگے نہ بڑھ سکی اور مایوس ہو کر کنارہ کش ہو گئی۔ انہی دنوں جادو رامے ایک ''شریف کاروباری'' کی حیثیت سے اپنی ہاؤسنگ سوسائٹی پر زور و شور سے کام کر رہا تھا۔ وہ وہاں ملازم ہو گئی۔ اس کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا تھا جو رامے کے پاس جاب کرنے والی ہر جوان خوبرو خاتون کے ساتھ ہوتا تھا۔ اسے کئی بار جادو رامے کی بے پناہ کراہت برداشت کرنا پڑی تھی۔ وہ کچھ عرصہ رامے کے دسترخوان پر ایک پسندیدہ ڈش کی طرح موجود رہی تھی پھر بتدریج نظر انداز کر دی گئی۔ بہرحال رامے کی رازدار اور مزاج شناس کے طور پر اس کی حیثیت اب بھی برقرار تھی۔

میں نے اسے مزید کُریدنے کی کوشش کی اور پوچھا۔ ''ہما! یہ سب کیا چل رہا ہے یہاں؟''

''ڈپٹی صاحب! تم یہی کچھ معلوم کرنے کے لیے تو یہاں گھسے ہو۔ کیا اب تک کچھ پتا نہیں چلا؟ تمہاری اس ڈھیس پٹاس کا کچھ نہ کچھ فائدہ تو ہوا ہوگا تمہیں؟''

''بس یہی پتا چلا ہے کہ تمہارا باس رائے یہاں کوئی میڈیسن بنوانے کی کوشش کر رہا ہے اور بدنصیب مزدوروں پر الٹے سیدھے تجربے کیے جا رہے ہیں۔''

''بدنصیب کیوں کہہ رہے ہو انہیں۔ ان کو اچھے خاصے روپے مل رہے ہیں۔''

''اور پرسوں جو کچھ ہوا ہے یہاں؟ قیامت مچی رہی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے درجنوں ہی جان سے چلے گئے ہوں گے؟''

اس نے لمبی سانس لی اور اپنے طویل بالوں کو انگلیوں سے سنوارتے ہوئے بولی۔ ''بس، یہ ایک واقعہ ہو گیا ہے۔ تم اسے حادثہ بھی کہہ سکتے ہو اور درجنوں بھی نہیں۔ میرے خیال میں بیس بائیس ہوں گے۔''

''اور یہ تھوڑے ہیں؟''

''میں کب کہہ رہی ہوں۔ سچی گل ہے، مجھے بھی افسوس ہوا ہے پر وہ کہتے ہیں نا کہ زندگی بچانے والی دوائیں ایسے ہی ایجاد ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی ان کے تجربوں میں جانوروں اور انسانوں کی جانوں کا بھی نقصان ہوتا ہے۔''

مجھے اس کے جواب پر غصہ تو بہت آیا مگر سچویشن ایسی تھی کہ میں اُس سے بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔

گفتگو کے دوران میں، میں نے اس سے ٹوہ لینے کی کوشش کی کہ یہاں ہم جس وسیع عمارت میں موجود ہیں، یہ لاہور میں کہاں واقع ہے؟

ہما کا جواب تھا کہ جادو رائے اور اُس کی ساتھی میم مائرہ ایسے معاملوں میں بے حد رازداری سے کام لیتے ہیں۔ یہاں موجود تمام تر لوگوں کو بڑی پلاننگ کے ساتھ اور بڑی احتیاط سے یہاں پہنچایا گیا ہے۔ ان دونوں کے اور ان کے چند قریبی ساتھیوں کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ یہ عمارت کس جگہ واقع ہے؟

اب پتا نہیں کہ ہما واقعی لاعلم تھی یا چھپا رہی تھی۔ بہرطور اس نے مجرے وقت میں میری مدد کی تھی اور میں اسے کسی بھی طرح چونکانا یا ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے خیال میں وہ ایک دلیر عورت بھی تھی اور اس کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ اس نے رسک لیتے ہوئے دوپہر کے وقت کچھ دیر کے لیے میرے ہاتھ اس شرط پر کھولے تھے کہ میں ضروریات سے فارغ ہو کر انہیں دوبارہ اسی طرح بندھوا لوں گا۔

رات کے دس بجے کے لگ بھگ وہی ہوا جس کا اندازہ میں پہلے ہی لگا چکا تھا۔ جس طرح عام لوگ اپنا ڈپریشن دور کرنے کے لیے دوا لیتے ہیں یا کسی نیک عمل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، جادو رائے جیسے خبیث اپنی خباثت میں مزید ڈوبنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جواں سال نابینا لڑکی کو شب بسری کے لیے جادو رائے کی طرف بھیج دیا گیا۔ میرے تجزیے کے مطابق جادو رائے کا یہ رین بسیرا اس لگژری اپارٹمنٹ سے زیادہ دور نہیں تھا۔

نابینا لڑکی کا نام ہما کی زبانی عنایہ معلوم ہوا۔ ابھی اسے جادو رائے کے بیڈ روم میں گئے بہ مشکل آٹھ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ہما عروج کے سیل فون پر کال کا میوزک اُبھرا...... اِک پھل موتیے دا مار کے جگا سوہنی اے......

ہما نے چونک کر کال ریسیو کی۔ اس ویڈیو کال کی دوسری جانب سیاہ چہرہ جادو رائے ہی تھا۔ ہما نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور موبائل کا رخ تھوڑا ٹیڑھا کر لیا۔ ''ہاں رائے صاحب!'' وہ لہجے میں مٹھاس بھر کر بولی۔ ''تم ٹھیک تو ہو نا؟''

''تمہاری ماں کا سر ٹھیک ہوں۔'' دوسری طرف رائے چنگھاڑا اور ہما بدک کر رہ گئی۔ ''یہ کیا نمونہ بھیجا ہے میرے لیے۔ کیا تیری نظر میں یہی ٹیسٹ ہے میرا۔ کیا سمجھتی ہے مجھ کو؟''

''کیا ہوا ہے رائے صاحب......؟ کڑی پسند نہیں آئی؟'' ہما ذرا سنبھل کر بولی۔

جواب میں بپھرے ہوئے رائے نے عنایہ نامی اُس لڑکی کے لیے غلیظ اور توہین آمیز الفاظ استعمال کیے۔

میں نے خود کو موبائل فون کے کیمرے سے دور رکھتے ہوئے موبائل کی اسکرین کی طرف دیکھا۔ رائے کے پُرآسائش بیڈ روم کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ نابینا لڑکی اس کے بیڈ کے ایک سرے پر ڈری سہمی بیٹھی تھی۔ اس کا دوپٹا فرش پر پڑا تھا... وہ بے بسی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا، وہ عام سی شکل و صورت کی تھی اور غالباً یہی بات آتش مزاج رائے کو مشتعل کر گئی تھی۔

''دفع ہو جا یہاں سے۔'' رائے کی چنگھاڑ پھر سنائی دی اور اس نے عنایہ کو باقاعدہ دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر تین چار

فٹ آگے چلی گئی...... اور پھر بدحواسی میں دیوار ٹٹولتی ہوئی بیڈروم کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا خوش رنگ دوپٹا وہیں پڑا رہ گیا۔

نابینا کی اس تذلیل پر دل لرز سا گیا۔ اس نے لڑکی کی صورت پر شرمناک ریمارکس دیے تھے۔ طرفہ تماشا یہ تھا کہ یہ ریمارکس راے جیسے بدشکل و بدخصلت نے دیے تھے۔

اس کے ساتھ ہی راے نے کال بھی منقطع کر دی۔

ہما کا چہرہ بجھا ہوا نظر آیا۔ وہ پنجابی لہجے میں مجھے ''ایکسکیوزمی'' کہتی ہوئی بلوری دروازے کے پیچھے اوجھل ہوگئی۔

دس پندرہ منٹ بعد واپس آئی تو کافی سنبھلی ہوئی تھی۔ اس نے کمرے کے ایک گوشے میں جا کر اپنا سیل فون نکالا۔ وہ ہلکے پھلکے موڈ میں نظر آنے لگی۔ اس نے راے کو آڈیو کال کی۔ اسپیکر آن تھا۔ دوسری طرف کی غصیلی آواز بھی تقریباً مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ وہ راے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ پہلے تو خود کو اور حالات کو گالیاں دیتا رہا پھر وہی رونا رونے لگا جو اس سے پہلے ہما مجھے بتا چکی تھی۔ اس کی گفتگو کا مفہوم یہ تھا کہ اب وہ کسی عورت کی نگاہوں میں اپنے لیے کراہت اور گریز نہیں دیکھ سکتا۔ اسے ویسی ہی خود سپردگی چاہیے جو اس نے اپنی مرجانے والی محبوبہ چاندنی میں دیکھی تھی۔

ہما نے کہا۔ ''اچھا غصہ تھوکو راے جی! میں کچھ اور کرتی ہوں۔''

راے نے دانت پیسے۔ ''اور کیا کرو گی...... مجھے تو لگتا ہے کہ آج کل تمہاری عقل پر ویسے ہی پتھر پڑے ہوئے ہیں۔''

وہ لجاجت سے بولی۔ ''دیکھو راے جی! دو تین لڑکیاں اب بھی ہیں میرے پاس جو تمہیں بالکل نہیں جانتیں...... سوہنی کڑیاں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو ریڈی کرتی ہوں...... اندھا کر کے بھیجتی ہوں تمہارے پاس۔''

''کیا بکواس ہے، اندھا کر کے بھیجتی ہوں؟ کیا تیزاب ڈالو گی اس کی آنکھوں میں؟'' وہ زہرناک ہو کر پھنکارا۔ غالباً نشیلے پان نے اس کی رگوں میں انگارے بھر رکھے تھے۔

''اندھا کرنے کے اور کئی طریقے بھی تو ہوتے ہیں راے جی......! اور لڑکی بھی تمہیں پسند آئے گی۔ بلکہ ایک کیا، دو بھیج دیتی ہوں۔ جس کو چاہے رکھ لینا۔''

مجھے محسوس ہوا کہ جیسے دوسری طرف گھاگ راے کی سمجھ میں بات آگئی ہے۔ وہ کچھ بڑبڑایا اور پھر فون بند کر دیا۔

ہما معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ کیا گفتگو ہے؟ پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی۔''

اس نے ادا سے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں ڈھانپ دیا۔ ''آلے دوالے کچھ نظر آرہا ہے تمہیں؟''

''فی الحال تو نہیں۔''

''تو یہ بھی تو اندھا پن ہی ہے۔'' اس نے کہا پھر اٹھی اور اپنے سڈول جسم کو بل دیتی ہوئی باہر چلی گئی۔

عجیب جنونی شخص تھا یہ جادو راے...... اور مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہما اس جنونی کو ہینڈل کرنے کا گر کسی حد تک جانتی ہے۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے قریبی کمرے سے مدھم آہٹیں سنائی دیں۔ یہ وہی ڈریسنگ روم تھا جہاں کل میں نے نابینا عنایہ کے ناخنوں پر پالش وغیرہ ہوتے دیکھی تھی۔ میں عام انداز میں چلتا ہوا اس ''کرٹن'' تک پہنچا اور جھری میں سے جھانکا۔ دو ماڈل نما لڑکیاں ہیجان خیز کپڑوں میں ہما عروج کے سامنے کھڑی تھیں۔ وہ تحکمانہ انداز میں انہیں کچھ ہدایات دے رہی تھی۔ وہ مسلسل اثبات میں سر ہلا رہی تھیں پھر میک اَپ آرٹسٹ فرزانہ ایک طرف سے نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کی چوڑی ریشمی پٹیاں تھیں جنہیں ''آئی ماسک'' بھی کہا جاتا ہے۔ فرزانہ نے جیسے ریہرسل کے طور پر ایک سیاہ پٹی لڑکی کی آنکھوں پر اچھی طرح باندھ دی اور اوپر نیچے ہو کر یہ دیکھنے لگی کہ اسے کچھ نظر تو نہیں آرہا۔

سب کچھ سمجھ میں آرہا تھا۔ ایک مخبوط الحواس شخص کے جنون سے عہدہ برآ ہونے کے لیے یہاں معلوم نہیں اور کیا کچھ ہونا تھا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر واپس اپنی جگہ آبیٹھا۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے پتا چلا کہ دونوں لڑکیوں کو جادو راے کی طرف بھیج دیا گیا تھا اور اس نے ان میں سے ایک کو اپنے پاس رکھ لیا ہے۔

میں نے ہما سے کہا۔ ''میں کب تک یہاں تمہارے پاس چھپا رہوں گا؟ کم وبیش 24 گھنٹے تو ہو ہی چکے ہیں۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی طرف سے بھی پریشانی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے حصے کا غصہ ان میں سے کسی پر اتارا جائے۔''

ہما نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں بھی یہی چاہتی

ہوں کہ اب تمہیں مزید یہاں نہ رہنا پڑے مگر اس سے پہلے کہ میں رائے جی سے بات کروں، مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے اور رائے جی کے درمیان کیا چل رہا ہے اور اس سے بھی وڈی اور خاص گل یہ کہ وہ باندری جاذبہ تمہاری دشمن کیوں بنی ہوئی ہے؟''

''میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ جاذبہ مجھے اپنی بہن کا قاتل سمجھتی ہے۔ حالانکہ میں نے اسے نہیں مارا تھا۔ وہ بس ڈر کر بھاگی اور سیڑھیوں سے گر کر اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ یہ سب لوگ جعلی دواؤں کے دھندے میں لگے ہوئے تھے۔''

''اور یہ واقعہ کب اور کہاں ہوا؟'' ہما نے پوچھا۔

میں نے اسے مختصراً بتایا کہ کس طرح ہم نے جادو رائے کی جعلی ادویات والا بڑا سیٹ اَپ پکڑا۔ کیسے وہاں پولیس کا چھاپا پڑا اور رائے مفرور ہوا۔

ساری بات سن کر اس کے چہرے پر تشویش کے سائے لہرانے لگے۔ اپنے سرخی لگے ہونٹوں کو سکیڑ کر بولی۔ ''یہ تو بڑی ڈھاڈی اور خطرناک باتیں بتا رہے ہو تم۔ اگر رائے کی زہریلی طبیعت کے حساب سے دیکھا جائے تو اب تک تم کو زندہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' چند لمحے توقف کر کے اس نے پرسوچ لہجے میں بات جاری رکھی۔ ''میرا خیال ہے کہ اگر تم چاروں اب تک بچے ہوئے ہو تو اس کی وجہ تمہارا ساتھی وہی منڈا ہے...... وہی گوراچٹا، معصوم سی شکل والا۔ کیا نام تھا اس کا؟''

''عمران۔'' میں نے کہا۔

''ہاں...... اس نے جادو رائے جی کو جو ''جادو'' دکھایا، وہ واقعی کمال کا تھا۔ بغیر آواز سنے اس نے بتادیا کہ کس نے، کس سے کیا گل کی ہے۔''

''جادو شادو نہیں۔ بس یہ ایک طریقہ یا فن ہے۔ کچھ لوگ کوشش کر کے اس میں بہت مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔''

ہما کی چمکیلی پیشانی پر سوچ کی لکیریں نظر آنے لگیں۔ ''میرا اندازہ ہے اور شاید تمہیں بھی پتا چل گیا ہوگا کہ رائے جی اور میم مائرہ اس منڈے سے کوئی خاص کام لینا چاہ رہے ہیں......''

ابھی ہما کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ وہ کچھ چونکی۔ اس کے چونکنے کی وجہ کا پتا مجھے بھی چل گیا۔ یہ چلّانے کی بہت مدھم سی آوازیں تھیں۔ یہ نسوانی آوازیں کسی قریبی کمرے یا اپارٹمنٹ سے آئی تھیں۔ کیا یہ اسی لڑکی کی آوازیں تھیں جسے آئی ماسک لگا کر ''نابینا'' بنایا گیا تھا اور رائے کے بیڈ روم میں بھیجا گیا تھا؟

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اوپر تلے تین فائر سنائی دیے۔ یہ پسٹل کے فائر تھے۔ ہما عروج کا چہرہ زرد ہو گیا۔ وہ مجھے وہیں چھوڑ کر تیزی سے بلوری دروازے کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔

اگلے چند منٹ میں نے اُلجھن اور تشویش میں گزارے۔ اس لڑکی کے ساتھ کچھ ہوا تھا یا پھر رائے کے ساتھ؟ ماحول میں ایک اَن دیکھی سراسیمگی سی محسوس ہو رہی تھی تب مجھے میک اپ آرٹسٹ فرزانہ کی پریشان صورت نظر آئی۔ وہ الماری میں کچھ رکھنے کے لیے کمرے میں آئی تھی۔

''فرزانہ! رائے جی نے کیوں مارا اُسے؟'' میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

وہ پہلے تو متذبذب رہی پھر بولی۔ ''وہ...... بہروپن تھی...... رائے صاحب اور میم مائرہ کے مخالفوں سے ملی ہوئی تھی۔ اس نے...... رائے صاحب پر...... حملہ کرنے کی کوشش کی...... لیکن خود ماری گئی۔''

''اس کے چلّانے کی آوازیں بھی آئی تھیں۔'' میں نے کہا۔

''بھھ...... بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔'' فرزانہ نے کہا اور تولیے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی جلدی سے باہر نکل گئی۔

پتا نہیں فرزانہ درست کہہ رہی تھی یا نہیں...... اور اگر درست کہہ رہی تھی تو کس حد تک؟

آدھ پون گھنٹے بعد ہما عروج بھی آن وارد ہوئی۔ اس کے چہرے پر گہرا تاسف تھا۔ اس نے بھی وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے اس کی ملازمہ فرزانہ نے بتایا تھا۔ تاہم مجھے مسلسل دال میں کچھ کالا نظر آ رہا تھا۔

وہ جاگ رہی تھی اور میں بھی مسلسل جاگ رہا تھا۔ رات بارہ بجے کے قریب نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ اس نے دکھ بھرے انداز میں مجھے وہ سب بتادیا جو میں پوچھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بولی۔ ''بہت نصیباں جلی نکلی یہ کنول...... انصیباں جلی یا پھر بیوقوف۔''

''کون کنول؟''

''وہی جو ماری گئی ہے اور جس کے بارے میں تم لگاتار ٹوہ لینے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''اس کا مطلب ہے کہ میرا اندازہ درست ہے۔

اصل واقعہ وہ نہیں جو دوسروں کو بتایا گیا ہے۔''
اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر آنکھوں میں آنے والی نمی پونچھ کر گویا ہوئی۔ ''اس نے رائے جی کو دیکھ لیا تھا۔ ڈر گئی اور رولا ڈالنا شروع کر دیا۔ اس کی آوازیں ہمیں یہاں تک پہنچی تھیں۔''
''تم نے اُسے سمجھا بجھا کر نہیں بھیجا تھا؟''
''بہت مغز ماری کی تھی اُس سے پر اب یہ بھی تو پتا نہیں کہ اس نے خود آنکھوں سے پٹی ہٹائی یا وہ خود ہٹ گئی۔ چلو جو بھی ہوا تھا وہ کھوتی، ڈنگر خود کو سنبھال لیتی۔ وہ جب ڈری اور اس نے رونا چلّانا شروع کیا تو رائے کا غصہ ساتویں آسمان تک پہنچ گیا۔''
''اور رائے نے اسے لاش بنا دیا۔'' میں نے ہما کا فقرہ مکمل کیا۔
''جو ہوا، اس کے بعد تو یہی ہونا تھا۔'' وہ افسردہ لہجے میں بولی۔
''اور اب اس بدقسمت کو بھی اس عمارت کے پچھلے احاطے میں کہیں زمین کھود کر دبا دیا جائے گا...... دوسری لاشوں کی طرح۔'' میں نے کہا۔
ہما نے ہونٹ بھینچے اور اثبات میں جواب دیا۔ ہما سے جو گفتگو ہوئی اس سے پتا چلا کہ رائے نے کنول نامی اس لڑکی کو اپنی خلوت کے لیے قبول کر لیا تھا مگر پھر خلوت اور قربت کے ان لمحوں میں کچھ ایسا ہوا کہ کنول نے اسے دیکھ لیا اور خوف کے مارے اپنے حواس میں نہ رہ سکی۔ رائے نے غضب ناک ہو کر اس پر تین فائر کیے تھے۔ ایک سیدھا آنکھ پر لگا، دوسرا بائیں آنکھ سے ذرا ہٹ کر پیشانی اور تیسرا عین دل کے مقام پر۔
ایک دلدوز احساس نے میرے رگ و پے میں دکھ اور یاسیت کا ریلا بہا دیا۔ کنول نامی یہ لڑکی بہ مشکل بیس بائیس سال کی رہی ہوگی۔ وہ انہی بدقسمت لڑکیوں میں سے تھی جو دولت اور شہرت کے سپنے آنکھوں میں سجا کر فلم اسٹوڈیوز اور پروڈکشن ہاؤسز کے چکر لگاتی رہتی ہیں۔ ان میں سے اکثر اپنے گوہرِ عفت سے محروم ہوتی ہیں اور مختلف طریقوں سے ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس سب کے باوجود وہ رہتی خالی ہاتھ ہی ہیں۔ ہما عروج خود بھی ان تمام حالات سے گزر چکی تھی۔ اب وہ اور انداز سے سوچنے لگی تھی۔ اسے پتا تھا کہ بہت کم ہی ایسی لڑکیاں اپنی منزل پاتی ہیں۔ ان میں سے اکثر چھوٹے چھوٹے رولز کے لیے بستروں پر پامال ہوتی ہیں اور عموماً ان رولز کا معاوضہ تک ہڑپ کر لیا جاتا ہے۔
ہما عروج ایسی لڑکیوں کو جادو رائے اور اس کے حواریوں تک پہنچاتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہاں وہ کم از کم اپنی ''محنت'' کا ٹھیک ٹھاک صلہ تو پاتی ہیں۔
اپنی مجبوریوں کے تحت ایسے ہی ''صلے'' کی امید لے کر یہاں پہنچنے والی کنول ان نیم تاریک راہوں میں ماری گئی تھی۔ شاید اس کے والی وارثوں کو بھی خبر ہی نہ ہونا تھی کہ وہ کہاں اور کن حالات میں زندگی کی بازی ہاری اور کس مٹی کے نیچے ابدی نیند سوئی۔
میرے اندر سے جیسے کسی نے پکار کر کہا...... ''جادو رائے! اگر تقدیر نے مجھ پر کوئی مہلک وار نہ کر دیا تو میں تجھے چھوڑوں گا نہیں......'' اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی آنکھوں میں ایک آتشیں نمی سی محسوس ہوئی۔

☆☆☆

اب میں ایک بار پھر اپنے ساتھیوں کے پاس تھا۔ مجھے عمران والی کیبن نما کوٹھڑی میں بند کیا گیا کیونکہ میری غیر موجودگی میں حسّام کو ماہین والی کوٹھڑی میں بھیج دیا گیا تھا۔ مجھے صحیح سلامت واپس دیکھ کر عمران مطمئن اور خوش ہوا تاہم میری چوٹوں پر اس نے کچھ تشویش بھی محسوس کی۔ ہما عروج نے میری واپسی والا مسئلہ بڑی خوش اسلوبی سے حل کر دیا تھا۔ کل صبح رائے کا موڈ ٹھیک دیکھ کر اس نے رائے کو بتا دیا تھا کہ ڈاکٹر جاذبہ کو دیوار سے پٹخنے کے بعد میں کہاں گیا تھا۔ ہما نے میرے بارے میں جو بیان دیا، اس کے مطابق میں جان بچا کر اس کے اپارٹمنٹ میں آگھسا اور چھپ گیا۔ پورے 48 گھنٹے میں نے ایک اسٹور روم میں چھپ کر گزارے پھر اتفاقاً میک اپ آرٹسٹ فرزانہ نے مجھے دیکھ لیا اور میں پکڑا گیا (ہما کا یہ سارا بیان اصل صورتِ حال پر پردہ ڈالنے کے لیے تھا)
ہما نے رائے کے سامنے اس بہیمانہ تشدد کا ذکر بھی کیا تھا جو ڈاکٹر جاذبہ نے اپنے چیمبر میں مجھ پر کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ جاذبہ کا بے حد ''ویک پوائنٹ'' تھا۔ وہ ایک طرح سے حکم عدولی اور من مانی کی مرتکب ہوئی تھی۔ کمر کی چوٹ کے سبب وہ ابھی اسپتال میں تھی البتہ ہما کا خیال تھا کہ جاذبہ کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی بھی ہو سکتی ہے۔
میں نے عمران سے پوچھا۔ ''تمہارے یہ تین روز کیسے گزرے؟''
''بہت مشکل۔ زبان میں کھجلی ہوتی رہی۔ کوئی بات کرنے والا نہیں تھا لہٰذا کھجلی مٹانے کے لیے زبان کو دیوار

پر گڑ تا رہا۔''

''تم کو بھی میری طرح ہنگامی طور پر اسپتال لے جایا گیا تھا۔'' کیا ہوا؟''

'' کچھ بھی نہیں۔ لگتا ہے کہ ہمارے حوالے سے ان کے اندیشے غلط ثابت ہوئے لیکن بہت سے لوگوں کا تو بہت بُرا حال ہوا۔ میں نے درجنوں ایسے بندے دیکھے تھے جن کے ناک، منہ سے خون جاری تھا۔ بہت سے مرے، کئی ابھی تک زیرِ علاج ہیں۔ زیرِ علاج لوگوں میں ایک دو ڈاکٹر بھی شامل ہیں۔''

''عمران! اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، ہمارے اندیشوں سے زیادہ سنگین ہے۔''

'' چاچو جان! وہ تو آپ کے حلیہ شریف سے بھی ظاہر ہے۔ پتا چل رہا ہے کہ آپ کو ٹھیک ٹھاک چوٹیں لگائی گئی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ خود کو چھڑا کر کہیں غائب ہو گئے تھے۔ یہ لوگ آپ کو اندھا دھند تلاش کرتے رہے ہیں۔''

میں نے مختصر الفاظ میں وہ سب کچھ عمران کے گوش گزار کر دیا جو ڈاکٹر جاذبہ اور پھر ہما عروج کے حوالے سے پیش آیا تھا۔ ہما عروج کے لگژری اپارٹمنٹ اور وہاں موجود لڑکیوں کے بارے میں بھی میں نے بتایا تاہم جادو رامے کے بیڈروم میں مرنے والی لڑکی کنول کا ذکر میں نے نہیں کیا۔ اس واقعے کو دہرانے سے مجھے اذیت کا سامنا ہوتا۔

عمران نے سب کچھ تعجب سے سنا پھر گہری سانس لے کر بولا۔'' ویسے چاچو! آپ نے یہاں سے جا کر مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''دیکھیں نا، آپ ماہین والے کیبن سے نکل کر چلے گئے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا......؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اکیلے میں ان ایزی محسوس کرنے لگی۔ اس کی کیفیت کو دیکھ کر میم مائرہ کے حکم پر حشام کو اس کے کیبن میں بھیج دیا گیا۔ اب وہ دونوں دو دن سے وہاں اکٹھے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں جل جل کر اور سڑ سڑ کر یہیں پر مر جاؤں۔ میرے انڈیا جا کر ''دیوداس'' بننے کی نوبت ہی نہ آئے۔''

''میرا اس میں کیا قصور؟ اگر وہ جاذبہ والا واقعہ نہ ہوتا تو میں بھی تمہاری طرح اگلے روز ہی اسپتال سے فارغ ہو کر یہاں واپس آجاتا۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ آپ جان بوجھ کر جاذبہ کے ہتھے چڑھے ہیں۔ آپ نے ضرور آنکھ شانکھ مار کر اسے اشتعال دلایا ہوگا۔ شاید یہ بھی کہہ دیا ہو کہ...... ہاں میں نے ہی تمہاری بہن کو جہنم واصل کیا تھا۔ آپ کا اصل مقصد صرف یہی تھا کہ ماہین اور حشام کو ایک ہی جگہ رہنے اور میرے سینے پر مونگ دلنے کا موقع مل جائے۔ حشام امیر کبیر باپ کا بیٹا ہے۔ مجھے تو...... مجھے تو یہ شک بھی ہے کہ اس نے آپ کو کوئی تگڑی رشوت وغیرہ دے دی ہے۔''

اس کی لایعنی گفتگو مزید آگے بڑھتی مگر کیبن نما کوٹھڑی کے دروازے پر ہونے والی آہٹ نے ہمیں چونکا دیا۔ جس چوکور خلا سے ہمیں کھانا پہنچایا جاتا تھا، وہاں انچارج بہروز کا لمبوترا چہرہ نمودار ہوا۔ اس نے عمران کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میم مائرہ کی طرف سے تمہارے لیے پیغام ہے۔''

''نہیں، مجھے ابھی کسی سے شادی نہیں کرنی۔'' وہ آنکھیں پونچھ کر بولا۔'' جدھر بھی جاؤ، شادی کا پیغام...... شادی کا پیغام۔''

بہروز نے برا سا منہ بنایا۔'' پتا نہیں کیا اوٹ پٹانگ بولتے ہو۔ میم مائرہ نے کہا ہے کہ ویڈیو آگئی ہے۔ ابھی آدھ گھنٹے بعد تمہیں بلایا جائے گا۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے کھٹاک سے خلا بند کیا اور اوجھل ہو گیا۔

''یہ کیا چکر ہے؟ کس ویڈیو کی بات ہو رہی تھی؟''

''یہ وہی چکر ہے جی جس کی وجہ سے اب تک آپ کی اور میری جان بچی ہوئی ہے...... اور ساتھ ساتھ ماہین اور حشام کی بھی۔'' وہ اب سنجیدہ تھا۔

''کیا مطلب؟''

''لپ ریڈنگ...... جس کو شروع شروع میں آپ محض بکواسیات قرار دیتے تھے۔'' وہ چند لمحے خاموش رہ کر بولا۔'' یہ کوئی بہت خاص سی سی ٹی وی ٹائپ کی ویڈیو ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں آواز نہیں، کوئی فرد یا ایک سے زیادہ افراد بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ اس ویڈیو میں کیا بولا گیا ہے۔ لپ ریڈنگ کے جو اور بہت سے استعمال ہیں، ان میں ایک استعمال یہ بھی ہے کہ خفیہ ایجنسیاں اور قانون نافذ کرنے والے ادارے خاموش ویڈیوز کی تہ تک پہنچنے کے لیے لپ ریڈرز کو استعمال کرتے ہیں۔''

میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ عمران کی یہ بات درست لگتی تھی کہ وہ کوئی بہت خاص ویڈیو ہوگی مگر اس کے ساتھ ہی ایک اندیشہ بھی ذہن میں آنے لگا ہے کہ کہیں ایسا

نہ ہو کہ اپنا مطلب نکل جانے کے بعد وہ خونی جانور راہے ہماری موت کا پروانہ جاری کر دے۔ بہر حال، اس قسم کے رسک تو اب لینے ہی تھے۔

ابھی ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ عمران کو لینے والے پہنچ گئے۔ آدھا گھنٹا بھی پورا نہیں ہوا تھا۔ شاید ان لوگوں کو اس اہم ویڈیو کی حقیقت جاننے کی بہت جلدی تھی۔ حسبِ معمول عمران کے ہاتھ زپ ٹائی سے پشت پر باندھ دیے گئے۔ جب ہاتھ باندھے جا رہے تھے تو عمران نے فرمائش کر دی کہ میرے چاچو بھی ساتھ جائیں گے۔

''وہ کس لیے؟'' انچارج بہروز نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

''کسی وقت مجھے ان سے مشورہ کرنا پڑتا ہے۔'' اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

جب وہ اپنی بات پر مُصر رہا تو بہروز نے سیل فون پر میم مائرہ سے رابطہ کیا اور اجازت لی۔ عمران کے بعد میرے ہاتھ بھی پشت پر باندھ دیے گئے۔ اس کام کے لیے دروازے میں موجود چوکور خلا کو استعمال کیا جاتا تھا۔ گارڈز مجھے خاص معاندانہ نظروں سے گھورتے تھے۔ اس کی اہم وجہ ان کی ساتھی گارڈ افروزہ کی موت تھی جو میرے ہاتھوں ہوئی۔ مسلح گارڈز کی نگرانی میں ہم دو تین راہداریوں سے گزر کر ایک مستطیل کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ ایک کانفرنس ہال لگتا تھا۔ کریہہ المنظر جادورامے اور میم مائرہ بھی یہاں موجود تھے۔ سامنے ایک بڑی ایل ای ڈی پر کوئی ڈاکومینٹری فلم چل رہی تھی جس میں سفید رنگ کے مختلف سانپ نظر آتے تھے۔ محسوس ہوتا تھا کہ یہاں سانپوں کے ساتھ بھی کچھ ہوتا ہے کیونکہ چند روز پہلے جب میں نے گودام میں ''زرد چھنی'' کو پھر سے ریت میں گُمس ہوتے دیکھا تھا تو وہاں باریک جال والے کچھ خالی پنجرے بھی دیکھے تھے۔ ایسے پنجرے عموماً سانپوں کو رکھنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

ہمارے پہنچتے ہی وہ ڈاکومینٹری بند کر دی گئی۔ اس کانفرنس ہال میں گہری سنجیدگی کا ماحول تھا۔ انچارج گارڈ بہروز اور گونگے فورمین جہانے کے سوا سب کو باہر نکال دیا گیا۔ عمران کو اسکرین کے سامنے ایک علیحدہ کرسی پر بٹھایا گیا۔ میں بھی ساتھ بیٹھ گیا۔ میم نے بہروز کو مخاطب کر کے عمران کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔ ''اس کے ہاتھ کھول دو۔ یہ کچھ نہیں کرے گا۔''

غالباً مائرہ کا مطلب یہی تھا کہ میری طرف سے زیادہ خطرہ ہے (اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ ماہین اور حشام ان لوگوں کے قبضے میں تھے۔ انہیں پتا تھا کہ کوئی بھی مہم جوئی کرنے سے پہلے ہم ان کی زندگیوں کا ضرور سوچیں گے)۔ عمران کے ہاتھ کھول دیے گئے۔ میم کے اشارے پر ایک ڈی وی ڈی آن کی گئی۔ لائٹس آف کر دی گئیں۔ اسکرین پر وہ ویڈیو نمودار ہوئی جس کا انتظار تھا۔

یہ کسی محل نما ہوٹل یا پھر گھر کا منظر تھا۔ انتہائی بیش قیمت سامان اور فرنیچر سے بے تحاشا امارت کا اظہار ہوتا تھا۔ نہایت نفیس تھری پیس سوٹ میں درمیانی عمر کا ایک نفیس اور اسمارٹ شخص کرسی پر براجمان تھا۔ اس کے سامنے کافی فربہ جسم کی ایک گول چہرے والی عورت بیٹھی تھی۔ وہ شکل سے جاپانی یا کسی اردگرد کے ملک کی لگتی تھی۔ اس نے نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اپنے حلیے سے وہ بھی نہایت امیر، تعلیم یافتہ اور مہذب دکھائی دیتی تھی۔ دونوں کے درمیان ایک چھوٹی سی میز تھی اور وہ گفتگو میں مصروف دکھائی دیتے تھے۔

پہلی نظر میں ہی ہمیں پتا چل گیا کہ یہ خاموش ویڈیو کسی خفیہ کیمرے سے بنائی گئی ہے۔ اس ویڈیو میں کسی طرح کی آواز ریکارڈ نہ ہو پائی تھی۔ کیمرے کا اینگل ایسا تھا کہ تھری پیس سوٹ والا شخص جب گردن اپنی مخاطب کی طرف ذرا موڑ کر بولتا تھا تو اس کے ہونٹ اور چہرے کے تاثرات وغیرہ وضاحت سے نظر نہ آتے تھے۔

''یہ صاحب امریکن ہیں؟'' عمران نے سوٹڈ بوٹڈ شخص کی طرف اشارہ کر کے میم مائرہ سے پوچھا۔

''تم نے ٹھیک اندازہ لگایا۔'' وہ بولی۔

''غالباً یہ دونوں انگلش ہی میں بول رہے ہیں؟'' عمران نے دوسرا سوال کیا۔

مائرہ نے اس سوال کا جواب بھی اثبات میں دیا۔ وہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی جیسے جلد سے جلد اس گفتگو کے بارے میں عمران کی زبانی کچھ سننا چاہتی ہو۔

جادورامے بھی بے حد متجسس نظر آتا تھا۔

عمران نے اپنی ساری توجہ ویڈیو پر اور دونوں کرداروں پر مرکوز کر دی۔ یہ کوئی سات آٹھ منٹ کی ویڈیو تھی۔ عمران نے ایک دفعہ اسے شروع سے آخر تک دیکھا پھر ویڈیو کے کچھ حصوں کو دو تین بار ''ری پلے'' کروایا اور ان پر خصوصی توجہ دی۔

مجھے عمران کے چہرے پر اُلجھن کے آثار نظر آ رہے تھے اور صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ ویڈیو کے رزلٹ سے

زیادہ مطمئن نہیں ہے۔ دوسری طرف میم اور راے کی بے قراری مسلسل بڑھتی جارہی تھی۔ وہ بار بار اس امید پر عمران کا چہرہ دیکھنے لگتے تھے کہ اب وہ کچھ بولے گا۔

بالآخر کئی منٹ بعد عمران نے اپنی چپ کا تسلسل توڑا۔ وہ میم مائرہ اور راے کی طرف دیکھ کر سوالیہ انداز میں بولا۔ ”یہ تو جاپانی خاتون ہیں۔ ان کا نام یوزوکی ہے اور ان صاحب کا نام غالباً ڈیرن ہے...... ڈیرن فورڈ؟“

میم مائرہ کے چہرے پر چمک نظر آئی۔ ستائشی لہجے میں بولی۔ ”بالکل ٹھیک کہا تم نے...... ویل ڈن!“

عمران متانت سے بولا۔ ”آپ کے ”ویل ڈن“ کا بہت شکریہ...... مگر مجھے لگتا ہے کہ میں آپ کو زیادہ مطمئن نہیں کرسکوں گا۔“

مائرہ کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ عمران نے ڈی وی ڈی کا کنٹرول سنبھال کر ویڈیو کے تین چار پورشن مائرہ اور راے کو دکھائے۔ ”آپ نے دیکھا ان میں کہیں بھی مسٹر ڈیرن کا چہرہ پوری طرح کیمرے کی طرف نہیں ہے اور آپ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ زیادہ تر گفتگو مسٹر ڈیرن نے ہی کی ہے۔“

بات مائرہ کی سمجھ میں آرہی تھی اور شاید کسی حد تک راے کی سمجھ میں بھی۔

عمران نے ویڈیو کے حوالے سے میرے ساتھ ایک دو بھی سرگوشیاں کیں اور ایک بار پھر پوری طرح ویڈیو کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ صرف بولنے والے کے ہونٹ ہی نہیں دیکھ رہا، اس کے تاثرات اور اس کے ہاتھوں کی بے ساختہ حرکات کو بھی پوری طرح نوٹ کررہا ہے۔ دونوں کرداروں کے چہروں سے عیاں تھا کہ وہ کسی خاص الخاص معاملے پر کلیدی قسم کی گفتگو کررہے ہیں۔ عینک والی جاپانی خاتون یوزوکی کے چہرے پر کسی وقت ایک پراسرار مسکراہٹ بھی دکھائی دیتی تھی۔ گفتگو کے آخر میں وہ ایک دو بار اپنی نہایت بیش قیمت رسٹ واچ پر بھی نظر ڈالتی تھی اور غالباً محدود ٹائم کے حوالے سے کوئی فقرہ بھی بولتی تھی پھر وہ دونوں اٹھ کر کیمرے کے فریم سے نکل جاتے تھے۔

”کچھ بتاؤ...... کیا پتا چلا تمہیں؟“ بالآخر جادو راے بے صبری سے بول اٹھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اب ڈانٹ ڈپٹ پر اتر آئے گا۔

اس موقع پر مائرہ نے مداخلت کی اور جلدی سے بولی۔ ”جتنا بھی تم سمجھ سکے ہو، اتنا تو بتاؤ۔“

عمران نے اثبات میں سر ہلا کر ویڈیو کے آخری حصے کا ایک پورشن ری پلے کیا اور بولا۔ ”میں آپ کو کوئی ایسی ناقص معلومات دینا نہیں چاہتا جو آپ کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچائے۔ سچی بات یہی ہے کہ میں اس ایک ڈیڑھ منٹ کے پورشن کے سوا کچھ بھی سمجھ نہیں پایا۔ آپ بھی کیمرے کا زاویہ دیکھ ہی رہے ہیں۔“

میم مائرہ نے عمران کی بات پر مثبت ردِعمل ظاہر کیا۔

عمران نے کہا۔ ”ویڈیو میں دو تین بار کسی بزرگ جاپانی اسکالر ڈاکٹر شا کا ذکر ہوا ہے اور اُن کے لکھے ہوئے پیپرز کا ذکر ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ جانتے ہوں ان ڈاکٹر شا کو اور ان کے پیپرز کو......“

میم مائرہ اور راے دونوں کے چہروں پر مثبت تاثرات نظر آئے۔ عمران کی بتائی ہوئی بات بہ خوبی ان کی سمجھ میں آئی تھی۔

میم مائرہ نے جوشیلے انداز میں عمران کو کُریدنا شروع کردیا کہ ڈاکٹر شا نامی کردار کے حوالے سے اور کیا بات سمجھ میں آئی ہے۔

عمران نے پھر کہا۔ ”ویری سوری میم! میں آپ کو اَنکل پچو قسم کی معلومات دینا نہیں چاہتا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں صرف اتنا ہی جان سکا ہوں...... ہاں تین چار فقرے اور ایسے ہیں جو اچھی طرح سمجھ میں آئے ہیں اور ممکن ہے کہ وہ کسی طرح آپ کے مددگار ہوسکیں۔“

عمران نے ویڈیو کا آخری پورشن دوبارہ پلے کیا اور بولا۔ ”یہ دیکھیں جی۔ یہاں مسٹر ڈیرن اور محترمہ یوزوکی کی لپ ریڈنگ آسانی سے ہورہی ہے۔ مسٹر ڈیرن نے کہا ہے۔ ”اس مختصر وقت میں تو یہ مسئلہ حل نہیں ہوپائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اگلی میٹنگ اسلام آباد میں رکھ لیں۔“

عمران نے ویڈیو کو سلو موشن پر کیا اور کہا۔ ”یہ دیکھیں جی۔ اسلام آباد کا لفظ بھی بالکل صاف سمجھ میں آرہا ہے اور یہ آگے کا فقرہ دیکھیں۔ مسٹر ڈیرن کہہ رہے ہیں بلکہ پوچھ رہے، ہیں! پانچ فروری کی شام ٹھیک رہے گی؟ جواب میں میڈم یوزوکی نے رسٹ واچ دیکھی ہے اور کہا ہے...... بالکل ٹھیک۔“

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ میم مائرہ اور گینڈے نما جادو راے کے چہروں پر پھر دبا دبا جوش نظر آنے لگا تھا۔

عمران اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ”یہاں ایک چھوٹا سا کنفیوژن ضرور ہے...... پانچ اور بارہ کہتے ہوئے بولنے والا ہونٹوں کو تقریباً ایک ہی طرح حرکت دیتا

ہے۔ یہ پانچ فروری بھی ہوسکتا ہے اور بارہ فروری بھی۔"

میم مائرہ کا دبا دبا جوش برقرار رہا، بولی۔ "یہ کوئی کنفیوژن نہیں...... ہم اس بات کو بہت حد تک سمجھ گئے ہیں...... کیوں رائے؟"

رائے نے اپنے پان رنگے ہونٹوں کو رومال سے پونچھا۔ "ٹھیک کہتی ہو۔" اس نے گونج دار آواز میں جواب دیا۔

میم مائرہ نے ایک بار پھر عمران کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے کافی مدد کی ہے۔"

"شکریہ...... لیکن اس میں میرے چاچو جی کا بھی کافی کردار ہے۔" عمران نے میرے نمبر بنانے کی کوشش کی۔

"میری تعریف تم دونوں کے لیے ہے۔" میم مائرہ نے کہا پھر انچارج بہروز کو کوئی اشارہ کیا اور رائے کے ساتھ کھسر پھسر میں مصروف ہوگئی۔

انچارج بہروز نے ہمیں بتایا کہ اب ہمیں واپس اپنے کوٹھری نما کیبن میں جانا ہوگا۔ مسلح گارڈز کی نگرانی میں ہم کانفرنس ہال سے باہر نکل آئے۔

☆☆☆

ہمیں کوٹھری نما کیبنوں میں ہی لے جایا گیا تھا مگر صرف ایک گھنٹے بعد ہمیں عمارت کے اندر ہی ایک نہایت بہتر جگہ پر منتقل کر دیا گیا۔ نہ صرف منتقل کر دیا گیا بلکہ مجھے بھی بندھے ہاتھوں کی مصیبت سے آزادی مل گئی۔ یہ گراؤنڈ فلور پر ایک پُرآسائش اپارٹمنٹ تھا۔ تین چار کمرے تھے۔ ضروریات کی تمام اشیاء موجود تھیں۔ ماہین اور حشام بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اس ساری مہربانی کی وجہ یہی سمجھ میں آتی تھی کہ عمران نے لپ ریڈنگ کے حوالے سے اچھی کارکردگی دکھائی تھی اور ان لوگوں کے لیے ایک نہایت اہم خاموش ویڈیو کو اپنے ہنر سے کسی حد تک زبان دی تھی۔ ایک اور اندازہ بھی ہو رہا تھا اور وہ یہ کہ غالباً آئندہ بھی یہ لوگ عمران سے کوئی خاص کام لینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

حشام بہت بجھا بجھا تھا۔ لگتا یہی تھا کہ اس قسم کے سنگین حالات سے اس کا واسطہ پہلی بار پڑا ہے۔ وہ ناز و نعم میں پلا ہوا اس قسم کی سختیوں کا عادی کہاں تھا۔ ثابت یہی ہو رہا تھا کہ ماہین سے صلح ہونے کے بعد ماہین کے دل میں اپنی جگہ برقرار رکھنے کے لیے اس نے اپنی ہمت طاقت سے بڑھ کر قدم اٹھایا تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اوکھلی میں سر دیا تھا اور نتیجے میں یہاں آپھنسا تھا۔ یہاں جو مار پیٹ اس سے ہوئی تھی، اس کے اثرات ابھی تک اس پر موجود تھے۔

ماہین یوں تو مضبوط لڑکی تھی مگر ان حالات میں وہ بھی کچھ ماند نظر آتی تھی اور اس کی ایک وجہ حشام بھی تھا۔

میں نے کہا۔ "عمران! محسوس ہو رہا ہے کہ تمہاری وجہ سے ان لوگوں کا رویہ ہم سے نرم پڑ رہا ہے۔ تمہیں میم مائرہ سے درخواست کرنی چاہیے کہ کم از کم ماہین اور حشام کو یہاں سے آزاد کر دیا جائے۔ یقینی بات ہے کہ ان دونوں کے گھروں میں حالات بہت خراب ہو چکے ہوں گے۔"

"میں بھی یہی سمجھتا ہوں جی کہ یہاں ہم چاروں کا اکٹھے رہنا کسی کی صحت کے لیے بھی اچھا نہیں ہے۔" وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ میری یہاں موجودگی حشام کو پریشان کرتی ہے۔ اس کی موجودگی میں ماہین سے بات کرتے ہوئے بھی مجھے جھجک محسوس ہوتی ہے اور یہی کیفیت شاید ماہین کی بھی ہے۔ دیکھ لیں وہ بے چاری اب بھی میری طرف سے رخ پھیر کر بیٹھی ہوئی ہے۔"

"ہاں، یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں اسی لیے کہہ رہا ہوں نا کہ میم سے بات کرو۔ ہوسکتا ہے کوئی راستہ نکل آئے۔"

"کبھی نہیں نکلے گا...... اور یہ بات آپ کو بھی پتا ہے۔ ماہین اور حشام اس عمارت کے قرب و جوار سے پکڑے گئے تھے۔ آزاد ہونے کے بعد وہ عمارت کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی نہ بھی کر سکے تو ایریا تو پوائنٹ آؤٹ کر ہی سکتے ہیں پھر بھی آپ کہتے ہیں تو بات کر کے دیکھتے ہیں۔"

ہمیں اس اپارٹمنٹ میں ایک ملازم اور ایک لیڈی شیف بھی مہیا کی گئی تھی۔ عمران نے ملازم کو پیغام دے کر میم کی طرف بھیجا کہ وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ چند منٹ بعد انٹرکام پر میم مائرہ سے اس کی بات ہوگئی۔ دس پندرہ منٹ کی اس گفتگو کا نتیجہ وہی نکلا جس کا ہمیں اندیشہ تھا۔ میم مائرہ کی طرف سے فی الحال ماہین اور حشام کو کسی بھی طرح کی رعایت دینے سے صاف انکار کر دیا گیا۔ ہاں اتنا ضرور کہا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو ان کے اہلِ خانہ کو ان کی خیر خیریت کے پیغامات بھجوائے جا سکتے ہیں بلکہ اگر وہ چاہیں تو اپنا ویڈیو پیغام ریکارڈ کروا سکتے ہیں۔ یہی پیشکش میرے اور عمران کے لیے بھی تھی۔ دیکھا جاتا تو ان لوگوں کی دیدہ دلیری حیران کن تھی۔ فقط چھ دن پہلے یہاں دو درجن کے قریب افراد پُراسرار طریقے سے ہلاک کر دیے گئے تھے۔ ابھی مزید نہ جانے کیا ہونا تھا مگر یہاں موجود لوگوں

کی خیر خیریت کے پیغامات باہر بھی بھجوائے جا رہے تھے۔
رات کو مجھے گلے میں خراش تھی۔ ساتھ میں کھانسی بھی ہو رہی تھی۔ شاید یہ ان ہی ادویات کے اثرات تھے جو ہمیں انجیکٹ کی گئی تھیں۔ ماہین بہت خیال رکھنے والی لڑکی تھی۔ مجھے مسلسل کھانستے دیکھ کر بولی۔ ''میں آپ کے لیے اسپیشل جوشاندہ بناتی ہوں، شہد والا۔ آپ بہتر محسوس کریں گے۔''
میں نے کہا ملازمہ سے کہہ دو مگر وہ خود ہی بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ عمران بھی گلے میں خراش محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''اچھا دو کپ بنالینا۔''
وہ چند منٹ بعد بڑا خوشبودار جوشاندہ بنا کر ہم دونوں کے لیے لے آئی۔ وہ میرے گھٹنے کی چوٹ کے بارے میں بھی فکر مند تھی۔ میں اس وقت عمران کے کمرے میں ہی بیٹھا ہوا تھا۔
اس واقعے کے قریباً ایک گھنٹے بعد مجھے ماہین والے کمرے کی طرف سے جھگڑے کی دبی دبی آوازیں آئیں۔ اندازہ ہوا کہ حشام، ماہین کے ساتھ تلخ کلامی کر رہا ہے۔ جب سے ہم اس اپارٹمنٹ میں پہنچے تھے، وہ بہت چڑچڑا دکھائی دے رہا تھا۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر ماہین کے کمرے کی طرف گیا۔ کھڑکی کا پردہ اندر سے کچھ سرکا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ماہین خاموش کھڑی تھی اور حشام اس پر بگڑ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ورم زدہ اور سوئی سوئی سی نظر آرہی تھیں۔ لگتا تھا کہ اس نے اپنا ڈپریشن کم کرنے کے لیے کوئی ٹرینکولائزر وغیرہ لیا ہوا ہے۔ وہ دانت پیس کر بولا۔ ''کیا ضرورت تھی تمہیں۔ میں پوچھتا ہوں آخر ضرورت کیا تھی تمہیں؟''
ماہین دبی دبی آواز میں بولی۔ ''حشام! تمہیں بتایا ہے انکل کا گلا خراب......''
''جھوٹ مت بولو۔'' وہ پھنکارا۔ ''انکل کا صرف بہانہ ہے۔ تم نے اُس کے لیے کیا سب کچھ۔ میں اندھا نہیں ہوں۔ دیکھتا ہوں سب کچھ...... محسوس کرتا ہوں۔''
''فار گاڈ سیک حشام......! یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟'' وہ جھنجلائی۔
''یہ باتیں چبھ رہی ہیں تمہیں۔ اس لیے کہ سچ ہیں۔ کیا ملازمہ مرگئی تھی جو تم نے اپنے ہاتھ سے جوشاندہ بنایا اور اس کے کمرے میں لے کر گئیں......''
''خدا کے لیے آہستہ بولو حشام! آج کیا ہوگیا ہے تمہیں؟''
''نہیں بولوں گا میں آہستہ...... نہیں بولوں گا...... اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔'' وہ زور سے چنگھاڑا اور اس کے ساتھ ہی سامنے رکھی ہوئی تپائی کو زور سے ٹھوکر ماری۔ شیشے کی چھوٹی سی تپائی دیوار سے ٹکرا کر چکنا چور ہوگئی۔ وہ جیسے اپنے حواس کھو رہا تھا۔ ماہین کا رنگ زرد نظر آنے لگا۔
عمران کا کمرا اس کمرے کے سامنے ہی تھا۔ وہ شور سن کر جلدی سے ماہین اور حشام کے پاس پہنچ گیا۔ ''کیا ہوا حشام؟'' اس نے اندر آکر پوچھا۔
حشام نشے کے زیر اثر تھا۔ نتائج سے بے پروا ہو کر دہاڑا۔ ''یہ تم پوچھ رہے ہو کہ کیا ہوا؟ تمہیں معلوم نہیں تو کس کو معلوم ہوگا؟ یہ تم ہو جس نے یہاں آکر میری زندگی جہنم بنائی ہے...... صرف تم ہو۔'' اس کی آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ ''مجھ سے اور برداشت نہیں ہوتا۔ میں مار دوں گا تمہیں...... باسٹرڈ...... باسٹرڈ!''
وہ دیوانہ وار عمران پر جھپٹا اور اس کا گریبان پکڑ لیا۔ وہ دوسرے ہاتھ کا مُکا عمران کے منہ پر رسید کرنا چاہتا تھا مگر ماہین نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ ''حشام! ہوش کرو۔'' وہ چلائی۔
''تم پیچھے ہٹ جاؤ۔'' حشام پھر گرجا اور جنونی انداز میں ماہین کو دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اس تپائی پر گری جو چند لمحے پہلے چکنا چور ہوئی تھی۔ اس کا سر اور ایک بازو بُری طرح تپائی سے ٹکرائے۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ کراہ نکل گئی۔ اس کا ہاتھ واضح طور پر زخمی ہوا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر عمران دفاعی انداز برقرار نہیں رکھ سکا۔ اس نے حشام کا ہاتھ شدت سے جھٹک کر اپنا گریبان چھڑایا اور ماہین کی طرف لپکا۔
میں بھی جلدی سے کمرے میں داخل ہوگیا اور بپھرے ہوئے حشام کو سنبھال لیا۔ ٹوٹا ہوا شیشہ لگنے سے ماہین کی ہتھیلی بُری طرح کٹ گئی تھی اور خون تیزی سے نکلنا شروع ہوگیا تھا۔ عمران نے اس کی زخمی ہاتھ والی کلائی تھامنا چاہی تو وہ جلدی سے ایک طرف سمٹ گئی۔
''رہنے دو...... کچھ نہ کرو تم...... جاؤ یہاں سے...... پلیز جاؤ۔'' وہ طیش آمیز لہجے میں بولی۔
عمران ٹھٹک کر رہ گیا۔ میں نے بھی عمران کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ حشام کی آتشیں نظروں کو نظر انداز کرتا ہوا باہر نکل گیا۔
حشام نے پھر کوئی تند و تیز جملہ کہنا چاہا مگر میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ملازمہ کی حیران پریشان صورت دروازے پر نظر آئی۔ میں نے اسے دروازہ بند کرنے کا

کہا۔ شاید دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے حشام کچھ اور بھی تند و تیز بولتا مگر ماہین کے زخمی ہاتھ کو دیکھ کر ہمیں اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ یہ قریباً تین انچ لمبا گہرا کٹ تھا۔ حشام نے اپنا رومال زخم پر رکھ کر اسے دبایا اور بلیڈنگ روکنے کی کوشش کی۔ ماہین کا پورا جسم لرز رہا تھا۔

''میں فرسٹ ایڈ باکس لے کر آتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''آپ زحمت نہ کریں۔'' حشام ذرا روکھے پن سے بولا۔ ''یہاں باکس ہے۔ میں بینڈیج کرلوں گا۔''

میں نے زیادہ اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ماہین کو تسلی تشفی دے کر اور اس کے سر کی چوٹ دیکھنے کے بعد کمرے سے نکل آیا۔

یوں لگتا تھا کہ ماہین کے حوالے سے حشام کی برداشت بہت جلد جواب دے جاتی ہے۔ خاص طور سے عمران کا اس کے آس پاس ہونا اسے بالکل ہی برداشت نہیں ہوتا اور اتفاق یہ تھا کہ اس قسم کے مواقع مسلسل پیدا ہو رہے تھے۔

مجھے حشام کا یہ رویہ ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ وہ شادی سے پہلے ہی ایک سخت گیر شوہر والا رویہ اپناتا جا رہا تھا۔ میرے خیال میں ماہین اور اس کے اہلِ خانہ کو حشام کی اس سیماب صفتی کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔

اگلے دو روز تک ماہین کی صورت نظر نہیں آئی۔ حشام خود ہی اس کے ہاتھ کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ حشام کے رویے نے عمران کو دکھ پہنچایا تھا۔ وہ دس بارہ گھنٹے تو گم صم رہا اور ایک بار پھر اپنی خاص طبع کے باعث ہنسنا بولنا شروع ہوگیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ شاید غصہ اترنے کے بعد حشام، عمران سے معافی مانگے گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا...... ہاں دوسرے روز شام کو جب میں ماہین کی خیریت دریافت کرنے اس کے کمرے میں گیا تو وہ آزردہ لہجے میں بولی۔ ''انکل تابی! پلیز میری طرف سے عمران سے سوری بول دیجیے گا۔ میں بہت شرمندہ ہوں اُس روز کے واقعے سے۔ حشام کے علاوہ خود میں بھی اُس سے کچھ سخت بول گئی۔''

''افسوس اس بات کا ہے کہ ایک معمولی سی بات کو اتنا بڑھا دیا گیا۔'' میں نے تاسف سے کہا۔ ''یہ بھی نہیں سوچا گیا کہ ہم کتنے سنگین حالات سے گزر رہے ہیں اور ہماری آپس کی کوآرڈینیشن کتنی ضروری ہے۔''

ملازمہ راشدہ کے قدموں کی چاپ پر میں خاموش ہوگیا۔ اس نے آکر اطلاع دی کہ میڈم ہما مجھ سے ملنے آئی ہیں۔

مجھے قدرے حیرانی ہوئی۔ جس اپارٹمنٹ میں ہم رہ رہے تھے، یہ کڑی نگرانی میں تھا۔ یہاں صرف ایک دروازہ تھا جہاں کڑا پہرا رہتا تھا۔ ہمیں یہاں سے قدم باہر نکالنے کی اجازت نہیں تھی البتہ میم مائرہ کی اجازت سے باہر کے اِکا دُکا لوگ یہاں آجاتے تھے۔ کل ایک اٹالین لپ ریڈر بھی آیا تھا۔ اس ایڈگر نامی لپ ریڈر کا شمار معروف ریڈرز میں ہوتا تھا۔ یہ شخص پیدائشی گونگا بہرا تھا اور گونگے بہرے لوگوں کی تربیت کے لیے ایک بڑا ادارہ بھی چلاتا تھا۔ اس نے اشاراتی زبان میں عمران سے طویل گفتگو کی تھی اور پھر بڑی فراخدلی سے عمران کی بہترین صلاحیت کا اعتراف بھی کیا تھا۔

ہاں تو میں بات کر رہا تھا ہما عروج کی آمد کی۔ وہ مجھ میں خاصی دلچسپی لے رہی تھی۔ بہرحال یہ کوئی رومانی نوعیت کی دلچسپی نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ وہ ایسے معاملات سے بہت اکتا چکی ہے۔ اس کی دلچسپی کا محور میری غیر معمولی جسمانی فٹنس تھی اور میرے ماضی کے وہ واقعات تھے جو مارشل آرٹ کے حوالے سے اس نے سن رکھے تھے۔ اسے کسی طرح میرے رہنما و استاد ''مہان'' فائٹر باروندا جیکی کے بارے میں بھی معلوم ہو چکا تھا اور وہ اس کے بارے میں مزید جاننا چاہتی تھی۔

ہما کے ساتھ ایک ڈیڑھ گھنٹا اچھے ماحول میں بات چیت ہوئی۔ چند ہی ملاقاتوں میں ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہم ایک دوسرے کو بہت عرصے سے جانتے ہیں۔ وہ کئی رازداری کی باتیں بھی مجھ سے کر جاتی تھی۔ اس حوالے سے وہ کافی بے خوف بھی تھی۔

میرے ذہن میں یہ سوال کافی دنوں سے اٹکا ہوا تھا کہ وہ موٹی چینی جیسی زرد ریت کا کیا معاملہ ہے؟ میں نے ہما سے اس ریت کا ذکر کیا اور کہا۔ ''پہلے اسے بڑی احتیاط کے ساتھ عام ریت میں سے نکالا جاتا ہے اور جاروں میں بند کیا جاتا ہے اور پھر سے ریت میں ملا دیا جاتا ہے۔''

ہما نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے یہ سب کچھ کہاں دیکھا؟

میں نے اُس رات کا واقعہ بتا دیا جب گارڈ افروزہ کو عدم آباد روانہ کرنے کے بعد میں گودام کے قریب سے گزرا تھا اور وہاں یہ منظر دیکھا تھا۔

وہ بولی۔ ''تم تیز ناک رکھتے ہو۔ بہت سونگھا سانگی

کر لیتے ہو۔ یہ بھید خاص خاص لوگوں کو ہی معلوم ہے۔ بس سمجھو کہ ان بیچارے مزدوروں کو کام پر لگائے رکھنے کا ڈھکوسلا ہے۔''

''یعنی وہ موٹی چینی جیسی ریت کچھ بھی نہیں؟''

''پہلے تھی...... پر اب کچھ بھی نہیں۔'' اس نے کہا پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''اصل میں گل یہ ہے کہ جو دوا یہاں بنائی جا رہی ہے، اس کے اندر شروع میں یہ پہلی شے ورتی (استعمال کی) لگتی تھی۔ اس ٹائم واقعی اس شے کی لوڑ ہوگی پر پھر یہ تجربہ ڈھیں پٹاس ہو گیا (ڈھیں پٹاس اس کا تکیہ کلام تھا) اب اس ریت چھاننے والے کام کی کوئی ضرورت نہیں۔ صرف مزدوروں کا ٹائم پاس کرایا جا رہا ہے۔ ان مزدوروں سے جو اصلی کام لیا جا رہا ہے، اس کا پتا تو تمہیں بھی چل گیا ہے۔''

''یعنی...... انجکشنز کے ذریعے دوا کا تجربہ ہو رہا ہے؟'' میں نے ہما ہی کی طرح دھیمی آواز میں کہا۔

اس نے رازداری کے انداز میں سر کو اثباتی حرکت دی۔

''آخر یہ دوا...... علاج کس چیز کا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

ہما نے آواز مزید دھیمی کی۔ ''راے جی کوئی آسان بندہ نہیں ہے۔ سمجھو کہ دو ہزار فٹ ڈونگا کنواں ہے۔ کوئی اس کے اندر کا حال نہیں جان سکتا۔ تم بھی اتنا ہی جانو جتنا ہضم کر سکو۔''

''تمہیں راے سے ڈر نہیں لگتا؟''

''میرا کیا بگاڑ لے گا۔ مار ہی دے گا نا...... اور ایک دو دن سے تو سچی سچی دل کرنے لگا ہے کہ کہیں دور نس (بھاگ) جاؤں اس بندے سے۔ اس کے کرتوت خراب سے خراب ہوتے جا رہے ہیں۔'' وہ آزردگی سے بولی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے پہلی بار وہ راے کا نام نمایاں نفرت سے لے رہی ہے۔

میرے دل نے گواہی دی کہ پچھلے ایک دو روز میں کوئی نیا واقعہ ہوا ہے یا پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ راے کے بیڈ روم میں ناگفتہ بہ حالت میں قتل ہونے والی بدنصیب کنول کی موت کا یہ ردعمل ہو۔ میں نے ہما کو تھوڑا سا مزید ٹٹولا تو اپنی افسردگی کے بہاؤ میں اس نے ایک اور لرزہ خیز انکشاف کیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ انسان پستی میں گرتا ہے تو اس کی رفتار کتنی تیز ہو جاتی ہے۔

جادو راے اپنی محبوبہ چاندنی کی موت کا غم غلط کرنے کے لیے چاندنی جیسی لڑکی ہی مانگ رہا تھا۔ بہت خوبصورت لیکن نابینا۔ پیسے کے زور سے حسین لڑکی یہاں لانا کون سا مشکل تھا مگر دوسری شرط نے اس کام کو دشوار کر دیا تھا۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ کچھ اور نکل آیا تھا۔ مجھے ہما کے الفاظ پر یقین نہیں آیا۔ کیا انسان اتنا سفاک بھی ہو سکتا ہے۔؟ مگر وہ انسان تھا بھی کہاں۔ وہ تو ایک بدبودار جانور تھا جس نے اپنی بدنمائی کو ایک بیماری کی طرح خود پر طاری کیا ہوا تھا اور گردابِ ہوس میں تھا۔ اس کے جنون کا شاخسانہ تھا کہ اس نے اتوار کے دن اپنے لیے دو خوش شکل لڑکیوں کا انتخاب کیا تھا۔ وہ نابینا نہیں تھیں لیکن انہیں اب زیادہ دیر ''بینا'' نہیں رہنا تھا۔ ہما کے لیے جادو راے کا حکم تھا کہ وہ اس کی خلوت میں پہنچنے سے پہلے پہلے بینائی سے محروم ہوں...... اس کی چاندنی جیسی ہو جائیں۔

''تو کیا کرو گے تم لوگ؟'' میں نے تھکی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''مجھے کیا کرنا ہے۔'' ہما کا لہجہ بوجھل تھا۔ ''جو کریں گے، یہاں کے ڈاکٹر ہی کریں گے۔ ان بیچاریوں کی آنکھوں میں دوا کے نام پر زہر ٹپکائیں گے۔ آنکھیں تو ویسی ہی رہیں گی اور نظریں دو تین ہفتوں میں ختم ہو جائیں گی۔ سمجھو بالکل ڈھیں پٹاس۔''

مجھے ہما کے دکھ اور مایوسی کی وجہ اچھی طرح سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ جن لڑکیوں کا ذکر ہو رہا تھا، یقیناً یہ ہما کے ذریعے ہی یہاں تک پہنچی تھیں۔ تب ہما کو معلوم نہیں تھا کہ جادو راے کا دیوانہ پن اسے کس کام پر اکسا رہا ہے۔ اب راے کا ارادہ جب اس پر کھلا تھا تو وہ دل مسوس کر رہ گئی تھی۔ راے کے خلاف اس میں بغاوت کی چنگاریاں پیدا ہوئی تھیں۔ تاہم راے کے جال سے نکلنا بھی اس کے لیے آسان نہیں لگتا تھا۔

اس نے اپنے موبائل پر مجھے ایک مختصر ویڈیو دکھائی جس نے دل مزید افسردہ کر دیا۔ یہ ان دو...لڑکیوں کی ویڈیو ہی تھی۔ یقیناً یہ انہی کم عقلوں میں سے تھیں جو شوبز کی چکاچوند سے متاثر ہو کر گھروں سے نکلتی ہیں۔ ہزار ہا نظروں کے تیر اپنے کومل جسموں پر سہتی ہیں اور منزل کی تلاش میں ایسے راستوں پر چلتی ہیں جو اُن کے تلووں کو لہولہان کرتا ہے۔ ان دو لڑکیوں کی بدقسمتی یقیناً دوسروں سے سوا تھی۔ آبرو کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ان کے پاس موجود ہے یا نہیں مگر آنکھیں تو موجود تھیں...... جو اَب ناموجود ہونے والی تھیں۔ میں نے دیکھا وہ ایک ڈریسنگ ٹیبل کے

سامنے بیٹھی تھیں۔ ایک ڈاکٹر ان کے قریب موجود تھا۔ میک اَپ آرٹسٹ فرزانہ کے ہاتھ میں ایک ڈراپر ٹائپ چیز تھی اور وہ ایک لڑکی کی آنکھوں پر جھکی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں کچھ ٹپکا رہی تھی۔ دونوں لڑکیاں اپنے انجام سے بے خبر ہنسی خوشی ایک سفاک عمل سے گزر رہی تھیں۔ کسی طاقتور کی بدصورتی کی سزا ان کی بینائی کو بھگتنا پڑ رہی تھی۔ چند ہفتوں بعد یہ دنیا ان کے لیے اندھیر ہو جانا تھی۔

☆☆☆

اور یہ منظر تھا ایک لگژری اسٹیشن ویگن کا۔ میری اور عمران کی آنکھوں پر آئی ماسک یعنی سیاہ پٹی تھی۔ ہمارے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور یقیناً ہمیں موٹر وے کے ذریعے کہیں لے جایا جا رہا تھا۔ ویگن میں مسلح گارڈز کے علاوہ بہروز بھی موجود تھا۔ اس تاریک شیشوں والی ویگن میں ہمیں سفر کرتے کم و بیش دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ غالب امکان یہی تھا کہ ہمیں لاہور سے اسلام آباد لے جایا جا رہا ہے۔ اسلام آباد کا ذکر اس اہم ویڈیو کلپ میں موجود تھا جسے عمران نے اپنے طریقے سے سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ یقیناً یہ جزوی طور پر ایک کامیاب کوشش ہی تھی۔

بالآخر ہم کسی عمارت میں داخل ہوئے۔ یہاں آکر ہماری آنکھوں سے پٹیاں ہٹا دی گئیں۔ عمران کے ہاتھ بھی کھول دیے گئے۔ یہ کسی صاحب ثروت شخص کی رہائش گاہ لگتی تھی مگر فی الحال یہاں رہائش کے کوئی آثار نہیں تھے۔ ایک لفٹ کے ذریعے ہمیں تیسرے فلور پر پہنچایا گیا۔ ہم ایک گیلری نما وسیع کمرے میں نمودار ہوئے۔ دیوار گیر کھڑکیوں سے دور دور کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ ہاں یہ ہمارا اسلام آباد ہی تھا۔ دور کہیں مسجد فیصل کے مینار اور ان سے آگے مارگلہ کے درخت جھلک دکھا رہے تھے۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ کمزور زرد دھوپ نشیب و فراز کو گرمانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

''خوش آمدید!'' یہ آواز میم مائرہ کی تھی جو بند گلے کے کوٹ اور پینٹ میں ہمارے سامنے کھڑی تھی۔

میں نے تعجب سے دیکھا۔ ایک کھڑکی کے پاس دو بڑے سائز کی ٹیلی اسکوپس رکھی تھیں۔ میم مائرہ کے عقب میں سیاہ وردیوں والے گارڈز کے علاوہ وہ اطالوی لپ ریڈر یا اسپیچ ریڈر بھی موجود تھا جو پندرہ دن پہلے ہمیں خفیہ عمارت کے اپارٹمنٹ میں ملا تھا۔ وہ تیکھے نقوش اور پتلے پتلے ہونٹوں والا ایک ہوشیار شخص تھا۔ قوت گویائی اور سماعت سے محروم ہونے کے باوجود اس کا چہرہ ہر وقت بولتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ عمران کو دیکھ کر مسکرایا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ ایک لپ ریڈر کی حیثیت سے وہ عمران کی عزت کرتا ہے۔

میرے کانوں میں ہیلی کاپٹر کی مدھم پھڑ پھڑاہٹ گونجی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے کھڑکیوں کے پار دیکھا مگر ہیلی کاپٹر نظر نہیں آیا۔ ہاں تقریباً 200 میٹر کے فاصلے پر کسی شاندار عمارت کا وسیع و عریض عقبی لان دکھائی دیا۔ اس سبز لان کے بیچوں بیچ تین چار کرسیاں اور میز دکھائی دے رہی تھیں۔

میم نے عمران کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''اس ہیلی کاپٹر پر ایک بہت اہم لیڈی یہاں پہنچی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے کاروباری پارٹنر کے ساتھ اس سامنے والے لان میں آئے گی۔ ان دونوں کے درمیان نہایت اہم قسم کی گفتگو ہونے والی ہے۔ ہمیں اس گفتگو کے بارے میں جاننے کی کوشش کرنا ہے۔ فاصلہ زیادہ ہے۔ یہ دونوں ٹیلی اسکوپس بھی اسی لیے یہاں رکھی گئی ہیں۔''

عمران نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر میم مائرہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کہیں یہ دونوں وہی بزنس پارٹنرز تو نہیں جو خاموش ویڈیو میں تھے؟''

''تم نے درست اندازہ لگایا ہے عمران! ہمارے لیے ان دونوں کی یہ آج کی گفتگو بہت اہم ہے۔ ہم جس لوکیشن پر موجود ہیں، ہم نے یہ بہت مشکل سے حاصل کی ہے۔ مقصد صرف یہی ہے کہ ہم آج کی گفتگو جان سکیں۔''

عمران نے اطالوی لپ ریڈر ایڈگر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ ایڈگر صاحب یہاں کس لیے ہیں؟''

''تم دونوں ایک دوسرے کی معاونت کر سکتے ہو۔ تم جانتے ہی ہو یہ بھی اس فیلڈ کے ماسٹر ہیں۔''

''میری معاونت تو میرے یہ انکل تابش صاحب کرتے ہیں اور یہ میرے ساتھ ہیں۔''

''تو تم یوں سمجھ لو کہ مسٹر ایڈگر بھی اپنے طور پر وہی کچھ کریں گے جو تم کرو گے۔ تمہاری ''فائنڈنگ'' کو ہم ٹیلی کر سکتے ہیں۔ یہ دوسری ٹیلی اسکوپ اسی لیے رکھی گئی ہے۔''

میں نے مائرہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بوجھل آواز میں کہا۔ ''میم! میری اور عمران کی سمجھ میں ایک بات بھی آ رہی ہے کہ آپ عمران کی مدد سے کوئی بہت خاص قسم کی گفتگو جاننا چاہ رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی بہت اہم راز ہی ہوگا جو آپ کے ساتھ ساتھ ہم پر بھی آشکار ہو جائے گا۔

جب یہ راز ہم پر بھی کھل جائے گا تو پھر آپ لوگ ہمیں جیتا جاگتا چھوڑنا کب پسند کریں گے؟''

مائرہ کے چہرے پر سرخی لہرا گئی۔ اس کی رنگت میں مقامی اور بدیشی آمیزش تھی۔ تقریباً تیس سال عمر کے باوجود وہ جسمانی طور پر بہت چوکس بلکہ کسی ایتھلیٹ کی طرح نظر آتی تھی۔ اس نے اپنے طیش کو دبایا اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''یہ بات تم دونوں بہت اچھی طرح سمجھ لو کہ تم فی الوقت کسی بھی طرح کی سودے بازی کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہے، غیر مشروط طور پر کرنا ہے۔ تمہاری وجہ سے ہمیں ایک راہ تو سوجھ ہی گئی ہے۔ اگر تم یہ کام نہ کرو گے تو کوئی اور کرے گا۔ یہ سامنے تمہاری ہی فیلڈ کا بندہ ایڈگر کھڑا ہے۔ ایسے ہی اور لوگ ہمیں مل سکتے ہیں۔''

عمران اطمینان سے بولا۔ ''تو ٹھیک ہے۔ اگر مرنا ہی ہے تو پھر تمہاری مدد کرنے کے بعد اور تمہارے گناہوں میں حصہ دار بننے کے بعد کیوں مریں؟''

''یہاں کوئی گناہ نہیں ہو رہا۔'' وہ دبنگ انداز میں بولی۔ ''تم سمجھ ہی چکے ہو گے کہ ہم یہاں فارمیسی کے حوالے سے کام کر رہے ہیں اور مقصد انسانیت کی بھلائی ہی ہے۔''

عمران تقریر کرنے والے موڈ میں آ گیا۔ ''یہ کیسی بھلائی ہے۔ آپ لوگوں نے بے شمار محنت کشوں کو دھوکے سے اپنی تحویل میں رکھا ہوا ہے۔ چار ہفتے پہلے جو کچھ ہوا، وہ کون سی انسانیت کی بھلائی تھی۔ دو درجن کے قریب بے گناہ تمہارے کسی تجربے کے گھاٹ اتر گئے۔''

''وہ بس ایک حادثہ تھا۔'' میم پھنکاری۔ ''ہمیں بھی اس کا بے حد افسوس ہے مگر ہم نے مرنے والوں کے لواحقین کو بھلایا نہیں۔ انہیں اتنا معاوضہ دیا ہے کہ ان کی دو نسلیں بیٹھ کر کھا سکتی ہیں اور ان کی جان ایک اچھے کام کے لیے ہی گئی ہے......''

عمران نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر میرا خفیف اشارہ پا کر ارادہ بدل دیا بس مایوس انداز میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ کھڑکیوں سے باہر ہیلی کاپٹر کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ معدوم ہو چکی تھی۔ سامنے وسیع خوبصورت لان میں اِکا دُکا باوردی ملازمین کے متحرک اجسام دکھائی دے رہے تھے۔

میم مائرہ نے گہری سانس لیتے ہوئے سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''بہرحال تم دونوں کے اندیشے درست نہیں ہیں۔ اگر تم نے واقعی کارکردگی دکھائی تو میں تمہیں مناسب رعایت دلانے کی پوری پوری کوشش کروں گی۔ کم از کم راے تمہاری جان بخشی تو کر ہی دے گا۔''

دور فاصلے پر سرسبز لان میں ہلچل سی محسوس ہونے لگی تھی اور یہ ہلچل لان سے باہر محل نما کوٹھی کے وسیع پورچ میں بھی تھی۔ کچھ لوگ ادھر سے بھی آ رہے تھے۔ تین چار بڑی بڑی لگژری گاڑیاں داخل ہوئیں۔ آگے پیچھے گارڈز کی نصف درجن گاڑیاں تھیں۔ دو موٹر سائیکل سوار محافظ اس ''کانوائے'' کے آگے آگے تھے۔ ٹیلی اسکوپ کے بغیر ہی مجھے اور عمران کو پتا چل گیا کہ اُس جانب سے جاپانی لیڈی یوزوکی کا بزنس پارٹنر ڈیرن وارد ہوا ہے۔

انچارج گارڈ بہروز کے اشارے پر عمران ایک ٹیلی اسکوپ کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا، اطالوی ایڈگر نے بھی دوسری ٹیلی اسکوپ کے سامنے جگہ سنبھال لی۔ ایک جانب طاقتور لینس والا ایک ویڈیو کیمرا ابھی حرکت میں تھا۔

چار پانچ منٹ بعد بھاری بھرکم جسم والی یوزوکی اور سوٹڈ بوٹڈ ڈیرن فورڈ گراؤنڈ میں موجود تھے اور اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ یوزوکی کا نہایت قیمتی ارجنٹینو کتا بھی بغیر ٹیلی اسکوپ کے ہی دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً وہ ہیلی کاپٹر میں اس کے ساتھ ہی یہاں پہنچا ہو گا۔ مؤدب ملازم ان دونوں کے ارد گرد گردش کرنے لگے۔ ان دونوں کے سامنے خورونوش کا کچھ سامان رکھا گیا۔ اسی اثنا میں ایک خوش قامت لڑکی بھی نظر آئی۔ وہ پینٹ اور جیکٹ میں تھی۔ بال کندھوں پر جھول رہے تھے۔ فاصلہ کافی زیادہ تھا پھر بھی وہ اچھی صورت کی لگتی تھی۔ وہ غالباً ڈیرن فورڈ کے ساتھ ہی یہاں پہنچی تھی۔ اسے دیکھ کر فربہ اندام یوزوکی نے اٹھ کر مصافحہ کیا۔ چند فقروں کے تبادلے کے بعد وہ لان سے باہر چلی گئی۔ میرا قیافہ یہی تھا کہ وہ ادھیڑ عمر ڈیرن کی بیٹی ہے۔ اس کے جانے کے بعد ڈیرن اور یوزوکی لان میں کرسیوں پر تنہا رہ گئے۔ ان کے سامنے دو فائلز رکھ دی گئی تھیں۔ ظاہر ہو رہا تھا کہ اب ان کے درمیان سنجیدہ نوعیت کی گفتگو شروع ہو چکی ہے۔ عمران اور اطالوی لپ ریڈر ایڈگر پوری طرح متوجہ تھے اور ٹیلی اسکوپس پر جھکے ہوئے تھے۔ سماعت اور گویائی سے محروم ایڈگر گاہے بہ گاہے اپنی نوٹ بک پر کچھ تحریر بھی کرتا تھا۔

تب عمران نے میم مائرہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ وہ اپنی ٹیلی اسکوپ کی پوزیشن بدلنا چاہتا ہے۔

میم مائرہ نے ٹیلی اسکوپ عمران کی مطلوبہ پوزیشن پر رکھوا دی۔ ایک دو منٹ بعد اطالوی ایڈگر نے بھی پوزیشن

بدلنے کی درخواست کی۔ عمران اور ایڈگر دونوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ خاطر خواہ نتائج حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہورہے۔ اسی دوران میں سبزہ زار میں بیٹھی ہوئی یوزو کی نے فون پر کسی سے بات بھی کی۔ بات کرتے ہوئے وہ سبزہ زار میں ٹہلنے لگی تھی اور اس نے چہرہ دوسری طرف کرلیا تھا۔ اس کا پارٹنر ڈیرن فورڈ انہاک سے کوئی کاغذ دیکھ رہا تھا۔

میم مائرہ نے عمران سے پوچھا۔ ''کچھ پلے پڑا؟''

''ابھی تک کچھ خاص نہیں۔'' عمران نے ذرا توقف سے جواب دیا۔ ''ایک بار پھر بزرگ جاپانی اسکالر ڈاکٹر شا کا ذکر ہورہا ہے۔ ایک دو فقرے جو سمجھ میں آئے ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر شا کے پیپر ادھورے ہیں...... اس ادھورے پن کی وجہ سے بہت مشکل ہورہی ہے۔''

''اس کے علاوہ؟'' میم مائرہ نے بیتابی سے پوچھا۔

''میڈم یوزو کی کسی جانور یا کیڑے کا ذکر بھی کررہی ہے شاید......''

''ضرور...... ضرور کیا ہوگا اُس نے یہ ذکر...... کہیں سانپ یا پھر زہر وغیرہ کی بات تو نہیں کی اس نے؟'' میم مائرہ کی آنکھوں میں ایک ہیجانی چمک نمودار ہوگئی۔

''زہر کی بات یوزو کی نے نہیں، شاید ڈیرن نے کی ہے لیکن فقرہ پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکا۔''

''سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ ضروری ہے...... بہت ضروری۔'' مائرہ کی آواز کانپ رہی تھی۔

عمران دکھاوے کے لیے مجھ سے سرگوشیاں کرنے لگا۔ بتانا یہ چاہ رہا تھا کہ اپنے معاون کی حیثیت سے مجھ سے تبادلۂ خیال کررہا ہے۔ میرے کان میں بولا۔ ''چاچو جی! دل تو چاہ رہا ہے کہ اس بل بتوڑی ناساں چوڑی جاپانی میڈم کے گریبان میں چھپکلی چھوڑ دوں۔ یہ اتنے زور سے چلّائے کہ اس کا چھوٹا سا منہ چوڑا ہوجائے پھر کچھ تو پتا چلے کہ خبیث بول کیا رہی ہے۔''

میں نے بڑی سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا جیسے عمران نے کوئی بہت پتے کی بات کی ہو۔ ''بالکل منہ بند کرکے بول رہی ہے ہتھنی کی بچی۔'' وہ بڑبڑایا۔

اس دوران میں میم مائرہ نے گونگے بہرے ایڈگر سے بھی تحریر شدہ رزلٹ لیا۔ مائرہ کے تاثرات دیکھ کر اندازہ ہوا کہ گو عمران کا رزلٹ بھی اچھا نہیں تھا مگر ایڈگر سے بہت بہتر تھا۔ سبزہ زار میں جاپانی یوزو کی ایک بار پھر ڈیرن فورڈ کے پاس آبیٹھی تھی۔ دونوں کی گفتگو پھر شروع ہوگئی۔ عمران ایک بار پھر سرتاپا نگاہ بن گیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے یقین سا تھا کہ وہ مائرہ اور جادو رامے کے لیے کوئی اہم انکشاف کرپائے گا مگر چند منٹ بعد کچھ ایسا ہوا جس نے امیدوں پر پانی سا پھیر دیا۔ جاپانی میڈم یوزو کی کا کتا شاید سردی کے باوجود دھوپ پسند نہیں کر پارہا تھا۔ دو ملازم بھاگے بھاگے لان میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑے سائز کی ایک رنگدار چھتری تھی جسے برولی بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے یہ بڑی چھتری کتّے کے اوپر تان دی اور واپس چلے گئے۔ کتّے کے ساتھ اس وی آئی پی سلوک کا نقصان یہ ہوا کہ ڈیرن اور یوزو کی دونوں ہی تقریباً عمران کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ اطالوی ایڈگر تو ان کو بالکل ہی دیکھ نہیں پارہا تھا۔

میم مائرہ، بہروز اور ان کے ساتھی سٹپٹائے ہوئے نظر آنے لگے۔ اگلے چار پانچ منٹ میں ٹیلی اسکوپس کی پوزیشن دو تین بار تبدیل کی گئی مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ یہ مایوس کن صورتِ حال تھی۔ لگ یہی رہا تھا کہ سبزہ زار میں اب دونوں پارٹنرز کی گفتگو شاید تادیر جاری نہیں رہے گی۔ محل نما کوٹھی کے پورچ میں اب گاڑیوں کو آگے پیچھے کیا جانے لگا تھا۔ وہ سفید فام لڑکی جو ڈیرن فورڈ کے ساتھ ہی یہاں پہنچی تھی، اب پورچ میں اس بیش قیمت ''روبی کون'' جیپ کے پاس موجود تھی جس میں ڈیرن فورڈ یہاں آیا تھا۔ وہ کسی مقامی خاتون سے باتیں کررہی تھی۔ اس مقامی خاتون نے ابھی کچھ دیر پہلے نہایت مہنگی ''روبی کون'' جیپ میں کچھ پھول اور گلے وغیرہ رکھے تھے۔ یہ اسی نوعیت کے پھول تھے جو عموماً کرسچین اپنی قبروں پر رکھتے ہیں۔

میں نے عمران سے کہا۔ ''یہ پورچ میں جو دو خواتین کھڑی باتیں کررہی ہیں، ان کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

اب اصل کام تو ہو نہیں پارہا تھا۔ عمران نے اپنی ٹیلی اسکوپ کو اسٹینڈ پر گھمایا اور اس کا رخ محل نما کوٹھی کے پورچ کی طرف کردیا۔ وہ کچھ دیر تک ہمہ تن متوجہ رہا پھر بولا۔ ''یہ کسی قبرستان میں جانے اور پھول چڑھانے کی بات ہورہی ہے۔ اس لڑکی کا یا اس کے ساتھی کا کوئی گرینڈ پا ہے جو غالباً یہاں کے قبرستان میں دفن ہے۔''

میرے جسم میں پھریری سی دوڑنے لگی تھی۔ کچھ کر گزرنے کی امنگ اچانک سینے میں جاگی تھی اور توانائی بن کر جسم میں پھیل گئی تھی۔ میں نے مؤدب انداز میں میم مائرہ سے پوچھا۔ ''یہاں آس پاس کوئی گورا قبرستان ہے؟''

''یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''پلیز! آپ میری بات کا جواب دیں۔ اس میں

آپ کا فائدہ ہے۔''
وہ چند سیکنڈ تک میری طرف دیکھتی رہی پھر شاید میرے غیر معمولی انداز نے ہی اسے سوچنے پر مجبور کیا۔ اس نے انچارج بہروز سے پوچھا۔ ''کوئی گورا قبرستان ہے یہاں؟''
بہروز بولا۔ ''جی نہیں، یہاں قریب تو کوئی نہیں۔ مری روڈ سے پنڈی کی طرف جائیں تو وہاں ایک ہے۔''
اس نے قبرستان کا نام بھی بتایا (یہ نام اس لپ ریڈنگ سے ٹیلی کر رہا تھا جو عمران نے کی تھی)
ایک عجیب سا ولولہ میرے اندر پیدا ہو چکا تھا۔ میں جان چکا تھا کہ سبزہ زار میں جو دو بزنس پارٹنرز بیٹھے کوئی خاص گفتگو کر رہے ہیں، وہ بہت وسائل والے لوگ ہیں۔ اس قدر وسائل والے کہ مائرہ اور رامے جیسے دبنگ بھی ان سے ٹکرا نہیں سکتے تھے نہ ہی ان کی سیکیورٹی کو توڑ سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی جو وہ دور دور سے ان کی ٹوہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کبھی کیمروں سے، کبھی ٹیلی اسکوپس کے ذریعے۔
ایسے ہی لوگوں سے ٹکرانے اور انہیں ششدر کر دینے میں مجھے اور عمران دانش کو مزہ آیا کرتا تھا۔ پندرہ برس گزر گئے تھے مگر ایسے مزے اور ایڈونچر کی طلب میرے اندر آج بھی کم نہیں ہوئی تھی بلکہ کبھی کبھی تو مجھے لگتا تھا کہ میرے تجربے نے میری جسمانی فٹنس کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر مجھے اور بھی ''کارگر'' بنا دیا ہے۔ سونے پر سہاگا یہ کہ اب عمران دانش کا عکس میرے ساتھ تھا۔ اس کے اندر اپنے باپ کی کئی صلاحیتیں پائی جاتی تھیں لیکن اس کی اپنی انفرادی خوبیاں بھی کچھ کم نہیں تھیں۔ ایک مثال یہ لپ ریڈنگ والا جادوئی فن تھا۔
میں نے عمران کے کان میں چند سرگوشیاں کیں پھر بڑے اعتماد سے میم مائرہ کی طرف دیکھا۔ ''میم! اگر آپ میرے ہاتھ کھلوا سکیں اور میرے اوپر بھروسا کر سکیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم آپ کا مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔''
وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی جیسے میری بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کی معاملہ فہم نگاہیں میرے اندر تک اترنے کی کوشش کر رہی تھیں۔
''کیا کرو گے تم؟ ان دونوں میں سے کسی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرو گے؟''
''آپ ایسا ہی سمجھ لیں مگر بھروسا رکھیں۔ ہم کچا ہاتھ ڈالنے والے نہیں ہیں۔''
''میں تمہاری بات سے اتفاق نہیں کر سکتی۔ بے شک تم دونوں ایڈونچر کے شوقین ہو اور مار دھاڑ میں طاق ہو مگر یہ لوگ تمہارے بس کے نہیں ہیں۔ یہ کسی اور کیٹیگری کے لوگ ہیں۔ ان کی سیکیورٹی دیکھ رہے ہو؟''
عمران بولا۔ ''میم ایسی ہی سیکیورٹیاں توڑنے میں تو مزہ آتا ہے۔ چھوٹے موٹے لوگوں سے ماتھا لگانے کے ہم بھی قائل نہیں۔''
''کیا کرو گے تم لوگ؟''
''یہ ہم پر چھوڑ دیں۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''اور آپ یہ بھی بہ خوبی جانتی ہیں کہ ہم کہیں بھاگ نہیں سکتے۔ ہمارے ساتھی ماہین اور حسام آپ کے پاس ہیں۔''
اس حوالے سے میرے اور میم مائرہ کے درمیان چار پانچ منٹ تک مدلل گفتگو ہوئی۔ آخر مائرہ کی آنکھوں میں ایک گرسنہ سی چمک نظر آنے لگی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کے پاس بھی کسی ''نتیجے'' تک پہنچنے کے لیے وقت بہت کم ہے۔ اس نے ایک سمت جا کر فون پر کسی سے بات کی۔ غالباً عمران کی نگاہوں سے بچنے کے لیے اس نے اپنا رخ دوسری طرف رکھا تھا۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ جادو رامے سے مشورہ کر رہی ہے۔
کچھ دیر بعد وہ فون بند کر کے میری طرف متوجہ ہوئی اور گہری سانس لے کر بولی۔ ''میں تم دونوں کو بتا چکی ہوں۔ یہ دونوں بندے جو وہاں سبزہ زار میں بیٹھے ہیں، بے حد...... بے حد اہم ہیں۔ ان میں سے کسی کا جانی نقصان بہت بڑا طوفان کھڑا کر سکتا ہے۔ ہم یہ نقصان افورڈ نہیں کر سکتے۔''
''نہیں ہوگا یہ نقصان۔'' میں نے ایک بار پھر میم کو یقین دلایا۔
ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر سبزہ زار میں اب حرکت سی نظر آ رہی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ امریکن ڈیرن اور جاپانی یوزوکی کے درمیان میٹنگ اب برخاست ہونے والی ہے۔ میم مائرہ جیسے ایک جست کے ساتھ فیصلے پر پہنچ گئی۔ اس نے انچارج بہروز کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھوں کی زپ ٹائی کھول دی۔ میں نے اپنی کلائیوں کو مسلا اور میم مائرہ سے وہ بریٹا پستول وصول کیا جس کی میں نے ڈیمانڈ کی تھی۔ مسلح گارڈز کے درمیان سے گزر کر میں اور عمران لفٹ تک پہنچے۔ بہروز دو چوکس گارڈز سمیت ہمارے ہمراہ تھا البتہ طے شدہ پروگرام کے مطابق اس نے آئندہ کچھ دیر میں ہونے والی کارروائی میں کوئی

حصہ نہیں لیا تھا۔ ہم ایک سفید اسٹیشن ویگن میں بیٹھے اور برق رفتاری سے مطلوبہ گورا قبرستان کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

یہ بہت ہلکی زرد دھوپ والی ایک یخ بستہ دوپہر تھی۔ مارگلہ اور مری کی طرف سے آنے والی برفانی ہوائیں ہڈیوں میں گھس رہی تھیں۔ میں اور عمران اس شہرِ خموشاں کے اندر دو گھنے درختوں کے عقب میں موجود تھے۔ ہماری یہاں آمد کے دس منٹ بعد ہی قبرستان کے اردگرد ہلچل محسوس ہونے لگی تھی۔ ہماری توقع کے عین مطابق امریکی ڈیرن فورڈ اور اس کی ساتھی خوش پوش لڑکی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ یہاں پہنچ چکے تھے۔ درجنوں ہی گاڑیاں تھیں جو اس گورا قبرستان کے اطراف میں آ کر کھڑی ہوئی تھیں۔ اب ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ڈیرن جب قبرستان کے اندر آئے گا تو اس کے ساتھ محافظ ہوں گے یا نہیں اور اگر ہوں گے تو کتنے ہوں گے؟"

آخر ہمارے لیے یہ معما حل ہوا۔ گھنی شاخوں کے اندر سے ہم نے دراز قد ڈیرن اور اس کی ساتھی لڑکی کو دیکھا جسے ہم اس کی بیٹی سمجھ رہے تھے، ان دونوں نے سیاہ چشمے لگا رکھے تھے۔ ان کے ساتھ صرف تین باوردی گارڈز قبرستان میں داخل ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھوں میں پھول اور گلدستے وغیرہ تھے۔

ہم نے دیکھا ایک ہیلی کاپٹر فضا میں پھڑپھڑاتا کسی طرف نکل گیا۔ غالباً یہ وہی ہیلی کاپٹر تھا جس پر جاپانی یوژو کی بزنس میٹنگ کے لیے اسلام آباد پہنچی تھی۔ ہم دم سادھے بیٹھے رہے۔ فضا میں آہستہ آہستہ کہرا ابھرنا شروع ہو گیا تھا اور کمزور سی دھوپ بھی اوجھل ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ڈیرن اور اس کی ساتھی لڑکی ہم دونوں سے تقریباً سو فٹ دور ایک قدیم سفید قبر پر جا کر رک گئے۔ اس گورا قبرستان کی زیادہ تر قبریں سفید پتھر ہی کی تھیں۔ اکثر پر صلیب یا پاک مریم کی مورتی نظر آتی تھی۔ ڈیرن اور لڑکی نے محافظ کے ہاتھوں سے پھول اور گلدستے لیے اور انہیں بڑے احترام سے قبر پر چڑھایا پھر محافظ تو پیچھے ہٹ گئے اور وہ دونوں اپنی آنکھیں بند کر کے دعا میں مصروف ہو گئے۔ محافظ پیچھے ہٹنے کے بعد ہمارے کافی قریب چلے آئے تھے۔ ان میں سے ایک تو اتنا قریب تھا کہ اگر گھوم کر اپنے عقب میں درختوں کو دیکھتا تو شاید ہم اسے نظر آ جاتے۔ یہ حرکت میں آنے کا وقت تھا۔

میں تیزی سے نکلا اور دو چار قدم چل کر اپنا دایاں بازو محافظ کے گلے میں حمائل کر دیا۔ گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ

حاصل مطالعہ

☆ بگ ایپل (BIG APPLE) نیویارک کو کہتے ہیں۔

☆ مصر کے فرعون توت کا اہرام 482 فٹ بلند اور 876 مربع فٹ پر مشتمل ہے۔

☆ ایئر فرانس کے کنکارڈ طیارے نے اگست 1995ء میں نیویارک سے پرواز کے بعد 31 گھنٹے 27 منٹ اور 49 سیکنڈ میں دنیا کا چکر لگا کر واپس نیویارک پہنچ کر عالمی ریکارڈ قائم کیا۔

☆ 1812ء کی جنگ کے دوران امریکی صدر کی رہائش گاہ کو زبردست نقصان پہنچا۔ عمارت کے بدنما داغوں کو چھپانے کے لیے اس پر سفید رنگ کر دیا گیا جس کی وجہ سے لوگوں میں وائٹ ہاؤس کہنے کا رجحان ہوا۔ تاہم اس بات کی تصدیق سرکاری طور پر 1902ء میں ہوئی۔

☆ مسجد عمرؓ بیت المقدس کے احاطے میں تحریک پاکستان کی نامور شخصیت مولانا محمد علی جوہر دفن ہیں۔

☆ سونے کے پانی سے قرآن مجید سب سے پہلے جناب قطبہ نے لکھا۔

(محمد شاہان سعید کی عرق ریزی)

مریض ڈاکٹر سے: "ڈاکٹر صاحب میں بہت خوش رہتا ہوں۔ نیند سکون سے آتی ہے، زندگی میں امن ہی امن ہے۔ ہر کام میں دل بھی لگتا ہے، کوئی پریشانی نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے؟"

ڈاکٹر: "میں آپ کی بیماری سمجھ گیا۔ آپ کی زندگی میں وٹامن شی (She) کی کمی ہے۔"

☆☆☆

ایک بوڑھے کسان نے اپنے بے گناہ بیٹے کو جیل میں خط لکھا۔

"پیارے بیٹے میں اس سال آلو کی فصل نہیں بو سکتا۔ مجھ سے کھیت میں کھدائی نہیں ہو سکتی۔ کاش تم میری مدد کر سکتے؟"

بیٹے نے جواب دیا: "بابا کھیت مت کھودنا کیونکہ وہاں میں نے اسلحہ چھپایا ہوا ہے۔"

اگلے دن پولیس نے سارے کھیت کی کھدائی کر ڈالی لیکن انہیں کچھ نہ ملا۔ بیٹے نے پھر باپ کو خط لکھا۔

"بابا اب آپ آلو کی فصل بو سکتے ہیں۔ میں یہاں سے آپ کے لیے اتنا ہی کر سکتا تھا۔"

(سحرش افضل، رتیڑہ)

ہلکی سی آواز بھی نہ نکال سکا اور ہوش سے بیگانہ ہو کر میرے بازوؤں میں بھنڈی توری کی طرح جھول گیا۔ میں نے آواز پیدا کیے بغیر اسے درختوں میں کھینچ لیا۔ اس کے ساتھی کو کچھ شک ہوا۔ اس نے آہستہ سے آواز دی۔ ''راجر! کہاں ہو؟'' اور درختوں کی طرف آیا۔

عمران نے بے ہوش راجر کے پہلو سے تیز دھار خنجر نکال کر اپنے ہاتھ میں کر لیا تھا لہٰذا جونہی مسلح محافظ قریب آیا، اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ عمران پہلو سے اس پر جھپٹا اور تیز دھار خنجر دستے تک اس کے سینے میں اتار دیا۔ عمران نے دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ ڈھانپ لیا تھا لہٰذا مضروب کی کراہ دور تک نہیں گئی۔ تیسرا محافظ گن اپنے کندھے سے اتار رہا تھا جب میں اس پر جا پڑا۔ میں نے اپنے دائیں بازو میں اس کی توانا گردن جکڑ لی۔ یہ سڈول جسم والا مقامی محافظ تھا۔ اپنی رائفل پر اس کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی لہٰذا میں کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا جو چند روز پہلے لاہور کی نامعلوم عمارت میں فی میل گارڈ افروزہ کے ساتھ ہو چکا تھا۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی اور وہ ایک شکستہ قبر پر ڈھیر ہو گیا۔

بند آنکھوں کے ساتھ مناجات میں مصروف ڈیرن اور اس کی ساتھی لڑکی جب تک گھوم کر اپنے محافظوں کی طرف دیکھتے اور ان کے رنگ برف کی طرح سفید ہوتے، ہم ان کے سروں پر پہنچ چکے تھے۔

''خبردار! آواز نہ نکلے۔'' میں نے بریٹا پسٹل کی یخ بستہ نال ڈیرن کی نیم سفید کنپٹی سے لگاتے ہوئے کہا۔ وہ ہکا بکا تھا۔

عمران نے لڑکی کو عقب سے دبوچ لیا تھا اور خنجر کی ٹھٹھری ہوئی تیز دھار اس کی صراحی دار گردن پر رکھ دی تھی۔ قبرستان کی اونچی چاردیواری سے باہر کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اندر کیا ہو چکا ہے۔

''یہ...... کیا تماشا ہے؟'' ڈیرن نے بہ زبان انگلش لرزاں آواز میں پوچھا۔

''یہ کچھ بھی نہیں ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''تماشا تب ہوگا جب تم یا یہ لڑکی کسی کو مدد کے لیے پکارو گے۔''

لڑکی اور ڈیرن نے سخت حواس باختہ نظروں سے ان درختوں کی جانب دیکھا جہاں کسی نامعلوم برٹش کی ٹوٹی پھوٹی قبر پر مقامی محافظ اوندھا پڑا تھا۔

عمران نے لڑکی کی گردن پر یخ بستہ دھار کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اُدھر کیا دیکھتی ہو۔ ان میں سے دو وفات پا چکے ہیں اور تیسرا پکا پکا بے ہوش ہے۔ لہٰذا یہ جان لو کہ ہمارے سروں پر خون سوار ہے۔ جو کہا جا رہا ہے، چپ چاپ اس پر عمل کرو۔'' عمران نے اسے قبرستان کے عقبی دروازے کی طرف دھکیلا۔

''لیکن......'' ڈیرن نے کچھ کہنا چاہا۔

''لیکن کچھ نہیں۔'' میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ تمہاری بدقسمتی یہ ہے کہ تم اپنی سلامتی کے حساب سے بہت غلط جگہ پر بہت غلط وقت پر پائے گئے ہو۔ تمہارے سارے محافظ ان کی ساری بے مثال مہارت اور ان کا سارا جدید اسلحہ بھی فی الوقت تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ بہتری اسی میں ہے کہ لاش بننے کے بجائے چپ چاپ آگے بڑھو۔''

ڈیرن مناسب جسم کا دراز قد شخص تھا تاہم اُس کے طور اطوار بتاتے تھے کہ وہ اس قسم کی صورت حال سے بالکل ناآشنا صرف ایک بزنس مین ہے۔

میں اور عمران ان دونوں کو تیزی سے دھکیلتے ہوئے قبرستان کے عقبی چھوٹے دروازے تک لائے۔ دروازے سے کچھ ہی فاصلے پر مائرہ اور جادو رامے کا ہرکارہ بہروزہ سفید وین میں موجود تھا۔ وین جھاڑیوں کے عقب میں تقریباً کیموفلاج تھی۔ ایک دو راہگیروں نے حیرت زدہ نظروں سے یہ منظر دیکھا لیکن تب تک ہم تاریک شیشوں والی اس وین میں سوار ہو چکے تھے۔ یہ سارا آپریشن نہایت تیز رفتاری سے صرف دو یا تین منٹ میں مکمل ہوا تھا۔ وین میں پہنچتے ہی لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ڈیرن کی ہلکی نیلی آنکھوں میں بھی حیرت کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ غالباً اسے بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنے لاؤ لشکر کے باوجود دو افراد نے اسے یوں اچک کر اس گاڑی میں لا بٹھایا ہے۔

☆☆☆

14 گھنٹے بعد ہم پھر لاہور میں تھے اور اسی نامعلوم عمارت میں جہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ ہمیں واپس بھی اسی طرح لایا گیا، جیسے لے جایا گیا تھا۔ ہماری آنکھوں پر سیاہ پٹیاں تھیں اور ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ کن راستوں سے گزرے ہیں۔ مجھے اور عمران کو پھر اسی آرام دہ اپارٹمنٹ میں پہنچا دیا گیا جہاں سے ہم علی الصباح روانہ ہوئے تھے۔ ماہین بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ حشام بھی فکرمند دکھائی دیتا تھا۔

اگلے روز دس بجے کے لگ بھگ جب ہم ناشتے سے

فارغ ہوئے تھے، انٹرکام کا بزر بج اٹھا۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف مائرہ قدرے ملائم آواز میں بول رہی تھی۔ رسمی کلمات کے بعد اس نے کہا۔ ''مسٹر تابش! ڈاکٹر جاذبہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔''

مجھے حیرت ہوئی۔ ''ڈاکٹر جاذبہ؟ کیا وہ مزید مار پیٹ کا ارادہ رکھتی ہے؟''

''تابش! وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔ راے صاحب بھی اس پر بہت خفا ہوئے ہیں۔ اسے اجازت کے بغیر تمہیں اسپتال سے نکالنا نہیں چاہیے تھا۔ بعد میں اس نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا، وہ بھی کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہے...... لو تم بات کرو۔''

دوسری طرف مائرہ نے ریسیور یقیناً ڈاکٹر جاذبہ کو تھمادیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''میں نے...... جو کچھ کیا...... غلط تھا۔ میں اس وقت اپنے حواس میں نہیں رہی تھی۔ آئی ایم سوری!''

''سوری تو شاید مجھے بھی کہنا چاہیے۔ میں نے تمہیں اٹھا کر بُری طرح دیوار پر پٹخا تھا۔''

''غلطی میری ہی تھی۔'' وہ منمنائی۔

یقیناً مائرہ اس کے سر پر ہی کھڑی تھی۔ جاذبہ معذرت کے الفاظ تو بول رہی تھی مگر محسوس ہوتا تھا کہ یہ الفاظ بس اس کی زبان تک ہی ہیں، دل میں نہیں ہیں۔

جاذبہ سے بات ختم ہوئی تو میم مائرہ نے ریسیور دوبارہ تھام لیا۔ ''مسٹر تابش! کل جو کچھ ہوا، وہ بالکل غیر متوقع تھا۔ اس سے ہمارے لیے کچھ مشکلات تو پیدا ہوں گی لیکن مثبت پہلو یہ ہے کہ ڈیرن اور اس کی ہونے والی بیوی اب ہمارے پاس ہیں۔ راے صاحب ڈیرن سے پوچھ گچھ کررہے ہیں۔''

''ڈیرن کی بیوی؟ وہ کون؟''

''وہی لڑکی جو اس کے ساتھ آئی ہے۔ اس کی ہونے والی بیوی ہے۔ ایلی نام ہے اُس کا۔''

مجھے حیرت ہوئی۔ ہم اسے ڈیرن کی بیٹی سمجھتے رہے تھے۔ درمیانی جسامت کی تھی مگر خوش شکل تھی اور بہت چست و چالاک نظر آتی تھی۔ میں نے ایک اور بات نوٹ کی۔ اس لڑکی یعنی ایلی کا ذکر کرتے ہوئے میم مائرہ کے لہجے میں عجب سی تلخی اتر آئی تھی۔

مائرہ واضح الفاظ میں اظہار تو نہیں کررہی تھی تاہم وہ عمران کی اور میری آج والی کارروائی سے کافی متاثر نظر آتی تھی۔ وہ اپارٹمنٹ میں ہمارے لیے کچھ مزید سہولتوں کا اضافہ کررہی تھی۔ ڈاکٹر جاذبہ کی زبانی اس نے جو ''سوری'' کہلوایا تھا، اس کے پیچھے بھی یہی وجہ تھی۔

میم مائرہ سے بات ختم ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ پنجابی فلموں کی ہیروئن کے ڈیل ڈول والی ہما عروج ہمارے اپارٹمنٹ میں آدھمکی۔ وہ ہماری کل والی ساری کارروائی سے آگاہ ہوچکی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ ڈیرن فورڈ اور اس کی گرل فرینڈ ایلی اب یہاں پہنچ چکے ہیں۔ ہما کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ ایک بہت بڑی کارروائی ہے جو ہوئی ہے۔ نیوز پیپرز اور الیکٹرانک میڈیا پر یقیناً تہلکہ مچ چکا ہوگا۔ ایک ارب پتی شخص کے ایسے اغوا سے بے شمار لوگ سکتہ زدہ ہوں گے۔

میں نے کہا۔ ''ہما! اب آئندہ کیا ہوگا؟''

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ ''ڈیرن صاحب اب راے کے شکنجے میں آگئے ہیں۔ اب پکی بات ہے کہ ان کے ساتھ کافی ڈھیس پٹاس ہوگی۔ اب ڈیرن صاحب کی زبان کا تالا کھل کررہے گا۔''

''کیا ہے اس تالے میں؟'' میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''وہی جس نے میم مائرہ اور راے جی کو پریشان کررکھا ہے۔ وہ مُٹھے بدھے تجربے کرنے پر مجبور ہورہے ہیں۔''

''کیا یہ ڈاکٹر شاوالا کوئی معاملہ ہے؟''

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ ''تم نے میرے ساتھ بھی ضرور کوئی ڈھیس پٹاس کرادینی ہے۔ خیر ڈرتی شرتی تو میں ہوں نہیں۔ جو دل میں آئے وہی کرتی ہوں۔''

''تو پھر کرو نا دل کی۔''

اس نے اپنی آواز کچھ اور پست کرلی اور رازداری کے انداز میں بولی۔ ''تمہیں یہ سن کر ضرور بہت حیرانی ہوگی کہ یہ ڈیرن صاحب اور میم مائرہ، میاں بیوی رہے ہیں۔''

''اوہ...... یہ تو انکشاف ہے...... تو اب طلاق ہوچکی ہے؟''

''طلاق تو چھوٹی شے ہے...... باقاعدہ دشمنی ہوچکی ہے۔ اٹ کتے کا ویر۔''

''وجہ؟''

''وجہ وہی جو تمہیں بتائی ہے۔ یہاں جو بھی چیز بن رہی ہے، وہ کوئی دوا ہے یا ویکسین۔ میرا اندازہ تو یہی ہے کہ اس دوا کی بنائی کا پورا طریقہ میم مائرہ اور راے جی کے پاس نہیں ہے...... اور شاید ان کے پاس بھی نہیں ہے جن کو

پکڑ کر یہاں لایا گیا ہے۔ یعنی ڈیرن صاحب اور وہ لڑکی۔ وہ لڑکی تو خیر ڈیرن صاحب کی وجہ سے اس رگڑے میں آگئی ہے۔ ڈیرن صاحب کی اصل ساجھے دار تو وہ موٹو جاپانی ہے جو ہیلی کاپٹر پر ان سے ملنے آئی تھی۔ کہتے ہیں وہ بھی ارب پتی عورت ہے اور دوائیوں شوائیوں کے کاروبار میں ہے۔"

"کہیں تم یہ تو نہیں کہنا چاہ رہی ہو کہ یہ دوا یا ویکسین بنانے کا کچھ طریقہ میم مائرہ اور رراے کے پاس تھا اور کچھ ڈیرن اور جاپانی یوزوکی کے پاس؟"

"کچھ ایسا ہی چکر چلا ہے یہاں...... میم مائرہ اور ڈیرن صاحب میں جب ناچاقی ہوئی اور ڈھیس پٹاس کے بعد گل بات علیحدگی تک پہنچنے لگی تو میم مائرہ کچھ خاص کاغذ وغیرہ لے کر ڈیرن صاحب کے گھر سے نکل آئی۔ وہ اپنی طرف سے پورے کاغذ لے کر آئی تھی پر افراتفری میں وہ کچھ کاغذ وہیں چھوڑ آئی۔ یہ سارا چکر یہی تھا۔"

میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ "تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب یہ دونوں پارٹیاں اپنے اپنے طور پر ویکسین تیار کرنے کی کوشش کر رہی ہیں مگر پورا طریقہ یا فارمولا کسی کے پاس نہیں ہے......؟"

"میری چھوٹی سی عقل میں تو یہی بات آرہی ہے ڈپٹی صاحب!"

"تم فلموں میں ضرور فیل ہوئی ہو ہما...... لیکن تمہاری عقل چھوٹی نہیں ہے۔ دبنگ عقل اور دبنگ طبیعت والی...... عورت ہو تم......"

"ہوں تو "عورت" نا۔" اس نے فوراً میری بات پکڑی۔ "یہی تو رونا ہے اس فلم ڈرامے کا۔ بائیس سال کی لڑکی اور پچیس چھبیس سال کی عورت۔ میں تو پھر کچھ زیادہ عمر کی ہی ہوں۔"

"اچھا، کوئی نئی تازی سناؤ۔" میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"نئی تازی یہ ہے کہ ایک اچھی خبر ہے۔" وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "وہ جن دو لڑکیوں کی شامت آنے والی تھی، ان کو رراے جی نے معاف کر دیا ہے یا یوں کہہ لو کہ فی الحال معاف کر دیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"وہی جو نحس قسم کا چکر چلنے والا تھا۔ دونوں کُڑیوں کو نابینا کرنے والا اور پھر ان کو رراے جی کے آگے ڈالنے والا۔ سچی کہتی ہوں، مجھے بہت زیادہ دکھ تھا اس کا۔"

"پر یہ چھٹکارا ہوا کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"سچی گل ہے کہ اس کی مجھے بھی سمجھ نہیں آئی۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید میم مائرہ نے ہی ان دونوں بیچاریوں پر ترس کھایا ہے اور رراے جی کو کچھ سمجھایا ہے۔"

"لیکن ان کی آنکھوں میں تو دوا ڈالنا شروع کر دی تھی تمہاری ملازمہ فرزانہ نے۔"

"فرزانہ تھوڑی ڈال رہی تھی۔ وہ تو جیسے ڈاکٹر کہہ رہا تھا، ویسے کر رہی تھی۔ شکر ہے کہ یہ کام چھیتی ہی رک گیا نہیں تو پورا پورا ڈھیس پٹاس ہو جانا تھا دونوں کی آنکھوں کا۔ اب بھی دونوں بیچاریوں کو کچھ دھندلا دھندلا نظر آرہا ہے۔ شاید کوئی عینک شینک لگانا پڑے گی۔"

میں نے دل میں سوچا...... میم مائرہ ایسی رحم دل لگتی تو نہیں ہے۔ سرخ بالوں کے نیچے اس کی پیشانی پر ہر وقت ایک سفاک چمک جھلک دکھاتی تھی۔ کوئی وجہ ہوگی جس کے سبب ان لڑکیوں کی آنکھوں کو بخشا گیا (یہ عقدہ دو روز بعد کھلا کہ اصل بات کیا ہوئی ہے)

☆☆☆

اس پُر آسائش اپارٹمنٹ میں ہم چاروں علیحدہ علیحدہ کمروں میں رہائش پذیر تھے۔ بہر طور ہماری حیثیت قیدیوں کی سی تھی۔ دو دن پہلے میرے اور عمران کے علاوہ ماہین اور حشام کے ویڈیو بیان بھی ریکارڈ کیے گئے تھے جس میں ہم نے اپنے لواحقین کو بتایا تھا کہ ہم بالکل خیر خیریت سے ہیں اور اپنی مرضی سے کسی "اہم کام" کے لیے اپنے قریبی دوستوں میں موجود ہیں۔ جلد ہی ہماری واپسی ہو جائے گی۔ میم مائرہ کے بقول یہ پیغامات ہمارے اپنوں تک پہنچا دیے گئے تھے۔

مجھے زیادہ فکر ماہین کی طرف سے ہی تھی۔ کچھ بھی تھا، وہ ایک لڑکی تھی۔ اس کی غیر موجودگی زیادہ مسائل پیدا کر سکتی تھی۔ وہ اس صورتِ حال پر بہت فکر مند تھی۔ رہی سہی کسر حشام کے رویّے نے پوری کر دی تھی۔ حقیقتاً ایسا ہی لگتا تھا کہ وہ شادی سے پہلے ہی ایک شوہر کی طرح اس پر اپنا حق جتانا شروع ہو گیا ہے۔ میں نے حشام کو اپنے پاس بلایا اور سمجھانے کی کوشش کی۔

"دیکھو حشام! ہم اس وقت مصیبت میں ہیں۔ عمران کے ساتھ تمہاری اور ماہین کی کھٹ پٹ اس مصیبت میں اضافہ کرے گی۔"

وہ بوجھل لہجے میں بولا۔ "انکل تابش! میں نے قسم کھائی تھی کہ اب ماہین کو کسی بات پر ٹوکوں گا اور نہ کبھی اس سے بحث کروں گا۔ میں ہر طرح سے اسے خوش رکھنا چاہتا

تھا...... اور اب بھی یہی چاہتا ہوں...... لیکن......'' وہ بات مکمل نہ کرسکا اور اس کی آنکھوں میں جھلاہٹ اور غصے کی سرخی سی دوڑ گئی۔

''شاید تم کہنا چاہتے ہو کہ عمران کی موجودگی تمہیں پریشان کرتی ہے؟''

''یہ...... یہ میرے بس میں نہیں ہے انکل......! میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔ کسی کا سایہ بھی اس پر برداشت نہیں کرسکتا۔''

میں اس موقع پر حشام سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ بھی اسی طرح اس سے محبت کرتی ہے مگر یہ سوال حشام کو مزید بھڑکاتا۔ میرا اپنا تجزیہ یہی تھا کہ ماہین حشام کے سلسلے میں محبت سے زیادہ تعلق اور وفاداری کی اسیر تھی۔ حشام کے نامناسب اور سخت رویّوں کو بھی وہ فقط اس لیے برداشت کرتی تھی کہ وہ ایک عرصہ تک منگیتر رہے ہیں اور اس تعلق میں بڑوں کی مرضی بھی شامل تھی۔ دوسری طرف عمران تھا جو پانی کے ایک تند ریلے کی طرح اس کی ہستی سے ٹکرایا تھا اور اسے اندر سے لرزہ براندام کردیا تھا۔ وہ عمران کے لیے بہت خاص جذبات رکھنا شروع ہوگئی تھی۔ تو کیا ان جذبات کو محبت کہنا چاہیے تھا؟ اگر یہ محبت تھی تو پھر حشام کے ساتھ کیا تھا؟ کیا ایک عورت دو محبتیں کرسکتی ہے؟ پھر مجھے ماہین کی خالہ کی وہ باتیں یاد آئیں جو ایک روز اس نے بڑی اُلجھن کے عالم میں مجھ سے کی تھیں۔ اس نے کہا تھا۔ ''کسی وقت اسے لگتا ہے کہ ماہین کے اندر کوئی شدید قسم کی کشمکش چل رہی ہے۔ وہ جو شادی کے نام سے بھی بدکتی تھی، اب کہنے لگی ہے کہ حشام کے ساتھ اس کی شادی جلد سے جلد کردی جائے۔''

چند روز پہلے رامے نے میرے ساتھ جو مارپیٹ کروائی تھی، اس کے سبب گھٹنے پر کچھ زیادہ ہی چوٹ آگئی تھی۔ یہ چوٹ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ اس کو ٹریٹمنٹ کی ضرورت تھی۔ میم مائرہ کے کہنے پر مجھے عمارت کے اسپتال والے پورشن میں لے جایا گیا۔ میرے ہاتھ اب باندھے نہیں جارہے تھے۔ ان لوگوں کو یقین تھا کہ جب تک میرے ساتھی ان کی تحویل میں ہیں، میں کوئی مہم جوئی نہیں کرسکتا۔

مجھے اسپتال کے ایک کمرے میں بٹھادیا گیا۔ ڈاکٹر کے آنے میں شاید ابھی کچھ دیر تھی۔ میں اس کا انتظار کررہا تھا جب کسی قریبی کمرے سے رونے چلّانے کی آوازیں آئیں۔ یہ آوازیں مدھم تھیں مگر سنی جارہی تھیں۔ کوئی لڑکی انگلش میں منت سماجت کررہی تھی۔ ''پلیز...... پلیز......! ایسا مت کریں...... یہ بالکل غلط ہے۔ اُف...... چھوڑیں مجھے...... فار گاڈ سیک......'' وہ دوہائی دے رہی تھی پھر اس نے مدد کے لیے کسی کو پکارا۔ میں نے غور سے سنا۔ وہ ڈیرن کا نام لے رہی تھی۔

اب میرے لیے شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ وہی خوب صورت امریکی لڑکی تھی جو ارب پتی بزنس مین ڈیرن فورڈ کے ساتھ پکڑ کر یہاں لائی گئی تھی۔

کیا پوچھ گچھ کے لیے اس پر تشدد ہورہا تھا یا پھر کوئی اس سے زور زبردستی میں مصروف تھا؟ لیکن کچھ بھی تھا، یہ اسپتال کا ایریا تھا۔ یہاں اس طرح کا کیا ہوسکتا تھا۔ لڑکی کی دوہائی پھر سنائی دی۔ ''اسے پیچھے ہٹاؤ مجھ سے...... میرے قریب نہ لاؤ۔''

''یہ تو ہونا ہی ہے۔'' بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ ''آرام سے بھی ہوجائے گا اور شور شرابا کرنے سے بھی...... اور یہ تمہاری بہتری کے لیے ہی ہے۔''

اسی دوران میں میرے گھٹنے کی مرہم پٹی کرنے والی لیڈی ڈاکٹر بھی آگئی۔ اس نے کمپاؤنڈر کی مدد سے میرے زخم کو صاف کیا۔ اسپیشل بینڈیج کی اور ایک انجکشن بھی لگایا۔ یہ اینٹی بائیوٹک تھا۔ یہ مقامی ڈاکٹر مجھ سے کچھ ڈری ڈری نظر آرہی تھی۔ میں نے پوچھا تو وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''بھئی، آپ جیسے لوگوں سے ڈرنا تو چاہیے...... ڈاکٹر جاذبہ کی کمر کا کباڑا ہوگیا ہے۔ ٹھیک طرح سے بیٹھ بھی نہیں سکتی۔''

''اور جو کچھ اُس نے میرے ساتھ کیا تھا، وہ بھی آپ لوگوں کو پتا ہی ہوگا۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور مجھے ادویات کے بارے میں ہدایات دے کر باہر چلی گئی۔

کسی قریبی کمرے سے اُبھرنے والی آوازیں اب تھم چکی تھیں تاہم میرا ذہن مسلسل ان میں اُلجھا ہوا تھا۔ ہلکی نیلی آنکھوں والی وہ ایلی نامی لڑکی بڑی تیز طرار لگتی تھی مگر یہاں آکر اس کی ساری طراری ہوا ہوچکی تھی۔ نہ جانے کس مصیبت میں تھی۔

میں اپنے اپارٹمنٹ کی طرف واپس آگیا۔ گارڈز نے اسٹیل کے سلائڈنگ ڈور کو ان لاک کرکے مجھے اندر پہنچایا اور دروازہ پھر مقفل کردیا۔ میں لنگڑاتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا تو وہاں ہما عروج پہلے سے آئی بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ بتارہا تھا کہ اس کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔ رسمی

کلمات کے بعد وہ بولی۔ ''خدا جانے تمہیں پتا ہے یا نہیں...... یہاں کسی سفر کی تیاری ہو رہی ہے۔''

''کیسا سفر؟''

''یہ تو ابھی ٹھیک سے مجھے بھی نہیں پتا مگر کوئی لمبا چکر ہی لگتا ہے۔ کہیں دور جانے کا پروگرام ہے۔ میم مائرہ اور رائے جی میں کل چار پانچ گھنٹے گل بات ہوئی ہے پھر ایک ملازم سے نقشہ وغیرہ بھی منگوایا تھا انہوں نے۔''

''ہو سکتا ہے کہ ڈیرن فورڈ سے پوچھ گچھ میں انہیں کسی اہم بات کا پتا چلا ہو۔''

''میرا اپنا خیال بھی یہی ہے۔ اندر ہی اندر کوئی کھچڑی پک رہی ہے۔''

اگر واقعی کہیں جانے کا پروگرام ہوا تو کون جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''ظاہری گل ہے، وڈے لوگ ہی جائیں گے...... یعنی میم مائرہ اور رائے جی۔'' پھر وہ ذرا ٹھٹکی اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''رائے جی سے ایک اور گل یاد آ گئی...... اور کوئی معمولی نہیں، بڑی ڈھیں پٹاس قسم کی گل ہے۔'' ہما کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آنے لگا۔

''کیا ہوا رائے جی کو؟''

''رائے جی کو نہیں، کسی اور کو ہوا ہے...... میں کئی واری سوچتی تھی کہ میم مائرہ اور ڈیرن صاحب میں طلاق کیوں ہوئی؟ اتنا امیر کبیر بندہ میم مائرہ کے ہتھ سے نکل گیا...... اب اس گل کا پتا چل رہا ہے کہ اس کی وجہ یہی چالاک چلتر کڑی تھی جس کا نام ایلی ہے۔ اب یہ ایلی کے کرتوت بھی دیکھو۔ ڈیرن صاحب اس کے باپ کی عمر کا ہے اور وہ اس سے ویاہ رچانے کے چکر میں تھی۔ بہر حال اب وہ میم مائرہ کے ہتھے چڑھ چکی ہے اور میرا خیال ہے کہ میم مائرہ نے اس سے بڑا ڈاڈھا بدلہ لیا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

ہما اپنی آواز مزید دھیمی کر کے بولی۔ ''جہاں تک میری سوچ کے گھوڑے دوڑتے ہیں، مجھے لگتا ہے کہ رائے جی کا دھیان اس کڑی ایلی کی طرف لانے میں کچھ نہ کچھ ہتھ میم مائرہ کا بھی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ رائے اس لڑکی ایلی کے پیچھے پڑ گیا ہے؟''

''پیچھے تو وہ کسی کے بھی پڑ سکتا ہے پر اب اس کا پیچھے پڑنا کچھ اور طرح کا ہو چکا ہے۔'' ہما نے ذرا توقف کیا اور دائیں بائیں دیکھ کر بولی۔ ''میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میری دونوں کڑیوں (لڑکیوں) کی جان رائے جی سے چھوٹ گئی ہے۔ اب ان کی آنکھوں میں دوا شوا نہیں ڈالی جائے گی۔''

''ہاں...... اور تمہیں حیرانی بھی تھی۔''

''اب وہی کام اس انگریز کڑی ایلی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھیں بس اب آٹھ دس دن کی پروہنی (مہمان) ہیں۔''

میرے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کچھ دیر پہلے کی وہ داد و فریاد بھی یاد آئی جو میں نے اسپتال کے کمرے میں سنی تھی۔ تو اس کا مطلب تھا کہ آج کل خوبرو ایلی کو اسی سفاک عمل سے گزارا جا رہا ہے جس سے پندرہ بیس روز میں بینائی ختم ہو جاتی ہے۔ اپنی بدنمائی کو صیغۂ راز میں رکھنے کے لیے یہ شیطان صفت جادو رائے کی ایسی اختراع تھی جس پر جتنی بھی لعنت بھیجی جاتی، کم تھی۔

ایک دن ہما عروج نے مجھے بتایا تھا کہ آنکھوں میں وہ مہلک ڈراپس ڈالنے سے کسی بھی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی پھر ایلی کیوں چلا رہی تھی؟ وجہ غالباً یہی تھی کہ اسے پتا چل چکا تھا کہ یہ ڈراپس اس کی آنکھوں کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔

☆☆☆

کئی دن اور گزر گئے مگر سفر کے بارے میں کوئی نئی بات سننے میں نہیں آئی۔ میرے گھٹنے کی چوٹ کافی بہتر ہو گئی تھی۔ عمران زیادہ وقت اپنے کمرے میں بندرہ کر گزار رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ حشام اسے دیکھ کر خوامخواہ ٹینشن میں چلا جاتا ہے۔ ہاں، کسی وقت وہ میرے کمرے میں ضرور چلا آتا اور اپنی باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتا رہتا۔ اس کا خیال بھی یہی تھا کہ اندر ہی اندر کوئی پلان بن رہا ہے۔ میری طرح اس کے ذہن میں بھی یہ سوال بار بار اٹھتا تھا کہ یہ جاپانی اسکالر ڈاکٹر شاکون ہے؟ زندہ ہے یا مر چکا ہے اور اس سارے معاملے سے اس کا کیا تعلق ہے؟

حشام بہت سینٹی مینٹل ٹائپ کا بندہ تھا۔ کسی وقت اتنا اچھا لگتا کہ حیرانی ہوتی مگر کچھ ہی دیر بعد اتنے بُرے رویّے کا مظاہرہ کرتا کہ طیش آنے لگتا۔ اب پھر وہ محبت سے ماہین کے آگے پیچھے گھومتا نظر آتا تھا۔ عمران کے ساتھ اس کی بس واجبی سی بات ہی ہوتی تھی البتہ میرے ساتھ کھل کر بات کر لیتا تھا۔ ایک روز میں اپنے بند کمرے میں مختلف ورزشیں کر رہا تھا کہ دروازے پر شائستہ دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے حشام اور ماہین کھڑے تھے۔

کچھ دیر تک عمومی گفتگو ہوتی رہی پھر حشام نے

انکشاف کیا۔ ”میں نے انٹر کام پر دو تین دفعہ میم مائرہ سے بات کی ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ بات چیت آپ کی اجازت کے بغیر ہوئی۔“

”چلو کوئی بات نہیں۔“ میں نے کہا اور دل میں سوچا کہ اور کون سے کام ہیں جو تم یہاں میری اجازت سے کرتے ہو۔

حسام نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ اس نے میم مائرہ سے ہم چاروں کی رہائی کی بات کی ہے۔ اسے یقین دلایا ہے کہ ہماری رہائی ان لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ رہائی کے بدلے اس نے اپنی طرف سے میم مائرہ کو ایک خطیر رقم کی پیشکش بھی کی ہے۔

میں سمجھ گیا کہ وہ ایک احمقانہ حرکت کا مرتکب ہوا ہے پھر بھی میں نے پوچھا کہ اس کی اس ”سفارت کاری“ کا کیا نتیجہ نکلا ہے۔ وہ ماہین کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”میں وہی بات بتاؤں گا جو ہوئی ہے۔ میم مائرہ نے آپ اور عمران کے بارے میں صاف جواب دے دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ لوگ آپ دونوں سے کوئی خاص کام لینا چاہ رہے ہیں۔ شاید آپ کو اپنے ساتھ یہاں سے کہیں لے جانا چاہ رہے ہیں۔“

”اور تم دونوں کے بارے میں کیا کہا ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔

”وہ کہتی ہے کہ اس بارے میں سوچا جاسکتا ہے مگر ابھی نہیں، بعد میں...... مگر جب اس نے آپ دونوں کے بارے میں صاف انکار کر دیا تو پھر میں نے اس بارے میں اس سے مزید کوئی بات نہیں کی۔“

میں نے دھیان سے حسام کی طرف دیکھا۔ مجھے لگا کہ پہلے تو نہیں لیکن اب وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس نے اپنے اور ماہین کے حوالے سے میم مائرہ کی منت سماجت بھی کر ڈالی ہو۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنے کا خواہاں تھا۔ ظاہر ہے کہ یہاں ہمارے لیے کئی طرح کے خطرات تھے۔ دوسرے عمران کی وجہ سے بھی ہر وقت اُس کی دم پر پاؤں آیا رہتا تھا۔

جو کچھ حسام بتا رہا تھا، وہ میرے لیے اتنا اہم نہیں تھا جتنی یہ بات اہم تھی کہ وہ میرے اور عمران کے متعلق میم مائرہ کے کمنٹس بتا رہا تھا۔ کیا واقعی مائرہ اور جادو والے ہم سے کوئی کام لینا چاہ رہے تھے۔ ابھی تک اس بارے میں کوئی بات ہمارے سامنے تو نہیں آئی تھی۔

مزید چار پانچ روز گزرے اور پھر ایک دن وہ سب

نخریلی بیوی

جیک چوری کے الزام میں پکڑے جانے کے بعد جج کے پاس پیش ہوا۔

جج نے سوال کیا۔ ”اس بات کو تم قبول کرتے ہو کہ تم نے تین بار کپڑے کی دکان میں چوری کی؟“

”جی جناب میں قبول کرتا ہوں۔“ جیک نے جواب دیا۔

جج نے پھر سوال کیا۔ ”کیا تم بتانا گوارا کرو گے کیا چیز تم نے تین بار چوری کی؟“

جیک نے جواب دیا۔ ”عالی جناب! میں نے عورتوں کی ایک شرٹ چوری کی۔“

”صرف ایک شرٹ؟“ جج نے پوچھا۔ ”مگر تم نے تو تین بار ایک دکان میں چوری کی؟“

”جی جناب میں تین بار دکان میں داخل ہوا۔ دو بار میں دکان میں اس لیے گیا کہ چرائی ہوئی شرٹ واپس کر دوں۔“

”واپس شرٹ؟ میں سمجھا نہیں۔“ جج نے کہا۔

جس پر جیک نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی میری بیوی گلوریا کو شرٹ کا ڈیزائن پسند نہیں آیا اسی لیے دو بار بدلنے گیا تھا کہ تیسری بار پکڑا گیا۔“

کچن کے اصول

حامد تازہ تازہ کالج گریجویٹ ہوا تھا۔ اس سلسلے میں ایک بڑی کمپنی میں نوکری کی درخواست دی۔

انٹرویو کے لیے کمرے میں داخل ہوا تو مالک نے حامد کو دیکھتے ہی کہا۔

”ہماری کمپنی کے اصولوں میں ایک اصول یہ ہے کہ کام کرنے والے کو صاف ستھرا رہنا ضروری ہے اور میں امید کرتا ہوں تم سے کہ جب تم میرے کمرے میں داخل ہوئے تو تم نے اپنے جوتے کو باہر رکھے پائدان پر اچھی طرح رگڑ کر صاف کر لیا ہوگا؟“

”جی جناب میں نے ایسا ہی کیا۔“ حامد نے جواب دیا۔

”اس پر مالک نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ایک اور چیز میں بتاتا چلوں کمپنی کے اصولوں کے مطابق سچ بولنا بہت ضروری ہے۔ اور دروازے کے باہر کوئی پائدان نہیں ہے، تمہاری اطلاع کے لیے۔“

(جاوید کاظمی، کراچی)

کچھ سامنے آ گیا جس نے ہمیں زچ کر رکھا تھا۔ ہما عروج مجھ سے ملنے آئی۔ وہ چھوٹتے ہی سرگوشی کے لہجے میں بولی۔ ''ڈپٹی جی! تم اور وہ منڈا عمران تیاری پکڑ لو۔ تم دونوں میم اور رائے جی کے ساتھ کہیں جا رہے ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اب مہینا ڈیڑھ مہینا تم دونوں یہاں نظر نہیں آؤ گے۔''

''جا کہاں رہے ہیں؟''

''یہ تو مجھے چنگی طرح پتا نہیں چل سکا پر میم مائرہ اور رائے جی کے درمیان ہونے والی بڑی خاص قسم کی گل بات میرے کانوں میں پڑی ہے۔ دونوں میں ٹھیک ٹھاک بحث ہو رہی تھی۔ میم مائرہ پر تم دونوں کا بہت رعب پڑ گیا ہے۔ وہ رائے جی کو سمجھا رہی تھی کہ تم دونوں بہت کام کے بندے ہو۔ بہت فائدہ دے سکتے ہو آگے جا کر۔ رائے جی کا دل تم دونوں کی طرف سے صاف نہیں ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ تم دونوں کی وجہ سے ان کے قریبی سنگی ساتھی ایبٹ آباد میں مارے گئے تھے...... جاذبہ کی بہن کا خون بھی ہوا تھا۔ وہ ان موتوں کو بھول نہیں سکتا۔ رائے جی نے یہاں تک بھی کہا کہ تم دونوں کو زندہ سلامت چلتے پھرتے اور کھاتے پیتے دیکھنا ان کے لیے ایک عذاب کی طرح ہے۔''

''تو پھر سوچ کیا رہا ہے۔ مار ڈالے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ میم مائرہ کا ہی جگرا ہے کہ اس نے کسی نہ کسی طرح رائے جی کو رام کیا ہے۔ وہ تم دونوں اور خاص طور سے تمہاری دلیری سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ عمران کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ وہ جو آواز سنے بغیر بات سمجھنے کا فن جانتا ہے، وہ ان کے لیے کہیں نہ کہیں فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس بارے میں تو رائے جی کا خیال بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔''

ہما عروج کی باتیں سنسنی پیدا کر رہی تھیں۔ میں نے ہما سے پھر دریافت کیا۔ ''تم نے اتنا کچھ سنا لیکن یہ اندازہ نہیں لگا سکی ہو کہ وہ کہاں جانے کی بات کر رہے ہیں؟''

''تمہیں بتایا تھا نا کہ چند دن پہلے ایک نقشہ ان دونوں کے سامنے تھا۔ سوچ کے گھوڑے تو یہی کہتے ہیں کہ یہ جگہ پاکستان سے باہر ہوگی شاید...... ہاں، ایک گل اور یاد آئی۔ ان دونوں کی باتوں میں گرم کپڑوں، خاص طرح کے دستانوں اور جرابوں وغیرہ کا ذکر بھی ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی بہت ٹھنڈی ٹھار قسم کی تھاں (جگہ) ہو۔''

ہما کی باتیں میری دھڑکن میں اضافہ کر رہی تھیں۔ ذہن بھی نسبتاً تیزی سے مصروفِ عمل تھا۔ میں نے دبے لہجے میں کہا۔ ''ہما! یہ سفید سانپوں کا کیا چکر ہے؟ یہاں پر اس رنگ کے سانپ موجود ہیں۔''

''مجھے اس بارے میں اتنا پتا نہیں...... ہاں، یہ کہا جاتا ہے کہ کئی دواؤں میں سانپ کا زہر استعمال ہوتا ہے۔ باقی اللہ دیاں، اللہ جانے۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ بھی کوئی سانپ وغیرہ کا چکر ہی ہو۔ بہت ٹھنڈے علاقوں میں اس قسم کے سفید سانپ پائے جاتے ہیں۔''

''مجھے تو بس کالے سانپ کا پتا ہے جو اپنے آسے پاسے کی ہر سوہنی زنانی کو ڈس لیتا ہے۔'' وہ اداسی سے مسکرا کر معنی خیز لہجے میں بولی جیسے موضوع بدلنا چاہ رہی ہو۔

''کہیں تم جادو رائے کا ذکر تو نہیں کر رہیں؟''

''اور کس کا کروں گی۔ وہ ڈیرن صاحب کی ساتھی لڑکی...... کیا نام ہے اُس کا...... ایلی...... کل رات ڈسی گئی نا۔''

مجھے شاک محسوس ہوا۔ ہم دونوں کچھ دیر خاموش رہے۔ ایلی کے بارے میں، میں کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن پھر بھی جو کچھ ہوا، اس کا دکھ تھا۔ پہلے پندرہ بیس روز میں بتدریج اس کی بینائی ختم کی گئی پھر اسے بدنما و بدفطرت جادو رائے کے آگے ڈال دیا گیا۔ بیوٹی اینڈ بیسٹ سے ملتی جلتی کہانی تھی یہ۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔ ''ہما! کیا تمہارا یہ جادو رائے اس طرح اپنی بدصورتی چھپا پاتا ہوگا؟''

''کیا کہا جا سکتا ہے ڈپٹی جی...... ! لیکن ایک گل تو ہے۔ رائے کی آواز بہت سوہنی ہے۔ لگتا ہے محمد علی یا امیتابھ بچن جیسا کوئی ایکٹر بول رہا ہو۔ کسی وقت تو نشیلے پان سے مست ہو کر گانا شانا بھی گنگنانے لگتا ہے۔ ایلی کی طرح جس کڑی نے کبھی اس کو دیکھا نہ ہو، وہ تو اس کی آواز سن کر یہی سمجھے گی کہ پتا نہیں کتنا سوہنا بندہ ہے۔''

''تم نے بھی کبھی سنا ہوگا اس کا گانا؟'' میں نے روانی میں پوچھا۔

اس کے خوبصورت چہرے پر کراہت نمودار ہو گئی۔ ناک چڑھا کر بولی۔ ''کاش، صرف گانا ہی سنا ہوتا۔''

نوجوان خوبرو ایلی کا سراپا میری نگاہوں میں گھوما اور افسردگی بڑھ گئی۔ ''کیا وہ دوبارہ بھی دیکھ پائے گی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو کوئی ڈاکٹر ہی بتائے گا۔ فی الحال تو وہ پوری پوری اندھی ہے۔ پچھلے اتوار کو رو رہی تھی۔ فرزانہ نے مجھے

بتایا انگریزی میں کہہ رہی ہے کہ نظر بالکل بند ہونے سے پہلے میں ایک بار کھلی تھاں (جگہ) پر جانا چاہتی ہوں۔ آسمان دیکھنا چاہتی ہوں...... پھل بوٹوں پر نظر ڈالنا چاہتی ہو......'' کچھ توقف کر کے ہما نے دوبارہ کہا۔ ''میم مائرہ نے ڈھاڈا بدلہ لیا ہے اُس سے۔ ڈیرن صاحب تو کیا ملنا تھا اسے، آنکھیں بھی گئیں...... اور عزت بھی۔''

اگلے تین چار روز میں وہی کچھ ہوا جس کا ہمیں اندازہ تھا (میں عمران کو بھی وہ سب کچھ بتا چکا تھا جو ہما عروج سے مجھے معلوم ہوا تھا) ایک روز میم مائرہ نے میرے اور عمران کے ساتھ طویل نشست کی۔ اس نے صاف لفظوں میں ہمیں بتایا کہ یوں تو اس کے اور رامے کے پاس بھی ایک سے بڑھ کر ایک جی دار اور جانباز بندے ہیں مگر ہم دونوں نے ڈیرن اور ایلی کو یہاں لانے میں جس طرح کی کارکردگی دکھائی ہے، وہ بہت متاثر کن ہے۔

اس تمہید کے بعد اس نے کہا۔ ''میں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھوں گی۔ صاف بات کروں گی۔ پچھلے دنوں تم دونوں نے رامے جی اور ان کے قریبی ساتھیوں کے ساتھ جو کچھ کیا، وہ رامے جی کے دل و دماغ پر نقش ہے۔ وہ تمہیں مارنے کا تہیہ کر چکے تھے اور موت بھی کوئی معمولی نہیں۔ یہ ایسی موت ہوتی جس میں بندہ خود موت کے لیے ترستا ہے اور فریادیں کرتا ہے۔ بہر حال میں تفصیل میں جا کر تمہیں ڈرانے دھمکانے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ مختصر یہ ہے کہ میں رامے کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوئی ہوں کہ اگر تم ایک اہم ٹارگٹ کے حصول میں نیک نیتی سے ہمارا ساتھ دو تو رامے جی، ماہین سمیت تم چاروں کو مناسب وقت پر آزاد کر دیں گے...... نہ صرف آزاد کریں گے بلکہ عداوت کا وہ مہلک رشتہ بھی ختم ہو جائے گا جو اس وقت بے حد خطرناک کے ساتھ تمہارے درمیان موجود ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میم مائرہ! آپ اصل بات کی طرف آئیں گی تو ہم کچھ کہہ سکیں گے۔''

میری اس بات کے جواب میں مائرہ نے جو کچھ کہا اور جو نتیجہ ہمیں نے اخذ کیا، وہ کچھ یوں تھا۔

......میم مائرہ اور جادو رامے پوری تیاری کے ساتھ یہاں سے کہیں جانا چاہ رہے تھے۔ اس نے جگہ کی نشاندہی نہیں کی تاہم وہ کوئی بہت سرد جگہ تھی اور ہمیں وہاں پہنچنے میں نو دس دن لگتے۔ اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ یہ جگہ پاکستان میں ہے یا پاکستان سے باہر ہے۔ ہاں، یہ ضرور کہا کہ یہ سفر اسی زندگی بخش ویکسین کے سلسلے میں ہے جس کی تکمیل یہاں اس نامعلوم عمارت اور یہاں کی لیبارٹری میں کی جا رہی ہے۔ مائرہ کا کہنا تھا کہ طب کی تاریخ میں یہ ویکسین ایک بہت بڑا انقلاب ہو گی۔ لوگ ششدر رہ جائیں گے...... وغیرہ وغیرہ۔

مائرہ کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ویکسین کے فارمولے میں غالباً کوئی کمی ہے جس کو پورا کرنے کے لیے یہ سفر اختیار کیا جا رہا ہے۔ کوئی خاص قسم کا زہر تھا یا پھر کوئی جڑی بوٹی تھی جو کسی مخصوص علاقے میں پائی جاتی تھی۔ یہ بات بھی سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ جو چیز بھی تھی، اس کے حصول میں سنگین قسم کا خطرہ پوشیدہ تھا۔ عین ممکن تھا کہ کچھ لوگوں سے ٹکراؤ کا اندیشہ بھی ہو۔

دیکھا جاتا تو فی الوقت میں اور عمران کسی بھی طرح کی سودے بازی کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ خاص طور سے ماہین اور حشام کے یہاں ہوتے ہوئے ہمارے ہاتھ مکمل طور پر بندھے تھے۔ جادو رامے ایک خونخوار شخص کا نام تھا۔ وہ ماہین اور حشام کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

بہر طور ایک شرط ایسی تھی جو میں اور عمران، میم مائرہ سے منوانے میں کامیاب رہے۔ پہلے ہم دونوں نے ایک طرف جا کر مشورہ کیا پھر میم مائرہ سے کہا کہ اس کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ اس سفر سے واپسی میں ہمیں ڈیڑھ ماہ سے زائد لگ سکتا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس عرصے میں ہمارے دونوں ساتھی ماہین اور حشام یہیں پر رہیں۔ انہیں آزاد کیا جائے یا ایسی صورت نکالی جائے کہ وہ ہمارے ساتھ جائیں۔

مائرہ عیاری سے مسکرائی۔ ''یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ دونوں تو اس معاہدے کی ضمانت کے طور پر یہاں موجود ہیں اور یہیں رہیں گے۔''

اس بات پر کافی بحث ہوئی۔ آخر مائرہ نے دوسرے کمرے میں جا کر جادو رامے سے مشورہ کیا۔ کھڑکی میں سے وہ ہمیں نظر آ رہی تھی تاہم اس کی ہوشیاری کی داد دینا پڑی۔ بات کرتے ہوئے اس نے اپنا رخ پھیر رکھا تھا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات موجود تھی کہ عمران لپ ریڈنگ کا غیر معمولی ہنر رکھتا ہے۔

ہمیں توقع نہیں تھی کہ جادو رامے سے میم مائرہ کی گفتگو سے ہمیں فائدہ پہنچے گا مگر ایسا ہو گیا۔ میم مائرہ نے واپس آ کر ہمیں بتایا کہ وہ اس سلسلے میں رامے جی کو قائل کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ ہمارے دونوں ساتھی بھی ہمارے ساتھ ہی رہیں گے (وہ کیوں قائل ہوا اور کیسے ہوا؟

اس کا پتا ہمیں کافی آگے جا کر چلا اور تب ہی ہمیں یہ معلوم ہوا کہ جادورا مے کس قدر بے رحم شخص ہے)

☆☆☆

جب دو روز بعد ہم اس نامعلوم پُراسرار عمارت سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ باہر کس قدر سردی ہے۔ بہرحال اردگرد کے مناظر ہم اب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہماری آنکھوں پر وہی آئی ماسک یعنی سیاہ پٹیاں تھیں۔ ماہین اور حشام بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہمیں ایک بار پھر اسی نیم گرم اسٹیشن ویگن میں بٹھایا گیا جس میں ہم اسلام آباد سے واپس لاہور پہنچے تھے۔ اب رات کا وقت تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم محسوس ہوتا تھا۔ میرے اور عمران کے ہاتھ ایک بار پھر پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔ ویگن کی اگلی نشست پر میم مائرہ بھی موجود تھی اور اس کی قدرے مردانہ آہنگ والی آواز گاہے بہ گاہے ہمارے کانوں تک پہنچتی تھی۔ اس کی باتوں سے ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ کم از کم ایک اور گاڑی بھی اس وقت ہمارے ساتھ ساتھ آ رہی ہے۔ غالب امکان یہ تھا کہ اس دوسری گاڑی میں جادورا مے بھی موجود ہے۔

ماہین اور حشام بالکل خاموش بیٹھے تھے البتہ عمران کی زبان میں وقفے وقفے سے کھجلی ہوتی تھی اور وہ کچھ نہ کچھ بولنا شروع کر دیتا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ سفر کافی طویل ثابت ہوگا مگر صرف ایک گھنٹے بعد کسی نیم پختہ راستے پر ہچکولے کھانے کے بعد گاڑی رک گئی۔ ہمیں باہر نکالا گیا۔ سردی نے مزاج پوچھا۔

عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”کوئی دیہاتی علاقہ لگتا ہے۔ ہریالی اور گوبر کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی ہے۔“

”ہریالی کی آ رہی ہے۔ گوبر کی شاید تمہارے دماغ میں ہوگی۔“

”پلیز...... پلیز!“ میم مائرہ کی تیز درشت آواز ایک سرگوشی کی طرح ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ ”کسی کی کوئی آواز نہیں آنا چاہیے۔“

ہم خاموش ہو گئے پھر ایک گارڈ نے میرا اور دوسرے نے عمران کا بازو پکڑ لیا۔ یقیناً ماہین اور حشام کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا کیونکہ ان کی آنکھوں پر بھی پٹیاں تھیں۔ ہم جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان بڑی خاموشی سے قریباً ایک فرلانگ چلے پھر دفعتاً یوں محسوس ہوا کہ سردی کم ہو گئی ہے۔ ہمیں تھوڑا سا جھک کر چلنے کو کہا گیا کیونکہ ہم جس جگہ سے گزر رہے تھے، وہاں چھت بہت نیچی تھی۔

”مجھے یہ کوئی سرنگ لگ رہی ہے۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

عمران بولا۔ ”اور مجھے بارودی سرنگ لگ رہی ہے۔ لگتا ہے کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔“

کسی خطرے کے حوالے سے عمران کا اندیشہ درست نہیں تھا۔ ہم خیر خیریت سے چلتے رہے۔ قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہمارے علاوہ کم و بیش آٹھ دس افراد مزید ہمارے ساتھ چل رہے ہیں۔ اچانک کسی کا پاؤں رپٹا۔ اس کے ساتھ ہی ایک سُریلی کراہ سنائی دی۔ ”اوہ مائی گاڈ!“

میں ایک لحظے میں پہچان گیا۔ یہ اسی امریکی لڑکی ایلی کی آواز تھی جسے میم مائرہ کے مشورے پر جادورا مے نے پہلے نظر سے محروم کیا تھا پھر اپنے تصرف میں لے آیا تھا۔

فوراً ہی جادورا مے کی گرج دار آواز بھی کانوں میں پڑی۔ اس نے لڑکی سے کچھ کہا تھا یا شاید اسے سنبھالا دیا تھا۔

سرنگ نما راستہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ہم مسلسل جھک کر چل رہے تھے اور سر بار بار کھردری چھت سے ٹکرا جاتا تھا۔ بالآخر ایک بار پھر سرد ہوا نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم کھلی جگہ پر تھے۔ جھاڑ جھنکاڑ میں چلتے ہوئے میم مائرہ نے بہت سخت آواز میں سرگوشی کی۔ ”بہت احتیاط سے۔ کوئی آواز نہ نکلے۔“

عمران جوابی سرگوشی سے باز نہیں رہ سکا۔ ”لیکن میم کوئی قدرتی آواز نکل جائے تو......؟ میرا مطلب ہے چھینک وغیرہ۔“

وہ کوئی جواب نہ دے پائی۔ یقیناً اسے گھور کر رہ گئی ہوگی۔ ایک ایک گارڈ نے بدستور ہمارے بازو تھام رکھے تھے۔ ہم کسی بڑی گاڑی کے پاس جا کر رکے تھے۔ یہ کوئی کنٹینر نما شے لگتی تھی۔ ہمیں عقبی دروازے سے کنٹینر پر چڑھایا گیا۔ باسمتی چاول کی تیز خوشبو ہمارے نتھنوں سے ٹکرائی۔ یقیناً اس کنٹینر پر چاول کی بوریاں لوڈ تھیں۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈیڑھ سو کے قریب آٹے کے تھیلے بھی ہیں۔ اسی سامان کے درمیان قریباً پانچ ضرب چھ فٹ کی جگہ ہمارے بیٹھنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ ہم سے میری مراد میں، عمران، حشام، انچارج بہروز تھے۔ بعد ازاں گونگا فورمین جہاناں بھی ہمارے ساتھ آ گیا۔ ماہین ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ روانگی سے

پہلے ہی میم مائرہ نے ہمیں بتادیا تھا کہ وہ ہمارے بجائے اس کے ساتھ سفر کرے گی۔ ہمارے درمیان جو ایگریمنٹ ہوا تھا، اس کے مطابق مائرہ نے ہر طرح ماہین کے تحفظ کی ضمانت دی تھی۔

کنٹینر کے گھپ اندھیرے میں پہنچ کر ہماری آنکھوں سے نہ صرف پٹی ہٹادی گئی بلکہ عمران اور حسام کے ہاتھ بھی کھول دیے گئے۔ صرف میرے ہاتھ ابھی تک بندھے ہوئے تھے۔

عمران نے بہروز سے پوچھا۔ ''یہ ہم کس جگہ پائے جارہے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''ہمیں کچھ بھی بتانے کی اجازت نہیں اور بہتر یہی ہے کہ آپ خاموشی سے سفر کرو ورنہ ہمیں آرڈر ہے کہ آپ کی آنکھیں دوبارہ باندھ دیں۔''

عمران نے تعریف طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''ملاحظہ کیا آپ نے؟ میں کہتا تھا نا کہ میں زبان سے کم بات کرتا ہوں، میری نگاہیں زیادہ بولتی ہیں۔ میری اسی ادا پر مہوش حیات مری تھی۔ اس نے بھی کہا تھا کہ تم بہت بولتے ہو عموجی! تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ دینی چاہیے۔''

یہ کنٹینر ایک بار چلنا شروع ہوا تو پھر چلتا ہی چلا گیا۔ کچھ اندازہ نہیں ہورہا تھا۔ کسی وقت لگتا تھا کہ ہم پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی طرف جارہے ہیں۔ کسی وقت افغانستان کا شبہ ہونے لگتا تھا۔ باسمتی چاول کی خوشبو مسلسل ہمارے دماغ کو چڑھ رہی تھی مگر یہ کچے چاول تھے، ہماری بھوک نہیں مٹا سکتے تھے۔ سردی نے مجھے تو بہت عرصہ پہلے تنگ کرنا چھوڑ دیا تھا لیکن باقیوں کی حالت ابتر تھی۔ خاص طور سے حسام کی۔ وہ ناز و نعم میں پلا ہوا امیر زادہ، ماہین کی نگاہوں میں جی دار بنتے بنتے سخت مصیبت میں آپھنسا تھا۔

خدا خدا کر کے ایک جگہ یہ کنٹینر رکا۔ بہروز نے اپنی گھڑی دیکھ کر بتایا کہ دن کے بارہ بجے ہیں۔ یہ کوئی بارونق جگہ ہی تھی۔ باہر سے مدھم آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں مگر اتنی مدھم تھیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ٹریفک کا ہلکا سا شور خاص طور سے گاڑیوں کے ہارن سنائی دیتے تھے۔ یکایک میں اور عمران بری طرح چونکے۔ کہیں پاس سے ہی کسی لاؤڈ اسپیکر پر بلند آواز ابھری اور ہلکی ہو کر اندر تک پہنچی۔ یہ سکھوں کے گیت کرتن کی آواز تھی جو کسی گوردوارے سے ابھری تھی۔

''تو کیا ہم ننکانہ صاحب یا حسن ابدال کے آس پاس ہیں۔'' میں نے سوچا۔ یہی سوال میں بہروز سے پوچھنا چاہتا تھا مگر اس کے چہرے کی خشونت دیکھ کر چپ رہا۔ اسی دوران میں کنٹینر کے عقبی حصے سے کسی کی آواز آئی۔ آٹے کی دو تین سفید بوریاں ہمارے سامنے سے سرکائی گئیں۔ گرما گرم دال چاول اور مچھلی کی خوشبو ہمارے نتھنوں تک پہنچی۔ کسی نے دو بڑے شاپر اندر کھسکا دیے۔ کچھ دیر کے لیے جو خلا نمودار ہوا اس میں سے میری نظر گزر کر سامنے ایک سڑک پر پڑی۔ لوگ آجا رہے تھے۔ سرما کی زرد کمزور دھوپ تھی۔ سامنے ہی ایک دکان کا بڑا سا بورڈ نظر آرہا تھا ''گلزار ریسٹورنٹ۔'' نیچے پتا لکھا تھا۔ ''اسٹریٹ نمبر 8 جیوا روڈ...... پٹھان کوٹ۔''

''پٹھان کوٹ!'' میں نے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا۔

شبہے کی گنجائش نہیں تھی۔ سڑک پر جس طرح کی گاڑیاں گزر رہی تھیں اور جو راہگیر نظر آرہے تھے۔ وہ یہ بتانے کے لیے کافی تھے کہ ہم پاکستان میں نہیں...... نہ ہی افغانستان میں بلکہ انڈیا میں ہیں۔ لاہور اور لائن آف کنٹرول سے بہت دور پٹھان کوٹ میں۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں وہ تنگ راستہ آیا جس میں سے جھک کر چلتے ہوئے ہم کل رات گزرے تھے۔

تو کیا وہ بارڈر پر موجود ان خفیہ سرنگوں میں سے کوئی ایک تھی جو اسمگلرز اور دیگر جرائم پیشہ افراد غیر قانونی آمد و رفت کے لیے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ جواب اثبات میں تھا۔ ہم لاہور سے نکل کر بڑے ڈرامائی اور خطرناک انداز میں انڈیا پہنچ گئے تھے۔ مائرہ اور را نے وہی کچھ کیا تھا جو اکثر کریمنل کرتے ہیں۔

میم مائرہ جو گفتگو کرتی رہی تھی، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سفر کسی سخت سرد علاقے میں ختم ہوگا۔ پٹھان کوٹ تو بہت زیادہ سرد نہیں۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ابھی ہمیں کافی آگے جانا ہے۔ عمران میرے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ مجھے کوئی اہم بات معلوم ہوئی ہے۔

شام تک مزید سفر کرنے کے بعد ہم کسی عمارت کے احاطے میں رکے۔ ہمیں کنٹینر سے باہر نکالا گیا۔ یہاں بلند چار دیواری تھی اور چاروں طرف پہاڑی علاقوں والے درخت تھے۔ سردی بلا کی تھی۔ ہمارے سانس بھاپ کی صورت خارج ہورہے تھے۔ یہاں احاطے میں ایک اور بڑا کنٹینر بھی ہمارے ساتھ ہی آکر رکا تھا۔ یقیناً اس میں سے

جادو رائے و دیگر افراد نکل کر عمارت کے اندرونی حصے میں جا چکے تھے۔ مجھے اور عمران کو دائیں بائیں دیکھتے پا کر میم مائرہ سردی سے سکڑی سمٹی میرے پاس آئی اور بولی۔ ''ماہین کے بارے میں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ پوری حفاظت سے میرے پاس ہے۔''

میرے ہاتھ ابھی تک بندھے تھے۔ میں نے دوپہر کا کھانا بھی عمران کی مدد سے کھایا تھا۔ میں نے مائرہ سے کہا۔ ''یہ کیسا مشترکہ مشن ہے جس میں، میں ''ساتھی'' بھی ہوں اور ''قیدی'' بھی؟''

وہ کچھ دیر تک میری آنکھوں میں دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں رائے سے مشورہ کرتی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ کل آگے روانگی سے پہلے، صبح تمہارے ہاتھ کھول دیے جائیں۔''

وہ برفیلی رات میں، عمران اور حشام نے ...... ایک کمرے میں گزاری جہاں کوئلوں والی انگیٹھی دہک رہی تھی۔ عمران اور حشام کو بھی اب یہ سمجھ آچکی تھی کہ وہ غیر قانونی طور پر انڈیا میں ہیں۔ آگے کیا ہونے والا تھا اس کی کچھ خبر نہیں تھی۔

صبح سویرے وعدے کے مطابق میرے ہاتھ کھول دیے گئے۔ رات سے اب تک ہم مسلسل چار مسلح گارڈز کی نگرانی میں تھے۔ یہ چاروں مقامی گارڈز تھے اور ان میں سے دو سکھ تھے۔ یقیناً یہ لوگ مائرہ اور رائے کے لیے سہولت کاری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انچارج بہروز نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے سخت آہنگ میں کہا۔ ''میم کا آرڈر ہے کہ اپنی ضروریات سے اچھی طرح فارغ ہولو۔ اگلے اٹھارہ بیس گھنٹے تک ہم کہیں رکیں گے نہیں۔''

صبح گیارہ بجے کے لگ بھگ اسی بند کنٹینر میں آٹے اور باسمتی کی خوشبو کے درمیان ہمارا انوکھا سفر پھر شروع ہوا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے، یہ کنٹینر جیسے برف کا غار بنتا گیا۔ حشام کے ہاتھ پاؤں نیلے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ عمران کے لیے چپ رہنا مشکل ہورہا تھا۔ کراہتے ہوئے بہروز سے مخاطب ہوا۔ ''بہروز خان! مجھے لگتا ہے کہ میرا آخری وقت آگیا ہے۔ کیا میں دل میں حسرت لیے ہی دنیا سے چلا جاؤں گا؟ مجھے آخری سانس تک پتا ہی نہ چل سکے گا کہ میں جا کہاں رہا تھا؟''

''لداخ!'' بہروز کھٹاک سے بولا۔ ''مگر لداخ میں سفر ختم نہیں ہوگا، وہاں سے آگے ہمیں پیدل جانا ہوگا۔''

''پپ ...... پیدل ...... اور وہ بھی اتنی ٹھنڈی جگہ پر...... پھر تو بہتر ہے کہ میں راہی عدم ہونے میں زیادہ تاخیر نہ کروں۔'' وہ اسی مختصر جگہ پر گھٹنے اٹھا کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے کچھ بڑبڑانے لگا جیسے کلمے کا ورد کر رہا ہو۔ حشام کے سوا سب کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ حتیٰ کہ گونگے جہانے کے ہونٹ بھی بے ساختہ مسکرانے والے انداز میں کھنچ گئے۔ لداخ والے انکشاف نے مجھے بھی حیرت زدہ کر دیا تھا۔

یہ سفر واقعی بہت طویل، سرد اور صبر آزما تھا۔ لداخ کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ اس کا شمار ہندوستان کے سرد ترین علاقوں میں ہوتا ہے۔ کچھ ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں ٹمپریچر منفی 25 درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ اس ہلاکت خیز سردی میں یہ ٹولا کس چیز کی تلاش میں جا رہا تھا؟

بہروز نے اٹھارہ بیس گھنٹے کا کہا تھا مگر ہمارا یہ دشوار گزار سفر جو کہیں کہیں بہت سست بھی تھا، کم و بیش 24 گھنٹے جاری رہا۔ کنٹینر سے باہر نکلے تو دنیا ہی اور تھی۔ کنٹینر اگر برف کے غار کی طرح تھا تو باہر برف کے سمندر جیسا تھا۔ نہایت گرم کپڑوں کے باوجود ہڈیوں میں گودا جمنا شروع ہوگیا۔ دن کے بارے بجنے والے تھے۔ حدِ نگاہ تک برف کی سفیدی نظر آتی تھی۔ آسمان گہرا نیلا تھا جس پر کہیں کہیں بادلوں کی سفید ٹکڑیاں تیرتی نظر آتی تھیں۔ دور شمال مغرب کی طرف کچھ برف پوش بلندیاں تھیں جن کے بارے میں بعدازاں معلوم ہوا کہ وہ کارگل کی چوٹیاں تھیں۔

دوسرا کنٹینر بھی رک چکا تھا۔ اس مرتبہ میں نے اس میں سے جادو رائے کو برآمد ہوتے دیکھا۔ اپنے ٹھگنے قد، گول مٹول جسم اور سیاہ رنگت کے ساتھ اسے باہر آتے دیکھ کر ایسا ہی لگا جیسے کوئی شیطانی قوت اس برف زار پر قدم رنجہ فرما رہی ہے۔ اس کے عقب میں دراز قد ہما عروج تھی جو رائے کی موجودہ منظورِ نظر ایلی کو سہارا دے کر لا رہی تھی۔ خوبرو ایلی کی ہلکی نیلی آنکھیں بظاہر بالکل بھلی چنگی تھیں مگر ان کی بینائی جادو رائے کی سفاکی کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ رائے کی سفاکی اور میم مائرہ کی منتقم المزاجی۔ بظاہر یہی پتا چلتا تھا کہ ماضی قریب میں جب میم مائرہ نے دیکھا کہ نوجوان و خوبصورت ایلی اس کے شوہر ڈیرن کے قریب آچکی ہے تو میم اور ڈیرن میں طلاق ہوگئی۔ اب اسی طلاق کا خمیازہ ایلی کو یہ بھگتنا پڑ رہا تھا کہ وہ اپنی بینائی اور عزت دونوں سے محروم ہوئی تھی۔ عورت کے بغیر رہنا رائے جیسے شخص کے لیے ممکن نہیں تھا لہٰذا ایلی یہاں بھی اس کے ساتھ تھی۔

کنٹینرز سے بہت سا سامان اتارا جا رہا تھا جن میں خیمے، خوراک کی پیٹیاں، پانی کے کین اور پتا نہیں کیا کچھ شامل تھا۔ ایک جانب بہت سے خچر بھی کھڑے نظر آرہے تھے۔ پندرہ بیس مقامی پورٹرز بھی تھے۔ مقامی اور پاکستانی گارڈز کی تعداد آٹھ تھی جن میں سے زیادہ کے پاس چھوٹی نال کی آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔

خچر مال برداری کے لیے تھے تاہم ان میں سے تین چار خچر بڑے سائز کے تھے اور خاص نسل کے لگتے تھے۔ پتا چلا کہ یہ جادورامے، میم مائرہ اور ایلی وغیرہ کی سواری کے لیے ہیں۔ بعد ازاں میم مائرہ کی طرف سے ماہین کو بھی ایک خچر پر سواری کی پیشکش کی گئی لیکن ماہین نے کہا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلنا پسند کرے گی۔

جادورامے کی گونج دار آتشیں آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ اپنے پان رنگے ہونٹوں کے ساتھ تڑخ کر بولا۔ ''یہ تمہاری والدہ کا آنگن نہیں ہے جہاں اپنی مرضی چلاؤ گی۔ تمہیں خچر پر بیٹھنا ہوگا اور ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔'' پھر وہ اپنے خطرناک انچارج گارڈ بہروز سے مخاطب ہوا۔ ''باندھ دو اس کی ٹانگ سے۔''

پہلے تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا باندھنے کا کہہ رہا ہے البتہ جلد ہی سمجھ میں آگیا اور اس کے ساتھ ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد برفیلی لہر دوڑ گئی۔ یہ قریباً چھ انچ مربع کی براؤن ڈبیا تھی جو اونچائی میں چار انچ رہی ہوگی۔ اس پر سرخ رنگ کی ایک چھوٹی سی لائٹ اسپارک کر رہی تھی۔ یقیناً یہ کوئی طاقتور بم تھا۔

بہروز، ہما عروج کے ساتھ آگے بڑھا۔ ہما عروج نے ایک قینچی کی مدد سے ماہین کی نیلی جینز کا پائنچہ تھوڑا سا کاٹا اور جینز کو گھٹنے سے اوپر تک چڑھا دیا۔ رائفل بدست گارڈز ہمارے اردگرد چوکس کھڑے تھے۔ ہما اور بہروز نے براؤن رنگ کی وزنی ڈبیا ماہین کے گھٹنے سے اوپر ایک لاسٹک بیلٹ اور بکل کے ذریعے یوں چسپاں کی کہ اسے اتارنا ممکن نہ رہا۔ مزید احتیاط کے طور پر اس کے اوپر چوڑی پلاسٹک ٹیپ کے بہت سے بل دے دیے گئے۔

جادورامے نے مجھے اور عمران کو ایک ساتھ ایک چھوٹا سا سیاہ ریموٹ کنٹرول دکھایا اور بولا۔ ''یہ میرے پاس رہے گا۔ ایسا ہی ایک دوسرا بہروز خان کے پاس ہے۔ اس چھوکری کی زندگی بس اسی وقت تک ہے جب تک تم انسان کے بچے بن کر چلتے رہو گے۔'' رامے کے لہجے میں ایک آتش دہکتی تھی۔

ماہین بالکل گم صم سی ہم سے دس پندرہ قدم کی دوری پر کھڑی تھی۔ یہ احساس بے حد اذیت ناک ہوتا ہے کہ ایک بارودی شے ہمارے جسم سے پیوست ہے اور کسی بھی وقت ایک ساعت شکن دھماکے سے ہمیں موت کے سفر پر روانہ کرسکتی ہے۔ ماہین کی زخمی ہتھیلی پر ابھی تک سفید پٹی نظر آرہی تھی۔ وہ کچھ کمزور بھی دکھائی دیتی تھی۔

مجھے وہ گھڑی یاد آئی جب سفر پر روانگی سے پہلے ہم نے مائرہ سے کہا تھا کہ ہم ماہین اور حسام کو یہاں چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ مائرہ نے پہلے انکار کیا تھا لیکن پھر رامے کے ساتھ مشورے کے بعد اچانک مان گئی تھی۔ اس آمادگی کی ہلاکت خیز وجہ اب سمجھ میں آرہی تھی۔ عمران کی آنکھوں میں بھی گہرا کرب کروٹ لے رہا تھا۔ ماہین کی کسی بھی تکلیف پر یہ بے پناہ کرب خود بخود اس کی آنکھوں میں جھلک دکھانے لگتا تھا۔

☆☆☆

انتہائی سرد موسم میں سفر کے وہ چار دن ناقابل فراموش تھے۔ یہاں برف کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ نہ کہیں کوئی درخت نہ آبادی کا نشان۔ منجمد ڈھلوانیں تھیں یا ایسی چھوٹی چھوٹی جھیلیں تھیں جن کا پانی جم کر پتھر ہو چکا تھا۔ رات کے وقت تو درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بیس پچیس درجے نیچے تک گر جاتا تھا۔ ان خاص قسم کے خیموں اور ہمارے لباسوں کے باوجود کسی وقت جسم سردی سے اکڑتا محسوس ہوتا تھا۔ چوتھے دن سارا وقت ہم نے خچروں سمیت ایک برفیلی ڈھلوان پر چڑھتے ہوئے گزارا۔ اب یوں محسوس ہوتا تھا کہ خچروں کی ہمت بھی جواب دیتی جارہی ہے۔ جس خچر پر ماہین سوار تھی، ہماری نگاہ ہمہ وقت اسی پر لگی رہتی تھی۔ پیدل چلنے کی نسبت جانوروں پر سواری زیادہ مشکل تھی۔ دونوں طرف گہری کھائیاں نظر آنے لگی تھیں۔ ماہین کی طرف سے ہمیں دوسرا اندیشہ اسی ''موت'' کا تھا جو ایک چوکور ڈبیا کی صورت اس کی ٹانگ سے چسپاں تھی۔ وہ چھوٹا ریموٹ میں نے دیکھا تھا جو ہمہ وقت بہروز خان کی چیسٹ پاکٹ میں رہتا تھا۔ اس کے اوپر سلائڈ کرنے والا سیفٹی کور موجود تھا پھر بھی کسی اتفاقی بلاسٹ کا اندیشہ کلی طور پر رد نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اسی شام وہ خچر ڈھلوان پر بری طرح پھسلا جس پر میم مائرہ سوار تھی۔ خچر کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور مائرہ کو بھی معمولی چوٹیں آئیں۔ اب واضح ہو رہا تھا کہ خچر زیادہ دیر ہمارا

ساتھ نہیں دے سکیں گے۔

اگلے روز ایسا ہی ہوا۔ ہم اس طویل ڈھلوان کے بالائی سرے پر پہنچ چکے تھے جس پر پچھلے دو روز سفر کرتے رہے تھے۔ اب آگے نشیب تھا جس پر خچر دو قدم نہیں چل سکتے تھے۔ برفانی ہواؤں میں رات وہیں پر کیمپنگ کی گئی۔ اگلے روز پروگرام کے مطابق نصف سے زائد پورٹرز اور ان کے تمام خچر واپس چلے گئے۔ صرف سات آٹھ ماہر ترین پورٹرز (مال بردار مزدور) اور گارڈز ہمارے ساتھ رہے اور آگے کا پیدل سفر شروع ہوا۔ ہم میں سے ہر ایک کے ہاتھوں میں برف پر چلنے والی اسٹکس تھیں اور ہم بہت سنبھل سنبھل کر اتر رہے تھے۔

عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''لگتا ہے یہ بدبخت رامے ہمیں اسی طرح چلاتا چلاتا بحر منجمد شمالی تک لے جائے گا۔ اللہ کرے یہ یہیں کہیں پھسلے اور کسی ایسی کھائی میں گرے جہاں ایک بھوکا برفانی چیتا پہلے سے موجود ہو۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ یہاں ہمارے سوا کوئی ذی روح موجود ہی نہیں ہے۔'' میں نے میلوں تک پھیلی برف کو دیکھ کر کہا۔

عمران سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''یہ انڈیا کے سرد ترین علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ ویرانی کے لحاظ سے بھی یہ برفستان دنیا میں شاید دوسرے نمبر پر ہے۔''

''اپنے وطن کے بارے میں تمہاری معلومات کافی ہیں۔''

''دیکھیں، آپ پھر میری دُم پر پاؤں رکھ رہے ہیں۔ میرا وطن یہ نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو میں کترینہ کیف، عالیہ بھٹ اور دیپکا جیسی نازنینوں کی کرم فرمائیاں چھوڑ کر اور کروڑوں کے بزنس کو لات مار کر پاکستان کیوں آتا؟''

میں نے کہا۔ ''آہستہ بولو اور احتیاط سے بولو۔ یہ نہ ہو کہ اس قافلے میں تمہارے جیسا کوئی اور لپ ریڈر بھی موجود ہو اور وہ جان جائے کہ تم انڈیا کے ہو۔''

''تو آپ کیا سمجھتے ہیں، لپ ریڈر ایسے ہی یہاں وہاں پڑے مل جاتے ہیں۔ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے...... بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں سنیل دت پیدا...... ویسے اداکارہ نرگس نے اتنے سال رونے کے باوجود کوئی اچھا انتخاب نہ کیا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

میں نے دور اُفق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''روشنی کم ہوتی جارہی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ برف باری شروع ہونے والی ہے۔''

''لگ تو مجھے بھی یہی رہا ہے۔'' عمران نے اپنی اونی ٹوپی کانوں تک کھینچتے ہوئے کہا۔

دس پندرہ منٹ کے اندر ہلکی برف باری شروع ہوگئی پھر بتدریج اس میں اضافہ ہوا۔ اب قیام ضروری ہوگیا تھا۔ جادو رامے اور میم مائرہ کے آرڈر پر ایک ہموار جگہ خیموں کے لیے منتخب کرلی گئی۔ خیمے ایستادہ ہوئے تو برف باری سے بچنے کے لیے سب خیموں میں جا گھسے۔ میم مائرہ اور رامے کے ٹینٹ اسپیشل قسم کے تھے اور نسبتاً کشادہ بھی۔ ایلی، جادو رامے کے ساتھ اس کے ٹینٹ میں ہوتی تھی۔ بے شک عورت کی قربت جادو رامے کی مجبوری بلکہ ناگزیر مجبوری بن چکی تھی۔ وہ بغیر کسی جھجک کے اعلان کرتا تھا کہ اسے ہمہ وقت عورت کی ضرورت ہوتی ہے۔ گئے برسوں میں اس نے اپنے پیسے کے زور پر ہر طرح کی عورتوں سے تعلق قائم رکھا تھا۔ اسے یہ فکر کبھی نہیں ہوتی تھی کہ اس کی بدنمائی سے جنم لینے والی کراہت سے فریق ثانی پر کیا گزرتی ہے مگر پھر چند ماہ پہلے نابینا چاندنی اس کی زندگی میں آئی تھی۔ اس کے ساتھ رامے کا تعلق کسی کراہت کے بغیر پروان چڑھا تھا۔ چاندنی تو نہیں رہی تھی مگر اب رامے کو اسی نوعیت کے تعلق کی ضرورت تھی جس میں فریق ثانی میں کراہت اور خوف نہ ہو بلکہ کسی نہ کسی درجے کی خودسپردگی ہو۔ یقیناً اب وہ یہی کچھ ایلی میں ڈھونڈنے کی کوشش کررہا تھا۔

ہمارے خیمے میں میرے ساتھ عمران اور حشام کے علاوہ ایک سکھ گارڈ منوہر سنگھ کو بھی جگہ ملی تھی۔ منوہر سنگھ تیس بتیس سال کا ایک صحت مند شخص تھا۔ بلا کا نشانے باز بھی تھا۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ تبتی زبان کے علاوہ ایک دو مقامی بولیاں بھی جانتا تھا۔ شاید اسے گارڈز میں شامل کیے جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

برف باری جاری تھی۔ شام کے فوراً بعد ہم نے ٹن پیک کھانے کو گیس اسٹوو پر خیمے کے اندر ہی گرم کیا۔ چکن قورمہ، حلیم اور چاول وغیرہ تھے۔ بالکل ایسا لگتا تھا کہ ابھی دس منٹ پہلے کسی ریسٹورنٹ سے کھانا لایا گیا ہے۔ نیند ابھی آنکھوں سے بہت دور تھی۔ منوہر سنگھ ہمیں اس علاقے کے بارے میں مختلف باتیں بتانے لگا۔ وہ کچھ عرصہ فوج میں بھی رہا تھا اور اس کی تعیناتی انہی علاقوں میں تھی۔ بعدازاں اپنی

گھریلو مجبوریوں کے سبب اسے نوکری چھوڑنا پڑی تھی۔
منوہر کی باتیں دلچسپ تھیں۔ ایک موقع پر اس نے کہا کہ اس دور دراز علاقے میں ایک دو ایسی برادریاں آباد ہیں جن کے افراد یہاں سے بہت کم باہر نکلتے ہیں۔ یہ لوگ اسکیموز کی طرز پر برف کے گھروں میں رہتے ہیں۔ ان کا زیادہ تر دار و مدار شکار پر ہی ہوتا ہے۔ سال میں صرف ایک مرتبہ کچھ لوگ یہاں سے باہر نکلتے ہیں اور اناج وغیرہ لاتے ہیں اور کبھی کبھی یہ تکلیف بھی نہیں کرتے۔

''ایک اور بڑی دلچسپ بات بھی سنی جاتی ہے۔'' منوہر اپنی باریک مونچھوں کے نیچے مسکرا کر بولا۔ ''کہتے ہیں کہ یہاں الٹی گنگا بہتی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔ ''یہاں گنگا کہاں سے آ گئی؟''

''محاورہ بول رہا ہوں بادشاہو!'' منوہر نے طویل ڈکار لے کر کہا۔ ''سنا ہے کہ اس برادری میں عورتوں کا زیادہ سکہ چلتا ہے۔ شکار اور اس طرح کے زیادہ سخت کام عورتیں ہی کرتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مرد نسبتاً سست اور کاہل ہو گئے ہیں اور زیادہ تر ایسے ہیں جو عورتوں کے کہنے پر چلتے ہیں۔''

''تم نے بس سنا ہی ہے یا دیکھا بھی ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''جب حاضر سروس تھا تب ایک دو ایسے بندوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہم لوگوں سے کافی مختلف لگتے تھے۔'' منوہر نے چند لمحے توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے شک پڑ رہا ہے کہ ہم اس علاقے سے زیادہ دور نہیں ہیں جہاں یہ ایک یا دو برادریاں آباد ہیں۔''

ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ میں نے عمران کو چونکتے دیکھا۔ پھر مجھے بھی چونکنا پڑا۔ کچھ دور افتادہ آوازیں ہماری سماعت تک پہنچی تھیں۔ جیسے ایک یا دو عورتیں چلائی ہوں اور پھر کسی نے بھاری مردانہ آواز میں کچھ کہا ہو۔ ہمارا خیمہ چونکہ ذرا ڈھلوان پر تھا اس لیے آوازیں ہم تک پہنچ گئی تھیں۔ ایک عورت کی آواز دوبارہ ابھری تو میں اور عمران خیمے سے باہر نکل آئے۔ برف کے گالے ہمارے چہروں سے ٹکرائے اور سردی کی لہریں جسم کے ننگے حصوں پر برچھیوں کی طرح لگیں۔ گارڈ منوہر سنگھ بھی ہمارے پیچھے آیا۔ ہماری طرح اس کے پاس بھی فی الحال کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ بس ایک ٹارچ تھی جس کی وجہ سے ہم نشیب کی طرف راستہ دیکھنے میں کامیاب ہوئے۔ اترائی میں ایک برفیلے تودے کے عقب میں ہمیں کچھ ہیولے نظر آئے جو ایک دوجے سے دست و گریباں تھے۔ لوہا ٹکرانے کی آوازیں بھی آئیں۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ چھوٹے دستے والی کلہاڑیاں تھیں۔ بڑی ٹارچ کے روشن دائرے میں ہمیں فوراً علم ہو گیا کہ دو مرد، تین عورتوں پر حملہ آور ہیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک مرد کی کلہاڑی ایک عورت کے سر میں دھنس گئی۔ وہ عورت ایک دلدوز کراہ کے ساتھ نشیب میں لڑھک گئی۔ مردوں میں سے ایک دراز قد تھا، دوسرا درمیانے قد کا۔ درمیانے قد والے نے ایک عورت کو اڑنگا لگا کر گرایا اور اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ کلہاڑی کے پے در پے وحشیانہ وار کر کے اس نے چند سیکنڈ میں عورت کے چہرے کا بھرتا بنا دیا پھر وہ اپنے ساتھی کی مدد کو لپکا جو تیسری عورت سے گتھم گتھا تھا۔ درمیانے قد والے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ قریب پہنچتے ہی کلہاڑی کا وحشیانہ وار تیسری عورت کے سر پر کرے گا اور اس کا بھی خاتمہ بالخیر کر دے گا۔

میں لپک کر اس کے سامنے آیا مگر وہ تو ایسے جنون میں تھا کہ لگا اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں، نہ ہی ٹارچ کی اس روشنی کو نوٹس کیا ہے جو اُن سب پر پڑ رہی ہے۔ مجھے جھکائی دے کر اس نے اپنے ہدف کی طرف بڑھنا چاہا تاہم اس کا بایاں بازو میری گرفت میں آ گیا۔ میں نے گرفت نرم نہیں پڑنے دی اور اسے گھما کر دور پھینک دیا۔ دوسری طرف عمران تیسری عورت کی مدد کو پہنچ گیا تھا۔

درمیانے قد والا حملہ آور گرنے کے بعد مجھ پر یوں جھپٹا جیسے کوئی خونخوار درندہ معمولی زخمی ہونے کے بعد شکاری پر آتا ہے۔ اس کی پھرتی حیران کن تھی۔ اس نے شاید تین چار سیکنڈ میں مجھ پر کلہاڑی کے درجن بھر مہلک وار کر ڈالے۔ میں نے جس طرح خود کو ان حملوں سے بچایا، مجھے ہی معلوم تھا۔ ایک دو بار تو کلہاڑی کا تیز دھار پھل میرے چہرے کو چھوتا ہوا گزرا۔ حملہ آور وار کرتے ہوئے چلا بھی رہا تھا اور ان لمحوں میں مجھے شک گزرا کہ شاید وہ عورت ہے...... اور پھر مجھے موقع مل گیا۔ میں ایک وار بچاتے ہوئے نیچے جھکا اور اس کے ساتھ ہی لات چلائی۔ یہ بڑا کارگر وار تھا۔ وہ عورت تھی یا مرد تھا، ہوا میں اڑتا ہوا کوئی پچیس فٹ نیچے ایک برفانی کھائی میں گرا۔

دائیں طرف دیکھا۔ عمران نے دراز قد حملہ آور کو جکڑ کر بے بس کر دیا تھا۔ تیسری عورت برف پر بے سدھ پڑی

تھی۔ ہمارے دیگر خیموں سے بھی لوگ نکل نکل کر ہماری طرف آرہے تھے۔

''ٹارچ لاؤ منوہر!'' میں نے پکار کر کہا۔

منوہر نے ٹارچ کا روشن دائرہ نیچے کھائی میں ڈالا۔ گرتی ہوئی برف اس روشنی میں چمکی اس کے ساتھ ساتھ وہ بے جان جسم دکھائی دیا جو ایک ابھری ہوئی برفیلی چٹان سے ٹکرایا تھا اور بے سدھ پڑا تھا۔ خون کا ایک بڑا دھبا بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹے دستے والی کلہاڑی بھی پڑی تھی۔

''کیا ہے یہ سب؟ یہ سب کیا ہے؟'' میم مائرہ کی چلاتی ہوئی حیران آواز میرے کانوں میں پڑی۔

اس کی طرح دیگر افراد بھی ششدر تھے۔ میں اور منوہر سنگھ احتیاط سے نیچے کھائی میں اترے۔ بے شک وہ عورت ہی تھی۔ عمر پچیس چھبیس سال رہی ہوگی۔ چہرے کے سوا اس کا سارا جسم موٹے سموری کپڑوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے خدوخال تبتی طرز کے تھے اور وہ نہایت مضبوط ہاتھ پاؤں کی دکھائی دیتی تھی۔ پشت کے بل گرنے سے اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے منوہر سنگھ کی طرف دیکھا۔ ''کہیں یہ اس قبیلے سے ہی تو نہیں جس کا ہم ابھی ذکر کررہے تھے۔''

''واہگرو جانے...... لیکن لگتا مجھے بھی ایسے ہی ہے۔''

کھائی سے اوپر اس سفاک عورت کا دراز قد ساتھی گارڈز کی گرفت میں واویلا کررہا تھا۔ وہ نامعلوم زبان میں بول رہا تھا اور کسی وقت دہاڑیں مارنے لگتا تھا۔ برف باری جاری تھی......

☆☆☆

دو عورتیں تو کلہاڑی کی ضربوں سے ماری جاچکی تھیں۔ تیسری بے ہوش تھی۔ عورتوں کو مارنے والی جنگجو عورت خود بھی کھائی میں مردہ پڑی تھی۔ برف باری اب ہلکی ہوگئی تھی۔ ہم گارڈز والے خیمے کے سامنے ناقابلِ بیان سردی میں موجود تھے۔ قاتل عورت کے جس جواں سال ساتھی کو پکڑا گیا تھا، وہ ایک تبتی خدوخال والا نوجوان تھا اور خوش شکل نظر آتا تھا۔ ابھرے ہوئے رخسار، چپٹی ناک۔ اس کے گلے میں گلوبند جیسی کوئی چمکیلی شے تھی۔ وہ کسی جانور کی کھال کے بھاری لبادے میں تھا۔ اسی کھال کا ٹراؤزر نما اس کے زیریں جسم پر تھا۔ میم مائرہ نے منوہر سنگھ سے پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہا ہے؟''

''منوہر بولا۔'' کھائی میں گر کر مرنے والی اس کی بیوی ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اسے مار ڈالا ہے تو مجھے بھی مار دو۔ مجھے زندہ کیوں رکھا ہے؟''

تھوڑی حیرت ہوئی۔ کھائی میں گر کر مرنے والی پچیس چھبیس سال سے کم عمر کی نہیں تھی جبکہ یہ جو خود کو اس کا شوہر بتا رہا تھا، بیس اکیس سال کا تھا۔ ایک چیز ہم نے یہ بھی نوٹ کی تھی کہ ہلاکت خیز لڑائی کے دوران میں اس کی بیوی نے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور جارحیت دکھائی تھی۔ شاید منوہر کا یہ اندازہ درست ہی تھا کہ یہ اسی برادری کے لوگ ہیں جہاں روزمرہ کے معاملات میں عورتیں زیادہ فعال کردار ادا کرتی ہیں۔

اچانک ہم سب کو چونکنا پڑا۔ تاریک برف پر کہیں دور سے کچھ ملی جلی آوازیں آئیں جیسے کچھ لوگ ہماری طرف آرہے ہوں۔ زیادہ چونکانے والی بات یہ تھی کہ انسانی آوازوں کے ساتھ ساتھ ہمیں بھیڑیوں کی دو چار آوازیں بھی سنائی دیں۔ میم مائرہ اور جادورائے سمیت سب ان آوازوں کی طرف متوجہ ہوگئے۔ میں نے دیکھا ٹارچوں کی روشنی میں منوہر سنگھ کا چہرہ زرد دکھائی دیا۔

وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''یہ بھیڑیے کی آواز سن رہے ہیں نا۔ اس کو یہاں لال بھیڑیا کہتے ہیں۔'' واہگرو کرپا کرے لیکن مجھے لگتا ہے کہ ہمارے لیے اور خاص طور پر آپ کے لیے مصیبت آنے والی ہے۔ وہ خطرناک زنانی آپ کے ہاتھوں ماری گئی ہے نا۔''

''اس کے مرنے سے بھیڑیے...... یا لال بھیڑیے کا کیا تعلق؟'' میں نے پوچھا۔

''تعلق ہے جی۔'' وہ لرزاں آواز میں گویا ہوا۔ ''جس برادری کا ہم ذکر کررہے ہیں، ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ لال بھیڑیوں کو اسی طرح پالتے ہیں جیسے ہم کتوں وغیرہ کو پالتے ہیں۔ اگر یہ اسی برادری کے لوگ ہیں تو پھر ان کے نزدیک آپ ہتھیارے ہیں۔''

''مگر میں نے اپنے لیے تو کچھ نہیں کیا۔ ہم نے تو ان عورتوں کو بچانے کی کوشش کی جن پر حملہ ہو رہا تھا۔''

اس سے پہلے کہ منوہر سنگھ جواب میں کچھ کہتا، دو فائر ہوئے جو یقیناً ہوائی فائر تھے۔ ہم نے دیکھا، ڈھلوان پر سے کچھ روشنیاں تیزی سے ہمارے قریب آرہی تھیں۔ یہ درجنوں روشنیاں تھیں۔

سنسنی خیز داستان کے باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیں

سر پھرے

علی عباس

انسان سمندر کے جھاگ کی طرح ہے جو پانی کی سطح پر تیر رہا ہو... جب ہوا چلتی ہے تو وہ اس طرح غائب ہو جاتا ہے... جیسے کبھی تھا ہی نہیں... بالکل اسی طرح ہماری زندگی... موت کے ہاتھوں میں بکھر جاتی ہے... اسلام آباد کی سرد اور برفیلی فضائوں میں گھومتے مفلوک الحال لوگوں کی کسمپرسی... ایک قاتل اجنبی ان کی زندگی کے تعاقب میں سرگرداں تھا۔

ایک صحافی کی ڈائری سے سفاک قاتل کی تلاش کا سنسنی خیز احوال
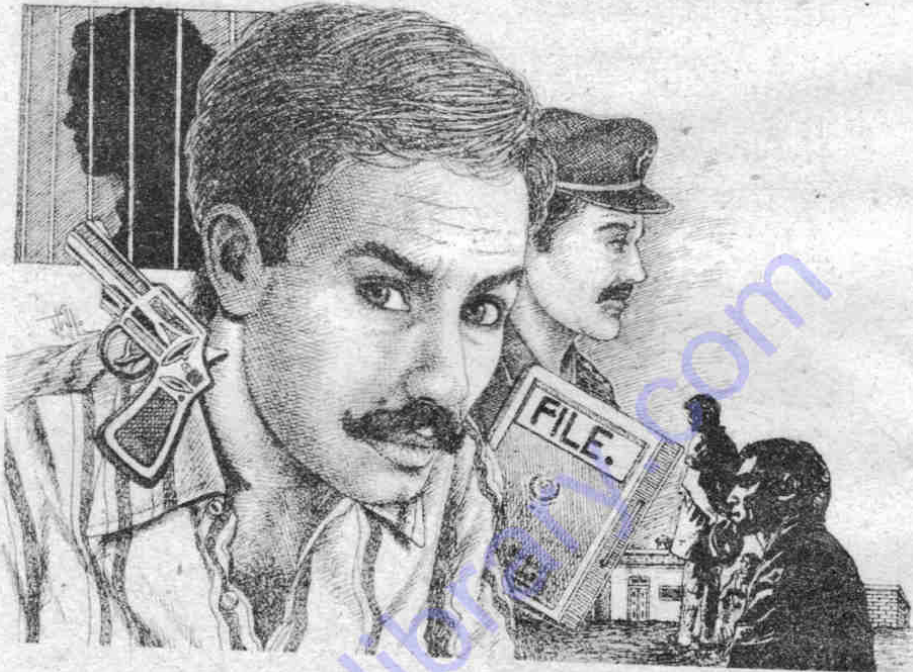
صبح آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے۔ میں عموماً ساڑھے سات بجے جاگ جاتا ہوں مگر اتوار کی رات چونکہ نیو ائر نائٹ تھی تو رات بھر شہر کی سڑکوں پر گشت کرنے کے بعد رات کے تقریباً دو بجے گھر واپسی ہوئی مگر شہر اب بھی جاگ رہا تھا۔ دارالحکومت میں چودہ اگست یا نئے سال کے دن پورا شہر سڑکوں پر اُمڈ آتا ہے اور گھڑی کی سوئی جب بارہ بجاتی ہے تو شہر بھر میں آتش بازی شروع ہو جاتی ہے جب کہ عام دنوں میں شہر پر اُداسی بسیرا کیے رہتی ہے اور تنہائی کا آسیب کسی طور پر جان چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتا۔

میرا بستر چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا مگر گزشتہ ایک ماہ سے ایک کہانی پر کام کر رہا تھا جس نے ایک نیا رُخ اس لیے بھی اختیار کر لیا تھا کہ نیا سال شروع ہونے سے تین روز قبل ہی شہر کے تین مختلف علاقوں میں ٹارگٹ کلنگ کے واقعات ہوئے تھے جن میں تین اور مزدور مارے گئے تھے۔

یہ دسمبر کے مہینے میں اس نوعیت کا چوتھا ایسا واقعہ تھا جس

میں بے بس مزدوروں کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ پولیس اور خفیہ اداروں میں میرے ذرائع مجھے کوئی ٹھوس خبر نہیں دے سکے تھے۔ شہر کے مصروف چوک چوراہوں میں جہاں عام دنوں میں مزدوروں اور کاریگروں کی بڑی تعداد موجود رہتی تھی، وہاں اب ویرانی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

پولیس نے قتل کی اس حالیہ واردات کے بعد ایک بار پھر اس کا الزام دشمن ملک کے خفیہ اداروں پر دھرا تھا مگر میں جانتا تھا کہ پولیس کے علاوہ تمام خفیہ اداروں میں اس معاملے کے حوالے سے کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا جب میری زوجہ کی آواز مجھے حال میں لے آئی جو مجھے ناشتے کی میز پر بلا رہی تھی۔

میں نے ناشتا کیا، تیار ہوا اور دفتر جانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ دفتر میں تمام رپورٹرز میرے ہی منتظر تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میں بن بتائے تو چھٹی نہیں کروں گا۔ میں نے سب کو نئے سال کی مبارک باد دی اور میٹنگ کرنے کے بعد واپس اپنے کمرے کا رُخ کیا۔

میری میز پر جاسوسی ڈائجسٹ کا شمارہ اسی طرح کھلا پڑا تھا جس طرح میں ہفتے کے روز چھوڑ کر گیا تھا کیونکہ مجتبیٰ یہ جانتا تھا کہ مجھے اپنی چیزوں کا میری مرضی کے بغیر چھوئے جانا پسند نہیں ہے۔ یہ دسمبر کا شمارہ تھا جس میں ایک خاص کہانی نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرلی تھی۔

آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں صحافتی حلقوں میں 'جاسوس' کی عرفیت سے مشہور ہوں تو جاسوسی ڈائجسٹ کی میری میز پر موجودگی پر حیران ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ یوں کہہ لیجیے کہ میری اس عرفیت کی ایک وجہ جاسوسی ڈائجسٹ بھی ہے کیونکہ میرا اور اس کا ساتھ ربع صدی سے زیادہ پر محیط ہے۔ میں نے ڈائجسٹ پر سرسری سی نگاہ دوڑائی تو معلوم ہوا کہ تمام کہانیاں تو میں پہلے ہی پڑھ چکا ہوں۔ یہ دسمبر کا شمارہ تھا اور میرے لیے جنوری کے شمارے کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ تھی کہ یہ جاسوسی ڈائجسٹ کا سالگرہ نمبر کے حوالے سے خصوصی شمارہ ہوتا ہے اور ہر کہانی ہی جاندار اور سسپنس سے بھرپور ہوتی ہے۔

میں گہری سوچوں میں کھویا ہوا تھا جب میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ کال کسی انجان نمبر سے آرہی تھی۔ میں نے فون اُٹھایا تو دوسری طرف شہر کی پولیس کے سربراہ احمد لطیف موجود تھے۔ اُن کے لہجے سے پریشانی عیاں تھی۔

''میر حسن صاحب، سرکلر روڈ پر آج پھر دہشت گردی کی واردات ہوئی ہے۔ دو مزدور مارے گئے ہیں۔''

''کیا؟'' میرے لہجے سے تشویش ہویدا تھی۔ ''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

''جی ایسا ہی ہوا ہے اور اس بار بھی قاتل یا قاتلوں نے کوئی سراغ نہیں چھوڑا۔''

''احمد لطیف صاحب، مجھے یہ خبر تو مل ہی جانی تھی۔ آپ نے زحمت کیوں کی؟'' میں نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر براہِ راست سوال کیا۔

''جی۔ آپ درست فرما رہے ہیں۔ آپ کو کال کرنے کا مقصد صرف اس بارے میں خبر دینا نہیں تھا بلکہ میں ذاتی طور پر اس معاملے پر آپ سے مدد چاہتا ہوں۔''

''میری مدد؟ میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

''دیکھیے، ہم نے شہر بھر میں ناکا بندی کر رکھی ہے مگر یہ کوئی بہت ہی منظم گروہ ہے جو ایسی وارداتیں کر رہا ہے اور آپ غالباً جانتے ہی ہوں گے کہ یہ تمام وارداتیں ان علاقوں میں کی گئی ہیں جہاں حکومت نے فی الحال سی سی ٹی وی کیمرے نصب نہیں کیے؟''

''میں جانتا ہوں اور اس معاملے پر فی الحال کسی بھی قسم کی رائے دینے سے قاصر ہوں۔'' میرے لہجے میں طنز نمایاں تھا جسے احمد لطیف صاحب بھی بھانپ گئے۔

''دیکھیے، آپ کی رائے کی میرے لیے بہت زیادہ اہمیت ہے کیونکہ آپ ماضی میں بھی ایسے معاملات کو سلجھا چکے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ آپ اس خبر پر بھی کام کر رہے ہیں۔ اس لیے آپ سے امید کرتا ہوں کہ آپ کو اگر کوئی سراغ ملے گا تو آپ اسے اپنے تک نہیں رکھیں گے۔''

''جی ضرور۔ مگر میری خبروں کا ذریعہ تو عموماً آپ جیسے دوست احباب ہی رہے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میر صاحب' ہمیشہ نہیں۔ شاذونادر ہی ہم نے آپ کی مدد کی ہوگی بلکہ آپ ہی ہمارے کام آتے رہے ہیں اور امید کرتا ہوں کہ اس بار بھی آپ ضرور ان نامعلوم افراد کی شناخت ظاہر کرنے میں ہماری مدد کریں گے۔''

''یہ تو آپ کی مہربانی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس معاملے پر آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں۔''

انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور فون رکھ دیا۔ مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ پولیس 'ڈیڈ اینڈ' پر کھڑی تھی۔ سادہ لفظوں میں یہ کہہ لیجیے کہ پولیس نے اپنے ہاتھ کھڑے کر دیے تھے۔ دوسرے اداروں کی صورتِ حال بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔ میں اس فون کال کے بعد حقیقتاً سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ شہر کی پولیس کا

سربراہ ہی جب بے بس ہو گیا تھا تو میرے لیے ان بھیانک وارداتوں کے ماسٹر مائنڈ تک پہنچنا آسان نہیں تھا مگر میں نے ان بے چہرہ دہشت گردوں کے چہروں سے نقاب اتارنے کا فیصلہ کیا اور دفتر سے نکل کھڑا ہوا۔

یہ واردات شہر کے پسماندہ ترین علاقے میں ہوئی تھی اور میرا رُخ بھی اسی جانب تھا۔ میں جب مرکزی شاہراہ سے اس علاقے کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ پولیس کی گاڑیوں کے علاوہ میڈیا کے نمائندے بھی اس خبر کو 'بریکنگ نیوز' کے طور پر چلانے کے لیے وہاں موجود تھے۔

میں نے براہ راست جائے وقوعہ پر جانے کے بجائے اس علاقے کو جانے والے ایک اور راستے پر گاڑی ڈال لی اور جلد ہی تلوار چوک پر موجود تھا جو جائے وقوعہ کے دوسری جانب تھا۔

دارالحکومت کے کچی آبادی نما اس علاقے میں اگرچہ گزشتہ چند برسوں کے دوران بہت سے ترقیاتی کام ہوئے تھے مگر یہاں اب بھی غربت و افلاس کی جھلک نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی تھی۔ میں نے گاڑی ایک جانب کھڑی کردی۔

میں پیدل چل کر قریب ہی ایک چائے خانے پر پہنچا تو وہاں کھڑے ایک شخص نے میری جانب گھور کر دیکھا۔ وہ یقیناً پولیس اہل کار تھا جو اس علاقے میں مشکوک سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے تعینات کیا گیا تھا۔

میں نے اس کی جانب سرسری نظر سے دیکھا اور چائے خانے کا رُخ کیا۔ چائے کا آرڈر دے کر ارد گرد نظر دوڑانے لگا۔ وہ سادہ لباس میں ملبوس اہل کار کن انکھیوں سے میری جانب ہی دیکھ رہا تھا۔

میں تقریباً نصف گھنٹے تک اس ڈھابے پر موجود رہا اور پھر کافی دیر تک اس علاقے میں بے مقصد گھومتا رہا۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے جب میں نے دوبارہ اس سڑک کا رُخ کیا جہاں یہ واردات ہوئی تھی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ وہاں اب پولیس کی ایک موبائل وین ہی کھڑی تھی۔ علاقے میں ویرانی ہی ویرانی تھی جیسے کسی گاؤں کے ریلوے اسٹیشن پر ٹرین کے گزر جانے کے بعد ہوتی ہے۔

اس وقت میرے دماغ میں ہری بتی جلی جس کے بعد مجھے اب اس خبر پر کام ہی نہیں کرنا تھا بلکہ ان شاطر قاتل یا قاتلوں تک پہنچنا بھی تھا جو ان غریب اور محنت کش مزدوروں کو نشانہ بنا رہے تھے اور ایسا کیوں کر رہے تھے؟ اس سوال کا جواب سردست کسی کے پاس نہیں تھا۔

میں نے گاڑی جائے وقوعہ سے تقریباً نصف کلومیٹر آگے لے جا کر کھڑی کی اور احمد لطیف کو کال بیک کی۔ انہوں نے دوسری بیل پر ہی میرا فون اٹھالیا، گویا وہ میری کال کے ہی منتظر تھے۔ میں نے ان سے تفتیشی افسر سے رابطہ کروانے کے لیے کہا اور انہوں نے میری یہ بات خوشی خوشی مان لی اور کہا کہ پندرہ منٹ میں تفتیشی افسر میرے پاس موجود ہوگا۔ میں سگریٹ سلگا کر پچھلے تمام کیسز کا خاکہ ذہن میں تیار کرنے لگا۔

قتل کی ایسی پہلی واردات شہر کے ایک مضافاتی علاقے میں ہوئی تھی جس میں دو مزدور ہلاک ہو گئے تھے اور قریب کہیں کوئی سی سی ٹی وی کیمرا نصب نہیں تھا۔ وہاں موجود ایک مزدور نے موٹر سائیکل کا نمبر نوٹ کیا تھا جس کے بارے میں بعد میں ہونے والی تفتیش میں یہ معلوم ہوا کہ وہ نمبر ہی جعلی تھا۔

دوسری واردات 10 دسمبر کو اتوار کے روز ہوئی۔ ایک بار پھر ایک ایسے علاقے کا انتخاب کیا گیا تھا جہاں قریب کہیں بھی سی سی ٹی وی کیمرے نصب نہیں تھے۔ اس واردات میں ایک فقیر کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس واردات کا کوئی عینی شاہد نہیں تھا۔

تیسری واردات 15 دسمبر کو جمعہ کے روز شام کے پانچ بجے ہوئی جب ایک سائیکل سوار کو نشانہ بنایا گیا۔ اس سے اگلی واردات 28 دسمبر کو دارالحکومت کے تین مختلف مقامات پر ہوئی جس میں دیہاڑی مزدور ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہوئے۔ اس دن ہونے والی ان تینوں وارداتوں میں چوری کی موٹر سائیکل استعمال ہوئی تھی جو آخری واردات کے بعد جائے وقوعہ کے قریب سے مل گئی تھی۔

''میر حسن صاحب۔''

میں چونک گیا۔ ایک ایس پی رینک کا پولیس افسر میرے سامنے کھڑا تھا۔

''جی جی۔'' میں حقیقت کی دنیا میں واپس لوٹ آیا تھا۔

''چیف صاحب نے آپ سے ملاقات کے لیے خاص ہدایت کی ہے۔''

''سجاد صاحب، کیا آپ میری گاڑی میں تشریف لا سکتے ہیں؟'' میں نے ایس پی کا نام اس کی وردی پر پڑھ لیا تھا۔

''کیوں نہیں۔'' وہ میری گاڑی میں آگیا۔ اس کے ساتھ ایک ایس ایچ او اور چند اور پولیس اہل کار بھی تھے جو دوسری گاڑی میں موجود تھے۔

''سجاد صاحب۔ آپ نے اب تک جو تفتیش کی ہے، کیا اس میں کوئی ایسا سراغ ہاتھ لگا جس سے آپ اس منظم گروہ یا فرد تک پہنچ سکیں جو یہ وارداتیں کر رہا ہے؟''

''نہیں۔ یہ معاملہ صرف پولیس ہی نہیں دیکھ رہی بلکہ

مشترکہ تفتیشی ٹیم بھی اس حوالے سے کام کر رہی ہے جس میں قانون نافذ کرنے والے تمام اداروں کی نمائندگی موجود ہے مگر فی الحال کوئی سراغ ہاتھ نہیں لگا۔"

"کیا آج کی واردات کا کوئی چشم دید گواہ ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"جی۔ قاتل موٹر سائیکل پر آئے تھے۔"

"کیا ایک سے زیادہ قاتل تھے؟"

"جی دو تھے۔ انہوں نے ہیلمٹ اور فیس ماسک سے اپنے چہرے ڈھانپ رکھے تھے۔"

"کوئی ایسی معلومات جو غیر معمولی رہی ہو؟"

"قاتل شارپ شوٹر تھے۔ انہوں نے دونوں ہی مقتولین کو بلینک رینج سے نشانہ بنایا اور صرف ایک ایک گولی ہی میں دونوں کا کام تمام کر دیا۔"

"ان کے زیرِ استعمال موٹر سائیکل کسی نے دیکھی؟"

"جی، چوری کی موٹر سائیکل تھی جو یہاں قریب سے ہی مل گئی تھی۔"

"وہ کس جانب سے آئے تھے؟" میں نے سوال کیا۔

"مغرب کی جانب سے۔" اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ مجھے اس حوالے سے ہونے والی تفتیش کی کاپی دے سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں، میں ساتھ ہی لے کر آیا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اس تفتیش کی کاپی میرے حوالے کر دی۔

میں نے یہ معلومات فراہم کرنے پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ گاڑی سے اُترا اور چند ہی لمحوں میں وہاں سے رُخصت ہو چکا تھا۔

میں نے گاڑی کا رُخ مغرب کی جانب کیا۔ مجھے بھوسے میں سے سوئی تلاش کرنا تھی۔ وہ مل جاتی تو ایسی وارداتوں کو دوبارہ ہونے سے روکا جا سکتا تھا۔

میری گاڑی کا رُخ ایک بار پھر تلوار چوک کی جانب تھا جہاں سے سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔

ان دونوں سڑکوں پر رونق دوبارہ بحال ہو گئی تھی۔ میں نے گاڑی کا رُخ اس زیرِ تعمیر سڑک کی جانب کیا جہاں سے میں کچھ ہی دیر پہلے ہو کر گیا تھا اور ڈھابے کے قریب گاڑی روک دی۔ وہ پولیس اہلکار اب وہاں موجود نہیں تھا۔ سڑک پر دکانیں کھل چکی تھیں۔ میں نے ایک کلو میٹر تک ہر دکان دیکھی مگر کہیں پر مجھے کوئی سی سی ٹی وی کیمرا نظر نہیں آیا۔ اس سڑک پر کوئی بینک بھی نہیں تھا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے جب میں واپس آیا مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں لگ سکا تھا۔

میں نے واپس دفتر کا رُخ کیا۔ مجھے ملزموں کی کھوج لگانے کے لیے اب غیر روایتی طریقہ استعمال کرنا تھا۔ میں دفتر پہنچا تو مجتبیٰ ہمیشہ کی طرح ٹیلی ویژن دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کافی بنوانے کے لیے کہا اور کاغذات کا پلندا کھول کر تمام تفصیلات کا گہرائی سے مطالعہ کرنے لگا جس کے مطابق، پولیس کو ہنگامی نمبر پر اس وقوعے کی اطلاع موصول ہوئی تھی اور نو بج کر پچاس منٹ پر ان دونوں محنت کشوں کو گولی ماری گئی تھی۔

پولیس کی ان دستاویزات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس واردات میں دیسی پستول استعمال کیا گیا تھا۔ عینی شاہد کے مطابق، ان دونوں ملزموں نے موٹر سائیکل چند ساعتوں کے لیے روکی تھی اور پھر اچانک فائرنگ کر دی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قاتل ایک اچھا نشانے باز تھا۔ پریشان کن بات یہ تھی کہ پچھلی تمام وارداتوں میں بھی قاتل اسی طرح دندناتے ہوئے آئے تھے اور یوں رفو چکر ہو گئے تھے گویا زمین نگل گئی ہو۔

میں نے ذہن میں ایکشن پلان ترتیب دے لیا تھا۔ مجھے آج کی واردات کے بعد دوبارہ اس خبر پر کام شروع کرنا تھا اور اصل مقصد قاتلوں کو اگلی واردات کرنے سے روکنا بھی تھا۔ اس دوران کافی آ گئی جس کے سِپ لیتے ہوئے میرے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ انہوں نے اگر دیسی پستول استعمال کیا ہے تو یقیناً انہوں نے یہ پستول کہیں نہ کہیں سے ضرور حاصل کیا ہو گا۔ شہر میں دو بڑے ڈیلر تھے جو غیر قانونی اسلحہ فروخت کرنے کا کاروبار کرتے تھے۔ وہ دونوں ایک عرصے سے میرے رابطے میں نہیں تھے مگر اُن سے اہم معلومات حاصل ہونے کی امید تھی۔

میں نے اپنا دوسرا موبائل نکالا جو اس خاص مقصد اور ایسے حساس موضوعات پر کام کرنے کے لیے ہمیشہ میرے پاس موجود ہوتا تھا۔

میں نے نمبر ملایا تو دوسری جانب سے کسی نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔ میں نے دوبارہ نمبر ملایا تو دوسری جانب سے فون اٹھا لیا گیا۔

"میر حسن صاحب۔ آج برسوں بعد اس ناچیز کو کیسے یاد کر لیا؟ کیا کسی بڑی خبر پر کام کر رہے ہیں؟"

"'حاجی صاحب' یونہی سمجھ لیجیے۔ وہ کیا ہے نا۔ شہر میں دن دہاڑے قتل ہو رہے ہوں اور پولیس اپنا کام نہ کر رہی ہو تو ہم ایسے صحافیوں کا میدان میں کودنا ضروری ہو جاتا ہے۔"

''جی میر صاحب۔ بات تو آپ نے سولہ آنے درست کی۔ حکم کیجیے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''کیا آپ نے گزشتہ کچھ عرصے کے دوران کوئی دیسی پستول فروخت کیا ہے؟'' میں نے کوئی لگی لپٹی بغیر سوال کیا۔

''میر صاحب، آپ شاید بھول گئے۔ ایک عرصہ ہوا، میں نے دیسی پستول فروخت کرنا چھوڑ دیے ہیں۔''

''یہ سانحہ کب ہوا؟'' میں نے حیران ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے پوچھا۔

''جناب ایک سال ہو گیا۔ دیسی پستولوں کی مارکیٹ میں اب مانگ ہی نہیں رہی۔ امپورٹڈ کا زمانہ ہے جناب۔ آپ شاہ صاحب سے بات کیجیے۔ ہو سکتا ہے کوئی سراغ ہاتھ لگ جائے۔''

''آپ اگر کسی ایسے شخص کے بارے میں جانتے ہوں جو دیسی اسلحہ فروخت کرتا ہو تو مجھے ضرور آگاہ کیجیے گا۔''

''جی ضرور۔ دو تین چھوٹے بیوپاری ہیں جو یہ کام کر رہے ہیں۔ میں آپ کو پرسوں تک ان کی تفصیل فراہم کر دوں گا۔''

شاہ صاحب ایک طویل عرصے سے غیر قانونی اسلحے کی فروخت کا کام کر رہے تھے۔ ان سے رابطہ کیا تو ان کا جواب بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ ان سے مجھے ایک اور اسلحہ ڈیلر عامر راؤ کا نمبر مل گیا جو صرف دیسی اسلحے کا کام کرتا تھا۔ اس نے حال ہی میں علاقہ غیر سے دیسی اسلحے کی ایک بڑی کھیپ منگوائی تھی۔ میرے لیے یہ ایک اہم سراغ ثابت ہو سکتا تھا۔

شام کے سات بج رہے تھے۔ میں نے عامر راؤ کا نمبر ڈائل کیا جس نے دوسری بیل پر ہی میرا فون اٹھا لیا۔

''کون بول رہا ہے؟''

''میر حسن۔''

''میر حسن کون؟ کوئی تعارف کروائیں صاحب۔''

''میں صحافی ہوں راؤ صاحب۔''

''جناب میں سیاست داں ہوں نہ بیوروکریٹ تو مجھ سے آپ کیا چاہتے ہیں؟'' اس نے بیزاری سے پوچھا۔

''میں شاہ صاحب کے ریفرنس سے بات کر رہا ہوں۔''

''کون شاہ صاحب؟''

''عامر راؤ صاحب، وہ شاہ صاحب جن کے لیے کبھی آپ اسلحے کی سپلائی کا کام کیا کرتے تھے۔''

''اوہ اچھا اپنے شاہ جی۔ حکم کیجیے۔''

''مجھے کچھ اہم معلومات چاہئیں۔ کیا آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''آپ کل میرے گھر تشریف لے آیئے۔ میں آپ کا منتظر رہوں گا۔'' ہماری بات ختم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ مجتبیٰ دروازے پر کھڑا میری جانب ہی دیکھ رہا تھا۔

''جی مجتبیٰ صاحب، خیریت تو ہے نا؟''

''جی سر۔ آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔''

''ہاں، بتاؤ۔ کیا بات کرنی تھی؟''

''سر مجھے یہ لگتا ہے کہ یہ کسی گروہ کا کام نہیں ہے بلکہ کوئی سرپھرا ہے جو یہ کام کر رہا ہے۔''

''تم یہ دعوے سے کس طرح کہہ سکتے ہو؟'' میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

''سر دیکھیے' مارنے والے نے اب تک صرف غریب لوگوں کو ہی مارا ہے۔''

''اس سے یہ تو ثابت نہیں ہو جاتا کہ یہ کسی سرپھرے کا کام ہے؟'' میں نے دوبارہ اس سے استفسار کیا۔

''سر۔'' وہ گھبرا گیا۔ ''میرا کہنے کا مطلب ہے، یہ کوئی سیریل کلر بھی تو ہو سکتا ہے؟''

''ہو تو سکتا ہے مگر دو یا زیادہ لوگ ہوئے تو؟'' میں نے سوال داغ دیا۔

''ہو سکتا ہے۔ دونوں ہی سرپھرے ہوں۔'' میں نے اس کے اس جواب پر سر پکڑ لیا مگر میرے دماغ میں گھنٹی ضرور بج گئی تھی۔

دو افراد یا زیادہ اگر ٹارگٹ کلنگ میں ملوث ہیں تو وہ ضرور کہیں نہ کہیں ملے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے، وہ کسی ذہنی عارضے کا شکار ہوں۔ میرا دماغ اس پہلو پر کام کرنے لگا تھا۔ مجتبیٰ نے مجھے گہری سوچ میں گم دیکھا تو کمرے سے چلا گیا مگر میرے سامنے اس معاملے کی گہرائی میں جانے کے لیے ایک اور دروازہ کھل گیا تھا۔

میرے سامنے اب تین ایسے راستے تھے جو مجھے اُن بے چہرہ قاتلوں تک لے جا سکتے تھے جن کے بارے میں آگے جا کر ساری تفصیل آ جائے گی۔ مجتبیٰ سے کہہ کر میں نے شہر کے نقشے کا ڈیجیٹل پرنٹ حاصل کر لیا تھا جس پر میں نے ان تمام مقامات کو نشان زد کیا جہاں کی سی سی ٹی وی فوٹیج مجھے چاہیے تھی۔ عامر راؤ سے ملاقات اہم ثابت ہو سکتی تھی اور ملزموں کے نفسیاتی مریض ہونے کے امکان کو بھی کسی طور پر رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

شام کے آٹھ بج رہے تھے جب میں گھر جانے کے لیے دفتر سے نکلا۔ رات دیر گئے اس تمام معاملے کے ہر پہلو کا

تفصیل سے تجزیہ کرتا رہا۔ یہ اگر دو یا زیادہ لوگ تھے تو کیا یہ ''سرپھرے'' تھے یا شہر میں صرف خوف و ہراس پھیلانا چاہتے تھے؟ شہر میں اگر خوف و ہراس پھیلانا ہی مقصد تھا تو پھر ایک ہی طبقے کے لوگوں کو کیوں نشانہ بنایا جا رہا تھا؟ میرے ذہن میں بار بار یہ سوال دستک دے رہا تھا۔

میں اگلی صبح رپورٹرز کی میٹنگ سے فارغ ہوا تو عامر راؤ سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس نے پُرتپاک انداز سے میرا استقبال کیا۔ اس نے مجھ سے میری آمد کی غرض و غایت پوچھی تو میں نے پوری کہانی اس کے گوش گزار کر دی۔ اس سے یہ حیران کن انکشاف ہوا کہ وہ دیسی اسلحے کا ہول سیلر تھا اور پورے ملک میں اس کے گاہک موجود تھے۔ میں نے اس سے دارالحکومت میں اس کے گاہکوں کے متعلق پوچھا۔ اس نے مجھے دو بندوں کے نمبر فراہم کر دیے جو اس سے اسلحہ لے کر آگے فروخت کیا کرتے تھے۔ ایک کا نام عدنان جٹ تھا اور دوسرا مشتاق قریشی تھا۔

میری مشتاق قریشی سے تو اسی دن ملاقات ہو گئی جس نے یہ انکشاف کیا کہ اس نے دیسی ساختہ پستول گزشتہ تین ماہ کے دوران دس لوگوں کو فروخت کیے ہیں اور وہ سب کے بارے میں جانتا تھا جو کسی نہ کسی گینگ کا حصہ تھے۔

عدنان جٹ سے رابطہ نہ ہو سکا۔ میں نے شہر میں نصب سی سی ٹی وی کیمروں کی مانیٹرنگ کرنے والے محکمے کے سربراہ عادل بیگ کو کال کی۔ ان سے میری اچھی سلام دعا تھی۔

''میر صاحب، احمد لطیف صاحب سے ابھی آپ کے بارے میں ہی بات ہو رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہے کہ آپ نے کیوں کال کی ہو گی؟'' عادل بیگ نے دوستانہ لہجے میں استفسار کیا۔

''عادل صاحب یہ بھی تو ممکن ہے جو آپ سوچ رہے ہوں، ویسا نہ ہو۔'' میں نے ترنت جواب دیا تو انہوں نے سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ بتائیے میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں؟''

''مجھے یکم جنوری کی سیکٹر 12، 13 اور 14 کی فوٹیج چاہیے۔''

''خیریت تو ہے میر صاحب۔ میرا نہیں خیال کہ ان علاقوں میں ایسی کوئی واردات ہوئی ہے جس کے لیے آپ یہ فوٹیج مانگ رہے ہیں۔''

''آپ میرے لیے ان فوٹیجز کا بندوبست کیجیے۔ آپ کو جلد سرپرائز دوں گا۔''

''جی بہت بہتر۔ میں آج شام ہی آپ کے دفتر میں فوٹیجز یو ایس بی میں کاپی کر کے بھجوا دیتا ہوں۔''

''بہت شکریہ عادل صاحب۔ امید کرتا ہوں کہ ہماری جلد ملاقات ہو گی۔''

میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا کہ پولیس نے فی الحال تفتیش کرنے کے لیے روایتی طریقۂ کار ہی اختیار کیا ہوا تھا جب کہ میرے تجربے کے مطابق، یہ واردات کرنے والا گروہ یا مجتبیٰ کے الفاظ میں سرپھروں کی منصوبہ بندی اور اس پر عملدرآمد کرنے کی رفتار نہ صرف پولیس کے طور طریقوں سے جدید تھی بلکہ وہ ہر معاملے میں پولیس سے ایک قدم آگے رہے تھے۔

آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں نے سیکٹر 12، 13 اور 14 کی فوٹیج کیوں مانگی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس جگہ یہ واردات ہوئی تھی، وہاں اگرچہ کیمرے نصب نہیں تھے مگر میرا خیال تھا کہ ان قاتلوں نے پولیس کو گھمانے کے لیے سیکٹر 10 کا رُخ نہیں کیا ہو گا جو جائے وقوعہ کے بالکل سامنے تھا اور وہ کچھ فاصلے پر موجود چوک سے بائیں یا دائیں جانب مڑ کر ان میں سے کسی سیکٹر کی حدود میں داخل ہو گئے ہوں گے۔

مجھے اب ان کی شناخت ان کی موٹر سائیکل سے کرنی تھی جو لال رنگ کی تھی اور وہ دو افراد تھے جنہوں نے ہیلمٹ پہن رکھے تھے۔ واردات کا وقت نو بج کر پچاس منٹ تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے نو بج کر پچاس منٹ سے لے کر 10 بج کر 10 منٹ تک کی ویڈیو فوٹیج دیکھنی تھی۔

اس وقت میرے ذہن میں اچانک ایک خیال کوندا۔ ہو سکتا ہے، تلوار چوک سے متصل بستی کی کسی دکان میں اندر کی جانب سی سی ٹی وی کیمرا نصب ہو۔ میرا اس جانب اب تک دھیان نہیں گیا تھا۔

میں فوراً دفتر سے نکلا اور نصف گھنٹے بعد جائے وقوعہ پر پہنچ چکا تھا۔ یہ اگرچہ ایک مصروف سڑک تھی مگر اس کے دونوں جانب خانہ بدوشوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ یہ سڑک سیکٹر 10 سے شروع ہو کر تلوار چوک پر ختم ہوتی تھی۔ یہ علاقہ دارالحکومت میں ہونے والی ترقی کے باوجود اس کے ثمرات سے محفوظ رہا تھا۔

آج اس علاقے کی زیرِ تعمیر سڑک پر کام ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا۔ دوسری سڑک کی حال ہی میں مرمت کی گئی تھی۔

میں نے تلوار چوک پر ایک جانب گاڑی کھڑی کی اور پہلے زیرِ تعمیر سڑک کا رُخ کیا۔ آج تمام دکانیں کھل چکی تھیں۔

دونوں جانب پنساری، قصائی اور اس قسم کا چھوٹا کاروبار کرنے والوں کی دکانیں تھیں۔

میں اس بستی کا بغور جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ راستے میں نسبتاً کچھ بڑے اسٹورز آئے مگر ان میں سی سی ٹی وی کیمرے نصب نہیں تھے۔ اس وقت میری نظر ایک بڑی فارمیسی پر پڑی جس کے قریب ہی ایک چھوٹا سا پرائیویٹ اسپتال تھا جس کے باعث یہاں لوگوں کی چہل پہل زیادہ تھی۔ قریب ہی یہ سڑک ختم ہو جاتی تھی جس کے بعد مرکزی شاہراہ آجاتی تھی۔

مجھے پورا یقین تھا کہ پولیس نے مرکزی شاہراہ کی فوٹیج دیکھی ہوگی۔ میں نے فارمیسی کا بورڈ دیکھا۔ مجھے باہر تو کوئی سی سی ٹی وی کیمرا نظر نہیں آیا۔ میں آگے بڑھنے ہی والا تھا جب مجھے فارمیسی کی مخالف سمت میں نصب کیمرے نظر آگئے جن کے بارے میں کسی کو گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ کیمرے کچھ اس طریقے سے لگائے گئے تھے جو سڑک کے علاوہ فارمیسی میں آنے جانے والے لوگوں پر بھی نظر رکھتے تھے مگر پہلی بار دیکھنے پر نظر نہیں آتے تھے۔

میں فارمیسی میں داخل ہوا جس کی اندرونی جانب بھی سی سی ٹی وی کیمرے نصب تھے۔ میں نے کاؤنٹر پر موجود درمیانی عمر کے باریش مرد سے اپنا تعارف کروایا جو میرا نام سن کر چونک گیا۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ نہ صرف میرا نام جانتا تھا بلکہ وہ میری کچھ خبروں کا دلدادہ بھی تھا۔ اس کا نام ابراہیم تھا۔ میں نے اس سے علیحدگی میں بات کرنے کی درخواست کی تو وہ مجھے قریب ہی ایک ڈھابے نما ریستوران پر لے گیا اور مجھ سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”میر صاحب، معذرت قبول کیجیے کہ اس علاقے میں اس سے بہتر کوئی دوسرا ریستوران نہیں ہے مگر آپ یہاں کی چائے پی کر مایوس نہیں ہوں گے۔“ اس نے ادرک والی دو کپ چائے منگوائی جو میں نے اس سے قبل نہیں پی تھی۔

میں خاموشی سے ریستوران کا جائزہ لے رہا تھا مگر وہاں کوئی کیمرا نصب نہیں تھا۔

میں نے اس سے اپنی آمد کی وجہ بیان کی تو وہ خوشی خوشی میری مدد کرنے پر تیار ہوگیا۔ ہم دونوں نے چائے ختم کی تو اس نے مجھے انتظار کرنے کا کہا اور وہ سی سی ٹی وی فوٹیج لینے میڈیکل اسٹور چلا گیا۔ اس وقت ہوٹل میں دو ایک لوگ ہی تھے جو چہرے مہرے سے محنت کش لگ رہے تھے اور ان کی گفتگو کا موضوع بھی گزشتہ روز ہونے والی قتل کی لرزہ خیز واردات ہی تھی۔

میڈیکل اسٹور سے جب ابراہیم واپس آیا تو میں اپنے ہی دھیان میں کرسی سے اٹھا تو ریستوران میں داخل ہونے والے نوجوان سے ٹکرا گیا۔ وہ نوجوان تو نہیں تھا بلکہ درمیانی عمر کا ایک مرد تھا۔ میرے ساتھ اکثر ایسا ہوجاتا ہے مگر اس مرد کی آنکھوں کے گرد پڑے حلقوں میں کچھ ایسا تھا جس نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔ میں نے اس پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور معذرت کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ ابراہیم نے سی ڈی میرے حوالے کی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور مرکزی شاہراہ کی جانب بڑھ گیا۔

میری چھٹی حس بار بار مجھے خطرے کے حوالے سے خبردار کر رہی تھی مگر میں نے اسے اپنا وہم خیال کرتے ہوئے ذہن سے جھٹک دیا اور مرکزی شاہراہ تک پیدل چلا مگر کسی اور دکان کے باہر یا اس کے اندرونی طرف سی سی ٹی وی کیمرے نصب نہیں تھے۔

میں واپس تلوار چوک کی جانب جانے کے لیے پلٹا تو دیکھا کہ وہ مرد مجھے ایک جانب فون پر بات کرتا ہوا دکھائی دیا جس سے میں ٹکرایا تھا۔ اس کے چہرے میں کچھ عجیب سی بات تھی۔ میں ایک جانب کھڑا ہوگیا اور کن انکھیوں سے اس کی حرکات وسکنات کو دیکھنے لگا۔ مجھے کچھ ہی لمحوں میں یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ بھی مجھے کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں اسے نظر انداز کرتا ہوا تلوار چوک کی جانب بڑھ گیا۔

تلوار چوک تک پہنچتے پہنچتے میرے کپڑے گرد سے اَٹ چکے تھے۔ دوسری سڑک پر زیادہ دکانیں نہیں تھیں اور صرف ایک گھر کے باہر ہی سی سی ٹی وی کیمرے نصب تھے مگر گھر کے دروازے پر بار بار دستک دینے کے باوجود بھی کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ میں نے دروازے پر دیکھا تو تالا لگا ہوا تھا۔ یہ علاقے میں نسبتاً ایک بہتر گھر تھا جو فوری طور پر اس محلے کا رُخ کرنے والوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کروا لیتا تھا۔

میں نے اردگرد سے پوچھنا مناسب خیال نہیں کیا اور واپسی کی راہ لی۔ شام پانچ بج چکے تھے اور سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ میں واپس تلوار چوک پہنچا اور دفتر جانے کے لیے گاڑی دوڑا دی۔

دفتر پہنچتے پہنچتے چھ بج گئے۔ استقبالیہ پر ایک پولیس سب انسپکٹر میرا منتظر تھا۔ اس نے ایک مہر بند لفافہ میرے حوالے کیا اور کہا۔

”یہ عادل صاحب نے بھجوایا ہے۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کمرے کا دروازہ

کھولا اور کمپیوٹر آن کر کے پورے معاملے پر ایک بار پھر غور کرنے لگا۔ میری میز پر شہر کا ڈیجیٹل نقشہ موجود تھا۔ میں نے مجتبیٰ سے اس کی ایک کاپی کروا کر لانے کے لیے کہا۔ وہ دوسری کاپی لے آیا تو میں نے اس کا گہرائی سے جائزہ لیا۔ مجھے اگرچہ شہر کا پورا نقشہ ازبر تھا مگر کچھ عجیب تھا۔ اس وقت میرے دماغ میں گھنٹی بجی۔

میں نے گزشتہ ایک ماہ کے دوران ہونے والی تمام وارداتوں کے مقامات کو نشان زد کرنا شروع کر دیا۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ حیران کن طور پر یہ تمام واقعات اگرچہ پانچ مختلف تھانوں کی حدود میں رپورٹ ہوئے تھے مگر حقیقت میں یہ تمام وارداتیں دو کلومیٹر کے دائرے میں ہوئی تھیں۔ میں نے جب زیادہ گہرائی سے نقشے کا جائزہ لیا تو یہ جان کر ایک بار پھر جھٹکا لگا کہ تمام وارداتیں تلوار چوک اور اس سے متصل بستی سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہوئی تھیں۔

میری اطلاعات کے مطابق دارالحکومت کی پولیس کو اب تک کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ سراغ تو مجھے بھی گزشتہ ایک ماہ سے نہیں ملا تھا مگر میں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔

میں نے مجتبیٰ سے کہا کہ وہ چھٹی کر سکتا ہے اور کمرا بند کر کے عادل بیگ کی جانب سے بھیجی گئی سی ڈی کمپیوٹر میں لگا کر فوٹیجز دیکھنے لگا۔ شام سات سے رات کے گیارہ بج گئے مگر ان فوٹیجز میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جس پر شک کیا جا سکتا اور میں ابھی صرف دو سیکٹرز کی فوٹیجز ہی دیکھ سکا تھا۔

میں تھک گیا تھا۔ میں نے کینٹین سے بلیک کافی منگوائی اور چسکیاں لے ہی رہا تھا جب مجھے عدنان جٹ کے نمبر سے کال موصول ہوئی۔ میں نے فون اٹھایا تو اس نے مہذب انداز سے بات کرنے کی پوری کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''کیا میں جان سکتا ہوں کہ میں کن صاحب سے مخاطب ہوں؟''

''جٹ صاحب عامر راؤ صاحب نے مجھے آپ کا نمبر دیا تھا۔ میں ایک صحافی ہوں اور مجھے آپ کی مدد چاہیے۔''

''اوہ ایہہ تے چنگی گل اے۔ حکم کرو میں تہاڈی کیہہ مدد کر سکنا آں؟'' (یہ تو اچھی بات ہے۔ آپ حکم کیجیے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟)

''آپ میرے بہت کام آ سکتے ہیں جٹ صاحب۔ کیا آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''کیوں نئیں جی، تہاڈے نل مل کے منوں بوہت خوشی ہوئے گی۔'' (کیوں نہیں، مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہو گی)

ہم نے اگلے دن صبح نو بجے ملاقات کا وقت طے کیا۔

مجھے رات دو بجے سے پہلے فارغ ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں دوبارہ فوٹیجز دیکھنے ہی لگا تھا جب فون کی گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی۔ زوجہ کی کال آ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ وہ میرے اب تک گھر نہ آنے پر پریشان ہو رہی ہوگی۔ میں نے ڈرتے ہوئے کال اٹینڈ کی اور خاموشی سے ڈانٹ سننے کے بعد رات دیر سے آنے کا کہہ کر فون کر دیا۔

میری جان سستے میں چھوٹ گئی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ مجھے اس رات گھر میں ہی گھسنے نہ دیا جاتا مگر اب ایسے تمام خطرات ٹل گئے تھے۔ میں دوبارہ پوری توجہ سے فوٹیجز دیکھنے لگا مگر ایسا کوئی سراغ ہاتھ نہیں لگا جس پر میں چونکتا۔

میں نے اس کے بعد ابراہیم کی جانب سے دی گئی فوٹیج دیکھنا شروع کی۔ میری پوری توجہ واردات سے نصف گھنٹا قبل اور بعد میں گزرنے والی موٹر سائیکلوں پر ہی مرکوز رہی جن پر دو لوگ سوار ہوں اور انہوں نے سیاہ رنگ کے ہیلمٹ پہن رکھے ہوں مگر میں ایسی کوئی موٹر سائیکل نوٹ نہیں کر سکا جس سے مجھے میرے مطلب کی معلومات حاصل ہو سکتی۔

میں نے میڈیکل اسٹور کے اندر کی فوٹیج لگا کر دیکھی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ درمیانی عمر کا مرد میڈیکل اسٹور میں موجود تھا جس سے میں آج صبح ہی ٹکرایا تھا اور وہ کچھ ادویات لے رہا تھا۔

میں نے زوم کر کے دیکھا تو میرے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی کیونکہ اس نے نیند آور گولیوں کے دو پتے لیے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ان گولیوں کا نشہ کرتا تھا اور اس کی آنکھوں کے گرد حلقوں کی وجہ بھی غالباً یہی تھی مگر اس کا حلیہ اس آبادی سے میل نہیں کھاتا تھا۔ وہ نسبتاً آسودہ حال گھرانے کا فرد معلوم ہو رہا تھا اور ان دونوں چیزوں نے ہی میری توجہ اس کی جانب مبذول کی تھی۔ ابراہیم اس پوری فوٹیج میں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

فوٹیجز سے تو کچھ ہاتھ نہیں لگا تھا مگر میرا یہ یقین پختہ ہو چکا تھا کہ قاتل تلوار چوک سے زیادہ دور نہیں رہتے تھے اور میری چھٹی حس نے مجھ پر یہ باور کروا دیا تھا کہ وہ اگر جھونپڑپٹی کے نہیں تھے تو اس بستی کے تھے یا کسی اور علاقے سے یہاں آتے تھے، کچھ دیر یہاں ٹھہرتے کیونکہ تلوار چوک سے شہر کی مرکزی شاہراہ پر جانے کے لیے بھی اسی بستی کی سڑک سے گزرنا پڑتا تھا جو اگرچہ ان دنوں زیر تعمیر تھی مگر موٹر سائیکلوں کی آمد و رفت کے لیے راستہ کھلا ہوا تھا۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی تو رات کے تین بج رہے تھے۔ مجھے صبح نو بجے عدنان جٹ سے بھی ملاقات کرنی تھی اور میری چھٹی حس مجھے تلوار چوک پر توجہ مبذول کرنے کا کہہ رہی تھی۔

میں گھر واپس پہنچا تو سب سو چکے تھے مگر زوجہ ٹی وی لاؤنج میں میرا انتظار کرتے کرتے نیند کی آغوش میں جا چکی تھی۔ میں نے اگرچہ پوری احتیاط سے دروازہ کھولا مگر وہ جاگ گئی اور میرے اس تاخیر سے آنے پر مصنوعی ناراضی کا اظہار کرنے لگی جس کے بارے میں مجھے معلوم تھا کیونکہ برسوں سے ایسا ہی ہوتا آرہا تھا۔

میں فریش ہونے کے لیے اپنے کمرے میں گیا تو اس دوران بیگم صاحبہ نے کھانا گرم کر کے دستر خوان پر لگا دیا تھا جس کی اشتہا انگیز خوشبو سے میری بھوک میں مزید اضافہ ہو گیا اور میں ندیدوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا مگر رات کے اس پہر زیادہ کھانا بھی مناسب نہیں تھا سو جلد ہی ہاتھ روک لیا۔

رات بھر میں ان وارداتوں کے بارے میں سوچتا رہا جن کی وجہ سے میں کافی دنوں سے بے خوابی کا شکار ہو گیا تھا۔ اس وقت اچانک ایک خیال نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے واردات کے دو کلومیٹر کے دائرے میں آنے والے تمام سیکٹرز اور اہم چوک چوراہوں کی سی سی ٹی وی فوٹیج دیکھنی چاہیے۔ میں یہ سوچتا سوچتا نیند کی وادی میں جا چکا تھا۔

صبح ساڑھے سات بجے الارم بجا تو میں جاگ گیا مگر کسل مندی محسوس کر رہا تھا۔ خان محمد میرا ناشتا تیار کر رہا تھا۔ میں نہا دھو کر فریش ہوا تو میرا ناشتا میز پر لگ چکا تھا۔ میں ناشتا کر کے فارغ ہوا تو آٹھ بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔ اس وقت دارالحکومت کی سڑکوں پر ٹریفک کا رش نسبتاً زیادہ ہوتا ہے اور مجھے شہر کے دوسرے کونے پر جانا تھا۔ میں نے فوراً گاڑی نکالی اور عدنان جٹ سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گیا۔

میں پورے وقت پر اس کے گھر پہنچ گیا تھا جو شہر کے متوسط طبقے کے علاقے میں تھا۔ میں نے گھر کی ڈور بیل بجائی تو عدنان جٹ نے دروازہ کھولا اور پُرتکلف انداز سے مجھے اندر آنے کے لیے کہا۔ اس کا چہرہ گول تھا، آنکھیں چہرے کی نسبت چھوٹی تھیں مگر ان میں چمک تھی۔ گھنی پلکوں اور چوڑی پیشانی نے اس کی شخصیت میں رعب پیدا کر دیا تھا۔

''جی میر صاحب، تشریف لائیے۔ میں آپ کا ہی منتظر تھا۔''

''بہت شکریہ عدنان صاحب۔ دیکھ لیجیے ایک صحافی کو کہاں کہاں کی خاک نہیں چھاننی پڑتی۔'' یہ کہہ کر میں مسکرا دیا۔

وہ مجھے تکلف کے ساتھ اپنے ڈرائنگ روم میں لے گیا جہاں اس نے میرے سواگت کے لیے غیر معمولی اہتمام کیا ہوا تھا۔

''میر صاحب، مختصر نوٹس پر بس یہ انتظام ہی ہو سکا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔''

میں یہ کہہ کر اپنے میزبان کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں ناشتا کر کے آیا ہوں اور ان کا شکریہ ادا کر کے دیسی ناشتے کا لطف لینے لگا جو بہت عرصے بعد نصیب ہوا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہوئے تو چائے کا دور چلا اور اس دوران بات کرنے کا موقع بھی مل گیا۔

''عدنان صاحب، آپ نے گزشتہ تین ماہ کے دوران کیا کسی ایسے شخص کو دیسی پستول بیچا ہے جسے آپ نہ جانتے ہوں؟''

اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم عموماً جاننے والوں کو ہی اسلحہ فروخت کرتے ہیں یا کوئی ایسا آ جائے جو ہمارے کسی جاننے والے کا واقف ہو۔''

''تو کیا آپ سے کسی ایسے شخص نے پستول خریدا جس کا کسی واردات میں استعمال ہونے کا اندیشہ ہو؟''

عدنان جٹ نے میری اس بات پر قہقہہ بلند کیا اور پھر خود ہی معذرت کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ''ظاہر ہے، کوئی پستول تحفے میں دینے کے لیے تو نہیں خریدے گا۔''

اس کے اس برجستہ جواب پر میرا بھی قہقہہ بلند ہوا۔

''میرے کہنے کا مطلب ہے، آپ بہت سے کینٹسرز کو پستول فروخت کرتے ہیں تو کیا اس بار کسی ایسے شخص کو پستول فروخت کیا جس سے آپ پہلی بار ملے ہوں یا اس سے مل کر حیران ہوئے بنا نہ رہ سکے ہوں؟''

اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ایک گاہک ایسا آیا تھا جس نے میرے ایک بیرونِ ملک مقیم عزیز کا حوالہ دے کر مجھ سے دو پستول لیے تھے۔''

''اس میں خاص بات کیا ہے؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''میں نے اس سے کہا بھی کہ میری اپنے عزیز سے اس بارے میں بات نہیں ہوئی مگر وہ ہڑبڑی میں تھا۔ وہ میرے عزیز کو اچھی طرح جانتا تھا تو مجھے انکار کرنا مناسب نہیں لگا۔''

''اور آپ نے اس کو پستول تھما دیے؟'' میرے تجسس

میں مزید اضافہ ہوگیا۔
"یہ تو اپنا کاروبار ہے میر صاحب۔ اس نے جلدی سے پستول لیے اور چند ہی لمحوں میں رفو چکر ہوگیا۔"
"تو اس میں عجیب بات کیا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"عجیب بات یہ ہے کہ میری اسی شام اپنے عزیز سے بات ہوئی تو انہوں نے انکار کیا کہ انہوں نے ایسا کوئی شخص میرے پاس نہیں بھیجا تھا۔"
میں اس پر چونک گیا اور سوال کیا، "اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ آپ کو بھی چکما دینے میں کامیاب رہا؟"
"ایسا ہی ہے مگر کیا ہے کہ دھندا ہی کچھ ایسا ہے۔"
"کیا آپ بتا سکتے ہیں، وہ کس علاقے سے آیا تھا؟"
"میر صاحب۔ میں نے اس کا انٹرویو نہیں کیا تھا۔" اس نے قہقہہ بلند کیا اور پھر معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "وہ درمیانی عمر کا مرد تھا اور چہرے مہرے سے شریف اور سلجھے ہوئے گھرانے کا لگ رہا تھا مگر......" اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس کی باتوں میں بے ربطگی تھی جیسے کسی نشے کے زیر اثر ہو۔"
ہم کچھ اور دیر باتیں کرتے رہے۔ میں نے عدنان جٹ کا شکریہ ادا کیا اور واپس دفتر آ گیا۔ میں نے دوبارہ عادل بیگ کو کال کی۔ انہوں نے پہلی ہی بیل پر میری کال اٹینڈ کر لی۔

میں نے ان سے تلوار چوک کے اردگرد دو کلومیٹر کے دائرے میں آنے والے تمام علاقوں کی سی سی ٹی وی فوٹیج بھیجنے کے لیے کہا۔ انہوں نے ایک بار پھر حیرت کا اظہار کیا مگر مجھ سے شام تک فوٹیجز بھجوانے کا وعدہ کیا۔ میں اس دوران اس واردات کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ مجھے تلوار چوک سے متصل بستی سے کوئی خاص سراغ نہیں ملا تھا مگر اس کا مطلب یہ کسی طور پر نہیں تھا کہ یہ قاتل اس علاقے سے ہو نہیں سکتے تھے۔ اس دن میں.... اس معاملے پر مختلف زاویوں سے غور کرتا رہا۔
دوپہر کے دو بج رہے تھے جب میں نے دوبارہ تلوار چوک کا رُخ کیا۔ گاڑی گزشتہ روز کی طرح قریب ہی پارک کی اور بستی میں داخل ہوگیا۔ کچھ ہی دور وہ مکان تھا جس میں سی سی ٹی وی کیمرے لگے ہوئے تھے۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو چند ہی سیکنڈ بعد دروازہ کھل گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ دروازہ کھولنے والا کوئی اور نہیں بلکہ ابراہیم تھا جس سے میری گزشتہ روز فارمیسی میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر چونک گیا اور سلام دعا کے بعد مجھ سے اندر آنے کے لیے کہا۔ میں اس کے ساتھ ہولیا۔
گھر میں ایک نئے ماڈل کی گاڑی کھڑی تھی جب کہ اس کے ساتھ ایک موٹر سائیکل بھی کھڑی تھی جس پر غالباً گرد سے بچانے کے لیے کپڑا ڈالا گیا تھا۔
میں گھر کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ ابراہیم با وسائل ہوتے ہوئے بھی اس علاقے میں رہتا ہے۔ وہ میرے چہرے پر ظاہر ہونے والی حیرت کو بھانپتے ہوئے بولا۔
"میر صاحب، میں ان گلیوں میں ہی پل کر جوان ہوا پھر موقع ملا تو خلیجی ملک چلا گیا۔ دولت کمائی تو وطن واپس آ کر کاروبار کرنے کا سوچا۔ میں چاہتا تو شہر کے کسی پوش سیکٹر میں گھر لے سکتا تھا، کاروبار کر سکتا تھا مگر میں نے اپنی مٹی سے جُڑے رہنے کو ترجیح دی۔" وہ اپنی ہی دُھن میں بولے جا رہا تھا۔
میں نے اس کے اس جذبے کی تعریف کی۔ ہم باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ گئے تھے۔
"آپ نے گھر کے باہر بھی سی سی ٹی وی کیمرے لگوا رکھے ہیں؟" میں نے یوں ہی بات شروع کرنے کے لیے سوال پوچھا۔
"میر صاحب، میرے والد صاحب میرے بچپن میں ہی گزر گئے تھے۔ والدہ بیمار ہیں۔ گھر پر اکیلی ہوتی ہیں تو کیمرے لگوا دیے تاکہ کام کے دوران بھی گھر پر نظر رہے۔"
"یہ تو آپ نے اچھا کیا۔ کیا مجھے آپ کی دکان اور گھر کی یکم دسمبر سے اب تک کی فوٹیج مل سکتی ہے؟" میں نے اصل مدعے پر آتے ہوئے کہا۔
"کیوں نہیں۔ آپ میرے ساتھ دکان پر چلیے۔ میں آپ کو فوٹیجز یو ایس بی میں کاپی کر کے دے دیتا ہوں۔"
ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے اس کی دکان پر آ گئے۔ میں گزشتہ روز کی طرح ڈھابے نما ریستوران میں بیٹھ گیا اور ابراہیم کے واپس لوٹنے کا انتظار کرتا رہا۔ وہ چالیس منٹ بعد واپس لوٹا۔ اس نے یو ایس بی احتیاط کے ساتھ میرے حوالے کی اور کہا۔
"یہ لیجیے۔ ہو سکتا ہے، یہ فوٹیجز آپ کے کچھ کام آ جائیں۔"
میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس تلوار چوک کا رُخ کیا۔ دفتر پہنچا تو میرے نام کا مہر بند لفافہ میری میز پر رکھا ہوا تھا۔

میں اگلے تین روز تک دن رات یہ فوٹیجز دیکھتا رہا جس سے کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ وہ کالی موٹر سائیکل پہلی واردات میں کچھ فوٹیجز میں نظر آئی تھی مگر پھر اچانک غائب ہو گئی تھی۔ ان بے چہرہ قاتلوں نے پوری منصوبہ بندی سے قتل کیے تھے۔

میں ابراہیم کی فوٹیجز دیکھنا بھول ہی گیا تھا اور میں بہت زیادہ پُریقین نہیں تھا کہ مجھے ان سے کچھ حاصل ہو سکے گا۔

اس دوران ایک اور واردات ہوئی جس کے باعث شہر میں دہشت پھیل گئی تھی۔ اس واردات میں ایک زیرِتعمیر عمارت پر کام کرنے والے مزدوروں پر اندھادھند فائرنگ کی گئی تھی جس میں چار مزدور ہلاک اور سات زخمی ہو گئے تھے۔

پولیس کی ناکا بندیوں اور تفتیشی نظام پر سوالیہ نشان اٹھائے جانے لگے تھے۔ مزدوروں نے ہڑتال کر دی تھی۔ شہر میں تمام تعمیراتی سرگرمیاں بند ہو گئی تھیں۔ مزدوروں کے ورثا نے قاتلوں کی گرفتاری تک دھرنا دے دیا تھا۔ دارالحکومت میں حالات بگڑتے جا رہے تھے۔ یہ سرپھرے تھے یا کوئی منظم گروہ؟ نہ میں اس بارے میں کچھ جانتا تھا اور نہ ہی پولیس تمام تر وسائل بروئے کار لا کر اس بارے میں کچھ معلوم کر سکی تھی۔

یہ عمارت تلوار چوک میں ابراہیم کے گھر والی گلی میں آگے جا کر گھوڑا چوک کے قریب تھی مگر وہاں بھی کوئی سی سی ٹی وی کیمرا نصب نہیں تھا۔ میں پریشان ہو گیا تھا۔ اس صبح میں یوں ہی ابراہیم کے گھر کی فوٹیج دیکھنے لگا۔ سب سے پہلے میں نے یکم جنوری کی فوٹیج دیکھی مگر اس میں کچھ خاص نہیں تھا۔

ابراہیم صبح نو بجے گھر سے نکلتا۔ دوپہر میں کھانا کھانے کا وقفہ کرتا اور پھر رات دیر گئے گھر واپس لوٹتا۔ صرف دو دسمبر کی فوٹیج دیکھنا باقی رہ گئی تھی مگر میں تھک چکا تھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ میری ہمت جواب دے گئی تھی۔ یہ نامعلوم قاتل کون تھے؟ میں اس سوال کا جواب پانے کی پوری سعی کر رہا تھا۔

اگلے دن صبح آٹھ بجے جاگا تو جسم دُکھ رہا تھا اور میں شکست تسلیم کرنے ہی والا تھا کیونکہ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ میری ہر کوشش ناکام رہی تھی۔ میں نے اُس روز دفتر سے چھٹی کرنے کا فیصلہ کیا اور گھر پر ہی لیپ ٹاپ پر ابراہیم کی دی ہوئی فوٹیج دیکھنے لگا۔ یہ دو دسمبر کی فوٹیج تھی جب ایسی پہلی واردات ہوئی تھی۔ میں نے پہلے میڈیکل سٹور کی فوٹیج دیکھی۔ اس میں کچھ تو عجیب تھا جس نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی تھی۔ میں نے بارہا فوٹیج دیکھی مگر اس میں کیا عجیب تھا؟ میں یہ نشاندہی کرنے میں بُری طرح ناکام ہو رہا تھا۔ میں نے

ساتویں بار فوٹیج دیکھی تو معلوم ہوا کہ میڈیکل اسٹور کے باہر ہیلمٹ پہنے ایک شخص نے موٹر سائیکل کھڑی کی، گھڑی پر وقت دیکھا اور ہڑبڑی میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

یہ ایک سراغ ہو سکتا تھا مگر ایسی کالی موٹر سائیکلیں شہر میں بہت سے لوگوں کے پاس ہوں گی اور یہ فرض بھی کر لیا جاتا کہ یہ موٹر سائیکل ان وارداتوں میں استعمال ہوئی تھی تو اس کا سراغ لگانا اس لیے آسان نہیں تھا کہ پولیس اس بارے میں پہلے سے ہی آگاہ تھی۔ میں نے اس کے بعد میڈیکل اسٹور کے اندر کی ویڈیو دیکھی تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ اس شخص نے میڈیکل اسٹور میں دوا لیتے ہوئے بھی ہیلمٹ پہن رکھا تھا۔ ابراہیم اس فوٹیج میں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس سے اگلی فوٹیج میرے لیے اور زیادہ حیران کن تھی جو ابراہیم کے گھر کے باہر کی تھی جس میں ایک نوجوان ہیلمٹ پہنے کھڑا تھا جب وہی سیاہ موٹر سائیکل وہاں آ کر رُکی اور وہ نوجوان اس پر سوار ہو گیا جس کے بعد یہ موٹر سائیکل برق رفتاری سے وہاں سے غائب ہو گئی۔ مجھے اب یہ دیکھنا تھا کہ یہ موٹر سائیکل واپس آئی یا نہیں مگر اس سے آگے کی فوٹیج نہیں تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے فائل کرپٹ ہو گئی تھی مگر میرے دماغ کی بتی جل چکی تھی۔ میں ایک اور موٹر سائیکل کے بارے میں جانتا تھا جو اب تک پردے میں رہی تھی۔ اس انکشاف پر میں حیران ہوئے بنا نہیں رہ سکا اور مجھے عدنان جٹ سے پستول خریدنے والے صاحب یاد آ گئے جنہوں نے اپنا تعارف ان کے بیرونِ ملک مقیم عزیز کے دوست کے طور پر کروایا تھا۔

میں نے عدنان جٹ کا نمبر ڈائل کیا جس نے دوسری بیل پر ہی فون اٹھا لیا۔ سلام دعا کے بعد میں نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر سوال کیا۔

”جٹ صاحب، آپ کے وہ عزیز بیرونِ ملک کہاں رہتے ہیں؟“

وہ میرے اس سوال پر پریشان ہو گیا اور کہا۔ ”وہ خلیج کے کسی ملک میں رہتے ہیں۔“

میں چونکا اس لیے نہیں کہ میں اسی جواب کی امید کر رہا تھا۔ میں نے آج شام اس سے ملاقات کے لیے کہا، اس نے مجھے ملاقات کا وقت دے دیا۔ میں نے اس دوران فوٹیجز میں سے ابراہیم کی تصویر گریب کر کے نکال لی تھی۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ میں نے گاڑی نکالی اور قریب ہی سیکٹر مارکیٹ سے تصویر کا کلر پرنٹ حاصل کیا۔ میں پوری امید کر رہا تھا کہ عدنان جٹ اس تصویر کو پہچان لے گا۔

میں پانچ بجے اس کے گھر پہنچا تو وہ میرا ہی منتظر تھا۔

"جی میر صاحب، خیریت تو ہے۔ یوں اچانک آمد کی وجہ کیا بنی؟"

"یہ تصویر دیکھیے۔ کیا یہ صاحب آپ سے پستول لینے آئے تھے؟"

اس نے غور سے تصویر دیکھی اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں دعوے سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ وہ شخص نہیں ہے۔"

میری امیدوں پر اوس پڑ گئی تھی مگر اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ "کیا آپ ابھی یہ تصویر اپنے عزیز کو بھیج کر ان سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ کیا وہ ان صاحب کو جانتے ہیں۔"

عدنان جٹ نے خوش دلی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میرا شک درست نکلا تھا۔ اس کا عزیز ابراہیم کو جانتا تھا اور اس سے یہ حیران کن انکشاف بھی ہوا کہ ابراہیم غریب ہونے سے ہی نہیں بلکہ غریبوں سے بھی نفرت کرتا تھا جس کے باعث وہ ڈنکی لگا کر خلیج کے اس ملک پہنچا تھا اور اس نے جب بہت زیادہ دولت جمع کر لی تو وطن واپس لوٹ گیا۔

میں عدنان جٹ سے ملاقات کر کے فارغ ہوا تو میرا رُخ تلوار چوک کی جانب تھا۔ میں ابراہیم کے میڈیکل اسٹور پر گیا تو ایک بار پھر ایک صاحب سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ میں نے ان صاحب کی جانب دیکھا تو مجھے دھچکا لگا کیونکہ یہ وہ صاحب ہی تھے جو اُس روز... مجھ سے ٹکرائے تھے جب میری پہلی بار ابراہیم سے ملاقات ہوئی تھی۔

اس نے مجھ سے معذرت کی اور اپنے راستے پر ہولیا۔ ابراہیم مجھے دیکھ کر چونک گیا۔ اس نے اپنے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے مجھے کھلے دل سے خوش آمدید کہا۔ میں اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے نمودار ہونے والی پریشانی کو بھانپ گیا تھا۔

"کیا ہوا میر صاحب۔ خیریت تو ہے نا؟" اس نے مجھ سے استفسار کیا۔

"ہاں خیریت ہی ہے۔ کیا چائے کے کپ پر بات ہو سکتی ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

ابراہیم نے فوراً ہاں کر دی۔ ہم دونوں میڈیکل اسٹور کے سامنے ڈھابے نما ریستوران میں آ گئے۔ میں چائے کی چسکیاں لینے لگا۔

"جی میر صاحب، سب خیریت تو ہے نا؟"

"خیریت ہی تو نہیں ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیوں کیا ہوا میر صاحب؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا، آپ نے مجھے جو فوٹیجز دیں، وہ سب کرپٹ ہو گئیں۔ کیا آپ مجھے دوبارہ فوٹیجز دے سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میر صاحب۔ معذرت قبول کیجیے۔ میں ایک ماہ سے زیادہ کا ڈیٹا نہیں رکھتا۔"

"ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ آپ کے علاقے میں غربت بہت ہے۔" میں نے ابراہیم کے تاثرات جاننے کے لیے خاص طور پر لفظ غربت پر زور دیا تھا۔

"جی۔ مجھے اس غربت سے نفرت ہے۔"

"اور غریبوں سے بھی؟" میں نے اچانک سوال پوچھا۔

"نہی، نہیں۔" اس کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ غریب اس دھرتی پر بوجھ ہیں۔ میں نے درست کہا نا؟"

"میر صاحب، بصدقِ صد درست کہا آپ نے۔ میں تو کہتا ہوں کہ دھرتی کو اس بوجھ سے پاک کر دینا چاہیے۔" وہ اپنی جھنجلاہٹ پر قابو نہیں پا سکا تھا۔

"مگر غریبوں نے آپ کا بگاڑا کیا ہے؟"

"غریب کے لیے یہ دنیا دوزخ سے کم نہیں مگر آپ نے یہ کیا موضوع شروع کر دیا۔" اس نے اچانک پینترا بدلا مگر اس دوران سادہ لباس میں ملبوس پولیس اہل کار ابراہیم کو حراست میں لے چکے تھے۔ ایک گھنٹے کے بعد اس کا ساتھی بھی پکڑا گیا اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس کا ساتھی کوئی اور نہیں بلکہ وہی درمیانی عمر کا مرد تھا جس سے میں دو بار ٹکرایا تھا۔

وہ دونوں پولیس کا تشدد برداشت نہیں کر سکے اور انہوں نے اپنے جرائم کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ یہ پریشان کن انکشاف بھی کیا کہ وہ غریبوں کو مار کر دراصل غربت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ غریبوں کے مسیحا تھے جو اُن کو غربت کی اس بیماری سے نجات دلا رہے تھے جو اُن کی ہر پل جان لے رہی تھی۔ یہ دونوں واقعتاً سرپھرے تھے جنہوں نے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ شہر میں خوف کی فضا قائم رکھی تھی۔

اُس رات میں کئی دنوں بعد پُرسکون نیند سویا۔ یہ میری زندگی کا مشکل ترین کیس تھا جو کبھی حل نہ ہوتا مگر وہ کہتے ہیں نا، ہر مجرم اپنا سراغ چھوڑ جاتا ہے تو کچھ ایسا ہی ابراہیم کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کی وجہ سے بھی ہوا تھا۔

❖❖❖

بزدل مجرم

اسما قادری

زندگی مسرت، دل لگی اور فرصت کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے... پیار بھرے رشتے اور مخلص دوستوں کا ساتھ اس سلسلے کو رواں رکھتا ہے... دوڑتی بھاگتی زندگی میں درد کا رشتہ کسی کسی سے ہی بن پاتا ہے... وہ بھی اپنی ہنستی مسکراتی دنیا میں مست تھی کہ کسی کی بھیگی آنکھ کے سیلِ رواں نے اسے بے چین و مضطرب کر دیا... ایک شیشۂ سادہ تھی جس کے آر پار آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا اچانک ہی اس شیشے میں دراڑ پڑی اور دوستوں کے لہجے بدل گئے...

ایک بزدل مجرم کے بھیس میں

چھپے دشمن کا خطرناک وار......

''بالکل نہیں، تم ہرگز بھی ایسا نہیں کرو گی۔''

''لیکن کیوں؟ وہ میری اتنی اچھی دوست ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اُسے میری مدد کی ضرورت ہے۔''

''مدد کرنی ہے تو ڈائریکٹ اس کے اکاؤنٹ میں رقم بھجوا دو۔ ملاقات کوئی ضروری نہیں ہے۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو عثمان! اس طرح تو اسے اپنی انسلٹ محسوس ہو گی۔ وہ مجھ سے ملاقات کی اتنی شدید خواہش مند ہے اور میں کہہ دوں کہ چونکہ میرے شوہر کے دل میں تمہارے لیے بہت سے شکوک و شبہات ہیں تو تم مدد کے نام پر مجھ سے یہ بھیک تو لے سکتی ہو لیکن میں تم سے ملاقات نہیں کر سکتی۔'' وہ خفا ہوئی۔

''کوئی بہانہ بھی بنایا جا سکتا ہے یار!'' وہ بیزار ہوا۔

''جب سے شادی ہوئی ہے یہی تو کر رہی ہوں۔ ہر بار بہانے بنانے کی وجہ سے میری ساری پرانی دوستیں چھوٹ گئی ہیں۔ اب سوشل میڈیا پر چند سہیلیاں بنائی ہیں تو تمہیں وہ بھی برداشت نہیں ہو رہیں۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''بات کو سمجھو صوفی! سوشل میڈیا کی دنیا کتنی فیک ہے تم نہیں جانتیں...... ہم اسکرین پر جن کے خوب صورت الفاظ پڑھتے ہیں، اسکرین کے پیچھے چھپی ان کی شخصیت کتنی بدصورت ہے، ہمیں اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ میں یہ سب صرف تمہارے اور اشعر کے تحفظ کے لیے کہہ رہا ہوں۔ اگر میں وہاں ہوتا تو پھر کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن تم وہاں اکیلی ہو۔ مجھے فکر ہوتی ہے کہ تم دونوں کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔''

عثمان نے اپنا لہجہ نرم کر لیا۔ اسے معلوم تھا کہ شادی کے بعد اس کی امی نے صوفی کو کافی مشکل وقت دیا تھا۔ وہ اپنے اصولوں کی سخت تھیں اور اپنی اولاد سمیت بہوؤں کو بھی اپنے کنٹرول میں دیکھنا چاہتی تھیں اس لیے بعض اوقات ان سے زیادتی بھی ہو جاتی تھی۔ صوفی نے وہ پورا وقت بہت صبر سے گزارا تھا۔ پچھلے برس امی کے انتقال کے بعد ان کا آبائی گھر فروخت کر کے سب بھائی بہنوں کو ان کا حصہ دیا

گیا تو عثمان نے صوفی کے لیے ایک اچھے پروجیکٹ میں تین کمروں کا کشادہ اپارٹمنٹ خرید دیا۔ وہ خود قطر میں ملازمت کرتا تھا اور سال میں ایک دو بار ہی اس کا پاکستان آنا ہوتا تھا۔ صوفی اور اشعر کو بھی اپنے پاس وزٹ ویزا پر دو بار بلا چکا تھا لیکن انہیں مستقل وہاں اس لیے شفٹ نہیں کروایا تھا کہ وہ خود پاکستان واپس آنے کی خواہش رکھتا تھا۔ جیسے ہی کاروبار سیٹ کرنے کے لیے مناسب رقم جمع ہوتی فوراً پاکستان آجاتا۔

''تو تم واپس آجاؤ نا، تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ میں یہاں کتنی تنہا ہوں۔'' بات اصل موضوع سے ہٹ گئی۔ صوفی نے اس سے وہ کہا جس پر وہ پچھلے چند مہینوں سے شدت سے اصرار کر رہی تھی۔

''اسی لیے تو تم سے کہا تھا کہ فی الحال اپارٹمنٹ کرائے پر دے دو اور خود اپنی امی کے گھر رہ لو۔ وہاں رہتیں تو تمہیں کم از کم تنہائی کا تو احساس نہ ہوتا۔''

''تمہاری کمی کہیں بھی رہنے سے پوری نہیں ہو سکتی اور امی کے گھر رہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب وہ گھر میری بھابیوں کا ہے اور میری قدر و عزت اسی میں ہے کہ میں وہاں بس مہمان بن کر ہی جاؤں۔ میکے میں ڈیرے ڈال لینے والی نندیں کسی کو نہیں بھاتیں۔'' اس نے امی کے گھر پر رہنے کے حوالے سے اپنا ہمیشہ کا موقف دہرایا۔

''وہ تو خیر چلو تمہاری مرضی ہے لیکن اب اکیلی رہ رہی ہو تو احتیاط بھی لازم ہے۔ تمہیں نہیں اندازہ کہ اکیلی رہنے والی عورت جس کا شوہر بیرون ملک کمائی کرنے گیا ہو، فراڈیوں کے لیے کتنا آئیڈیل شکار ہو سکتا ہے۔'' بات گھوم پھر کر دوبارہ اسی جگہ آگئی تھی۔

''اچھا بابا! نہیں بلا رہی اپنی کسی فیس بک دوست کو گھر پر، تم وہاں سکون سے رہو۔'' آخر کار صوفی نے ہتھیار ڈال دیے لیکن اس کا دماغ مسلسل کوئی تدبیر سوچنے میں مصروف تھا۔

☆☆☆

صوفیہ عرف صوفی کا شمار بھی خواتین کی اسی قسم میں ہوتا تھا جو اپنی تنہائی بانٹنے کے لیے سوشل میڈیا کا استعمال کرتی ہیں۔ سسرال میں رہتے ہوئے تو ذرا کم موقع ملتا تھا لیکن جب سے اپنے الگ گھر میں منتقل ہوئی تھی، سوشل میڈیا کا استعمال خاصا بڑھ گیا تھا۔ اشعر کو پلے گروپ میں داخل کروانے کے بعد سے وہ مزید فارغ ہو گئی تھی۔ گھر کے کام کاج نمٹانے کے بعد اس کا زیادہ وقت سوشل میڈیا پر ہی گزرتا تھا۔ اس کی فیس بک پر کئی اچھی دوستیں بن گئی تھیں۔ وہ کئی گروپ میں ایڈ تھی اور اپنی سہیلیوں کی پوسٹس پر ری ایکٹ اور کمنٹ کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی وقتاً فوقتاً پوسٹس لگاتی رہتی تھی۔ اس کی پوسٹس عموماً اشعر یا اپنے گھر کی تصاویر پر مشتمل ہوتی تھیں۔ کبھی وہ پردوں کے کلر کے متعلق مشورے طلب کر رہی ہوتی تو کبھی اسے اپنے صوفہ کورز کے سلسلے میں اطمینان چاہیے ہوتا تھا۔ عثمان کے اپنے اور اشعر کے لیے بھیجے گئے تحائف کی تصاویر تو فیس بک پر ڈالنا لازم تھا کہ اس کے بعد تعریفوں اور ماشاءاللہ، سبحان اللہ کی گردان سے وہ پھولے نہیں سماتی

تھی۔ خواتین میں گیان بانٹنا بھی وہ اپنا فرض سمجھتی تھی اور اپنے لمبے لمبے کمنٹس کے ذریعے لوگوں کو بتاتی تھی کہ کیسے سسرال میں شکر صبر سے وقت گزار کر اس نے اپنے میاں کا دل اپنی مٹھی میں کیا اور اب وہ وقت ہے کہ میاں سمیت اس کا سارا پیسا بھی اس کے قبضے میں ہے۔

فیس بک پر اس کی کئی اچھی سہیلیاں بن چکی تھیں جن میں سے کچھ سے اِن باکس گفتگو کا سلسلہ تھا تو کچھ بہت ہی خاص سہیلیوں کو واٹس ایپ پر بھی ایڈ کر رکھا تھا۔ شازیہ کا شمار بھی ایسی ہی خاص سہیلیوں میں ہوتا تھا۔ شازیہ سے اس کی جان پہچان خواتین کے ایک گروپ سے ہوئی تھی۔ اس کی پوسٹوں سے اسے پتا چلا تھا کہ شازیہ کی ایک بیٹی کا چہرہ چولھے پر دھری گرم تیل کی کڑاہی گرنے سے جھلس گیا تھا۔ شازیہ نے ایک آدھ بار بچی کی تصاویر بھی اس کے اِن باکس میں شیئر کی تھیں۔ صوفی ان تصویروں کو دیکھ کر کانپ گئی تھی۔ آٹھ نو سال کی بچی حادثے کے نتیجے میں جتنی بدہیئت ہو گئی تھی سو ہو گئی تھی۔ وہ تو اس اذیت کا سوچ کر ہی کئی راتوں تک ڈھنگ سے سو نہیں سکی تھی جس اذیت سے وہ بچی گزری تھی۔ ایک ماں کی حیثیت سے اسے کسی بھی بچے کی تکلیف بہت شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ شازیہ کی بیٹی نائلہ کی تکلیف کا بھی یہی معاملہ تھا۔

شازیہ سے ہمدردی نے اسے اس سے مسلسل رابطے میں رہنے پر مجبور کر دیا۔ ان روابط سے اسے اندازہ ہوا کہ شازیہ کا تعلق زیریں طبقے سے ہے۔ ایسا خاندان جو مشکل سے اپنے بنیادی اخراجات پورے کرتا تھا۔ بچی کے بہترین علاج کی استطاعت کہاں سے رکھتا۔ ابتدائی علاج بھی لوگوں کی ہمدردی کے سہارے ہی ہوا تھا۔ اس علاج سے بچی کی زندگی بچ گئی تھی اور زخم بھی بھر گئے تھے لیکن شازیہ کی خواہش تھی کہ اپنی بدشکل بچی کو اس حالت میں لا سکے کہ وہ اس معاشرے کے لیے قابلِ قبول تو بن سکے۔ اس مسئلے کا واحد حل پلاسٹک سرجری کی صورت میں موجود تھا لیکن شازیہ کے اتنے وسائل نہیں تھے کہ اس مہنگے علاج کے اخراجات برداشت کر سکے۔ اس کا تعلق بھی اندرونِ سندھ کے ایک چھوٹے شہر سے تھا جہاں کے سرکاری اسپتالوں میں عام بیماریوں کا بھی ڈھنگ سے علاج نہ ہوتا تھا تو پلاسٹک سرجری تو محض ایک خواب ہی تھا۔ اس نے اپنے کچھ ذرائع سے معلومات حاصل کی تھیں جن کے مطابق کراچی کا ایک سرجن نائلہ کا علاج کر سکتا تھا۔ سرجن نے رعایت کا بھی وعدہ کیا تھا لیکن یہ رعایتی فیس بھی لاکھوں میں تھی۔ شازیہ نے کہہ سن کر اِدھر اُدھر سے خاصی رقم جمع کر لی تھی لیکن اب بھی ایک ڈیڑھ لاکھ کی کمی تھی۔ صوفی کو عثمان گھر کے خرچ کے علاوہ ذاتی خرچ کے نام پر جو رقم دیتا تھا، اس کا بیشتر حصہ اس کے پاس محفوظ تھا اور وہ اس میں سے کم از کم ایک لاکھ روپے آرام سے شازیہ کو دے سکتی تھی۔ اس سارے حساب کتاب کے بعد اس نے شازیہ کی کراچی آنے کے سلسلے میں حوصلہ افزائی کی تھی اور اشاروں میں اپنے تعاون کا بھی بتا دیا تھا۔ اس سب کا نتیجہ تھا کہ شازیہ اپنی بچی اور شوہر سمیت ان دنوں کراچی میں اپنے کسی دور پار کے عزیز کے گھر موجود تھی اور اس نے صوفی سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ صوفی خود بھی اس سے ملنا چاہتی تھی۔ اس نے شازیہ اور اس کی فیملی کی زبردست سی دعوت کا بھی سوچ رکھا تھا اور آج عثمان سے اسی سلسلے میں گفتگو کی تھی لیکن عثمان قطعی اس بات کے لیے راضی نہیں تھا کہ وہ اجنبی لوگوں کو اپنے گھر میں بلائے۔ اس نے آج کل کے حالات کی اونچ نیچ بتا کر صوفی کو اس دعوت کے لیے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس کے اتنا منع کرنے پر صوفی نے گھر پر دعوت کا پروگرام تو ملتوی کر دیا تھا لیکن شازیہ سے ملاقات بہرصورت کرنا چاہتی تھی۔ بہت سوچ سوچ کر آخرکار اسے ایک ترکیب سوجھ ہی گئی تو جھٹ شازیہ کا نمبر ڈائل کر ڈالا۔

”کیسی ہو تم صوفی؟ قسم سے میں تم ہی کو یاد کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ تمہارے شہر میں آ کر بھی ابھی تک تم سے ملاقات نہیں ہو سکی ہے۔“ شازیہ کال ریسیو کرتے ہی حسبِ عادت لگاوٹ سے کہنے لگی۔

”میں بھی تم سے ملاقات کے لیے بے چین ہوں شازی اور اس سلسلے میں تم سے ایک زبردست سا آئیڈیا بھی ڈسکس کرنا چاہتی ہوں۔“

”وہ کیا بھئی، میں بھی تو سنوں۔“ شازیہ نے اس کا پُرجوش لہجہ محسوس کر کے تجسس سے پوچھا۔

”ہم باہر کسی اچھی جگہ ملتے ہیں۔ اس بہانے ہماری ملاقات بھی ہو جائے گی اور بچوں کی آؤٹنگ بھی۔ تمہیں تو پتا ہے کہ عثمان یہاں نہیں ہوتے تو میں اشعر کو کہیں گھمانے پھرانے لے جا ہی نہیں پاتی۔ اچھا ہے بچے انجوائے کرتے رہیں گے اور ہم ایک دوسرے سے باتیں۔“

”لیکن تم نے تو پہلے کہا تھا کہ تم مجھے اپنے گھر پر انوائٹ کرو گی۔“ اس نے جتنی گرم جوشی سے شازیہ کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا تھا، شازیہ کا ردِعمل اتنا پُرجوش نہیں تھا بلکہ اس میں ہلکے سے شکوے کی جھلک بھی تھی۔ صوفی اندر ہی

اندر جھینپ گئی لیکن چونکہ وضاحتیں پہلے ہی سوچ چکی تھی سو لہجے کو زبردستی بشاش بنا کر بولی۔

''ہاں یار وہ پروگرام بس میں نے خود ہی کینسل کر دیا۔ گھر پر کسی کو بلاؤ تو سارا وقت بس کام میں لگے رہنا پڑتا ہے۔ ایسے میں خاطر مدارت تو ہو جاتی ہے لیکن آنے والوں سے ڈھنگ سے بیٹھ کر بات کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ باہر ملیں گے، بچوں کو انجوائے کروائیں گے، کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا پینا کریں گے اور خوب مزے سے گپ شپ لگائیں گے۔''

''تمہیں یہی ٹھیک لگتا ہے تو ایسے ہی سہی۔'' شازیہ نے جیسے بادل ناخواستہ ہامی بھری۔

''تھینک یو یار۔ میں تمہیں بتاؤں کہ میں کئی ماہ سے کہیں گھومنے نہیں گئی۔ امی کے گھر بھی کم کم ہی جانا ہوتا ہے۔ تمہیں تو پتا ہے کہ زیادہ میکے جاؤ تو پھر بھابیوں کے منہ بننے لگتے ہیں۔'' اس نے گفتگو کا رخ خواتین کے پسندیدہ چغلی پروگرام کی طرف موڑ دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب آگے کی ساری گفتگو اسی موضوع پر ہونی ہے۔ یوں اس کی شازیہ کو مزید وضاحتیں دینے سے جان چھوٹ گئی لیکن فون بند کرنے سے پہلے وہ ملاقات کا پروگرام طے کرنا نہیں بھولی تھی۔

☆☆☆

''تمہارا واپسی کا کب تک پروگرام ہے عثمان! میرے خیال میں اب تمہیں اس سلسلے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔'' اشعر اسکول جا چکا تھا، وہ چائے پیتے ہوئے ویڈیو کال پر عثمان سے بات کر رہی تھی۔ عثمان مختلف ٹائم زون میں ہونے کی وجہ سے بعد میں جاگتا تھا اور یہ وہ وقت ہوتا تھا جب وہ اشعر کو اسکول بھجوانے کے بعد کچن سمیٹ کر فارغ ہو چکی ہوتی تھی۔ اس وقت عثمان سے سکون سے ویڈیو کال پر بات کرنا اس کا روزانہ کا معمول تھا۔

''کیا بات ہے، آج صبح صبح اتنی سیریس کیوں ہو؟'' ناشتے کے لیے کافی پھینٹتے عثمان نے اس کی سنجیدگی کو محسوس کیا۔

''میں اکیلی رہتے رہتے تھک گئی ہوں عثمان! مجھے اور اشعر کو تمہاری ضرورت ہے۔ صرف پیسے سے ہم کب تک خود کو بہلائیں۔ پیسا تمہارا نعم البدل تو نہیں ہے نا۔'' وہ اداس تھی۔ کل خاندان میں کوئی تقریب تھی اور وہ صرف اس لیے نہیں جا سکی تھی کہ اس کے لیے لیٹ نائٹ اکیلے بچے کے ساتھ شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کا سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔

''مجھے تمہاری تنہائی کا احساس ہے یار لیکن تم اکیلی ہی تو یہ سب نہیں بھگت رہی ہو نا؟ میں بھی یہاں تنہا ہوں اور بہت کچھ مس کرتا ہوں۔ اب یہی دیکھ لو کہ ہم ساتھ ہوتے تو اس وقت تم میرے لیے ناشتا بنا رہی ہوتیں اور میں دس بار تمہارے جگانے پر سو سو نخرے کر کے بستر چھوڑتا۔''

''تم واپس آ جاؤ تو یہ سب ہو سکتا ہے۔''

''بس تھوڑا سا انتظار میری جان! جہاں اتنے سال صبر کیا ہے کچھ عرصہ اور...... میں کوشش کر رہا ہوں کہ پاکستان میں بزنس کی کوئی سیٹنگ بن جائے تب ہی واپس آؤں۔ اس بار چھٹیوں پر آؤں گا تو کچھ نہ کچھ سیٹنگ کر کے ہی جاؤں گا، پکا وعدہ۔'' عثمان اسے بتانے اور بہلانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ جب وہ ہمیشہ کی طرح نارمل ہو کر مسکرا کر باتیں کرنے لگی تو بولا۔

''اچھا سنو، آج میرا بہت بزی شیڈول ہے۔ رات دیر سے ہی فارغ ہوں گا تو ہو سکتا ہے آج رات تم سے بات نہ ہو سکے۔''

''چلو ٹھیک ہے، ویسے بھی آج میں خود بھی بزی ہوں گی۔''

''تم کہاں، اپنی امی کی طرف جا رہی ہو؟'' عثمان نے مکھن لگے سلائس کا لقمہ نگل کر کافی کا بڑا سا گھونٹ لیا اور اس سے پوچھا۔ وہ ہمیشہ سے ناشتے میں چائے کے مقابلے میں کافی پسند کرتا تھا اور اسی انداز سے ناشتا کرتا تھا۔

''امی کی طرف جاؤں تو تم سے بات کرنے میں کیا مسئلہ ہے۔ میں شازیہ سے ملنے جا رہی ہوں۔'' اس نے اب تک عثمان کو اپنے نئے پروگرام سے آگاہ نہیں کیا تھا لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ اسے بتائے بغیر ہی کہیں چلی جاتی۔

''کون شازیہ؟'' عثمان، شازیہ کو بھول چکا تھا۔

''ارے میری وہی فیس بک فرینڈ جس کی بیٹی کا چہرہ......''

''کہاں جا رہی ہو تم اُس سے ملنے؟'' عثمان نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا اور تیز لہجے میں پوچھا۔

''ایک پارک کا پروگرام بنایا ہے۔ پبلک پلیس پر تو تمہیں یہ خطرہ نہیں ہوگا نا کہ وہ ہمیں لوٹ لے گی یا اغوا ہی کر کے لے جائے گی۔'' صوفی کا لہجہ اس سے زیادہ تیز ہو گیا۔

''یہ رسکی ہے صوفی...... پتا نہیں کون لوگ......''

''باہر سیکڑوں لوگوں میں کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر تمہیں ہماری اتنی ہی فکر ہے تو یہاں آ کر رہو اور

ہماری حفاظت کرو۔'' اس بار صوفی نے اس کی بات کاٹ دی اور تندی سے بولی۔

''ٹھیک ہے پھر جیسی تمہاری مرضی ویسے کرو۔'' عثمان نے خفگی سے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ صوفی کا دل اس کی خفگی پر تھوڑا سا بُرا تو ہوا لیکن پھر اس نے سر جھٹک کر اس بات کو ذہن سے نکال دیا۔ وہ شازیہ سے وعدہ کر چکی تھی اور کوئی نیا بہانہ بنا کر پروگرام ملتوی کرنے کا قطعی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

☆☆☆

''ساڑھے چھ۔'' عثمان نے سرہانے رکھا موبائل اٹھا کر وقت دیکھا اور بستر پر اٹھ بیٹھا۔ وہ کل رات گئے تک مصروف رہا تھا اور واپس آتے ہی چینج کر کے سو گیا تھا۔ تھکن اتنی شدید تھی کہ رات کا سویا ابھی جاگا تھا، وہ بھی اپنے معمول سے تقریباً آدھا گھنٹا تاخیر سے۔

''پاکستان میں ساڑھے آٹھ ہو رہے ہوں گے۔ اشعر اسکول جا چکا ہوگا اور اب کسی بھی وقت صوفی کی کال آنے والی ہوگی۔'' اس نے سوچا اور بستر چھوڑنے سے پہلے صوفی کو ایک وائس میسج کیا۔

''ہیلو ڈارلنگ! آج میں دیر سے اٹھا ہوں اور شاور لینے جا رہا ہوں۔ شاور کے بعد خود تمہیں کال کرتا ہوں۔'' پیغام روانہ کرنے کے بعد وہ بستر چھوڑ کر غسل خانے میں جا گھسا۔ نیم گرم پانی سے شاور لے کر تازہ دم ہو کے باہر نکلا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر برش کرنے لگا۔ موبائل اس سارے عرصے میں خاموش رہا تھا جس کا مطلب اس نے یہی لیا تھا کہ صوفی نے اس کا وائس میسج سن لیا ہے اور صبر سے اس کے کال کرنے کا انتظار کر رہی ہے۔ بالوں میں برش کرنے کے بعد موبائل ہاتھ میں لے کر کچن کا رخ کرتے ہوئے اس نے صوفی کو کال کرنے کی نیت سے وائس اَیپ کھولا۔ یہ دیکھ کر اس کے ماتھے پر تفکر کے بل پڑ گئے کہ اس کا صوتی پیغام صوفی کے نمبر پر وصول ہی نہیں ہوا تھا جس کے دو ہی مطلب ہو سکتے تھے۔ اول موبائل بند تھا، دوم موبائل پر انٹرنیٹ سروس دستیاب نہیں تھی۔ موبائل آف رکھنے کی صوفی کو بالکل بھی عادت نہیں تھی۔ البتہ نیٹ ایشو ہونے کا امکان تھا۔ وہ کیبنٹ سے کافی کا جار نکالنا بھول کر صوفی کو وائس اَیپ کال کرنے لگا۔ کال نہیں لگی۔ اس طرف سے مایوس ہو کر اس نے عام کال ملا دی۔

''ہم معذرت خواہ ہیں کہ آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے۔'' دوسری طرف سے سنائی دینے والے مشینی پیغام نے اس کے ماتھے پر بننے والا شکنوں کا جال مزید گہرا کر دیا۔ اس کا پہلا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا کہ صوفی کے موبائل پر انٹرنیٹ سروس موجود نہیں تھی۔ دراصل اس کا موبائل ہی آف تھا اور یہ ایک خلافِ معمول بات تھی۔ اس نے وائس ایپ کھول کر ایک بار پھر چیک کیا۔ صوفی کا لاسٹ سین، پونے تین بجے کا لکھا ہوا آ رہا تھا یعنی کل دوپہر تین بجے کے بعد سے اب تک اس نے دوبارہ وائس ایپ کا استعمال نہیں کیا تھا۔

''کیا وہ مجھ سے ناراضی کا اظہار کر رہی ہے؟'' اسے کل کیا جانے والا صوفی کا واپسی پر اصرار اور پھر کال کے آخر میں ہونے والی ہلکی سی تلخ کلامی یاد آئی تو اندازہ لگایا اور قدرے مطمئن ہوتے ہوئے کافی بنانے کی تیاری کرنے لگا۔ کافی پھینٹتے ہوئے کئی بار اس نے صوفی کا نمبر ٹرائی کیا۔ لیکن نتیجہ ہر بار ایک ہی تھا۔

''صوفی ایسا تو کبھی نہیں کرتی۔ کچھ بُرا لگے تو دو چار باتیں سنا لیتی ہے لیکن رابطہ کبھی ختم نہیں کرتی۔'' ہر بار کی ناکامی نے اس کی تشویش میں اضافہ کر دیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ موبائل کے سوا اس کے پاس صوفی سے رابطے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا۔ لینڈ لائن فون خود صوفی نے لگوانے سے صاف انکار کر دیا تھا کہ استعمال ہوگا نہیں اور فضول میں بل آتا رہے گا۔

''آخر کیا مسئلہ ہے؟'' جھنجلاہٹ اور پریشانی میں وہ کافی کو بھول گیا اور سوچنے لگا کہ کس طرح صوفی کی خیریت معلوم کرے۔ آخرکار صوفی کی امی کا نام ذہن میں جگمگایا اور ان کا نمبر ڈائل کر دیا۔

''خیریت ہے بیٹا تم اتنی صبح صبح کیسے؟'' ابتدائی سلام دعا کے بعد انہوں نے یوں صبح صبح کال کرنے کی وجہ دریافت کرنی چاہی۔

''صوفی کا معلوم کرنا تھا آنٹی! میرا اُس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا تو سوچا آپ سے پوچھ لوں۔''

''میری تو اس سے پرسوں آخری بار بات ہوئی تھی بیٹا! شرافت بھائی کے بیٹے کا ولیمہ تھا تو میں نے اس سے یہ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا کہ وہ ولیمے میں جائے گی یا نہیں۔'' انہوں نے اسے بتایا۔

''ٹھیک ہے آنٹی! میرے خیال میں صوفی کا فون خراب ہو گیا ہے اس لیے اس کے نمبر پر کال نہیں جا رہی ہے۔'' اس نے بیک وقت انہیں اور خود کو تسلی دی۔

''تمہاری اُس سے بات ہو تو کہنا مجھے بھی فون کر لے ورنہ میں پریشان رہوں گی۔ سرور آفس کے لیے نکل گیا

ہوتا تو میں اسے صوفی کا معلوم کرنے بھیج دیتی۔'' انہوں نے اپنے چھوٹے بیٹے کا حوالہ دیا۔

''آپ پریشان نہ ہوں آنٹی! میری جیسے ہی صوفی سے بات ہوتی ہے، میں اسے آپ کو کال کرنے کے لیے کہتا ہوں۔'' اس نے جواب دے کر سلسلہ منقطع کیا اور وقت دیکھا۔ سوا سات بج رہے تھے یعنی پاکستان میں تقریباً سوا نو۔ اس وقت پاکستان میں لوگ اپنی جائے کار پر پہنچ چکے ہوتے تھے یا پہنچنے والے ہوتے تھے۔ ایک نجی ادارے میں کام کرنے والا صوفی کا بھائی سرور بھی ان ہی لوگوں میں شامل تھا۔

''اور کس سے مدد لوں؟'' وہ دھیرے سے بڑبڑایا اور اپنے بھائی کے بارے میں سوچا۔ ''بھائی جان کو بیچ میں ڈالنا شاید مناسب نہ ہو۔ اگر کوئی معمولی مسئلہ ہوا تو خوامخواہ سب مذاق اُڑائیں گے اور صوفی الگ ناراض ہو گی کہ میں نے اسے تماشا بنا دیا۔'' اس نے خود ہی اس خیال کو رد کر دیا۔

''بشیر بھائی کو کال کرتا ہوں۔'' اس بار اس کے ذہن میں اپارٹمنٹ بلڈنگ کا انتظام و انصرام سنبھالنے والی یونین کمیٹی کے صدر کا نام آیا۔ کبھی کبھی چھوٹے موٹے مسائل ہو جاتے تھے تو صوفی اسے اطلاع دیتی تھی کہ آج پانی نہیں آیا، کچن کی لائن بلاک ہو رہی ہے، کچرا اٹھانے والا کچرا لینے نہیں آیا وغیرہ وغیرہ۔ ان سب مسائل کے حل کے لیے وہ بشیر بھائی کو ایک کال کرتا تھا اور مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔ اب بھی ان کی مدد لی جا سکتی تھی۔

''لیکن بشیر بھائی ابھی سو رہے ہوں گے۔'' گھڑی پر نظر پڑی تو وہ بشیر بھائی کا نمبر ملاتے ملاتے رک گیا۔ اسے علم تھا کہ بشیر بھائی کی صبح گیارہ بجے سے پہلے نہیں ہوتی۔

''ویسے بھی مجھے تھوڑی دیر انتظار کرنا چاہیے۔ یقیناً صوفی کے موبائل کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہو گی اور وہ موقع ملتے ہی خود پہلی فرصت میں مجھے کال کرے گی۔ اسے معلوم ہے کہ میں روزانہ جب تک اس کی اور اشعر کی خیریت معلوم نہیں کر لیتا مجھے سکون نہیں ملتا۔'' اسے احساس ہوا کہ وہ صرف ایک کال نہ مل سکنے پر ضرورت سے زیادہ پریشان ہو رہا ہے۔ صوفی کا فون بند ہونے کی کوئی بھی معمولی وجہ ہو سکتی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے خود کو ذرا سا سنبھالا اور اپنے معمول کے کام انجام دینے لگا۔

ناشتا اس کا پسندیدہ اور روزانہ والا ہی تھا لیکن ذہن پر موجود دباؤ کی وجہ سے وہ ڈھنگ سے کھا نہیں سکا اور تیار ہو کر آفس کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس دوران اس نے کئی بار موبائل چیک کیا تھا۔ صوفی ہنوز آف لائن تھی۔ آفس پہنچ کر معمول کے کاموں میں اُلجھنے کے باوجود اس کا ذہن مکمل طور پر صوفی کی طرف سے نہیں ہٹ سکا۔ درمیان میں موقع ملنے پر کئی بار صوفی کا نمبر بھی ٹرائی کیا لیکن نتیجہ ہر بار ایک ہی تھا۔

''کوئی مسئلہ ہے کیا عثمان! جب سے آفس آئے ہو، میں نوٹ کر رہا ہوں کہ تم کچھ اُلجھے اُلجھے سے ہو۔'' اس نے پتا نہیں کون سی بار صوفی کا نمبر ملانے کے بعد ناکامی کا سامنا کیا تھا جب اس کے کولیگ اظہر نے اس سے دریافت کیا۔

''گھر کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں یار لیکن صوفی کا نمبر ہی مسلسل بند جا رہا ہے۔ ایسا پہلی بار ہوا ہے تو مجھے کچھ پریشانی ہو رہی ہے۔'' اظہر سے اس کی خاصی بے تکلفی تھی اس لیے فوراً ہی اپنا مسئلہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

''فون خراب ہو گیا ہو گا یا نیٹ ورک ایشو ہو گا۔'' اظہر نے بھی وہی کہا جو وہ پہلے ہی سوچ چکا تھا۔

''شاید ایسا ہی ہو لیکن صوفی کل دوپہر کے بعد سے مسلسل آف لائن ہے اور یہ ایک خلافِ معمول بات ہے۔ اگر کوئی پرابلم تھا بھی تو صوفی ابھی تک ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ فوراً خرابی کو دور کرواتی ورنہ سیدھے سیدھے نیا موبائل لے لیتی۔''

''تو تمہیں کیا لگ رہا ہے؟'' اظہر نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''کوئی واضح خیال نہیں ہے ذہن میں لیکن میں اس وجہ سے تھوڑا پریشان ہوں کہ صوفی کل اشعر کے ساتھ اپنی کسی فیس بک دوست سے ملنے جانے والی تھی۔ اسے ساتھ میں کیش بھی لے جانا تھا۔'' اس نے اظہر کو شازیہ اور اس کی بیٹی نائلہ کے حادثے کے بارے میں مختصراً بتایا۔

''واقعی یہ تھوڑی پریشان کن بات ہے۔ تمہیں بھابی کو منع کرنا چاہیے تھا۔''

''منع کیا تھا یار لیکن تمہاری بھابی کو جب کسی کے ساتھ ہمدردی کا بخار چڑھ جائے تو اسے کچھ سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے۔'' اس نے اظہر کی بات کا تھوڑی جھلاہٹ سے جواب دیا اور بشیر بھائی کا نمبر ملانے لگا۔

''سالا مالیکم عثمان بھائی! آج صبح، صبح کیسے یاد کر لیا؟'' بشیر بھائی کے لیے پونے بارہ بجے بھی صبح ہی تھی۔

''وعلیکم السلام بشیر بھائی۔ مجھے ذرا اہم کام تھا اس لیے آپ کو زحمت دی ہے۔''

''بولو جی بولو۔ اب کیا شکایت ہو گئی ہے ہماری

بھرجائی کو انتظامیہ سے؟'' بشیر بھائی نے سابقہ تجربات کی روشنی میں پوچھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں بشیر بھائی! ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے اور مجھے آپ کی تھوڑی سی مدد چاہیے۔''

''بتایئے جی، بندہ خدمت کے لیے ہی بیٹھا ہے۔'' بشیر بھائی نے لہک کر جواب دیا۔

''میرا اپنی وائف سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ آپ ذرا معلوم کروا دیں کہ گھر پر سب خیریت تو ہے۔''

''ابھی معلوم کروا دیتے ہیں جناب! آپ پریشان نہ ہوں۔ ویسے میں نے کل دوپہر تو بھابی جی اور اشعر کو ایک آن لائن ٹیکسی میں بیٹھ کر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ اپنے میکے گئی ہوں۔'' بشیر بھائی نے اس کا مدعا سن کر تعاون کی یقین دہانی کروانے کے ساتھ ساتھ رپورٹ بھی دی۔

''وہ وہاں نہیں ہیں۔ پلیز آپ چیک کر کے مجھے بتا دیں۔'' اس کی پریشانی اس کے لہجے سے چھلکنے لگی۔

''جی، جی اچھا، بس آپ مجھے پانچ منٹ دیں۔'' بشیر بھائی سنجیدہ ہو گئے۔

''تسلی رکھو۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو گا۔'' اس ساری گفتگو کو سنتے اظہر نے اسے تسلی دی۔ وہ محض سر ہلا کر رہ گیا اور خود کو کام میں مصروف کرنے کی کوشش کی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد بشیر بھائی کی واٹس ایپ کال آنے لگی۔

''جی بشیر بھائی۔'' اس نے جلدی سے کال وصول کی۔

''وہ ایسا ہے عثمان بھائی، میں نے پتا کروایا ہے۔ گھر تو آپ کا لاک ہے۔ میں نے گارڈز سے معلوم کیا تو ان کا کہنا ہے کہ کل دوپہر انہوں نے بھابی جی اور منے میاں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ واپس آتے ہوئے نہیں دکھائی دیے۔ میں نے کل دوپہر سے اب تک کی کیمرے کی ریکارڈنگ بھی دیکھی ہے۔ اس میں بھی کچھ نہیں ہے۔'' بشیر بھائی کے سنجیدہ لہجے میں دی گئی اطلاع نے اسے سن سا کر دیا۔

''عثمان بھائی۔'' اس کی طرف سے خاموشی پر انہوں نے اسے پکارا تو وہ چونکا۔

''جی، جی بشیر بھائی۔ بہت شکریہ آپ کے تعاون کا۔''

''میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتایئے۔'' انہوں نے پیشکش کی۔

''جی کوئی ضرورت پڑی تو ضرور بتاؤں گا۔'' اس نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ اظہر جو اپنی سیٹ پر جا چکا تھا، اسے فون رکھتا دیکھ کر دوبارہ اس کے پاس آیا۔

''کیا اطلاع ہے؟''

''صوفی اور اشعر گھر پر نہیں ہیں۔ وہ کل سے واپس نہیں آئے۔''

''کہیں کسی رشتے دار کے گھر......؟''

''نہیں یار، صوفی تو اپنے میکے بھی مجھے اطلاع دیے بغیر نہیں جاتی، کسی اور رشتے دار کے گھر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''پھر اب؟''

''میں صوفی کے بھائی سے بات کرتا ہوں۔'' وہ سرور کا نمبر ملانے لگا۔

''تم فکر مت کرو، میں معلوم کرتا ہوں۔'' سرور نے اس کی ساری بات سنی اور پھر تسلی دینے کے انداز میں بولا لیکن ظاہر ہے وہ صوفی اور اشعر کے بارے میں کچھ معلوم ہونے سے پہلے پُرسکون نہیں ہوسکتا تھا۔ فکرمندی سے اس کے سر میں درد ہونے لگا۔

''پریشان مت ہو یار! اللہ سب خیر کرے گا۔'' اظہر نے اسے پریشانی سے سر تھامتے دیکھا تو تسلی دی۔ سردست وہ اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ عثمان کے پاس بھی انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ انتظار کا یہ دورانیہ تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے پر مشتمل تھا جو اس نے بہت صبر سے گزارا۔ آخر کار سرور کی کال آ گئی۔

''میں نے ہر ممکنہ جگہ معلوم کر لیا ہے عثمان۔ وہ دونوں کسی رشتے دار یا دوست کے گھر پر موجود نہیں ہیں۔ تمہارے اپارٹمنٹ بلڈنگ جا کر بھی وہی کچھ معلوم ہوا ہے جو کچھ تم مجھے پہلے ہی بتا چکے ہو۔'' سرور کے انداز میں مایوسی تھی اور ایک بھائی ہونے کے ناتے گہری فکرمندی بھی۔

''میرے پاس اب اس کے سوا کوئی گنجائش نہیں رہی کہ پولیس کے پاس جا کر صوفی اور اشعر کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروا دوں۔ بس تمہاری اجازت لینے کے لیے رک گیا تھا۔''

''اجازت کی کیا بات ہے سرور؟ میری بیوی اور بچہ کل سے لاپتا ہیں۔ میں کیسے تمہیں ایف آئی آر کروانے سے منع کر سکتا ہوں۔'' پریشانی کی انتہا پر پہنچ کر وہ طیش میں آ گیا اور آواز خودبخود ہی بلند ہو گئی۔

''تم حوصلہ کرو۔ میں جاتا ہوں تھانے۔'' سرور نے

اسے تسلی دے کر جلدی سے سلسلہ منقطع کر دیا۔ ادھر اس کی بلند آواز سن کر اظہر اور مزید دو کولیگ اس کے گرد جمع ہو چکے تھے۔

''مجھے پاکستان جانا چاہیے۔ اظہر پہلی دستیاب فلائٹ میں میری سیٹ بک کروانے کی کوشش کرو یار۔'' اس نے سرخ آنکھوں کے ساتھ اظہر سے التجا کی۔

''میں کرتا ہوں انتظام اور ایڈمن آفس میں تمہاری چھٹی کی بات بھی کرتا ہوں۔'' اظہر نے اس کا شانہ تھپکا۔

''چھٹی ملے نہ ملے، مجھے پاکستان ہر حال میں جانا ہے۔ نوکری جاتی ہے تو بے شک چلی جائے۔'' اس وقت اسے صوفی اور اشعر سے بڑھ کر کسی چیز کی فکر نہیں تھی۔ وہ نوکری جس کی سہولیات نے اسے بیوی بچے سے دور رکھا ہوا تھا۔ ایک پل میں غیر اہم لگنے لگی تھی۔

☆☆☆

''صوفی...!'' وہ اشعر کی انگلی تھامے پارک کے داخلی راستے پر کھڑی اندر آنے والی ہر عورت کے چہرے کو اس امید پر ٹٹول رہی تھی کہ ہو سکتا ہے وہ شازیہ ہو جب ایک اسکارف اور ماسک کی مدد سے سر اور چہرہ ڈھانپے عورت نے اسے پُرجوش سے انداز میں پکارا اور اگلے ہی لمحے اس کے گلے لگ گئی۔

''پہچان لیا تم نے مجھے۔'' صوفی نے خود بھی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''کیسے نہیں پہچانتی۔ تم بالکل اپنی پروفائل پکچر جیسی ہو ورنہ عام طور پر لوگوں نے اتنے فلٹر لگائے ہوتے ہیں کہ پکچر میں حور اور اصل میں لنگور دکھائی دیتے ہیں۔'' شازیہ نے اتنی بے ساختگی سے یہ جملہ ادا کیا کہ صوفی کے لبوں سے بے ساختہ قہقہہ ابل پڑا۔

''میں پریشان ہو رہی تھی کہ تمہیں تو میں نے دیکھا نہیں ہے تو پہچانوں گی کیسے؟ تم نے اپنی کوئی پکچر بھی لگائی ہی نہیں فیس بک پر۔''

''امجد کی طرف سے اجازت نہیں ہے۔ انہیں اچھا نہیں لگتا کہ ہر کوئی ان کی بیوی پر نظر ڈالے۔ اب بھی دیکھ لو پبلک پلیس پر آئے ہیں تو مجھے یہ اسکارف اور ماسک پہنا دیا ہے۔'' شازیہ نے ہنس کر اس کے شکوے کا جواب دیا تو اس نے بے ساختہ شازیہ کے پیچھے کھڑے مرد کو دیکھا۔ اس نے بھی چہرے پر ماسک لگا رکھا تھا۔

''السلام علیکم۔'' اسے متوجہ ہوتے دیکھ کر اس نے جھٹ سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' صوفی نے اس کے سلام کا جواب دیا اور شازیہ کی طرف جھک کر سرگوشی میں بولی۔

''لگتا ہے، تمہیں بھی کسی کا اپنے میاں کے چہرے پر نظر ڈالنا پسند نہیں۔''

شازیہ اس کے اس جملے پر کھسیانی سی ہو کر ہنس دی پھر وضاحت دینے لگی۔

''کووڈ کے بعد سے امجد پبلک پلیس پر لازماً ماسک استعمال کرتے ہیں۔ اصل میں انہیں استھما کی شکایت ہے نا تو بہت احتیاط کرنی پڑتی ہے۔''

''میں تو مذاق کر رہی تھی۔ آپ سنائیں امجد صاحب کیسے مزاج ہیں؟ کیسا لگا آپ کو ہمارا کراچی؟ کوئی مشکل تو پیش نہیں آ رہی یہاں؟'' وہ براہِ راست امجد سے مخاطب ہو کر اس سے اخلاقاً پوچھنے لگی۔

''اللہ کا شکر ہے ادی۔ ہم یہاں بہت آرام سے ہیں۔ کراچی اور کراچی والے دونوں بہت پیارے ہیں۔'' امجد کی اردو صاف تھی لیکن لہجہ اس کے سندھی اسپیکنگ ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔

''بیٹا تو بہت پیارا ہے تمہارا لگتا ہے تم پر ہی گیا ہے۔'' اب شازیہ اس کے ساتھ جڑ کر کھڑے اشعر کو پیار کر رہی تھی۔

''کچھ میری طرح ہے اور کچھ عثمان جیسا، اس لیے زیادہ ہی پیارا ہے۔'' صوفی نے ہنس کر جواب دیا اور متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نائلہ کہاں ہے؟ وہ کیوں نظر نہیں آ رہی تم لوگوں کے ساتھ؟''

''بتاتی ہوں، آؤ پہلے کہیں چل کر آرام سے بیٹھ جائیں۔'' شازیہ اس کا ہاتھ تھام کر ایک بینچ تک لے گئی۔

''خدانخواستہ طبیعت تو خراب نہیں ہے نائلہ کی؟'' صوفی نے بینچ پر بیٹھتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا۔

''طبیعت ٹھیک ہے اس کی، تم بے فکر رہو۔'' شازیہ نے اسے تسلی دی۔

''پھر وہ آئی کیوں نہیں؟ تم تو کہہ رہی تھیں کہ اسے مجھ سے اور اشعر سے ملنے کا بہت شوق ہے۔''

''وہ پبلک پلیس پر جاتے ہوئے گھبراتی ہے۔ اسے لوگوں کی ترحم بھری نظریں اچھی نہیں لگتیں۔ بعض لوگ تو اتنے ظالم ہیں کہ اس کے منہ پر ہی اس کے متعلق سوال جواب کرنے لگتے ہیں۔'' شازیہ نے افسردہ سے لہجے میں نائلہ کے نہ آنے کی وجہ بتائی تو وہ خود بھی اداس ہو گئی لیکن

نائلہ سے ملاقات نہ ہو سکنے کا بھی ملال تھا۔

''تم اُسے بھی اپنی طرح اسکارف اور ماسک پہنا کر لے آتیں۔''

''جب بہت مجبوری ہو تو ایسا ہی کرتی ہوں لیکن اسے اُس سے تکلیف ہوتی ہے اور چہرے کے جلے ہوئے حصے پر خارش اور جلن ہونے لگتی ہے۔ کراچی آتے ہوئے سارا راستہ اسی حالت میں گزرا تھا اس کا جس سے کافی تکلیف ہو گئی تھی۔ اب دوبارہ اسی تکلیف سے گزارنا اچھا نہیں لگا مجھے۔ اگر تم نے اپنے گھر ملاقات کے لیے بلایا ہوتا تو پھر بھی لے آتی کہ چلو تھوڑی دیر صرف راستے تک کی پریشانی ہے۔'' شازیہ کی دی وضاحت اس کے لیے شرمندگی کا سبب بن رہی تھی۔ وہ اتنے دکھی اور پریشان لوگ تھے اور وہ صرف اور صرف عثمان کے شک کی وجہ سے انہیں طریقے سے اپنے گھر مدعو نہیں کر سکی تھی۔

''یہ لیجیے ادی۔'' امجد اُن کی گفتگو کے دوران وہاں سے غائب ہو گیا تھا۔ اب واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں کچھ اسنیکس اور کافی کے ڈسپازیبل کپ تھے۔

''ارے آپ نے یہ تکلف کیوں کیا؟ میزبان تو میں ہوں۔ یہ تو میری ذمے داری ہے۔'' صوفی پر گھڑوں پانی گر گیا۔

''آپ ادی ہو ہماری۔ ہمارے ہوتے آپ خرچہ کرو تو ہمیں اچھا تو نہیں لگے گا نا۔'' اس کی سادی سی وضاحت، صوفی کی شرمندگی میں مزید اضافے کا سبب تھی۔ ان میاں بیوی کے معمولی لباس اور جوتے ان کی مالی حیثیت کی چغلی کھا رہے تھے لیکن وضع داری کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔

''یہ کافی پیتے ہیں پھر اس کے بعد آپ لوگ مجھے اپنے ساتھ وہاں لے کر چلیے گا جہاں آپ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اب یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں نائلہ سے ملے بغیر ہی واپس چلی جاؤں۔'' اس نے سارے ڈر خوف اور احتیاط کے تقاضے ایک طرف رکھے اور بالکل اچانک فیصلہ کر لیا۔

''لل...... لیکن......'' شازیہ اس کا فیصلہ سن کر بوکھلا گئی۔

''کیا لیکن؟ کیا تم مجھے نائلہ سے ملوانا نہیں چاہتیں؟'' صوفی نے اسے پیار سے ڈپٹا۔

''نہیں، ایسی تو بات نہیں۔ بس میں اس لیے پریشان ہو رہی تھی کہ ہم جہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، وہ بڑا گندہ مندہ اور تنگ سا علاقہ ہے تو تم اور اشعر پریشانی محسوس کرو گے۔''

''میں کون سا برطانیہ کی رائل فیملی سے تعلق رکھتی ہوں کہ کسی چھوٹے علاقے میں جاتے ہوئے گھبراؤں گی۔ اسی کراچی میں پل بڑھ کر جوان ہوئے ہیں۔ ہر چھوٹے بڑے علاقے میں دوست اور رشتے دار پھیلے ہوئے ہیں اور ہر جگہ آنا جانا بھی ہوتا ہے۔ اس لیے تم پریشان نہ ہو اور جلدی سے کافی پیو پھر ہم چلتے ہیں۔'' اس نے چپس کا ایک پیکٹ کھول کر اشعر کو پکڑایا اور خود بھی کافی پینے لگی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ماسک کے پیچھے چھپے شازیہ اور امجد کے چہروں پر پریشانی ہے۔

☆☆☆

ائرپورٹ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا لیکن عثمان کے لیے ہر طرف تاریکی تھی۔ اس نے بہت تھکے ہوئے انداز میں اپنے چھوٹے سے سفری بیگ کے ساتھ ارائیول لاؤنج میں قدم رکھا تو سامنے ہی سرور اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ عثمان کو آتا دیکھ کر وہ چند قدم آگے بڑھ کر اس سے گلے ملا۔ اس کے انداز میں بھی تھکاوٹ تھی لیکن اس نے شانہ تھپک کر عثمان کو ایک خاموش تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

''کوئی اَپ ڈیٹ؟'' عثمان نے آس سے اس کی طرف دیکھا۔

''اب تک تو کچھ خاص نہیں لیکن پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم جلد صوفی اور اشعر تک پہنچ جائیں گے۔'' سرور نے اسے تسلی دی اور اسے اپنے ساتھ لیے باہر کی طرف بڑھا۔

''پاکستان کی پولیس سے کسی اچھے نتیجے کی امید رکھنا خود کو دھوکا دینے کے برابر ہے۔'' اس نے تلخی سے تبصرہ کیا۔

''نہیں، نہیں...... مجھے صوفی کے کیس پر کام کرنے والا انسپکٹر شاہنواز مختلف پولیس والا لگا ہے۔ اس نے بہت توجہ سے میری بات سنی تھی اور ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی بھی کروائی تھی۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو اور مجھے صوفی اور اپنا بچہ صحیح سلامت مل جائیں۔ ان دونوں کو کچھ ہوا تو میں خود کو معاف نہیں کر سکوں گا۔'' عثمان کے لہجے میں وسوسے بول رہے تھے۔ اس کی شکل دیکھ کر کوئی بھی شخص اس کے پریشان ہونے کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ شاید وہ رویا بھی تھا اس کی آنکھوں اور ناک کی سرخی سرور نے اندر لاؤنج میں ہی نوٹ کر لی تھی۔ رات کے اس پہر آخری دسمبر کی سرد رات میں

کھلی فضا میں چلتے اس سرخی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ سرور نے گاڑی میں بیٹھتے ہی گاڑی کا ہیٹر آن کر دیا۔

"کیا ہم اس وقت سیدھا تھانے چل سکتے ہیں؟" گاڑی ائرپورٹ سے نکل کر شارع فیصل پر پہنچی تو اس نے سرور سے پوچھا۔

"اس وقت تھانے جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ رات کے اس پہر ہمیں وہاں انسپکٹر شاہنواز سمیت کوئی بھی کام کا بندہ نہیں ملے گا۔" سرور کا جواب مبنی بر حقیقت تھا اس لیے اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

"ابھی میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دیتا ہوں سفر سے تھکے ہوئے آئے ہو، چند گھنٹے آرام کر لو، پھر صبح تھانے چلیں گے۔" سرور کا انداز سمجھانے والا تھا، اس نے محض سر کو ایک تفہیمی جنبش دی اس کے بعد کا سارا سفر خاموشی سے کٹا۔ منزل پر پہنچے تو اپارٹمنٹ بلڈنگ کا اونگھتا ہوا چوکیدار گاڑی کے ہارن کی آواز سن کر چونک کر جاگا اور جلدی سے بھاگ کر گاڑی تک آیا۔

"سلام صاحب!" وہ عثمان کا صورت آشنا تھا، اسے دیکھ کر زوردار سلام کیا اور بیریئر ہٹا کر گاڑی کو اندر آنے کا راستہ دیا۔

"آج سردی ذرا زیادہ ہے۔" سرور نے گاڑی سے نکلتے ہوئے محض خاموشی کو توڑنے کی نیت سے تبصرہ کیا۔

"ہونہہ۔" جواباً اس نے محض ہنکارا بھرا۔

"آئی ایم سوری۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تم سے راستے میں کھانے وغیرہ کا پوچھ لیتا۔" سرور کو اچانک خیال آیا۔

"فلائٹ پر ڈنر سرو ہوا تھا۔" عثمان نے مختصر جواب دیا۔

"کہیں چائے کافی کے لیے چلتے ہیں۔" سرور نے پیشکش کی۔

"ابھی طلب نہیں ہے۔ اگر ہوئی تو خود بنالوں گا، مجھے پریکٹس ہے۔" عثمان کا انداز کچھ سپاٹ سا تھا۔

"سوری، میں تمہیں اپنے ساتھ گھر نہیں لے جاسکا۔ ایکچویلی ٹینشن سے امی کا بی پی شوٹ کر گیا تھا۔ اس وقت وہ کچھ بہتر ہیں لیکن ڈاکٹر نے انڈر آبزرویشن رکھا ہوا ہے۔ آسیہ (سرور کی بیوی) انہی کے ساتھ ہے جبکہ بڑی بھابی کا تو تمہیں علم ہی ہے کہ وہ ان دنوں چلے میں ہونے کی وجہ سے اپنی امی کے گھر رکی ہوئی ہیں۔" سرور کو لگا کہ اس کا موڈ خراب ہے اس لیے وضاحت دینے لگا۔

"اِٹس او کے سرور۔ میں خود بھی سیدھا گھر ہی آنا چاہتا تھا لیکن تمہیں مجھے آنٹی کی طبیعت کے متعلق بتانا چاہیے تھا۔ ہم سیدھے اسپتال ہی چلے جاتے۔" اس نے نرمی سے سرور سے کہا۔

"اسپتال جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وزیٹنگ آورز کے علاوہ وہ کسی کو پیشنٹ سے ملنے ہی نہیں دیتے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر صبح پولیس اسٹیشن سے فارغ ہو کر پہلی فرصت میں اسپتال کا چکر ہی لگائیں گے۔" وہ اپنے بیوی بچے کے لیے جتنا بھی پریشان تھا، اسے اخلاقیات تو نبھانی ہی تھی۔

"چلو دیکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے صبح تک امی کی چھٹی ہی ہو جائے۔ بھائی جان کو بھی میں نے فون کر دیا تھا۔ وہ ٹرین میں بیٹھ چکے ہیں صبح تک وہ بھی یہاں پہنچ جائیں گے۔" سرور نے اسے اپنے بڑے بھائی اختر کے بارے میں آگاہ کیا۔ اختر سرکاری ملازم تھا اور ان دنوں اس کی سندھ کے کسی دور دراز علاقے میں پوسٹنگ تھی جہاں آمدورفت کے لیے ٹرین ہی سب سے بہتر اور مناسب ذریعہ تھا۔

"تھینک یو یار! یہ ایسا مسئلہ ہے کہ مجھے لگا میرے بھائی بہنوں کے مقابلے میں تم لوگ ہی اسے زیادہ بہتر طور پر ڈیل کر سکتے ہو اس لیے تم سے ہی مدد مانگی۔" عثمان نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"اپنی بہن اور بھانجے کے لیے بھاگ دوڑ کر کے ہم تمہارے اوپر کوئی احسان نہیں کریں گے۔ وہ دونوں ہمارے لیے بھی اہم ہیں اور ہم بھی ان کے لیے اتنے ہی پریشان ہیں جتنے تم۔" سرور نے اسے باور کروایا۔

"یقیناً۔" عثمان فقط اتنا ہی کہہ سکا۔

"او کے، پھر میں چلتا ہوں، صبح ملیں گے۔" سرور نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"میں تمہیں اندر آنے اور کافی پینے کی آفر کرتا لیکن مجھے احساس ہے کہ تم بہت تھکے ہوئے ہو اور اس وقت تمہارے لیے گھر جا کر تھوڑی دیر آرام کر لینا ہی سب سے زیادہ مناسب ہے۔" عثمان نے اس بار قدرے گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" سرور نے تائید کی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ اس کے گاڑی اسٹارٹ کر کے روانہ ہونے تک عثمان وہیں کھڑا رہا پھر لفٹ کی مدد سے اپنے اپارٹمنٹ پر پہنچ گیا۔ دروازے کی اضافی چابی اس کے پاس موجود تھی اس لیے لاک کھول کر اندر داخل ہونے

میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ اندر روشنیاں گل تھیں۔ اس نے پہلے لاؤنج کو روشن کیا پھر خواب گاہ میں آ گیا۔ صوفی اور اشعر کے بغیر اسے اپنا سجا سجایا گھر کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔ اس نے خواب گاہ کی لائٹیں بھی کھولیں اور بیگ کو بے دلی سے بستر پر اچھالا۔ اگلے لمحے شاید وہ خود کو بھی بستر پر گرا دیتا لیکن نظروں نے ایک ایسا منظر دکھا کہ وہ بستر کو بھول کر دائیں جانب کی دیوار کی طرف بڑھنے پر مجبور ہو گیا۔ اس دیوار پر ایک بہت خوب صورت پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔ اس پینٹنگ کے پیچھے ایک چھوٹا سا خلا تھا جہاں صوفی بینک لاکر کی چابی رکھتی تھی۔ اس وقت وہ پینٹنگ اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی تھی۔ اس نے دیوار تک پہنچ کر اس کے ساتھ ٹکی فرش پر رکھی پینٹنگ کو پلٹ کر اس میں موجود مخصوص خلا کو چیک کیا۔ اس کے اندیشے کے مطابق چابی اپنی جگہ پر موجود نہیں تھی۔ اس کے ذہن میں ایک بجلی سی چمکی اور جلدی سے اپنا موبائل نکال کر تیزی سے اس کی اسکرین پر انگلیاں چلانے لگا۔ کچھ ہی دیر میں اس کے اور صوفی کے مشترکہ اکاؤنٹ کی تفصیلات اس کے سامنے تھیں۔ کل شام سے آج شام تک چار بار اکاؤنٹ سے بڑی رقوم بذریعہ اے ٹی ایم نکالی گئی تھیں۔ اتنی بڑی رقوم وہ بھی اتنی جلدی جلدی صوفی کبھی نہیں نکالتی تھی۔ کبھی ایک آدھ بار بڑی رقم نکالنے کی نوبت آئی بھی تھی تو اس نے عثمان کو پیشگی آگاہ کر دیا تھا۔ پھر اب ایسا کیا تھا کہ وہ بغیر کسی اطلاع کے اتنی تیزی سے رقم پر رقم نکلوا رہی تھی؟ اس سوال کا جواب تب ہی حاصل ہو سکتا تھا جب صوفی سے رابطہ ہوتا فی الحال وہ یہی کر سکتا تھا کہ اے ٹی ایم کارڈ بلاک کروا دے چنانچہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بینک کی ہیلپ لائن کا نمبر ڈائل کیا اور طے شدہ طریقہ کار کے مطابق یہ کام کر ڈالا۔

☆☆☆

''خدا کے لیے میرا بچہ میرے حوالے کر دو۔ تم لوگ جیسا جیسا کہہ رہے ہو میں ویسا ہی کر رہی ہوں پھر کیوں تم نے میرے بچے کو مجھ سے دور رکھا ہوا ہے؟'' کرسی کے ساتھ بندھی صوفی بلک بلک کر التجا کر رہی تھی لیکن اس کے سامنے کھڑی عورت پر قطعی کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ ماسک کے اوپر سے جھانکتی اس کی آنکھوں میں مکمل بے حسی اور بیزاری تھی لیکن صوفی اس کے باوجود اس کی منت سماجت کرتی جا رہی تھی۔

''تمہیں بتا دیا ہے کہ تمہارا بچہ بالکل ٹھیک ہے پھر کیوں میرا دماغ کھا رہی ہو؟'' اس کے مسلسل اصرار پر آخر کار اس عورت نے اسے کرخت لہجے میں ڈپٹ ڈالا۔

''میں جب تک اسے دیکھ نہیں لوں گی، مجھے چین نہیں آئے گا۔ وہ خود بھی پریشان ہوگا۔ وہ دنیا میں آنے کے بعد سے کبھی ایک رات بھی میرے بغیر نہیں سویا اور آج دوسری رات ہو گئی ہے تم لوگوں نے ہم ماں بیٹے کو ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھنے دی ہے۔'' اس نے کہہ کر ایک بار پھر بلکنا شروع کر دیا۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں باس سے بات کروں گی لیکن تب تک تم کھانا تو کھا لو۔ جب سے یہاں آئی ہو تم نے ایک بار بھی کھانا نہیں کھایا ہے۔ اس طرح تو تم مر مرا جاؤ گی۔'' اس بار وہ عورت قدرے نرم پڑ گئی تھی لیکن اس کا لہجہ شاید قدرتی طور پر ہی کرخت تھا کہ نرمی کا اثر اس کی آواز میں نہیں آتا تھا۔

''مجھے کھانا نہیں کھانا، مجھے اپنے بچے کو دیکھنا ہے اور اپنے گھر جانا ہے۔ میں نے سب کچھ تم لوگوں کے حوالے تو کر دیا ہے پھر تم لوگ ہمیں جانے کیوں نہیں دیتے۔'' صوفی کے انداز میں تھوڑی سی ضد تھی۔

''ایک اے ٹی ایم کارڈ اور لاکر کی چابی دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہم اگر تمہیں یہاں سے جانے دیں گے تو تم سب سے پہلے اپنا اے ٹی ایم بلاک کرواؤ گی اور ایسا ہم اس وقت تک نہیں ہونے دیں گے جب تک تمہارے اکاؤنٹ میں موجود پوری رقم نہ نکلوا لیں۔''

''میں تمہیں بلینک چیک لکھ کر دے دیتی ہوں۔ تم ایک ساتھ پوری رقم نکلوا لو لیکن ہمیں یہاں سے جانے دو۔'' صوفی نے اسے پیشکش کی۔ اصل میں اے ٹی ایم کارڈ سے رقم نکالنے میں یہ قباحت تھی کہ ایک دن میں رقم نکالنے کی حد مقرر تھی اس لیے وہ لوگ اکٹھی ساری رقم نہیں نکلوا سکتے تھے۔

''چیک میں ہمارے لیے رسک ہے۔ ہو سکتا ہے ہم چیک کیش کروانے جائیں اور وہاں دھر لیے جائیں۔ اس لیے جو جیسا چل رہا ہے چلنے دو۔'' عورت نے اس کی تجویز ماننے سے انکار کر دیا۔

''اس طرح کب تک چلے گا؟ میرا شوہر مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوگا اور جب اسے مسلسل میرا موبائل آف ملے گا تو وہ چونکے گا تو۔'' صوفی نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ عثمان روزانہ بلاناغہ اس سے دن میں دو وقت بات کرتا ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ عثمان مسلسل رابطہ نہ ہونے پر چونکے اور انہیں تلاش کرنے کے لیے کچھ کرے

لیکن یہ تو بہرحال ہر ایک سمجھتا تھا کہ رابطوں کی آسانی کے اس دور میں میاں بیوی کے درمیان گفتگو ہوتی رہتی ہوگی۔

''جب تک تمہارے شوہر کو سارے معاملے کی خبر ہوگی اور وہ یہاں آکر ہمارے خلاف کارروائی شروع کروائے گا ہم سب کچھ سمیٹ کر نکل چکے ہوں گے۔''

عورت پر قطعی کوئی اثر نہیں ہوا۔

''خدا تم لوگوں کو غارت کرے۔ لالچ میں اندھے ہو کر تم لوگوں نے ہم بے گناہ ماں بیٹے کو اذیت میں ڈال رکھا ہے۔'' صوفی مسلسل ناکامی سے جھنجلا کر بددعاؤں پر اتر آئی۔

''کھانا تو تم کھا نہیں رہی ہو، بہتر ہے میں تمہارا منہ ہی بند کردوں۔'' عورت کو اس کے بددعا دینے پر غصہ آ گیا اور اس کے احتجاج کے باوجود اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔

☆☆☆

''ہم نے آپ کی بیگم کے موبائل کی سی ڈی آر نکلوائی ہے۔ جس سہ پہر وہ بچے سمیت غائب ہوئیں، اس سہ پہر ان کا موبائل ایک مشہور تفریحی پارک میں ایکٹو تھا۔ پھر آف کردیا گیا اور اس کے تقریباً دو گھنٹے بعد دوبارہ آن کیا گیا۔ ان کے نمبر سے ایک کال بھی کی گئی جس نمبر پر کال کی گئی تھی وہ ہمیں مل گیا ہے اور ہم ٹریس کرنے کی کوشش کررہے ہیں کہ وہ کس کے زیر استعمال ہے۔'' سرور کے بیان کے مطابق انسپکٹر شاہنواز واقعی بااخلاق پولیس والا ثابت ہوا تھا اور نہایت تمیز سے انہیں حالات سے باخبر کررہا تھا۔

''انہوں نے آپ کو بتایا ہوگا کہ میری بیوی صوفیہ اپنی ایک فیس بک فرینڈ سے ملنے اس پارک گئی تھی اور اس کے پاس کم و بیش ایک لاکھ کا کیش بھی موجود تھا۔ کیا آپ نے اس مذکورہ فیس بک آئی ڈی کو چیک کیا ہے؟'' عثمان نے سرور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

''ہمارے ماہرین اس فیس بک آئی ڈی کو چیک کررہے ہیں۔ اس کے علاوہ پارک کے سی سی ٹی وی کیمرے بھی چیک کیے گئے ہیں آپ کی مسز اور بیٹے کو چہرے پر ماسک پہنے ایک جوڑے کے ساتھ پارک کے مین گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ وہ ساتھی خاتون سے ہنستے ہوئے بات کررہی تھیں اور ان کے انداز سے بالکل ظاہر نہیں ہورہا تھا کہ انہیں زبردستی وہاں سے لے جایا جارہا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ پارک کے اندر لگے بیشتر کیمرے کام نہیں کررہے تھے اس لیے اگر اس مشکوک جوڑے نے کہیں ماسک اتارے بھی ہوں گے تو ہمیں ان کی کوئی فوٹیج نہیں مل سکی۔''

''انسپکٹر صاحب، عثمان کے گھر سے ان کے بینک لاکر کی چابی بھی غائب ہے۔ عثمان کو شک ہے کہ چابی کو اس کی مخصوص جگہ سے صوفی کے بجائے کسی دوسرے شخص نے نکالا ہے۔ ہم صبح سیدھے یہاں چلے آئے ہیں ورنہ بینک جاکر معلوم کرنے کی کوشش کرتے کہ لاکر سے کچھ نکالا گیا ہے یا نہیں۔ اکاؤنٹ سے تو اے ٹی ایم کے ذریعے مسلسل بڑی رقمیں نکلوائی جارہی تھیں۔ عثمان نے احتیاطاً اے ٹی ایم کارڈ بلاک کروادیا ہے۔'' سرور نے انسپکٹر کو مزید آگاہ کیا۔

''اے ٹی ایم کارڈ بلاک ہونے سے وہ لوگ سمجھ جائیں گے کہ آپ اس معاملے میں انوالو ہو چکے ہیں اور

اپنی بیوی اور بچے کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انسپکٹر نے عثمان کی طرف دیکھتے ہوئے خیال آرائی کی پھر تسلی دینے والے انداز میں بولا۔

''ہم اپنی کارروائی جاری رکھے ہوئے ہیں۔آپ اللہ سے امید رکھیں۔ان شاء اللہ آپ کی بیوی اور بچہ جلد مل جائیں گے۔آپ فی الحال یہ کریں کہ جس بینک میں آپ کی مسز کا لاکر ہے مجھے اس کی ڈیٹیلز دے دیں۔میں معلوم کروا لوں گا کہ لاکر سے کچھ نکالا گیا ہے یا نہیں۔''

عثمان نے اس کی فرمائش پر ساری تفصیلات ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیں۔اسی اثنا میں ایک سب انسپکٹر ہاتھ میں کاغذ کی ایک چٹ پکڑے اجازت لے کر پُرجوش سا اندر داخل ہوا۔

''سر! موبائل نمبر ٹریس ہو گیا ہے۔مسز صوفیہ کے موبائل سے آخری بار جس نمبر پر کال کی گئی تھی وہ نمبر اسی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے ایک سیکیورٹی گارڈ کے زیرِ استعمال ہے جہاں یہ لوگ رہائش پذیر ہیں۔'' اس کے الفاظ دھماکا خیز تھے۔انسپکٹر بھی اچھل پڑا اور حکم دیا۔

''ٹیم بھیج کر اسے یہاں بلواؤ فوراً۔''

''میں نے بھجوا دی ہے سر۔'' سب انسپکٹر نے فوراً اپنی کارکردگی کی رپورٹ دی۔

''گڈ۔'' انسپکٹر شاہنواز نے اسے سراہا اور پھر اس کاغذ کی طرف متوجہ ہو گیا جس پر عثمان نے بینک کا نام اور برانچ وغیرہ کی تفصیلات لکھی تھیں۔

''اس بینک برانچ منیجر سے تو میری اچھی جان پہچان ہے۔میں ابھی فون پر ہی ساری تفصیلات لے لیتا ہوں۔'' اس نے کہا اور کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''منیجر صاحب ذرا یہ تو معلوم کر کے بتائیں کہ صوفیہ عثمان نامی خاتون نے پچھلے دو دن میں اپنے لاکر سے کچھ نکالا ہے یا نہیں۔'' ابتدائی سلام دعا کے بعد اس نے بینک منیجر سے مدعا بیان کیا اور اسے ضروری تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ دوسری طرف سے اس سے انتظار کرنے کی درخواست کی گئی۔

''ابھی تھوڑی دیر میں سب معلوم ہو جاتا ہے۔آپ لوگ اس دوران چائے پی لیں۔''

''نو تھینکس انسپکٹر صاحب! ہمیں بالکل بھی طلب نہیں ہے۔'' عثمان نے صاف انکار کر دیا۔وہ اس قدر پریشان تھا کہ کھانے پینے سمیت دنیا کی کوئی شے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔یہاں تک کہ رات کو نیند بھی نہیں آسکی تھی۔تھوڑی دیر آنکھ لگتی بھی تھی تو بُرے بُرے خواب اسے خوف زدہ کر کے اٹھنے پر مجبور کر دیتے تھے۔

''میں ذرا ایک کال کر لوں۔'' سرور معذرت خواہانہ انداز میں کہتا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا۔

''آپ کو کسی جان پہچان والے پر تو شک نہیں ہے؟ میں یہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اکثر تنہا عورتیں جن کے پاس مال و دولت ہو فریبی لوگوں کی سازش کا شکار بن جاتی ہیں اور پولیس اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیے مارتی پھرتی ہے۔'' سرور کے جانے کے بعد انسپکٹر نے اس سے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''شک تو مجھے کسی پر نہیں انسپکٹر صاحب لیکن میری طرف سے آپ کو اجازت ہے کہ جسے چاہے شاملِ تفتیش کر لیں۔'' اس کا جواب واضح تھا۔

''آپ اس طرح ہمارے ساتھ تعاون کرتے رہے تو ہم بہت جلد مجرموں تک پہنچ جائیں گے۔'' انسپکٹر نے اسے سراہا۔اسی وقت فون کال کے لیے گیا سرور واپس آگیا۔

''آسیہ کو کال کرنے گیا تھا۔امی کو فی الحال اسپتال سے چھٹی نہیں ملی ہے اس لیے وہ ان کے ساتھ وہیں ہے۔بھائی جان بھی اسٹیشن سے سیدھے اسپتال پہنچے ہیں۔ان کا یہاں آنے کا ارادہ تھا لیکن میں نے کہلوا دیا ہے کہ فی الحال وہ گھر جا کر سفر کی تکان اتاریں۔میں اور عثمان یہاں کے معاملات دیکھ رہے ہیں۔'' واپس اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے اس نے پست آواز میں عثمان کو تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''اچھی بات ہے۔'' اس نے تائیدی انداز میں جواب دیا اور پھر انسپکٹر کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس سے مخاطب تھا اور اس سے اس کی جاب وغیرہ سے متعلق تفصیلات جاننا چاہتا تھا۔یہ گفتگو چل ہی رہی تھی کہ بینک منیجر کی کال آگئی۔انسپکٹر جب تک بات کرتا رہا وہ اور سرور اس کی یکطرفہ مختصر گفتگو سے اندازے قائم کرتے رہے۔ آخرکار کال بند ہوئی اور انسپکٹر ان کی طرف متوجہ ہوا۔

''کل صبح دس بجے کے قریب آپ کی مسز بینک آئی تھیں اور لاکر سے زیورات نکال کر لے گئی تھیں۔''

''وہ کس کے ساتھ تھی؟'' عثمان نے بے قراری سے پوچھا۔

''اکیلی، میری انوالمنٹ کی وجہ سے منیجر نے بینک کے باہر لگے کیمرے کی ریکارڈنگ بھی چیک کی ہے۔وہ ایک آن لائن کار سروس کے ذریعے وہاں پہنچی تھیں اور ان کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔'' انسپکٹر کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں سی تھیں اور یہ شک ایک سوال کی صورت اس کی

زبان پر آ بھی گیا۔
''کیا آپ کی اپنی مسز سے کوئی لڑائی وغیرہ تھی؟''
''ایسی کوئی خاص نہیں۔ بس میں چاہتا تھا کہ وہ اس طرح اکیلی اجنبی لوگوں سے ملنے نہیں جائے لیکن وہ اپنے فیس بک فرینڈز کو بہت اہمیت دیتی تھی اور اس نے میری بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔'' عثمان نے جواب دیا۔ اسی وقت سیکیورٹی گارڈ کو لینے جانے والی ٹیم اسے لے کر وہاں پہنچ گئی۔ چوبیس پچیس سال کا وہ پٹھان لڑکا کافی خوف زدہ تھا۔
''رب کا قسم صاب ام نے کچھ نہیں کیا، ام ایک دم بے قصور ہے۔'' عثمان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس نے دوہائیاں دینی شروع کر دیں اور کوشش کی کہ آگے بڑھ کر اس کے پیر پکڑ لے لیکن اسے لانے والے سپاہی نے کالر سے کھینچ کر اسے سیدھا کھڑا کر دیا اور پیٹھ پر ایک دھموکا جڑتے ہوئے بولا۔
''جب تو نے کچھ نہیں کیا تو ہمیں دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کیوں کر رہا تھا بھوتنی کے؟''
''ام...... ام ڈر گیا تھا صاب۔'' وہ رونے لگ گیا۔
''یہ بتاؤ کہ پرسوں شام ان کی بیگم نے تمہیں کال کیوں کی تھی؟'' انسپکٹر نے عثمان کی طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھا۔
''وہ ام سے بولا کہ ان کا جاننے والا پلمبر آ رہا ہے اسے اوپر آنے دو۔ ام بولا بھی باجی کہ ادھر بلڈنگ میں بشیر بھائی کی اجازت کے بغیر کوئی پلمبر، الیکٹریشن نئی آ سکتا پر اس نے ام کو بولا کہ خان پلیز اسے آنے دو۔ ام بشیر بھائی کا پلمبر سے مطمئن نئی اے۔ یہ امارے بھروسے کا پلمبر ہے۔ ایک بار ٹھیک سے کام کر جائے گا تو روز روز کا پریشانی سے جان چھوٹے گا۔ ام نے سوچا باجی اتنا عرصہ سے بار بار پریشان ہوتا ہے تو اس کا یہ چھوٹا سا بات مان لیتا اے۔ ام بھیج دیا پلمبر کو اوپر۔'' اس نے ساری کتھا کہہ سنائی۔
''تم نے پہلے یہ بات کیوں نہیں بتائی تھی؟'' انسپکٹر نے اس سے سخت لہجے میں پوچھا۔
''بشیر بھائی کا ڈر سے۔ وہ اپنا اصول توڑنے پر ام کو نوکری سے بھی نکال سکتا تھا۔'' اس کے لہجے کی سادگی ہی اس کی بے گناہی کا ثبوت تھا۔
''اس پلمبر کا حلیہ بتا سکتے ہو؟''
''بالکل بتا سکتا اے، لمبا، دبلا اور سانولا سا آدمی تھا۔ لہجے سے سندھی لگتا تھا اور قمیص شلوار پہنے ہوئے تھا۔

شادی

''مس! میں آپ کو کیسا لگتا ہوں؟''
''بہت پیارے...... صاف ستھرے!''
''تو میں اپنی امی کو آپ کے گھر بھیج دوں؟''
''کیوں؟'' تیور بگڑنے لگے۔
''بات آگے بڑھانے کے لیے!''
''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا...... ابھی زمین سے ابھرے نہیں اور چلے ہو شادی کی باتیں کرنے!''
''مس! دماغ آپ کا خراب ہو چکا ہے...... ٹی وی ڈرامے، انڈین فلمیں اور انٹرنیٹ دیکھ دیکھ کر...... میں تو ٹیوشن کی بات کر رہا تھا...... آپ کو شادی کے سوا کچھ نہیں آتا کیا؟''

بہاولپور سے بشریٰ افضل کی سوغات

اس کا آنکھ بہت بڑا اور موٹا موٹا تھا۔ باقی ام نئی بتا سکتا کیونکہ اس نے چہرے پر ماسک لگایا ہوا تھا۔''
''سر یہ تو......'' گارڈ کا فر فر بیان کردہ حلیہ سن کر سب انسپکٹر نے شاہنواز کو متوجہ کیا۔
''بالکل یہ تو اسی شخص کا حلیہ ہے جسے پارک کی فوٹیج میں مسز صوفیہ عثمان کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔'' شاہنواز اس کی بات سمجھ گیا۔
''مطلب وہ لوگ جو ملاقاتی بن کر آئے تھے، صوفیہ اور اشعر کو اغوا کر کے لے گئے ہیں اور اب صوفیہ کو پریشر میں لے کر اس سے یہ سب کروا رہے ہیں۔'' سرور نے بھی ان کی بات سن کر اندازہ لگایا۔
''ہو سکتا ہے۔'' انسپکٹر نے مختصر جواب دیا اور پھر اپنے ماتحت کی طرف متوجہ ہو کر اسے احکامات دینے لگا۔
''اسے لے جا کر اس کا بیان ریکارڈ کرو اور حاجی بشیر سے رابطہ کر کے اس سے وہ ریکارڈنگ بھجوانے کا کہو جس میں پلمبر کے آنے جانے کا ثبوت موجود ہے۔ اس ریکارڈنگ کو دیکھ کر ہی تصدیق ہو گی کہ یہ پلمبر اور پارک والا بندہ ایک ہی ہے یا نہیں۔''
''او کے سر۔'' ماتحت نے سلوٹ مارا اور پٹھان گارڈ سمیت کمرے سے باہر نکل گیا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد انسپکٹر عثمان سے مخاطب ہوا۔
''دیکھیں عثمان صاحب بظاہر تو یہ اغوا ہی کا کیس ہے لیکن میں پھر بھی آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ آپ ذہنی طور پر خود کو ہر طرح کی صورت حال کے لیے تیار رکھیں۔''
''کیا مطلب؟ میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔'' عثمان

نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ ایسے ہی کچھ سرور کے بھی تاثرات تھے۔

''اس سیٹ پر بیٹھ کر میں نے بڑے محیر العقل واقعات دیکھے ہیں۔ بعض اوقات ہوتا یہ ہے ہم جس کو مغوی سمجھ کر تلاش کر رہے ہوتے ہیں، وہی اصل مجرم نکل آتا ہے۔''

''آپ میری بہن پر الزام لگا رہے ہیں۔'' انسپکٹر کی بات سن کر سرور بھڑک گیا۔

''میں صرف ایک امکان ظاہر کر رہا ہوں۔ آپ طیش میں آنے سے پہلے اس بات پر بھی غور کیجیے کہ ہر جگہ آپ کی بہن مجرموں کے لیے سہولت کار کا کردار ادا کرتی نظر آ رہی ہیں۔''

''ایک عورت جو اپنے بچے سمیت مجرموں کی تحویل میں ہے، ان کے ساتھ تعاون کے سوا کر بھی کیا سکتی ہے۔'' سرور کو انسپکٹر کی دلیل نے متاثر نہیں کیا۔

''سرور ٹھیک کہہ رہا ہے انسپکٹر صاحب لیکن اگر پھر بھی آپ کے دل میں کوئی شک ہے تو اسے دور کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ آپ مجرموں تک رسائی حاصل کریں اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیں۔'' عثمان نے بدمزگی بڑھنے سے بچنے کے لیے مداخلت کی اور عقلی دلیل دے کر دونوں کو مزید بولنے سے روک دیا۔

''اب آپ لوگ جا سکتے ہیں جیسے ہی مزید کوئی اَپ ڈیٹ ملی میں آپ لوگوں کو آگاہ کر دوں گا۔'' انسپکٹر کا موڈ پوری طرح بحال نہیں ہوا تھا یا شاید اس کی کوئی اور مصروفیت تھی جو اس نے صاف لفظوں میں انہیں وہاں سے جانے کا کہہ دیا۔ چار و ناچار انہیں وہاں سے اٹھنا پڑا۔

☆☆☆

''بلاک کر دیا تیرے شوہر نے اے ٹی ایم کارڈ بلاک کر دیا۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کی اس حرکت کی سزا تجھے اور تیرے بیٹے کو بھگتنی پڑے گی۔'' عورت ہذیانی انداز میں بُری طرح صوفی کے بالوں کو کھینچ رہی تھی اور وہ درد سے چیخنے کے ساتھ ساتھ مسلسل بول رہی تھی۔

''خدا کے لیے میرے معصوم بچے کو کچھ نہیں کہنا، اس کا اس سب میں کوئی قصور نہیں ہے۔''

''کہنا...... ہم تو تم دونوں کو مار کر تمہاری لاش کچرے کے ڈھیر پر پھینک دیں گے۔ ہم تمہیں صرف پیسوں کی خاطر یہاں لائے تھے۔ جب پیسے نہیں ملیں گے تو ہمیں کیا تمہارا اچار ڈالنا ہے۔'' عورت نے اس کے بالوں کو ایک اور جھٹکا دیا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ عثمان سے زیادہ دن ہمارا غیاب نہیں چھپے گا۔ پتا چلنے کے بعد اسے وہی کرنا تھا جو اُس نے کیا ہے۔''

''تو بس پھر ٹھیک ہے، ہم نے بھی بس اب تیری اور تیرے بچے کی جان ہی لینی ہے۔'' عورت کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے کچا چبا جائے۔

''اسے چھوڑ دو ڈارلنگ! حالات اتنے بھی بُرے نہیں کہ ہم بالکل ہی مایوس ہو جائیں۔'' ایک مردانہ آواز کی مداخلت نے عورت کا ہاتھ صوفی کے بالوں سے ہٹا دیا۔

''تم نے سنا ہی ہوگا کہ ہاتھی مر بھی جائے تو سوا لاکھ کا ہوتا ہے اور ہم تو وہ ہیں جو آم تو آم گٹھلیوں کے دام بھی کھرے کرنا جانتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ آم ہم نے چوس لیے ہیں اور اب گٹھلیوں کے دام وصول کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اب جائے گا اس کے شوہر کے پاس اس کے اور بچے کے اغوا کا پیغام بھاری تاوان کے مطالبے کے ساتھ۔ جو رقم اس نے ہمیں وصول کرنے سے روک دیا ہے اب اس سے دگنی رقم خود ہمارے حوالے کرے گا۔'' چہرے پر ماسک ہونے کی وجہ سے صوفی اس کی مسکراہٹ نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اس کی آنکھوں کی شیطانی چمک اسے سب بتا رہی تھی۔

''یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے لیکن کام بڑھ جائے گا۔'' عورت کے غصے کا گراف نیچے آنے لگا۔

''دام بڑھیں تو کام بڑھنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ میرے خیال میں کام ابھی سے شروع کر دو اور ماں بیٹے کی ایک زبردست سی ویڈیو بنا ڈالو۔ عثمان خان پر ہماری کال کا اثر نہیں ہوا تو ویڈیو کا تو ضرور ہوگا۔''

''میرے بچے کو کچھ مت کہنا، اس معصوم نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔'' اس کا منصوبہ سنتے ہی صوفی چیخنے لگی۔

''تم کیمرا آن کر دو۔ میں بچے کو لے کر آتا ہوں تاکہ ایک اچھا کلپ تیار ہو سکے۔'' وہ یوں بول رہا تھا جیسے کوئی ماہر ڈائریکٹر ہو۔ ذرا دیر میں ہی اس کی اشعر کے ساتھ واپسی ہو گئی۔ اشعر اس حال میں تھا کہ اُس کے ہاتھ پیر بندشوں میں جکڑے ہونے کے ساتھ ساتھ منہ پر بھی ٹیپ چپکا ہوا تھا۔ وہ اسے گود میں اٹھا کر لایا تھا اور لانے کے بعد فاصلے سے صوفی کے سامنے زمین پر پٹخ دیا تھا۔

''اشعر! میرے بچے، میری جان کے ٹکڑے۔'' صوفی بیٹے کی حالت دیکھ کر تڑپ اٹھی اور اسے بے قراری سے آوازیں دینے لگی۔ وہ بھی ماں کو دیکھ کر اس کے پاس

جانے کے لیے مچلنے لگا لیکن بندھے ہوئے ہاتھ پیر اس کی راہ کی رکاوٹ تھے۔ اس کی بے بسی دیکھ کر کرسی سے بندھی صوفی نے بے قراری سے اس تک پہنچنے کے لیے اپنا پورا زور لگایا۔ اس کے زور لگانے سے بندشیں تو نہ ٹوٹیں، وہ خود کرسی سمیت بُری طرح زمین پر ایک زوردار دھماکے سے گر گئی۔ گرنے سے اس کے ماتھے سمیت جسم کے کئی حصوں پر چوٹیں لگیں اور بے اختیار منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ موبائل کا کیمرا آن کیے اس پورے منظر کی عکس بندی کرنے والوں کے لیے یہ ایک آئیڈیل سچویشن تھی چنانچہ وہ پوری دلجمعی سے اپنا کام کرتے رہے۔

☆☆☆

”پڑوس کا دروازہ بجاؤ۔“ ہیڈ کانسٹیبل شاہد سومرو نے اپنے مطلوبہ گھر کے دروازے پر لگا بڑا سا تالا دیکھ کر اپنی چھوٹی سی افسری کا رعب جھاڑنے کے لیے اپنے ساتھ آئے سب کانسٹیبل سچل کو بارعب لہجے میں حکم دیا۔ سچل کو بے شک اس کا لہجہ بُرا لگا لیکن اس نے حکم کی تعمیل میں تاخیر نہیں کی اور ایک دروازہ توڑ قسم کی دستک دی۔

”کیر آہے۔ صبر نہ ہوچھا؟“ اندر سے کسی نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا اور طیش بھرے تاثرات کے ساتھ دروازہ کھولا لیکن پھر دو وردی والوں کو اپنے سامنے پا کر سٹپٹا گیا۔

”سلام سائیں، خیر آئے سائیں؟“ مُکا بنانے کے خواہشمند اس کے ہاتھ اتنی تیزی سے معافی مانگنے کے لیے جُڑے جیسے یہ کوئی خودکار عمل ہو۔

”یہ تمہارے پڑوسی کہاں ہیں؟“ سب کانسٹیبل نے رعب سے دریافت کیا۔

”خبر نہیں سائیں! چار پانچ دن سے غائب ہیں۔ شاید کسی رشتے دار سے ملنے گئے ہوں۔“ اس نے جواب دیا پھر تجسس سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔

”سب خیر تو اے سائیں؟ کیا کچھ گڑبڑ کی ہے ان میاں بیوی نے؟ میں تو پہلے ہی دینو چاچا کو منع کررہا تھا کہ باہر سے آئے ہوئے اجنبی لوگوں کو مکان کرائے پر نہ دے۔“ اس نے سوال کیا اور سوال کا جواب ملنے سے قبل ہی اندازے بھی لگانے شروع کردیے۔

”کتنے لوگ رہتے ہیں اس گھر میں؟“

”بس دو میاں بیوی ہی ہیں سائیں، بال بچہ کوئی نہ۔“

”ان کی تو ایک بچی ہے نا وہی جس کا چہرہ جل گیا تھا۔“ شاہد سومرو اس کا جواب سن کر چونکا۔

”وہ تو پہلے والے کرائے داروں کی تھی سائیں، وہ لوگ تو کب کا گھر خالی کرکے جاچکے یہ بے اولاد میاں بیوی ان کے بعد آئے ہیں۔“ اس کا جواب شاہد سومرو کو چکرا دینے والا تھا۔ اوپر سے اسے جو تفصیلات فراہم کی گئی تھیں، یہاں اس سے تھوڑی مختلف صورتِ حال تھی۔

”یہ تصویریں دیکھو اور بتاؤ کہ کیا یہی تمہارے پڑوسی ہیں؟“ اس نے اپنا ٹچ موبائل نکال کر اس میں محفوظ تصاویر اس شخص کے سامنے کیں۔

”یہ، یہی تو ہیں ہمارے پڑوسی سائیں پر ان کی کوئی اولاد نہیں ہے۔“

”پھر یہ بچی کس کی ہے؟“ اس نے اسکرول کرکے ایک اور تصویر اس کے سامنے کی۔

”یہ تو نائلہ ہے، اپنی ناہید اور رفیق کی بیٹی۔“ وہ جھٹ پہچان گیا۔

”مطلب یہ ان دونوں کی بیٹی نہیں ہے؟“ اس نے پھر تصویر سامنے کرکے تصدیق چاہی۔

”بالکل نہیں ہے سائیں۔ آپ بولو تو میں رفیق سے آپ کی فون پر بات کروا کر تصدیق بھی کروا سکتا ہوں۔ اس کی حیدرآباد میں نوکری لگ گئی تھی تو بیوی بچوں کے ساتھ وہاں چلا گیا تھا۔ کبھی کبھی ہم لوگوں کی آپس میں فون پر بات چیت بھی ہوجاتی ہے۔“ وہ شخص مکمل طور پر پُریقین تھا۔

”رفیق کا فون نمبر اور پتا دو۔“ شاہد سومرو نے حکم دیا۔

”ابھی اندر بچے سے لکھوا کر لایا سائیں۔ میں کبھی اسکول نہیں گیا نا تو مجھے لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔“ وہ غڑاپ سے واپس اندر گھس گیا۔ اس کے اندر جاتے ہی دو بچے موڑھے اٹھائے باہر آئے اور ان دونوں کو بیٹھنے کی پیشکش کی۔ انہوں نے بھی تکلف نہیں کیا اور موڑھوں پر ٹک گئے۔ یہاں ایک تو جرائم کی شرح کم تھی۔ دوسرے سارے معاملات پولیس سے زیادہ وڈیروں کے ہاتھ میں تھے تو پولیس والوں کو زیادہ کام کرنا ہی نہیں پڑتا تھا۔ کبھی کرنا پڑے تو یوں تھک جاتے تھے۔

”صاب دودھ۔“ ابھی انہیں وہاں بیٹھے مشکل سے ایک ڈیڑھ منٹ ہی گزرا ہوگا کہ اندر سے ایک دس بارہ سال کا بچہ ٹرے میں گرم دودھ کے پیالے رکھ کر لے آیا۔ بچے کے پیچھے اس کا باپ بھی تھا۔ پولیس والوں کے دودھ پینے تک وہ مؤدبانہ ان کے سامنے کھڑا رہا پھر فون نمبر اور پتا

لکھا کاغذ ان کے حوالے کیا۔

''ذرا ہمیں اس مکان کے مالک کے پاس تو لے چل۔'' شاہد سومرو نے ڈکار لیتے ہوئے اس سے فرمائش کی۔

''ہلو سائیں ہلو۔ قانون سے تعاون کرنا تو ہمارا فرض ہے۔'' وہ فوراً تیار ہوگیا۔ ایک دو گلیاں چھوڑ کر ہی دین محمد عرف دینو کی کریانے کی دکان تھی۔ اس نے بھی ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور ملائی والی چائے اور بسکٹوں سے خاطر مدارت کرنے کے بعد شازیہ اور امجد کے شناختی کارڈز کی فوٹو کاپیز کے علاوہ موبائل نمبر بھی ان کے حوالے کر دیے۔

''دونوں میاں بیوی کس مزاج کے بندے تھے چاچا؟'' تفتیش کو مکمل کرنے کے لیے شاہد سومرو نے دو چار سوالات بھی کرنا ضروری سمجھا۔

''بھلے ہی لوگ تھے سائیں! کرایہ وقت پر دیتے تھے، کبھی کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں کیا اور کبھی کوئی دوسری بُرائی سننے میں نہیں آئی۔'' دین محمد نے متانت سے جواب دیا۔

''کام کیا کرتا تھا امجد؟''

''لکڑی کا کام تھا سائیں۔ لکڑی سے سجاوٹ کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بنا کر شہر کی مارکیٹ میں دیتا تھا پر سنا ہے اس کی بیوی زیادہ ہوشیار عورت تھی۔ وہ فون پر امجد کی بنائی ہوئی چیزیں بیچنے کے علاوہ، فون پر ہی بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتی تھی۔ فون پر یہ کام کیسے ہوتا ہے اپنے کبھی سمجھ نہیں آیا۔'' چھ دہائیاں پیچھے کا دین محمد جس کی ساری زندگی ایک محدود سی دنیا میں گزری تھی آن لائن کاروبار کی دنیا کو بھلا کیسے سمجھتا۔

''یہاں آنے سے پہلے کہاں رہتے تھے دونوں؟''

''قریب کے قصبے میں ہی رہتے تھے۔ امجد کی عورت کی اپنی ساس سے نہیں بنتی تھی۔ ایک دن زوردار لڑائی کے بعد ساس نے اسے گھر سے نکال دیا تو امجد کرائے کا مکان ڈھونڈتے ڈھونڈتے میرے پاس آپہنچا۔ سنا ہے امجد کی بیوی اور ماں آپس میں سگی پھپھی بھتیجی تھیں پر پھپھی کو اپنی شہری بھتیجی کے طور طریقے پسند نہیں آتے تھے۔ وہ بھی نہیں دبتی تھی کیونکہ ایک تو بڑے شہر کی تھی دوسرے شوہر سے زیادہ پڑھی لکھی تھی۔'' دین محمد کے پاس خاصی معلومات تھیں۔ ان معلومات کی روشنی میں شاہد سومرو افسرانِ بالا کو اچھی سی رپورٹ تیار کر کے بھجوا سکتا تھا۔

☆☆☆

''میری بچی کو کسی بھی طرح ڈھونڈ کر لاؤ، تم تین تین مرد ہو کر کچھ نہیں کر پا رہے ہو۔ میری بیٹی اور نواسے کو کچھ ہوا تو میں تم تینوں کو معاف نہیں کروں گی۔'' یہ صوفی کی والدہ شمسہ بیگم تھیں جنہیں بڑی مشکل سے بلڈ پریشر کنٹرول ہونے کے بعد اسپتال سے رخصت کر کے گھر بھیجا گیا تھا اور انہوں نے گھر پہنچتے ہی داماد اور بیٹوں کے لتے لینے شروع کر دیے تھے۔

''پولیس انہیں تلاش کر رہی ہے امی۔ ان شاء اللہ وہ دونوں بہت جلد مل جائیں گے۔ آپ ٹینشن مت لیں ورنہ دوبارہ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔'' اختر نے آگے بڑھ کر انہیں سمجھایا۔

''تم تو رہنے ہی دو۔ دفتر سے چھٹی لے کر یہاں آ بیٹھے ہو تو اسی کو بہت بڑا کارنامہ سمجھ لیا ہے۔'' انہوں نے بیٹے کو جھڑک کر رکھ دیا۔

''پولیس انہیں ڈھونڈ رہی ہے امی، میں کوئی شرلاک ہومز یا جیمز بانڈ تو ہوں نہیں کہ مجرموں کو ڈھونڈ کر ان کے قبضے سے آپ کی بیٹی اور نواسے کو چھڑوا سکوں۔'' اختر کو ان کا ڈانٹنا بُرا لگا۔

''پلیز بھائی جان!'' سرور نے بڑے بھائی کو ملامتی نظروں سے دیکھا تو وہ زیرِلب بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

''آپ ٹینشن مت لیں امی! پولیس کام کر رہی ہے اور ہم مسلسل ان سے رابطے میں ہیں۔ اللہ نے چاہا تو جلد صوفی اور اشعر ہمارے پاس ہوں گے۔'' سرور ماں کو تسلیاں دینے لگا جبکہ عثمان کو اپنے بجتے ہوئے فون کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس کے بھائی لقمان کی کال آرہی تھی۔

''اتنی بڑی بات ہوگئی اور تم نے ہمیں بتایا نہیں عثمان! وہ تو آج تمہاری بھابی اسپتال گئیں چیک اپ کے لیے تو انہیں وہاں تمہارے چھوٹے سالے کی بیوی مل گئی اس نے بتایا نوشابہ کو۔'' سلام کے فوراً بعد انہوں نے عثمان سے شکوہ شروع کر دیا۔

''بس بھائی، میں نے سوچا کہ خوامخواہ آپ لوگوں کو پریشان کرنے کا کیا فائدہ؟''

''کیوں، ہم کوئی غیر ہیں کیا کہ تمہاری پریشانی سے دور رہیں۔'' انہوں نے اسے ڈانٹا اور پھر تفصیلات معلوم کرنے لگے جو عثمان کو طوعاً و کرہاً بتانی پڑیں۔ مشکل سے اُن کی کال نمٹا کر فارغ ہوا تھا کہ بہن کی کال آنے لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ نوشابہ بھابی نے حسبِ عادت خبر پورے خاندان

میں نشر کر دی ہے۔ اس نے آنے والی کال کاٹی اور فون کو سائیلنٹ پر ڈال دیا۔

''اچھا یار اب اجازت دو، میں چلتا ہوں۔'' اب وہ ماں کی ٹانگیں دباتے سرور سے مخاطب تھا۔

''کھانا کھا کر جانا بیٹا! آسیہ نے بس تیار کر ہی لیا ہو گا۔'' سرور کے کچھ کہنے سے پہلے ہی صوفی کی امی نے پٹ سے آنکھیں کھولیں اور اس سے اصرار کیا۔

''کھانے کا دل نہیں چاہ رہا آنٹی بس میں گھر جا کر تھوڑی دیر آرام کروں گا۔'' وہ وہاں رکا نہیں۔

''میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' سرور اس کے پیچھے پیچھے آیا۔

''نہیں میں نے کیب منگوالی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ بذریعہ کیب اپنے اپارٹمنٹ پر پہنچ چکا تھا۔ صوفی ڈرائیو کرنے سے ڈرتی تھی اس لیے اس نے ابھی تک پاکستان میں گاڑی نہیں خریدی تھی۔ وہاں پہنچ کر فون جیب سے نکالا تو دیکھا کہ اس پر کئی مسڈ کالز ہیں جن کا اسے موبائل سائیلنٹ پر ہونے کی وجہ سے علم نہیں ہو سکا تھا۔ زیادہ تر مسڈ کالز اس کے اپنے فیملی ممبرز کی تھیں لیکن ان کے درمیان ایک اجنبی نمبر بھی موجود تھا جس سے دو بار کال کی گئی تھی۔ وہ ابھی اس نمبر پر غور کر رہی رہا تھا کہ اس سے دوبارہ کال آنے لگی۔ اس نے تجسس کے باعث وہ کال ریسیو کر لی۔

''جس کی بیوی اور اکلوتا بیٹا غائب ہے، اسے فون کالز کا دھیان نہیں، بڑی حیرت کی بات ہے۔'' اس کی ''ہیلو'' سنتے ہی کسی نے اس پر طنز کیا۔

''کون؟'' وہ چونکا۔

''وہی جس کے قبضے میں تمہاری جان کا طوطا ہے۔'' دوسری طرف موجود شخص ہنسا۔

''کہاں ہیں صوفی اور اشعر! پلیز انہیں آزاد کر دو۔'' وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ کر جذباتی انداز میں درخواست کرنے لگا۔

''آزادی کی قیمت وصول کرنے سے تو تم نے ہمیں روک دیا ہے پھر ہم کیسے انہیں آزاد کر دیں؟'' اس کا اشارہ اے ٹی ایم کارڈ بلاک کرنے کی طرف تھا۔

''میں ابھی کارڈ اِن بلاک کر دیتا ہوں۔ تمہیں جتنی رقم لینی ہے لے لو لیکن ان دونوں کو واپس کر دو۔'' وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔

''نہیں، اب آزادی کی قیمت کچھ اور ہو گی اور وہ تم ہمیں ادا کرو گے۔'' اس نے عثمان کو ایک بڑی رقم بتائی۔

''یہ تو بہت زیادہ ہیں۔'' عثمان بوکھلایا۔

''کیا بیوی بچے کی زندگی سے بھی بڑھ کر ہیں؟'' اس نے مکاری سے پوچھا۔

''نہیں، نہیں لیکن مجھے اتنی بڑی رقم ارینج کرنے میں وقت لگے گا۔'' عثمان بوکھلایا۔

''جتنا عرصہ ان کی دوری برداشت کر سکتے ہو، اتنا وقت لے لو لیکن ہمارے پاس وہ جتنے دن رہیں گے، ان کی ٹوٹ پھوٹ بڑھتی جائے گی پھر یہ نہ کہنا کہ مال اچھی حالت میں نہیں بھجوایا۔'' اس کے لہجے میں پوشیدہ دھمکی نے عثمان کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔

''پلیز تم ان کے ساتھ کچھ بُرا نہ کرنا۔ میں جلد سے جلد رقم کا انتظام کر لوں گا۔'' اس نے تڑپ کر اس شخص کی منت کی۔

''چلو کوشش کریں گے لیکن تمہاری کوشش ہماری کوشش سے بہت تیز ہونی چاہیے۔''

''بالکل ہو گی بس تم یہ بتاؤ کہ رقم کہاں پہنچانی ہو گی؟''

''وہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا لیکن ابھی تم اس بات کو دماغ میں بٹھا لو کہ اس فون کال کے بارے میں پولیس کو نہیں بتاؤ گے۔''

''نہیں بتاؤں گا لیکن چونکہ میں پولیس میں پہلے ہی رپورٹ کر چکا ہوں تو ان کے ساتھ ملنا جلنا لگا رہتا ہے۔''

''اس کا مسئلہ نہیں بس تمہیں انہیں اس کال اور تاوان کے متعلق کچھ نہیں بتانا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو مجھ سے یہ بات چھپی نہیں رہے گی۔ تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ وہاں میرا مخبر کون ہے۔'' اس نے عثمان کو متنبہ کیا۔

''میں نہیں بتاؤں گا بس تم میری بیوی اور بچے کو کوئی تکلیف مت دینا۔'' عثمان نے اس سے التجا کی۔

''اگر میں نے انہیں آرام سے رکھا تو تم رقم کا جلدی انتظام کیسے کرو گے؟'' وہ ہنسا۔

''میں ہر ممکن جلدی کر لوں گا اور تمہیں اسی نمبر پر اطلاع بھی دے دوں گا۔''

''یہ نمبر آئندہ تمہیں بند ملے گا اس لیے اسے ٹرائی کرنے کی زحمت نہیں کرنا۔ کال میں خود تمہیں کروں گا۔''

''میری ایک بار صوفی سے بات تو کروا دو۔''

''میں اس وقت ان سے بہت دور ہوں۔ ہاں تمہیں ایک ویڈیو بھیج دیتا ہوں۔ اسے دیکھ کر تمہیں اپنی بیوی بچے

کے زندہ ہونے کا یقین بھی آجائے گا اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھ آجائے گی کہ رقم کا جلد از جلد انتظام کرنا کیوں ضروری ہے۔'' اس نے عثمان کی فرمائش پوری کرنے سے معذوری ظاہر کی اور آخر میں معنی خیز لہجے میں کہتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اگلے ہی لمحے عثمان کو واٹس ایپ میسج وصول ہونے کا نوٹیفکیشن ملا۔ اس نے جھٹ سے میسج کھولا تو وہاں ایک ویڈیو اس کی منتظر تھی۔ ویڈیو دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ صوفی اور اشعر کی بے بسی ناقابلِ برداشت تھی اور یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ وہ ایسے لوگوں کی قید میں ہیں جن کے اندر انسانیت کا شدید فقدان ہے۔

''مجھے اپنا آپ بھی بیچنا پڑا تو میں تم دونوں کو ان ظالموں کے پنجے سے ضرور چھڑواؤں گا۔'' ان دونوں کے چہروں پر نظریں جمائے عثمان نے عہد کیا اور دل ہی دل میں اپنا آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے لگا۔

☆☆☆

''نائلہ نام کی جس بچی کی تصاویر کو شازیہ لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتی رہی ہے، اس کے والدین نہایت سیدھے سادے اور اَن پڑھ لوگ ہیں۔ بچی کے ساتھ حادثہ پیش آیا تو انہوں نے اپنی استطاعت کے مطابق اہلِ محلہ کے تعاون سے جتنا علاج ممکن ہو سکا کروایا اور صبر کر لیا۔ پھر دونوں میاں بیوی کو حیدرآباد میں گھریلو ملازمت مع رہائش مل گئی تو دونوں بچوں سمیت وہاں شفٹ ہو گئے۔ شازیہ اور امجد نے ان کے خالی کیے گئے مکان میں رہائش اختیار کی تو انہیں نائلہ کے حادثے کا بھی علم ہوا۔ آس پاس کے کئی لوگوں کے موبائلز میں نائلہ کی تصاویر محفوظ تھیں جو شازیہ نے آنے بہانے سے اپنے موبائل پر منتقل کر لیں۔ اس کے بعد اس نے سوشل میڈیا گروپس میں خود کو نائلہ کی ماں ظاہر کر کے اس کے علاج کے نام پر لوگوں سے مدد طلب کرنا شروع کر دی۔ وہ ہوشیار عورت تھی اس لیے اس نے چالاکی یہ کی کہ اپنی وال پر اس حوالے سے کوئی پوسٹ لگانے کے بجائے خواتین کے مخصوص گروپس میں اس حوالے سے پوسٹس لگائیں اور ان پوسٹس پر بھی براہِ راست نائلہ کی تصاویر لگانے کے بجائے کچھ مخصوص خواتین کے اِن باکس میں تصاویر بھیجیں۔ اس حوالے سے اس کا استدلال تھا کہ وہ بچی کی تصاویر عام کر کے اسے ڈس ہارٹ نہیں کرنا چاہتی حالانکہ وہ صرف اس بات سے بچ رہی تھی کہ کہیں تصاویر وائرل ہونے سے بچی کے والدین کو خبر نہ مل جائے اور اس کا فراڈ سامنے آجائے۔'' انسپکٹر شاہنواز نے ایک سانس میں انہیں ساری تفصیل بتائی اور خشک ہو جانے والے گلے کو تر کرنے کے لیے قریب رکھا گلاس اٹھا کر پانی کے دو گھونٹ لیے۔

''شازیہ نے مالی امداد کے لیے ایسی خواتین کا انتخاب کیا تھا جن کی پوسٹس اور کمنٹس سے ان کی خوش حالی کا اندازہ ہوتا تھا۔ زیادہ رقم کے حصول کے لیے اس نے نائلہ کی پلاسٹک سرجری کا شوشہ بھی چھوڑ دیا تھا اور خواتین کو بتاتی رہی تھی کہ وہ اپنی بچی کی زندگی سنوارنے کے لیے اسے کراچی لے کر جا رہی ہے جہاں اس کا بہت مہنگا علاج ہونے والا ہے۔ اتفاق سے آپ لوگ کراچی سے ہیں تو آپ کی بیگم نے کراچی آمد پر اس سے اور نائلہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کر دی اور یہ اشارہ بھی دے دیا کہ نائلہ کے علاج کے لیے براہِ راست ایک معقول رقم بھی اسے دیں گی۔ اس سارے سلسلے میں ان کے درمیان واٹس ایپ نمبرز کا تبادلہ بھی ہوا۔ ہم نے آپ کی مسز کی میسجز چیٹ سے ہی شازیہ کا واٹس اپ نمبر حاصل کر کے اس کی رہائش تک رسائی حاصل کی تھی۔ آگے اس کے مالک مکان سے ہمیں دونوں میاں بیوی کے شناختی کارڈز کی فوٹو کاپیز مل گئیں جن کی مدد سے ہم نے ان کے بینک اکاؤنٹس ٹریس کیے۔ ان بینک اکاؤنٹس کی ڈیٹیلز نکلوانے پر ہمارے سامنے کچھ مزید دلچسپ باتیں آئیں۔'' انسپکٹر نے ان دلچسپ باتوں کو بیان کرنے سے پہلے اپنے تینوں سامعین کی دلچسپی کا اندازہ لگانے کے لیے ان کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ اسے محسوس ہوا کہ عثمان کچھ گم صم سا ہے اور اس کی بات توجہ سے نہیں سن رہا ہے۔

''کیا بات ہے عثمان صاحب! آپ میری طرف متوجہ نہیں ہیں؟'' اس نے فوراً عثمان کو ٹوکا۔

''نہیں، نہیں میں سن رہا ہوں۔ پلیز آپ جاری رکھیں۔'' اگرچہ وہ تاوان کی رقم کا انتظام کرنے کے سلسلے میں اُلجھا ہوا تھا لیکن اس میٹنگ میں آنے سے انکار کرنے کا اس کے پاس کوئی معقول بہانہ بھی نہیں تھا اس لیے طوعاً و کرہاً وہاں چلا آیا تھا اور اب زبردستی ہی دلچسپی بھی ظاہر کرنی پڑ رہی تھی۔

''ہم نے شازیہ اور امجد کے بینک اکاؤنٹس کی جو ٹرانزیکشنز چیک کی ہیں ان سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ پچھلے چھ ماہ میں ان کے اکاؤنٹس میں مسلسل رقوم آتی رہی ہیں جن میں یقیناً ان کی ذاتی کمائی کے علاوہ امدادی رقوم

بھی شامل ہیں۔ ایک مزے کی بات اور بتاؤں۔ شازیہ بیٹی کے علاج کا بہانہ بنا کر لوگوں کو اپنے شوہر امجد کی بنائی سجاوٹی اشیا خریدنے پر بھی مجبور کرتی رہی ہے۔ عموماً جو لوگ شک و شبہے کی وجہ سے براہِ راست امداد دینا پسند نہیں کرتے وہ ایسے افراد سے خریداری کر کے انہیں سہارا دینے میں حرج نہیں سمجھتے تو بس سمجھ لیں کہ اس نے اس طرح سے بھی خوب رقم بنائی ہے۔''

''بہت ہی کوئی شاطر اور مجرمانہ ذہن کی عورت ہے۔'' سرور نے دانت کچکچا کر تبصرہ کیا۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس طرح کی عورتوں کے لیے ہماری صوفی جیسی گھریلو عورت کو اپنے جال میں پھانسنا یقیناً بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔'' اختر نے بھی اپنی رائے دی۔

''کھیل تو جناب خوب کھیلا جا رہا ہے۔ بینک ریکارڈز چیک کرنے پر یہ بات سامنے آئی ہے کہ جس تاریخ سے مسز صوفیہ اور عثمان صاحب کے اکاؤنٹ سے رقوم نکلوائی جا رہی ہیں اسی تاریخ سے اور سیم انہی ٹائمنگو میں شازیہ اور امجد کے اکاؤنٹس سے بھی رقوم نکلوائی جاتی رہی ہیں۔ رقوم نکالنے کے لیے جو اے ٹی ایمز استعمال کی گئیں، ان کی کیمرا ریکارڈنگ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ رقم نکالنے والا امجد تھا بس یہ بات سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ لوگ اتنا کیش کیوں نکال رہے ہیں اور اسے کس شکل میں محفوظ کریں گے کیونکہ ان کے ناموں سے مزید کوئی اور بینک اکاؤنٹ ریکارڈ پر نہیں ہے۔''

''جب آپ کو سمجھ آ جائے تو ہمیں بھی آگاہ کر دیجیے گا۔'' عثمان نے بیزار سے لہجے میں کہا اور یکدم ہی اپنی جگہ چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

''آئی ایم سوری انسپکٹر صاحب! آئی تھنک وہ مینٹلی ڈسٹرب ہے اس لیے اس طرح بی ہیو کر گیا ہے۔'' اختر نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کر کے صورتِ حال کو سنبھالنے کی سعی کی۔ انسپکٹر جواب میں کچھ نہیں بولا لیکن اس کی آنکھوں کے تاثرات بڑے عجیب سے تھے۔

''میرے ذہن میں ایک اندیشہ ہے انسپکٹر صاحب!'' سرور کے مخاطب کرنے پر وہ ماحول میں واپس آیا اور اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ عثمان کے اے ٹی ایم کارڈ بلاک کرنے کے بعد جبکہ مجرموں کو مزید رقم حاصل کرنے کا موقع نہیں مل رہا ہے وہ صوفی اور اشعر کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہوں گے۔ موجودہ صورتِ حال میں تو وہ دونوں ان کے لیے ناکارہ ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان سے جان چھڑانے کے لیے وہ خدانخواستہ انہیں......'' سرور اپنی بات مکمل نہیں کر سکا لیکن مفہوم واضح تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ مجرم اس کی بہن اور بھانجے کو قتل کر سکتے ہیں۔

''زیورات اور اے ٹی ایم کا پن کوڈ حاصل کرنے کے بعد ہی اصل میں وہ دونوں ان کے لیے ناکارہ ہو چکے تھے لیکن چونکہ ہمیں ابھی تک ایسی کوئی بات پتا نہیں چلی ہے اس لیے ہم یہی ذہن میں رکھ کر کام کریں گے کہ دونوں مغویان فی الحال زندہ ہیں اور ہمیں انہیں بچانا ہے۔'' انسپکٹر نے بہت رسان سے اس کے سوال کا جواب دیا اور خود کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ تھا جو مسلسل اسے کھٹک رہا تھا۔

☆☆☆

''رقم کا انتظام کر لیا ہے تم نے؟'' عثمان کو جس فون کال کا انتظار تھا، وہ بالآخر آ گئی تھی۔

''رقم بالکل تیار ہے، بس تم یہ بتاؤ کہ کب اور کہاں پہنچانی ہے۔'' اس نے بے قراری سے جواب دیا۔

''ایک نیلے رنگ کا بیگ لو اور ساری رقم اس میں رکھ دو۔ رقم کے اوپر کچھ فالتو کپڑے اور پرانے اخبارات وغیرہ بھی رکھ دینا تاکہ بیگ بھرا ہوا لگے۔'' ادھر سے ہدایت ملی۔

''ٹھیک ہے، میں یہ کام کر دوں گا مگر مجھے یہ تو پتا چلے کہ رقم پہنچانی کہاں ہے؟''

''وہ، میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔'' دوسری طرف سے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ عثمان نے نوٹ کیا تھا کہ پہلی کال کے بعد اغوا کار نے بھی طویل کال نہیں کی تھی حالانکہ ہر بار وہ نئے نمبر سے ہی رابطہ کرتا تھا۔ شاید اسے خدشہ تھا کہ کال کے ذریعے اس کی لوکیشن ٹریس کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ عثمان، جسے محسوس ہو رہا تھا کہ مجرم پولیس سے کئی قدم آگے ہیں۔ تاوان کی رقم ادا کر کے اپنی بیوی اور بچے کو خاموشی سے واپس لانے کے سوا کچھ بھی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کے بڑے بھائی لقمان نے بھی مشورہ کرنے پر اسے یہی صلاح دی تھی۔ رقم کے انتظام کے لیے بھی اسے بڑے بھائی سے مدد لینی پڑی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کچھ رقم اپنے کولیگ اظہر سے بھی منگوائی تھی تب جا کر اغوا کاروں کے مطالبے کے مطابق رقم جمع ہوئی تھی۔

وہ کچھ اعصاب زدہ سا اپنے اپارٹمنٹ سے مطلوبہ بیگ کی خریداری کے لیے فوری طور پر نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں بشیر بھائی سے سامنا ہوا لیکن وہ اتنا غائب الدماغ ہو رہا تھا کہ ان کے سلام کرنے کے باوجود ان کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ اصل میں، اس پر صرف ایک دُھن سوار تھی اور وہ یہ کہ اپنی طرف سے سب کچھ مکمل رکھے تاکہ جیسے ہی اغوا کار کوئی اگلی ہدایت دے، وہ اس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو۔

کیب سروس کے ذریعے کیب منگوا کر وہ قریبی مارکیٹ گیا اور جلد ہی مطلوبہ بیگ خرید کر واپسی کی راہ اختیار کی۔ قسم قسم کی اشیا سے بھری مارکیٹ میں اس بیگ کے سوا کسی شے نے اسے متوجہ نہیں کیا تھا۔ ہاں مارکیٹ کے باہر اس نے ایک ردّی والے کے پاس رک کر پرانے اخبارات ضرور خریدے تھے۔ درحقیقت ان دنوں وہ کھانا پینا بھی بس زندہ رہنے کی حد تک کر رہا تھا تو پھر ایسے میں کوئی اور شے کیسے اسے متوجہ کرتی۔ وہ تو یہ بھی نوٹ نہیں کر سکا تھا کہ مارکیٹ جانے اور وہاں سے واپس آنے کے دوران اس کا تعاقب کیا جاتا رہا ہے۔ تعاقب کار نے اس کی اس سرگرمی کی رپورٹ کسی کو بھجوا دی تھی جبکہ وہ اغوا کار کی ہدایت کے مطابق رقم کا بیگ تیار کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس کے پاس سوائے انتظار کرنے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔ سو موبائل سامنے رکھے منتظر نظروں سے اسے تکنے لگا۔

☆☆☆

صوفی کی حالت بہت خراب تھی۔ کرسی کے ساتھ مسلسل بندھے رہنے کے باعث جسم اکڑ کر تختہ ہو گیا تھا اور ایک ایک جوڑ میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ پورے دن میں اجابت کے لیے جانے کے سوا اسے اس کرسی سے نجات نہیں ملتی تھی یا پھر کھانے کے وقت تھوڑی دیر کے لیے ایک ہاتھ کھولا جاتا تھا۔ اس جسمانی تکلیف کے ساتھ ساتھ ذہنی اذیت بھی تھی۔ ہر دم اس خوف میں رہنا کہ معلوم نہیں اس جگہ سے آزادی ملے گی بھی یا نہیں؟ کہیں وہ دونوں خاموشی سے تو نہیں مار دیے جائیں گے؟ مر گئے تو لاش کو کفن دفن بھی نصیب ہوگا یا نہیں؟ کس قدر اذیت ناک تھا۔ اس سے کوئی الفاظ میں بیان کرنے کا کہتا تو وہ بیان نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا سارا دن رونے، التجائیں کرنے اور اپنے اُن گناہوں کی معافی مانگنے میں گزرتا تھا جن کی پاداش میں وہ اس اذیت ناک جگہ پہنچا دی گئی تھی۔ اب بھی اسے کچھ سُجھائی نہیں دیا تو بلند آواز میں رونا شروع کر دیا۔

''خاموش ہو جاؤ، یہ کیا نحوست پھیلا رکھی ہے۔'' چہرے پر ہمیشہ ماسک چڑھائے رکھنے والی عورت منظر میں داخل ہوئی اور اسے بلند آواز میں ڈانٹا۔

''کیوں کر رہے ہو تم لوگ ہمارے ساتھ اتنا ظلم۔ ہم نے تمہاری ہر بات مانی ہے، سارا پیسا تمہارے حوالے کر دیا ہے پھر بھی تم لوگ ہمارے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہو۔ آزاد کیوں نہیں کر دیتے تم ہمیں۔'' وہ عورت کے ڈانٹنے پر خاموش ہونے کے بجائے جنونی انداز میں چیخ چیخ کر بولنے لگی۔

''بکواس بند کرو۔'' عورت نے اُس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر ڈالا۔

''کیا کر رہی ہو ڈارلنگ؟ بیچاری نے کوئی غلط بات تو نہیں کی ہے بس ایک چھوٹی سی خواہش ہی کا تو اظہار کیا ہے اور ہمارا فرض بنتا ہے کہ جس نے ہمارے ساتھ اتنا تعاون کیا ہے، ہم بھی اس کی ایک بات مان لیں۔ ایک ذرا سی آزادی ہی تو مانگ رہی ہے بیچاری۔'' عورت ہی کی طرح چہرے کو ماسک کے پیچھے چھپائے مرد کمرے میں داخل ہوا اور بظاہر اپنی ساتھی عورت کو ٹوکنے لگا لیکن اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ کرسی سے بندھے اس کے سن پڑتے وجود میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔

''تم ہمیں یہاں سے جانے دو، ہم کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے اور ساری زندگی اپنی زبان بند رکھیں گے۔'' اس بار اس نے جھکی نگاہوں اور پست آواز کے ساتھ درخواست کی۔

''تمہاری پُرزور فرمائش پر تمہاری درخواست قبول کرتے ہوئے میں تم دونوں کو آزاد کر رہا ہوں۔ امید ہے تمہیں میرا یہ فیصلہ پسند آئے گا۔'' مرد نے کچھ ایسے لہجے میں جواب دیا کہ وہ اپنی نگاہیں اٹھا کر دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔ مرد کے ہاتھ میں لمبی نال والا خوفناک پسٹل موجود تھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکلی لیکن خاموش پسٹل سے نکلنے والی بے آواز گولی نے سینے میں داخل ہو کر اس چیخ کا گلا گھونٹ دیا۔ آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہونے سے پہلے اس نے جو آخری منظر دیکھا وہ اس کمرے میں موجود دوسری کرسی سے بندھے وجود کے سینے سے خون کا فوارہ اچھلنے کا تھا۔ سارے خوف اور اندیشے ختم ہو گئے اور موت کے فرشتے نے دونوں نفوس کی روحیں قبض کر لیں۔

☆☆☆

''آئی ایم سوری عثمان! تمہاری بات نہ مان کر میں نے خود کو اور اشعر کو بہت بڑی مصیبت میں پھنسا لیا ہے۔ پلیز ہمیں یہاں سے نکالنے کے لیے کچھ کرو اور جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں مان لو۔'' یہ وہ ریکارڈڈ آڈیو پیغام تھا جو اسے صوفی سے بات کرنے کے اصرار پر کل بھیجا گیا تھا۔ یہ پیغام صوفی اور اشعر کے زندہ ہونے کا واحد ثبوت تھا اس لیے کل سے اب تک وہ اس پیغام کو بے شمار بار سن چکا تھا۔ اس پیغام کو سنتے ہوئے اسے ہر بار احساس ہوتا تھا کہ وہ صوفی اور اشعر سے اپنے اندازے سے بھی زیادہ محبت کرتا تھا اور یہ طے تھا کہ اگر وہ دونوں اسے نہ ملے تو وہ ان کی جدائی میں گھل گھل کر ہی مر جائے گا۔

''لوٹ آؤ یار! تم دونوں کے بغیر جینا بہت مشکل ہے۔'' وہ آنکھوں میں آئی نمی کو صاف کرتے ہوئے بلند آواز میں بڑبڑایا۔ اسی وقت موبائل کی گھنٹی نے اسے متوجہ کرلیا۔ اسکرین پر جگمگاتا اجنبی نمبر اس کے لیے امید کی ایک کرن تھا۔ اس نے جھپٹ کر کال ریسیو کی۔

''ابھی ابھی بیگ سمیت گھر سے نکلو اور کیب لو۔ آگے کی ہدایات میں تمہیں تھوڑی دیر بعد دوں گا۔'' اس کی ''ہیلو'' سنتے ہی دوسری طرف سے حکم سنایا گیا اور کوئی سوال کرنے سے قبل ہی سلسلہ منقطع کردیا گیا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور بیگ کندھے سے لٹکا کر باہر کی طرف دوڑا۔ اس وقت اسے اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ دیکھ سکے اپارٹمنٹ کا دروازہ لاک بھی ہوا ہے یا نہیں۔ کیب اس نے لفٹ سے نیچے جاتے جاتے ہی منگوالی۔

''سلام صاحب۔'' مین گیٹ پر موجود پٹھان گارڈ نے اسے دیکھ کر مؤدبانہ کہا لیکن اس نے اس کا سلام سنا ہی نہیں اور باہر نکل کر بے قرار نظروں سے کیب کو تلاش کرنے لگا۔ مشکل سے چند سیکنڈوں کے انتظار پر کیب پہنچ گئی۔

''اتنی دیر لگادی تم نے۔ کچھ احساس بھی ہے کہ مجھے کتنے ضروری کام سے جانا ہے۔'' اس نے بلاوجہ کیب ڈرائیور کو ڈانٹ پلادی۔

''دیر کیسی سر؟ میں تو فوراً ہی آگیا ہوں۔'' ڈرائیور حیران ہوا۔

''اچھا باتوں میں ٹائم ضائع نہ کرو اور گاڑی چلاؤ۔'' اس نے ایک بار پھر اسے ڈپٹا۔

''جانا کہاں ہے سر؟ آپ نے مینشن نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی میں فری ہونے کی وجہ سے آگیا۔'' ڈرائیور نے

پیکنگ

شادی ہوئی تو دوسرے دن دولھا میاں نے اپنی نئی نویلی بیوی سے اس پارلر کے بارے میں دریافت کیا جس نے بڑی مہارت سے اس پر عروسی سنگھار کے جوہر دکھائے تھے۔ اسی شام وہ ایک تحفہ لے کر اس بیوٹی پارلر میں پہنچا۔ ڈبا دیکھتے ہی پارلر والی کا دل اچھل کر حلق میں آیا۔ وہ ایک بیش قیمت موبائل فون کا ڈبا تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اسے کھولا تو اندر ابتدائی دور کا ایک دقیانوسی فون سجا ہوا تھا۔

''یہ کیا اٹھا لائے آپ، اس ڈبے میں؟ اس نے قدرے غصے اور جھلاہٹ سے کہا۔

''بی بی! حساب برابر کرنے آیا ہوں۔ میرے ساتھ بھی یہی کیا گیا تھا۔ میک اپ کی پیکنگ میں آپ نے میری بیوی کا جو چہرہ چھپایا تھا، نہانے کے بعد وہ اسی طرح بے نقاب ہوا تھا جیسے عمدہ ڈبے میں یہ پرانا ماڈل!''

اسلام آباد سے شکیل حسین کاظمی کا جوابی وار

گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

''تم چلو تو سہی یار، میں ابھی بتاتا ہوں۔'' اسے ظاہر ہے کال کا انتظار تھا۔ دو تین منٹ کا یہ انتظار بھی اسے پہاڑ سا محسوس ہوا۔

''سائٹ ایریا کی طرف آؤ۔'' مختصر کال اور مختصر ہدایت تھی۔ جس کے مطابق اس نے ڈرائیور کو منزل سے آگاہ کیا۔ ابھی مشکل سے پانچ چھ منٹ کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ ایک بار پھر کال آنے لگی۔ وہی اجنبی نمبر والی کال تھی جسے اسے ہر صورت اٹینڈ کرنا تھا۔

''جہاں ہو، وہیں اتر جاؤ اور کسی دوسری ٹیکسی میں بیٹھو۔'' ایک اور نادرشاہی حکم جاری ہوا۔ جس پر ظاہر ہے اسے عمل کرنا تھا۔ ایک سے دوسری ٹیکسی بدلنے میں گھن چکر بنے اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ اس کا تعاقب کیا جارہا ہے۔ آخرکار اسے ٹیکسی چھوڑ کر پیدل چلنے کا حکم دیا گیا۔ شانے پر بیگ لٹکائے پیدل چلتا ہوا وہ حسب ہدایت ایک خستہ حال مکان کے باہر جاکر رکا اور مکان کی ایک کھڑکی کو دھکا دے کر کھولا۔ اس کھلی کھڑکی سے اس نے بیگ اندر پھینکا ہی تھا کہ آس پاس سے کچھ سائے نکل کر اس مکان کی طرف لپکے۔ وہ آنکھیں پھاڑے ان سایوں کو دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

''یہ سب آپ لوگوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر آپ

لوگ مداخلت نہ کرتے تو آج میری بیوی اور بچہ میرے پاس ہوتے۔'' وہ پولیس اسٹیشن میں بیٹھا انسپکٹر شاہنواز سے اُلجھا ہوا تھا۔ شاہنواز اس کی سخت باتیں صرف اور صرف اسی لیے خاموشی سے سن رہا تھا کہ اس کے ماتحتوں سے اندازے کی غلطی ہوئی تھی۔ وہ سمجھے تھے کہ مکان میں رقم وصول کرنے کے لیے کوئی موجود ہوگا اس لیے اس کے بیگ اندر پھینکتے ہی مکان پر چڑھائی کر دی تھی لیکن مکان اندر سے خالی تھا اور کافی دیر انتظار کے باوجود کوئی وہاں بیگ اٹھانے نہیں آیا تھا۔

''آپ سے کہا کس نے تھا کہ آپ میرا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچ جائیں اور مداخلت کریں۔'' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ انسپکٹر کا گریبان ہی پکڑ لے۔

''آپ جیسے تعلیم یافتہ لوگ پولیس کے ساتھ تعاون کرنے کے بجائے مجرموں کے اشاروں پر چلیں گے تو اس ملک میں قانون کی بالادستی کیسے ہوگی؟ آپ کو ہم پر بھروسا کرنا چاہیے تھا۔'' اس بار انسپکٹر نے بھی ناراضی کا اظہار کیا۔

''بھروسا اُس پر کیا جاتا ہے جس میں کوئی اہلیت ہو۔ پاکستان کی نااہل پولیس پر کوئی بے وقوف ہی بھروسا کر سکتا ہے۔'' وہ کچھ زیادہ ہی آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

''آپ ہمارے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں عثمان صاحب! اتنے کم وسائل کے باوجود میں نے اس کیس پر بہت تیزی سے کام کیا ہے۔'' شاہنواز نے احتجاج کیا۔

''سر جی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب! آپ خود سوچیے کہ یہ ان کی ذہانت ہی تو ہے کہ آپ کی باڈی لینگویج سے کسی تبدیلی کا شک ہوا اور پھر بینک اکاؤنٹ کی ٹرانزکشن سے اندازہ لگا لیا کہ آپ تاوان دینے کے لیے رقم اکٹھی کر رہے ہیں۔ اس اندازے کی وجہ سے ہی آپ کی مستقل نگرانی کروائی جا رہی تھی۔ آخری لمحات میں غلطی نہ ہوتی تو مجرم ہمارے قبضے میں ہوتے۔'' شاہنواز کا ماتحت بھی اس کی حمایت کے لیے میدان میں اترا۔

''لیکن مجھے ان کی ذہانت سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ میری بیوی اور بچہ اب بھی مجھ سے دور ہیں۔'' اس کی حالت جذباتی دباؤ کے باعث غیر ہو رہی تھی۔

''کیا تاوان ادا کرنے سے وہ مل جاتے؟ کیا طریقہ طے ہوا تھا اُن کی واپسی کا؟'' انسپکٹر نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''اس نے کہا تھا کہ رقم ملتے ہی وہ ان دونوں کو آزاد کر دے گا۔''

''اس نے کہا اور آپ نے یقین کر لیا۔ اگر یہ لوگ ایسے ہی قول و فعل کے سچے ہوتے تو یہ بھیانک کام کرتے ہی کیوں؟''

''میرے پاس اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔'' انسپکٹر کی دلیل نے اسے دھیما کر دیا۔

''آپ کو ہر صورت مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی۔ ہم آپس میں مشورہ کر کے کوئی لائحہ عمل طے کرتے تو مجرم کی گردن پکڑنے میں کامیاب ہو جاتے۔''

''اس نے کہا تھا کہ یہاں اس کا مخبر موجود ہے۔'' اس کے انکشاف نے ایک پل کے لیے انسپکٹر کو گنگ کر دیا۔

''بلف کیا تھا اُس نے۔ اگر یہاں اس کا کوئی مخبر موجود ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ پولیس آپ کی نگرانی کر رہی ہے۔'' اگلے ہی لمحے وہ شانے جھٹک کر عقلی دلیل دے رہا تھا۔ اس بار گنگ ہونے کی باری عثمان کی تھی۔

''اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟'' کچھ دیر کے توقف کے بعد اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''سب سے پہلے تو یہ دعا کریں کہ وہ مایوسی اور طیش میں مغویان کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔'' انسپکٹر نے جل کر جواب دیا تو اس کا سر جھک گیا۔

''مسئلہ یہ ہے کہ جس دن سے یہ وقوعہ پیش آیا ہے شازیہ اور امجد نے ایک بار بھی اپنے موبائلز آن نہیں کیے ہیں۔ کوئی کال، کوئی میسج نہیں۔ سوشل میڈیا سے بھی بالکل غائب۔ یہاں تک کہ شازیہ نے آن لائن ٹیوشن پڑھنے والے بچوں سے بھی رابطہ نہیں کیا ہے۔ حالانکہ ان بچوں کے والدین کا کہنا ہے کہ شازیہ بے حد پنکچوئل ٹیچر تھی جو چھٹی کرنا تو دور کی بات کبھی لیٹ بھی نہیں ہوتی تھی۔'' انسپکٹر اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہتھیلی پر ہلکے ہلکے مکے مارتا ہوا کچھ بے بسی سے کہہ رہا تھا۔

''رانا صاحب کہتے تو ہیں سر جی کہ ٹیکنالوجی کبھی بھی دھوکا دے دیتی ہے۔'' سب انسپکٹر نے اپنے کسی سینئر کا حوالہ دیا۔

''ٹیکنالوجی......'' عثمان کے دماغ میں کچھ کلک ہوا اور جلدی سے اپنا موبائل کھول کر اس پر کچھ سرچ کرنے لگا۔

''او مائی گاڈ! اتنی اہم بات میرے دماغ سے کیسے نکل گئی۔'' اسکرین پر کچھ دیکھتے ہوئے وہ بہ آواز بلند بڑبڑایا۔

"کچھ مجھے بھی بتائیں۔" انسپکٹر متجسس ہوا۔

"یہ فائنڈ مائی (Find My) نام کی ایک ایپ ہے۔ صوفی کی ایک بُری عادت ہے کہ وہ چیزیں رکھ کر اکثر بھول جاتی ہے اور چیزوں کے معاملے میں تو پھر بھی گزارا ہو جاتا ہے لیکن اپارٹمنٹ کی چابیاں اِدھر اُدھر رکھ کر بھولنے سے اکثر مسئلہ بن جاتا تھا۔ اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ اسے ایک ائرٹیگ خرید کر بھیج دیا۔ یہ ایک چھوٹا سا بٹن جتنا آلہ ہوتا ہے جسے چابیوں یا کسی بھی ایسی چیز میں ڈال سکتے ہیں جن کے گم ہونے کا ڈر ہو۔ صوفی نے اسے چابیوں میں ڈالا تھا اور میں نے اس ائرٹیگ کو اپنے موبائل پر موجود ایپ پر تا کہ جب بھی صوفی چابیاں گم کرے ایپ کھول کر گم شدہ چابیوں کی لوکیشن معلوم کی جا سکے۔ اتفاق سے جب سے یہ ائرٹیگ ڈالا گیا چابیاں گم ہی نہیں ہوئیں اس لیے اس ایپ کو استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی اور میرے ذہن سے یہ بات بالکل نکل گئی۔" وہ پُرامید سا انسپکٹر کو تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔

"مطلب ہم اس ائرٹیگ کی مدد سے مغویان اور اغوا کاروں میں سے کسی تک پہنچ سکتے ہیں۔" انسپکٹر جوش میں آ گیا۔

"مجھے پوری امید ہے۔ یہ دیکھیں، یہ جس طرح لوکیشن آہستہ آہستہ تبدیل ہو رہی ہے، مجھے لگتا ہے ہمارا ائرٹیگ کسی متحرک گاڑی میں موجود ہے۔" اس نے انسپکٹر کو اسکرین پر انگلی رکھ کر سمجھایا۔

"جلدی کرو اوئے۔ گاڑیاں تیار کرو۔ خبردار اس بار کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔" انسپکٹر شاہنواز فوراً عمل کے لیے تیار ہو گیا۔

☆☆☆

دسمبر کی آخری رات اپنے جوبن پر تھی۔ اہلِ کراچی مشکل سے اپنی جھلک دکھانے والی سردی کے ناز نخرے اٹھانے کے لیے پوری طرح تیار سڑکوں پر نکلے ہوئے تھے۔ دسمبر کی آخری رات کو رخصت کرنے اور نئی صبح کو خوش آمدید کہنے کے لیے منچلوں کا اپنا ہی انداز تھا۔ کہیں تیز موسیقی کے ساتھ الاؤ کے گرد رقص ہو رہا تھا، تو کہیں انگاروں پر باربی کیو کیا جا رہا تھا۔ نوعمر اور بے قابو نوجوان سڑکوں پر ون ویلنگ کرتے پھر رہے تھے۔ رومانوی جوڑوں کے درمیان ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے نئے سال کے لیے نئے عہد و پیمان جاری تھے، کچھ جگہوں پر بنتِ انگور بھی شیشے کے کھنکتے پیمانوں میں گردش کر رہی تھی۔ سڑکوں پر سے گزرتی بیشتر گاڑیوں سے موسیقی کی آوازیں پھوٹ رہی تھیں۔ غرض شہر کا وہ طبقہ جو دسمبر کی اس آخری رات کو الوداع کہنے کے لیے گھروں سے باہر نکلا ہوا تھا، ایک ایسی موج میں بہہ رہا تھا جو شہری انتظامیہ کی طرف سے عائد کی گئی بیشتر پابندیوں کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لے گئی تھی۔ نظم و نسق قائم کرنے کی کوشش میں ہلکان پولیس والے بھی تھک ہار کر لوگوں کو تھوڑی چھوٹ دینے پر مجبور ہو گئے تھے اور صرف وہاں مداخلت کر رہے تھے جہاں نقضِ امن کا کوئی خدشہ پیدا ہو جاتا تھا۔

اس چمکتی دمکتی رات میں وہ جوڑا ابھی گاڑی میں ہلکی موسیقی لگائے سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ دونوں ہی نے تیاری میں خاص اہتمام کیا تھا۔ قیمتی لباس، میک اَپ، برانڈڈ جوتوں اور عمدہ خوشبوؤں سمیت کسی شے کی کمی نہیں تھی لیکن چہروں پر ماسک ایک جزو لازم کی طرح موجود تھا۔

"تم نے انہیں مارنے میں بہت جلدی کی۔ نیو ائر نائٹ گزر جانے دیتے پھر ان سے جا چھڑاتے۔" عورت نے اپنے ساتھی مرد کو ٹوکا اور پھر سڑکوں پر جاری ہنگامے کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے مزید بولی۔

"لگتا ہے سارا شہر ہی باؤلا ہو کر سڑکوں پر نکل آیا ہے۔ اتنی پولیس لگی ہوئی ہے۔ اگر کسی نے گاڑی کی تلاشی لے لی تو ایک ساتھ دو دو لاشیں نکلنے پر ہم سیدھے پھانسی چڑھ جائیں گے۔"

"یہ سارا تو کیا آدھا شہر بھی نہیں ہے۔ کچھ معلوم بھی ہے کہ کراچی کی آبادی تین ساڑھے تین کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ اگر سارے کے سارے لوگ باہر نکل آئیں تو سوچو کیا حشر ہو گا۔ رہی پولیس والوں کے چیکنگ کرنے کی بات تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان بیچاروں کے پاس سر کھجانے کی فرصت نہیں ہے۔ گاڑیوں کی چیکنگ کرنے کے جھنجٹ میں کہاں پڑیں گے۔" مرد مطمئن تھا اور اسے بھی اطمینان دلا رہا تھا۔

"تمہاری یہی عادت ہے، ڈرنے والی بات پر بھی نہیں ڈرتے ہو۔ پولیس والے غلطی نہ کرتے تو آج ہم نے پھنس جانا تھا۔" عورت نے خفگی کا اظہار کیا۔

"ڈر کے آگے جیت ہے ڈارلنگ، تم نے سنا نہیں جو ڈر گیا وہ مر گیا۔" مرد نے قہقہہ لگا کر گویا اس کی خفگی سے بھی لطف اٹھایا۔ گاڑی مسلسل آگے بڑھتی اب پُررونق سڑکوں سے ہٹ کر قدرے سنسان سڑکوں کی طرف جا رہی تھی۔ بالآخر اسے ایک قبرستان کے قریب روک دیا گیا اور مرد

نے گاڑی کے اندر باہر کی ساری بتیاں گل کر دیں۔ گاڑی تھی بھی سیاہ رنگ کی اس لیے اندھیرے میں ایسے مدغم ہوئی کہ اندھیرے کا ہی حصہ بن گئی۔

''باہر آجاؤ، تمہیں میری مدد کروانی پڑے گی۔'' مرد نے بے آواز گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے عورت سے کہا تو وہ طوعاً وکرہاً اپنی جانب کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ سڑک پر رونق بے شک نہیں تھی لیکن وقفے وقفے سے کوئی نہ کوئی تیز رفتار گاڑی یا بائیک گزر ہی جاتی تھی۔

''تم آس پاس نظر رکھو، میں ڈکی کھولتا ہوں۔'' مرد نے کہا اور چابی کی مدد سے ڈکی کا تالا کھولنے لگا۔ کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ تالا کھل گیا تو اس نے ڈھکن اٹھایا۔ اندر اوپر تلے دو لاشیں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ اندھیرے کے باعث وہ لاشوں کو دیکھ نہیں پا رہا تھا لیکن یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اوپر والی لاش عورت کی ہے۔

''مدد کے لیے آجاؤ۔'' اس نے ڈکی کا ڈھکن راڈ کی مدد سے کھڑا کیا اور اپنی ساتھی عورت کو پکارا۔ وہ بادل ناخواستہ اس کی مدد کے لیے آگے بڑھی۔

''زیادہ کام نہیں ہے۔ بس باہر ہی دیوار کے ساتھ لٹا دیں گے۔'' مرد نے اسے تسلی دی۔ ایک ایک طرف سے دونوں نے اس چادر کے سرے تھام لیے جس میں لاش کو لپیٹا گیا تھا۔ عورت سرہانے کی طرف تھی۔ اس سے چادر سنبھل نہ سکی اور مردہ عورت کے بال باہر نکل کر لہرانے لگے۔ یہی وہ وقت تھا جب کسی نے تیز روشنی ڈالی اور لاش سمیت وہ دونوں روشنی میں نہا کر رہ گئے۔

☆☆☆

چادر سے نکل کر ہوا میں جھولتے ان بالوں کو دیکھ کر انسپکٹر شاہنواز کے برابر میں بیٹھے عثمان کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ روشنی میں نہائے ان دونوں مرد و زن نے جس انداز میں چادر کو دونوں جانب سے پکڑ رکھا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ چادر میں ایک عدد لاش موجود ہے، عورت کی لاش۔

''اوئے پکڑو انہیں۔'' انسپکٹر بھی لاش دیکھ کر بوکھلا گیا تھا اور چیختا ہوا گاڑی سے اترا تھا۔ وہ دونوں جن کی آنکھیں تیز روشنی سے چندھیا گئی تھیں اچانک پیش آنے والی اس صورت حال پر ذرا تاخیر سے سنبھلے جب تک وہ لاش پھینک کر فرار کی راہ اختیار کر پاتے، پولیس والے انہیں گرفت میں لے چکے تھے۔

''سر ڈکی میں ایک اور لاش موجود ہے۔'' گاڑی کے قریب کھڑے ایک ماتحت نے اطلاع دی۔

''نکالو، اسے بھی باہر۔'' انسپکٹر نے حکم دیتے ہوئے بے اختیار عثمان کی طرف دیکھا۔ وہ گاڑی سے باہر آرہا تھا۔

''ذرا ماسک تو اتارو ان حرام خوروں کے۔'' عثمان سے نظریں چرائے انسپکٹر نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔ فوراً ہی گرفتار شدہ جوڑے کے چہروں سے ماسکس نوچ لیے گئے۔

''یہ تو شازیہ اور امجد نہیں ہیں۔'' ان کے چہرے دیکھ کر انسپکٹر بے ساختہ بول اٹھا۔

''یہ لاشیں بھی صوفی یا اشعر کی نہیں ہیں۔'' عثمان نے اسے اطمینان سے بتایا تو اس نے ڈکی سے نکالی جانے والی دوسری لاش کو دیکھا۔ لاش چادر میں لپٹی ہوئی تھی لیکن قد و قامت سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ کوئی بچہ نہیں بلکہ بڑا آدمی ہے۔ عثمان کو البتہ اس لاش کو دیکھنے سے پہلے ہی حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا۔ اسے یاد آگیا تھا کہ صوفی کے بالوں کی رنگت مختلف ہے اور وہ اتنے زیادہ لمبے بھی نہیں ہیں جتنے اس لاش کے بال تھے۔

''کدھر ہیں اوئے مغوی عورت اور بچہ؟'' انسپکٹر نے گرفتار شدہ مرد کے چہرے پر ایک زناٹے دار تھپڑ رکھ کر دیا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔

''گیم از اوور ثاقب! ابھی بتائیں یا تھانے پہنچ کر تشدد کے بعد ہمیں بتانا تو ہے۔'' اس کے ساتھ کھڑی عورت نے اپنے ساتھی سے کہا اور انسپکٹر کی طرف رخ کر کے سپاٹ لہجے میں بولی۔

''میں ثانیہ ثاقب ہوں انسپکٹر صاحب! میں آپ کو اس جگہ لے چلتی ہوں جہاں وہ دونوں موجود ہیں۔''

''گاڑی میں بٹھاؤ انہیں، ہری اَپ۔'' انسپکٹر نے حکم جاری کیا اور اپنے نائب کو مزید چند ہدایات دینے لگا۔ اس دوران لاشیں بھی دیکھی گئیں اور انکشاف ہوا کہ وہ شازیہ اور امجد کی لاشیں ہیں۔ امجد کے لباس کی جیب سے چابیوں کا وہ گچھا بھی بازیاب ہو گیا جس میں ائر ٹیگ ڈالا گیا تھا۔ اس ساری کارروائی کے بعد پولیس پارٹی کے کچھ لوگ موقع پر ہی رک گئے تھے اور ضروری کارروائی کے لیے ایمبولینس سمیت دیگر متعلقہ افراد کو کال کی جا رہی تھی۔ جو گاڑیاں روانہ ہوئی تھیں، ان میں بیٹھنے والوں کی ترتیب یہ تھی کہ گرفتار شدہ مرد کو الگ گاڑی میں بٹھایا گیا جبکہ عورت انسپکٹر والی گاڑی میں اس کے برابر فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ پچھلی نشست پر عثمان اور ایک ماتحت موجود تھے۔

''اگر تم پولیس کے ساتھ تعاون کر ہی رہی ہو تو باقی

تفصیلات سے بھی آگاہ کر دو۔ ہمارے نزدیک تو شازیہ اور امجد ہی اغوا کار تھے اور یہ بات بالکل سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ تم دونوں میاں بیوی درمیان میں کہاں سے ٹپک پڑے۔'' انسپکٹر جو خود گاڑی چلا رہا تھا ثانیہ نامی اس عورت سے پوچھنے لگا۔

''ہم اچانک نہیں ٹپکے، ہم ابتدا سے اس قصے میں موجود تھے۔ یہ اور بات کہ کسی کو ہماری موجودگی کی بھنک نہیں پڑ سکی۔'' عورت کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ پھیلی جیسے اسے خود پر فخر ہو۔

''وضاحت کرو۔'' انسپکٹر نے رعب سے حکم دیا۔

''ہم جدید دور کے چور ہیں اور اپنا شکار اکثر سوشل میڈیا پر تلاش کرتے ہیں عموماً خواتین کی پوسٹس ہمیں ان کے مالی حالات سے آگاہ کر دیتی ہیں۔ جیولری، گاڑیاں، گھر کا ساز و سامان، ہوٹلنگ کا معیار وغیرہ سب ہمیں بتا دیتا ہے کہ ان تلوں میں کتنا تیل ہے۔ ہم کسی نہ کسی طرح ایسے گھروں تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور اپنے مطلب کا مال حاصل کر لیتے ہیں لیکن صوفی اور شازیہ کا کیس اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہمارے لیے قدرے مختلف تھا۔'' وہ بہت اطمینان سے اپنے بارے میں بتا رہی تھی اور گاڑی میں موجود ہر شخص توجہ سے سن رہا تھا۔

''صوفی اور شازیہ ایک ساتھ میری نظروں میں آئی تھیں اور میں نے دونوں ہی کی مالی حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ صوفی کے پاس اگر باہر کی کمائی کی وجہ سے بہت کچھ تھا تو شازیہ نے بھی بیٹی کے علاج کے بہانے موٹی رقم جمع کر رکھی تھی۔ میں نے دونوں سے دوستی بڑھائی اور اس دوستی کے سبب ہی مجھے شازیہ سے علم ہوا کہ کراچی میں دونوں کب اور کہاں مل رہے ہیں۔ میں نے ثاقب کے ساتھ مل کر ایک تیر سے دو شکار کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ اتفاق ہی تھا کہ دونوں تک ہمیں ایک ساتھ رسائی حاصل ہو گئی۔ وہ لوگ پارک کے باہر ٹیکسی کا انتظار کر رہے تھے۔ ثاقب نے اپنی کار ان کے سامنے لے جا کر روک دی اور ظاہر کیا کہ یہ ایک پرائیویٹ ٹیکسی ہے۔ ان لوگوں کے گاڑی میں بیٹھتے ہی ہمارا کام آسان ہو گیا اور ہم بے ہوشی کی حالت میں انہیں اپنے ٹھکانے پر لے گئے۔

''لیکن امجد تو باقاعدہ تم لوگوں کے لیے کام کر رہا تھا؟'' انسپکٹر کو وہ سارے مقامات یاد آ گئے جہاں جہاں امجد پایا گیا تھا۔

''اسے اپنی بیوی کی زندگی بچانے کے لیے ہمارے ہر حکم کی تعمیل کرنی پڑ رہی تھی۔ صوفی بھی تو اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے ہماری ہر بات مان رہی تھی نا۔''

''یعنی یہاں چوروں کو مور پڑ گئے تھے۔ شازیہ اور امجد صوفی کو لوٹنے کا پلان بنا کر آئے تھے، الٹا خود پھنس گئے۔'' انسپکٹر نے تبصرہ کیا۔

''بالکل ایسا ہی ہے۔'' ثانیہ نے تائید کی۔

''تم لوگوں نے انہیں قتل کیوں کیا؟''

''ثاقب نہیں چاہتا تھا کہ بعد میں وہ کسی طرح ہمارے لیے مصیبت بن سکیں۔ وہ اپنے خلاف کہیں کوئی ثبوت چھوڑنے کا قائل نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیتے ہوئے باہر کی طرف دیکھا۔ اب وہ پُر رونق سڑک پر تھے اور بارہ بجنے میں کچھ دیر ہی باقی رہ جانے کے باعث جوش و خروش میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔

''اگلے کٹ سے گاڑی موڑ لیجیے گا۔'' اس نے انسپکٹر کی رہنمائی کی۔

''یعنی وہ صوفی اور اشعر کو بھی زندہ چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا؟'' انسپکٹر نے اندازہ لگایا۔

''ایسا ہی ہے۔ شاید وہ ایسا کر بھی گزرتا لیکن میں نے کسی نہ کسی بہانے اسے روک رکھا تھا۔ میں بے اولاد ہوں اور مجھ سے ایک معصوم بچے کو قتل کیا جانا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔'' اس نے اعتراف کیا پھر طنزیہ انداز میں بولی۔

''مال اور اولاد کو ایسے ہی فتنہ نہیں کہا گیا۔ میرے پاس ماں بننے کے لیے جو واحد راستہ تھا، اسے اختیار کرنے کے لیے خطیر رقم کی ضرورت تھی۔ اس رقم کے حصول کے لیے میں اور ثاقب جرائم کی دلدل میں دھنس گئے۔ شازیہ اور امجد کا معاملہ بھی کچھ ملتا جلتا تھا لیکن انہوں نے ہمارے جتنی بے رحمی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے دھوکا دہی کی راہ اختیار کی تھی۔ شازیہ زبردستی نائلہ کی ماں بن کر لوگوں سے رقمیں بٹور رہی تھی۔ صوفی کو بھی اسی مقصد کے لیے گھیرا تھا لیکن صوفی، نائلہ سے ملنا چاہتی تھی اور اس کے پاس نائلہ موجود نہیں تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر صوفی کو نائلہ کے سلسلے میں مطمئن کر دے گی لیکن اس کھیل میں ہماری انٹری سے سارا گیم ہی بدل گیا۔''

''کیا تم دونوں میاں بیوی کے ساتھ مزید کچھ افراد بھی شامل تھے؟''

''نہیں، ثاقب کو نفسیات میں دلچسپی ہے اور وہ انسانی نفسیات سے کھیلنا اچھی طرح جانتا ہے اس لیے افرادی قوت نہ ہونے کے باوجود وہ مسٹر عثمان کو باور کروانے میں کامیاب

ہو گیا تھا کہ ہمارے مددگار ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔'' اس نے انسپکٹر کے سوال کا جواب دیا اور گاڑی ایک کشادہ گلی میں مڑوائی۔ گلی میں ایک پرانے تعمیر شدہ گھر کے آگے گاڑی رکوا کر وہ نیچے اتری تو بارہ بجنے میں دو تین منٹ ہی رہ گئے تھے۔ اس نے گیٹ پر لگا تالا کھولا۔ عثمان، پولیس والوں سے بھی زیادہ تیزی سے گھر میں داخل ہوا لیکن پورا گھر خالی پڑا ہوا تھا۔ وہ متوحش ہو گیا۔

''وہ لوگ نیچے تہ خانے میں موجود ہیں۔'' ثانیہ نے بتایا اور تہ خانے کی طرف رہنمائی کی۔ جس وقت وہ لوگ سیڑھیاں اتر کر تہ خانے میں پہنچے، باہر آتش بازی اور ہوائی فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ صوفی اور اشعر انہیں بندھے ہوئے ہاتھ پیروں کے ساتھ ایک میلے سے بستر پر پڑے ہوئے مل گئے۔ صوفی ہوش میں تھی لیکن اشعر سو رہا تھا۔

''عثمان، تم آ گئے عثمان، مجھے معلوم تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔ وہ بیک وقت رو بھی رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھی۔

''مجھے چابیوں کے ساتھ موجود ٹریکر نے تم تک پہنچایا ہے۔ ہمارے اپارٹمنٹ کی چابیاں ابھی تک امجد کی جیب میں موجود تھیں۔'' عثمان اس کے بندھے ہوئے ہاتھ پیر کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے بتا رہا تھا لیکن اس میں سننے کا یارا نہیں تھا۔ تحفظ کا احساس ملتے ہی وہ مزے سے بے ہوش ہو گئی تھی۔

''ماں اور بچے کو جلدی سے اسپتال شفٹ کراؤ۔'' انسپکٹر نے حکم جاری کیا۔ ایمبولینس آئی تو عثمان بھی اس کے ساتھ ہی اسپتال روانہ ہو گیا۔ انسپکٹر شاہنواز کو البتہ ضابطے کی کارروائی کے لیے وہیں رکنا پڑا تھا۔

☆☆☆

''یہ کتنی روشن اور خوب صورت صبح ہے۔ اُس سیلن زدہ تہ خانے میں قید میں کھلا آسمان دیکھنے کو ترس گئی تھی اور کبھی کبھی لگنے لگتا تھا کہ شاید اب کبھی آزاد فضا میں سانس نصیب ہی نہ ہوگا۔'' اسپتال کی عمارت سے باہر نکل کر صوفی نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے خوشی اور اداسی کی ملی جلی کیفیت میں اسے بتانے لگی۔ اسے اور اشعر کو تقریباً دس گھنٹے انڈر آبزرویشن رکھنے کے بعد ڈسچارج کر دیا گیا تھا اور وہ پہلی جنوری کی نرم سی دھوپ اور خوشگوار ہوا کو اپنے وجود پر محسوس کرتی عثمان سے مخاطب تھی۔ اشعر ان دونوں سے چند قدم آگے چلتا ان غباروں سے کھیل رہا تھا جو عثمان صبح صبح ہی اس کے لیے لے آیا تھا۔

وہ بظاہر بالکل نارمل تھا لیکن ڈاکٹر نے ہدایت کی تھی کہ اغوا کے ٹراما سے نکالنے کے لیے اس کی ماہرِ نفسیات سے کونسلنگ ضرور کروائی جائے۔

''بھول جاؤ بُرا وقت اور اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے ہمیں آزمائش سے ضرور گزارا لیکن کسی بھی بڑے نقصان سے محفوظ رکھا۔'' عثمان اسے تسلی دیتے ہوئے مسلسل اشعر پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ وہ ان سے چند قدم مزید آگے چلا گیا تھا لیکن چونکہ وہ اسپتال کے لان میں ہی موجود تھے تو یہ کوئی زیادہ تشویش کی بات نہیں تھی۔

''میں آئندہ تمہاری ہر بات مانوں گی اور ایسی کوئی حماقت نہیں کروں گی۔'' تازہ گزرا ہوا حادثہ صوفی کو جذباتی کر کے فرمانبرداری پر اکسا رہا تھا۔

''آئندہ میں تمہارے سر پر ہی مسلط رہوں گا اور تمہیں ایسی حماقت کا موقع ہی نہیں دوں گا۔'' عثمان کے کہے اس جملے کا مطلب ذرا تاخیر سے صوفی کی سمجھ میں آیا۔

''یعنی، یعنی اب تم ہمیں چھوڑ کر ملک سے باہر نہیں جاؤ گے؟'' خوشی سے اس کی آواز کانپنے لگی۔

''بالکل، میں نے حالات سے سیکھ لیا ہے کہ صرف اور صرف پیسے کے پیچھے بھاگتے رہنا زندگی نہیں ہے۔ اپنوں کا ساتھ سب سے اہم ہوتا ہے۔ میں اب یہیں رہ کر کام کروں گا اور ہم ڈھنگ سے اپنی زندگی کو ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کریں گے۔ اشعر بھی اب بڑا ہو رہا ہے اور اسے ہم دونوں کی بھرپور توجہ کی ضرورت ہے۔'' وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اس نے صوفی کے لیے نئے سال کی پہلی صبح کو مزید خوب صورت کر دیا تھا۔

''تھینک یو سو مچ عثمان!'' اس نے جذباتی ہو کر عثمان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر جوش سے دبایا۔

''تھینک یو کہنے کا موقع اب میرے بیٹے کو دو۔'' عثمان کے ہونٹوں پر شرارتی مسکراہٹ اتری۔

''مطلب؟'' صوفی کو کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔

''بیچارہ بہت تنہا رہ لیا۔ اگلی سالگرہ پر اسے کسی بہن یا بھائی کا تحفہ دینے کا سوچو۔''

''تم بھی نا بس۔'' صوفی نے شرما کر اس کے بازو پر ناز سے ایک گھونسا مارا۔ عثمان زور سے ہنس دیا۔ صوفی کی شرمائی شرمائی سی ہنسی بھی اس کی بلند ہنسی میں شامل ہو گئی۔ اشعر نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا اور انہیں ہنستا دیکھ کر خود بھی ہنسنے لگا۔ زندگی کی تصویر اپنے رنگوں کے ساتھ مکمل تھی۔

☆☆☆

دوسرا رنگ

گمنام مسیحائی

زویا صفوان

زندگی حادثات سے پُر ہے... مگر کچھ حادثے اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ انسان خواہشِ دنیا سے منہ موڑ لیتا ہے... ایک ایسی نہج پر پہنچ جاتا ہے کہ ذہن و دل مفلوج ہو جاتے ہیں... صلاحیتیں مفقود ہو جاتی ہیں... مسلسل ڈپریشن اور اختلاجی کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے جس کے زیرِاثر وہ کچھ بھی کرگزرتا ہے۔ زخموں سے چور... غموں اور اذیتوں سے برسرِپیکار ایک ایسی ہی لڑکی کے آزار... جو اسے کبھی جگاتے تھے اور کبھی بے حس و بے حال کر دیتے تھے۔ جاگتے لمحوں میں حقیقت شناس بن کے اُداسی اور صداقت بھری سوچوں کو عملی صورت دینے والے ایک ایسے ہی جرأت مند گمنام مسیحا کی مسیحائی...

سالِ نو کے موقع پر ایک نئے آہنگ سے روشناس کراتی تحریر کے رموز

نئی اسپتال کا وہ مختصر سا کمرا سُریلے اور شرمگیں قہقہوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ یہ کمرا ماضی قریب میں اسپتال کا کاٹھ کباڑ، استعمال شدہ سرنجیں اور ڈرپ کی خالی بوتلیں وقتی طور پر رکھنے کے کام آتا تھا لیکن اب کچھ عرصے سے اسپتال کے نچلے درجے کے عملے نے اسے تفریحی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا تھا۔ شفٹ تبدیل ہونے پر نرسیں اکثر ایک آدھ گھنٹا گپ شپ کے لیے بیٹھ جایا کرتیں۔

اس دورانیہ میں اپنی نجی زندگی کے پوشیدہ معاملات، شوہر، سسرال، والدین، بہن بھائیوں سے تعلقات اور کسی نہ کسی مریض کے متعلق گفتگو کر کے تازہ دم ہونا ان کا ایک معمول بن چکا تھا۔ اس وقت بھی یہ محفل اپنے جوبن پر تھی۔ صبح کے اوقات میں کام کرنے والی نرس شہلا شادی کے بعد پہلے روز وہاں آئی تھی اور اس کے آتے ہی سب نے 'ٹریٹ' کا مطالبہ کر دیا تھا۔ شہلا نے بھی فیاضی سے کام لیتے ہوئے ان سب کے لیے پزا منگوا لیا تھا جسے اب وہاں موجود خواتین نہایت رغبت

سے کھانے میں مصروف تھیں۔

"یوں تو شادی بہت بڑا جوا ہے لیکن لگتا ہے تجھے یہ جوا راس آ گیا ہے۔" مہک نے پزا پر کیچپ لگاتے ہوئے شہلا کو مخاطب کیا۔

"ہاں! جوا اگر سوچ سمجھ کر کھیلا جائے تو کبھی ناکام نہیں ہوتا۔" شہلا نے بھرپور نزاکت سے جواب دیا۔

وہ پچیس برس کی متوسط قامت، چھریرے بدن اور گندمی رنگت کی حامل تھی۔ اس کے نقوش اور رکھ رکھاؤ میں ایک خاص قسم کی جاذبیت پائی جاتی تھی۔

"پکس تو دکھاؤ بھئی شادی کی۔" ردا نے بھی پزا کا ایک ٹکڑا کیچپ میں ڈبوتے ہوئے مطالبہ کیا۔

"اب یہ مت کہنا کہ اسٹیٹس پر لگا تو دی تھیں۔" سنبل نے حسبِ سابق دور کی کوڑی لاتے ہوئے پیش گوئی کی۔ وہ ان سب خواتین میں منفرد لگتی تھی۔ نفیس کھلا عبایہ اور چہرے کو مکمل طور پر حجاب میں لپیٹے وہ کھانے پینے کے اوقات میں بھی اپنا چہرہ بے پردہ نہیں کرتی تھی تاہم اس وقت داڑھ میں درد اور مسوڑھوں پر ہونے والی سوزش سے وہ اشیائے خورونوش میں بہت احتیاط کر رہی تھی۔

سنبل کی اس بات پر شہلا نے ایک بار پھر نزاکت سے اپنا حنائی ہاتھ پیشانی پر مارتے ہوئے قہقہہ لگایا اور متانت سے کہنے لگی۔

"ایک دو دن میں نیا فون مل جائے گا مجھے۔ پھر ساری تصویریں آرام سے دیکھ لینا۔"

"واؤ...... نیا فون۔" مہک اور ردا نے بھرپور حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا۔

سنبل نے البتہ باوقار خاموشی ہی اختیار کر رکھی تھی۔ وہ ان سب کا حصہ ہونے کے باوجود مزاجاً قدرے مختلف تھی۔

"ہاں!" شہلا نے تفاخر سے گردن اکڑائی۔

"بھئی واہ! تجھے تو شادی خوب راس آ گئی ہے۔" ردا جز بز ہوئی۔

اس کی نظروں میں حسد کی ہلکی سی لہر بھی موجزن تھی۔ اس حسد کے درونِ پردہ اصل وجہ یہ تھی کہ شہلا نے اسپتال میں داخل ہونے والے ایک قدرے ادھیڑ عمر مریض کی 'تیمارداری' میں کامیاب ہو کر ہی شادی کی تھی۔ احسن نامی وہ شخص اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد ڈپریشن کا شکار ہو کر اعصابی تناؤ کے علاج کی غرض سے اسپتال داخل ہوا تھا اور یہاں شہلا کی صورت میں ایک نیا جیون ساتھی پا کر زندگی کی رعنائیوں میں دوبارہ مگن ہو گیا تھا۔

"ہاں تو تم بھی کر لو نا بھئی!" وہ حسبِ عادت نزاکت سے گویا ہوئی اور یکدم کسی خیال کے تحت سنبل کی جانب متوجہ ہو کر شیریں انداز میں کہنے لگی۔

"تم کوئی گڈ نیوز کب دے رہی ہو بھئی؟ یہ دونوں تو چلو انگیجڈ ہیں۔ تم بھی تو کوئی ہل جل کرو نا۔"

سنبل اس شیریں لہجے میں پنہاں ہلکی سی چبھن محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کا چہرہ لمحہ بھر کے لیے متغیر ہوا تاہم وہ خود کو سنبھالتے ہوئے متوازن انداز میں کہنے لگی۔

"جس روز کوئی ایسا مل گیا جو میری ذمے داری مکمل طور پر اپنے سر لے تو میں شادی میں دیر نہیں کروں گی لیکن ایسا کوئی ملے بھی تو سہی۔"

شہلا اس جواب پر جز بز ہو کر رہ گئی۔ وہ سنبل کا مطمحِ نظر اور چوٹ فوری طور پر بھانپ گئی تھی۔

"ایسے تو تمہیں کوئی کبھی ملنے سے رہا۔" شہلا نے اس کے حلیے پر چوٹ کی۔ سنبل کو اس کی اصل شکل وصورت میں کبھی کسی نے دیکھا ہی نہیں تھا۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ اپنی نمائش کر کے شادی کروں تو کیا فرق رہ گیا مجھ میں اور......"

سنبل نے یکدم اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ اسے اپنی مبینہ مثال کی تلخی کا اندازہ ہو گیا تھا۔

شہلا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ سنبل کی اسی صاف گوئی اور دوٹوک اندازِ گفتگو کی وجہ سے اسے زیادہ پسند نہیں کرتی تھی۔

"تم نے تو پزا چکھا بھی نہیں سنبل!" مہک نے موضوعِ گفتگو تبدیل کرنا چاہا۔

"کھائے گی بھی کیسے؟ نقاب اٹھ گیا تو ہم اس کا حسین چہرہ دیکھ کر کہیں غش کھا کر بے ہوش ہی نہ ہو جائیں نا۔" شہلا نے چوٹ کی۔

سنبل نے تلملاتے ہوئے کوئی سخت جواب دینے کے لیے ہونٹ وا کیے ہی تھے کہ قاسم نامی ایک وارڈ بوائے تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔

"سسٹر! ذرا جلدی سے روم نمبر فورٹی ٹو میں آ جائیے۔" وہ عجلت میں بولا۔

"کیوں؟ وہاں کیا ہے؟" ردا نے بیزاری سے دریافت کیا۔

"ایک ایکسیڈینٹ کیس آیا ہے جی۔ جلدی چلیے۔ پیشنٹ کو بہت بلیڈنگ ہو رہی ہے۔" اس نے فوراً وضاحت کی۔

''ہم تو اس وقت آف ڈیوٹی ہیں۔'' مہک نے کہا۔

''سوری! مجھے گھر جلدی پہنچنا ہے۔'' شہلا نے حسبِ عادت فوراً ہری جھنڈی دکھائی۔

''ویسے اس وقت تمہیں سسٹر ماریہ کو ہینڈ اوور کرنا تھا۔ اگر وہ نہیں پہنچیں تو تھوڑا ویٹ کر لیتیں وہاں۔'' سنبل نے اصولی بات کی۔

''سسٹر ماریہ کبھی ٹائم پر آئی بھی ہے جو اب آجاتی۔ اس کے پاس ہر روز ہی کوئی نہ کوئی بہانہ ہوتا ہے۔ میں تو اتنی دیر ویٹ کر کے اپنا ٹائم ویسٹ نہیں کر سکتی۔'' مہک نے رکھائی سے جواب دیا اور اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

سنبل نے ردا کی جانب دیکھا۔ وہاں بھی لاتعلقی اور بے نیازی کا عالم تھا۔

''ڈاکٹر ادریس کہاں ہیں؟'' سنبل نے ان تینوں کی جانب سے سرد مہری بھانپ کر قاسم سے استفسار کیا۔

''وہ تو کل ہی لیو پر چلے گئے تھے۔'' قاسم نے بتایا۔

سنبل بے بسی سے گہری سانس بھر کے رہ گئی۔ اس سرکاری اسپتال میں احساسِ ذمے داری اور پیشہ وارانہ اخلاقیات کا شدید فقدان تھا۔

''او کے! تم چلو! میں آتی ہوں۔'' وہ فوراً اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسپتال کے عملے کی بے پروائی ایک معمول تھی لیکن سنبل تاحال خود کو اس معمول کا عادی نہیں بنا سکی تھی۔ وہ اس بے حسی پر ہمیشہ تاسف محسوس کیا کرتی تھی۔

''ایکسیڈینٹ کیس ہے تو پھر پولیس بھی لازمی انوالو ہو گی۔'' سنبل نے قاسم کی معیت میں آگے بڑھتے ہوئے یکدم کسی خیال کے تحت دریافت کیا۔

''نہیں سسٹر! وہ تو کہہ رہے ہیں کہ پیشنٹ کو چھت سے گر کر چوٹیں لگی ہیں۔ باقی آپ خود ایک بار دیکھ لیں۔'' قاسم نے بتایا۔

سنبل نے اپنی داڑھ میں اٹھتی ٹیسوں سے دھیان ہٹانے کے لیے سر جھٹکا۔ وہ اس لمحے شدید بیزاری محسوس کر رہی تھی تاہم اگلے ہی لمحے یہ بیزاری بے یقینی، تاسف اور صدمے میں ڈھل گئی۔

☆☆☆

''کیا ہوا سسٹر جی؟ رک کیوں گئی ہیں؟'' قاسم نے اس کے قدم ساکت دیکھ کر استفسار کیا۔

''یہ...... یہ...... ایکسیڈنٹ کیس لایا گیا ہے؟'' اس کی آواز سرسراہٹ سے مشابہ تھی۔

نگاہیں ہنوز کمرا نمبر بیالیس کے اس بستر پر مرکوز تھیں جہاں متورم چہرے کی حامل ایک سات سالہ لڑکی بے سُدھ پڑی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر سنبل کو اپنا وجود شل ہوتا محسوس ہوا۔ حلق میں کانٹے اُگ آئے تھے۔

''ڈاکٹر صاحب کو بلوا دیں جلدی! خدا کا واسطہ ہے۔'' ایک تیس، بتیس سالہ خاتون نے اسے دیکھتے ہی التجا کی۔

اس کے نقوش بچی سے بہت مشابہ تھے۔ آنکھوں کی وحشت، کرب اور چہرے کی متغیر رنگت نے اسے قابلِ رحم بنا رکھا تھا۔

''یہ ڈاکٹر صاحب ہیں کہاں آخر؟'' پینتیس سالہ اس مرد نے قاسم کو تندی سے مخاطب کیا۔

''صبر رکھو باؤ! آجاتے ہیں ڈاکٹر صاحب بھی۔'' قاسم نے منہ بنایا۔

''عجیب سسٹم ہے ویسے! اس پورے اسپتال میں ایک بھی ڈاکٹر نہیں ہے کیا؟'' مرد طیش میں آیا۔

''صبر نہیں ہوتا تم سے باؤ؟ پیچھے ہٹو! اور انہیں اپنا کام کرنے دو۔'' قاسم نے بھی روایتی انداز میں اسے اپنے تیور دکھائے۔ اسے غالباً یاد آگیا تھا کہ وہ بھی اس اسپتال میں 'بادشاہ' انسان ہے۔

''صبر کریں؟ کیسے صبر کریں بھئی؟ یہاں ہمارے جگر کے ٹکڑے کا یہ حال ہو گیا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ صبر کرو۔'' وہ اپنا ضبط کھو کر چلا اٹھا۔

''آپ دونوں باہر چلے جائیے پلیز! مجھے اپنا کام کرنے دیجیے۔'' سنبل نے حتی الامکان نرمی اور شائستگی سے انہیں مخاطب کیا اور قاسم کو پُرسکون رہنے کا اشارہ کر دیا۔

قاسم بادلِ ناخواستہ خاموش تو ہو گیا۔ تاہم اس کے چہرے اور آنکھوں میں ناپسندیدگی کی لہریں واضح محسوس ہو رہی تھیں۔ سنبل نے فوری طور پر آگے بڑھ کر بچی کو ابتدائی طبی امداد دینے کا آغاز کر دیا۔ وہ بظاہر بے حد پُرسکون اور منظم انداز میں اپنی پیشہ وارانہ مہارت کا مظاہرہ کر رہی تھی لیکن حقیقت تو یہی تھی کہ اس کے دل و دماغ میں ایک شدید کشمکش برپا تھی۔ اس لمحے اس کا نقاب بہترین آڑ ثابت ہو رہا تھا۔ وہاں موجود کسی بھی شخص کو اندازہ ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کس بے دردی اور وحشت سے اپنے ہونٹ کچل رہی تھی۔ اس سے یہ بات بھلا کیسے پوشیدہ رہ سکتی تھی کہ یہ ایکسیڈنٹ کیس نہیں تھا۔

بچی کے بدن کو بار بار جھٹکے لگ رہے تھے۔ نیم بے ہوشی میں اس کی زبان سے برآمد ہونے والے الفاظ سنبل کے اعصاب کے لیے کٹھن امتحان ثابت ہو رہے تھے۔ اس نے

ابتدائی طبی امداد دینے کے بعد بچی کو اعصابی سکون کا انجکشن لگا دیا۔ اس لمحے اسے بھی کسی سکون آور دوا کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ داڑھ میں درد نا قابل برداشت ہونے لگا تھا۔

''کمال کی بات ہے ویسے۔ اسپتال میں جاب کرتی ہوں۔ کہنے کو سرکاری اسپتال ہے اور دندان سازی کا شعبہ ہی یتیم پڑا ہوا ہے۔ اس درد کا یہاں کوئی علاج ہی نہیں ہے۔'' اس کے ذہن میں تلخ سوچ ابھری۔

اسپتال میں دندان سازی کا شعبہ دوپہر دو بجے تک ہی معالجہ کی سہولت فراہم کرتا تھا۔ اس کے بعد آؤٹ ڈور سے پرچی لے کر وہاں موجود جونیئر ڈاکٹر کو ہی معائنہ کروایا جا سکتا تھا۔ اسی پل سنبل کے جبڑے اور کانوں میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی اور اس کے حواس مختل کر گئی۔

''اس کا کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ خالی خولی میڈیسنز سے کام نہیں چلنے والا۔'' اس نے درد سے بے حال ہوتے ہوئے سوچا۔

سرکاری ڈاکٹر کا انتظار بھی لاحاصل تھا۔ وہ اپنی شادی کے لیے مہینہ بھر کی چھٹی پر تھا۔ بچی کو ابتدائی طبی امداد فراہم کرنے کے بعد وہ اس کے والدین کے پاس چلی آئی۔

''میری انا یہ کیسی ہے اب سسٹر؟ وہ ٹھیک ہے نا؟'' عورت نے اسے دیکھتے ہی تڑپ کر دریافت کیا۔

مرد بھی مضطرب نگاہوں سے اسی کی جانب متوجہ تھا۔

''دیکھیے محترمہ!'' سنبل نے متانت سے اپنی بات کا آغاز کیا۔ ''سب سے پہلے تو آپ مجھے یہ بتائیے کہ آپ نے یہاں آ کر جھوٹ کیوں بولا؟''

''نن......نہیں......مم......میں......نن......نے جھوٹ تو نہیں بولا۔'' نور نامی عورت نے حیرت سے کہا۔

''آپ کی بچی چھت سے یا سیڑھیوں سے گر کر بے ہوش نہیں ہوئی ہے۔ اور اگر آپ اس بات سے واقف نہیں ہیں تو میں آپ کی لاعلمی پر ماتم ہی کر سکتی ہوں۔''

سنبل کی اس بات پر نور کی رنگت فق ہو گئی۔ اسی لمحے سنبل کے جبڑے اور کانوں میں سرایت کرتی درد کی لہریں اب گردن کے عقبی حصے کو گرفت میں لے چکی تھیں۔

''وہ ہوش میں آ کر کوئی نہ کوئی ری ایکشن ضرور دے گی۔ میں نے بچی کو نیند کا انجکشن لگا دیا ہے۔ آپ کی بچی اگر سیڑھیوں سے گری بھی ہے تو اس کی وجہ کچھ اور تھی۔ میری مانیے تو اسے یہاں سے لے جائیے۔ گھر پر ہی میڈیسنز وغیرہ دیجیے۔ بچی کو اس وقت پیار اور توجہ کی ضرورت ہے۔''

''آپ کھل کر بات کیوں نہیں کر رہیں؟ ہوا کیا ہے آخر میری بیٹی کو؟'' مرد نے بھڑک کر دریافت کیا۔

''آپ کی بچی کسی سیکسوئیل ہراسمنٹ کا شکار ہوئی ہے۔ کیوں، کہاں اور کیسے؟ یہ بات تو میں نہیں جانتی میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ آپ کی بیٹی شدید اسٹریس میں ہے۔'' سنبل نے اپنا غصہ دباتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔'' نور نے بے یقینی سے سر دائیں بائیں جھٹکا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے، یہ تو میں نہیں جانتی۔ یہ مجھ سے بہتر آپ لوگ جانتے اور سمجھتے ہوں گے۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ ایسا ہو چکا ہے۔''

سنبل نے اتنا کہہ کر ایک توقف کیا اور اپنے ہونٹ کچلتے ہوئے مزید گویا ہوئی۔

''آپ کے لیے ایک مخلص نصیحت ہے۔ اس بات کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھیے گا اور بچی کے ہوش میں آتے ہی یہاں سے چلے جانا۔ مجھے ایک ضروری کام سے کہیں جانا ہے ورنہ میں باقی معاملات بھی دیکھ لیتی۔''

سنبل نے ان دونوں کے فق چہروں کی جانب دیکھا اور اپنا بیگ لینے کے لیے اندرونی سمت بڑھ گئی۔ اسے علم ہی نہ ہوا کہ اس کے وہاں سے حرکت کرتے ہی ایک اوٹ میں کھڑے کسی شخص کی آنکھوں میں ہزار ہا قمقموں کی روشنی پھوٹنے لگی تھی۔

اس نے سنبل کے اسپتال سے جانے کا انتظار کیا اور اپنا موبائل فون نکال کر ایک مخصوص نمبر ملا لیا۔

☆☆☆

شمروز علی کسلمندی سے اپنے بستر پر لیٹا تھا۔ وہ گزشتہ آٹھ گھنٹے میں اپنی بھرپور نیند پوری کر چکا تھا تاہم اس وقت سستی اور بیزاری اسے بستر سے نکلنے ہی نہیں دے رہی تھی۔ شمروز سوشل میڈیا کا معروف 'نیوز میکر' تھا جسے ہمہ وقت کسی نہ کسی بریکنگ نیوز کی ہی تلاش رہتی تھی۔ اب آج کل ملکی سیاسی حالات کے باعث کہیں کوئی دوسری خبر ہی نہ ہوتی تھی۔ عوام بھی اس سیاسی 'کساد بازاری' سے خاصے اوب چکے تھے۔ انہیں کچھ منفرد سننے اور پڑھنے کی تمنا تھی۔

انہی خیالات میں غلطاں شمروز کو فون کی گھنٹی نے چونکایا۔ یہ اس کے مخصوص نمبر کی گھنٹی تھی جو اس کے مخصوص مخبر افراد کو ہی دیا گیا تھا۔

''ہاں بولو!'' شمروز نے جمائی لیتے ہوئے بلاتمہید کہا۔

''ایک بریکنگ نیوز ہے آپ کے لیے۔'' دوسری جانب

سنائی دینے والی آواز قاسم کی تھی۔ وہ اس سے قبل بھی کئی اہم خبریں شمروز کو پہنچاتا رہا تھا۔

''ہاں؟ کیا نیوز ہے؟'' شمروز چونکا۔

اسے قاسم کی جانب سے ہمیشہ دھما کے دار خبریں ہی ملتی تھیں۔ گزشتہ بار بھی اس نے اسپتال کے نچلے عملے سے ڈاکٹرز کی جانب سے ہونے والی مبینہ زیادتیوں اور ان کی بے پروا روش کا پول کھولا تھا۔

''سیکسوئیل ہراسمنٹ کیس آیا ہے اسپتال میں۔'' وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

''وکٹم کون ہے؟'' شمروز نے ایک توقف سے دریافت کیا۔

''ایک سات، آٹھ سالہ بچی۔'' قاسم کا لہجہ سرگوشی میں ڈھل گیا۔

''تو یہ کون سی نئی بات ہے یار؟ یہ نیوز تو اب اتنی پرانی ہو چکی ہے کہ پبلک کو کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی۔'' شمروز بیزاری سے بولا۔ ''اس کیس نے بھی اپنا چارم کھو دیا ہے۔''

''لیکن اس کیس میں انٹرسٹ اور چارم دونوں ہی ملیں گے۔'' قاسم نے زور دیا۔ ''بچی کے والدین کو پتا ہی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ سو فیصد گارنٹی سے بتا رہا ہوں کہ اس کیس میں کوئی 'اپنا' انوالو ہے۔ کوئی 'سگا' یا بہت ہی قریبی 'اپنا'۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ؟ بچی کے والدین کسی کو 'سیف' کرنا چاہ رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ کچھ دیر میں بچی کو یہاں سے لے بھی جائیں۔''

قاسم اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ شمروز بھی کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

''میں نے تو اپنا کام کر دیا ہے۔ اب آگے آپ دیکھ لیجیے کہ نیوز کو کہاں کیا 'ٹریٹمنٹ' دے کر پبلک کے سامنے لاتا ہے۔'' قاسم اس کی خاموشی پر اوب گیا۔

''ٹھیک ہے! میں آتا ہوں کچھ دیر تک وہاں۔ پھر آگے کی دیکھی جائے گی۔'' شمروز نے ایک توقف کے بعد حتمی انداز میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے سر جی! لیکن میرا وہ......'' قاسم نے ذومعنی انداز میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہاں ہاں! مل جائے گا پہلے نیوز تو بننے دو۔'' شمروز بیزاری سے بولا اور فون بند کر دیا۔

اس کے ذہن میں ایک نئی ہلچل برپا ہو چکی تھی۔

☆☆☆

سنبل اپنے کمرے میں چھت پر نظریں جمائے بستر پر دراز تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو لکیروں کی صورت میں بہتے کنپٹیوں سے ہوتے گردن بھگو رہے تھے۔

''اس طرح روتے رہنے سے کیا فائدہ ہونے والا ہے؟'' اس نے آنکھیں میچتے ہوئے خود سے سوال کیا۔

''کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' ایک خود کار سوچ نے اعتراف کیا۔

''تو پھر اس طرح آنسو بہانے کا مقصد؟''

''پتا نہیں! مجھے خود بھی سمجھ نہیں آ رہی۔'' اس کے آنسوؤں میں مزید شدت آئی۔

''جو ہو گیا ہے، اسے قبول کرو۔''

''کر ہی لوں گی۔ کسی نہ کسی دن تو کر ہی لوں گی۔'' سنبل کے اندر ایک مزاحمتی سوچ ابھری اور ہاتھ خود کار انداز میں بستر کے ایک جانب تپائی پر رکھی رپورٹ کی جانب بڑھ گئے۔

یہ رپورٹ اسے گزشتہ رات ہی موصول ہوئی تھی جس کے مطابق اس کے منہ میں پیدا ہونے والے پھوڑے مخصوص کینسر کے باعث تھے۔ یہ کینسر اپنی نوعیت کے دوسرے درجے پر تھا۔

اس رپورٹ کو دیکھنے کے بعد ڈاکٹر نے علاج کے نتیجے میں افاقہ کی امید بھی ظاہر کی تھی لیکن اس کی ہمت جانے کیوں شکستہ ہو گئی تھی۔ علاج کے لیے رقم کا بندوبست کہاں سے ہونا تھا؟ اس احساسِ بے بسی کے باعث آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

''کیا فائدہ ہے اس طرح آنسو بہانے کا؟'' اس کے ذہن پر ایک بار پھر خفگی بھری سوچ نے دستک دی۔

''پتا نہیں...... کہہ تو رہی ہوں کہ پتا نہیں مجھے۔ بس یہ زندگی ایسی ہی شے ہے۔ جب اس کی ڈور ہاتھ سے نکلتی محسوس ہوتی ہے تو تڑپ اور آنسوؤں پر اپنا اختیار نہیں رہتا۔'' وہ جھنجلائی۔

''کیسی زندگی اور کون سی زندگی؟ یہ زندگی تو اسی وقت ختم ہو گئی تھی جب......'' دماغ نے اب اسے بے دردی سے مختلف مناظر دکھانے شروع کر دیے۔

سنبل کی اذیت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

''ہاں! ٹھیک ہے۔ ایسی زندگی سے واقعی موت اچھی ہے۔'' وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر بے بسی سے چلائی۔ ''لیکن یہ موت یکدم آ جاتی تو کیا بہتر نہیں تھا؟ آگہی بہت بڑی اذیت ہوتی ہے۔''

''کیا پتا یہ آگہی بھی کسی بہتری کے لیے ہو۔'' دماغ میں ایک اور سرسراہٹ ابھری۔

سنبل نے گہری سانس بھری اور اپنے آنسو صاف کر کے خود کو متوازن کرنے کی کوششوں میں ہلکان ہونے لگی۔
چند لمحوں بعد اس نے اپنا ذہنی ارتکاز تبدیل کرنے کے لیے موبائل فون اٹھا کر فیس بک کھولی اور انگلی کی جنبش سے دیس بدیس میں ہونے والی سرگرمیوں پر نظریں دوڑانے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی نگاہیں ایک تصویر اور اس پر دکھائی دینے والے مندرجات پر ساکت ہوگئیں۔
''سرکاری اسپتال میں ایک ہولناک انکشاف۔ بچی سے درندگی کا مظاہرہ کرنے والا اس کا اپنا...... حقیقت جان کر آپ کے بھی رونگٹے کھڑے ہوجائیں گے۔ کیا یہ قربِ قیامت کی نشانی ہے؟''
ان سنسنی خیز فقرات کے ساتھ انابیہ کا معصوم چہرہ دیکھ کر اس کے دل کو ایک ٹھیس لگی۔
''آہ...... وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔'' اس نے تاسف سے سوچا اور خبر مکمل پڑھنے کے لیے وہاں فراہم شدہ مخصوص لنک کھول لیا۔
''تنازعات کے شکار سٹی اسپتال میں ایک نیا ہولناک واقعہ۔ سات سالہ بچی کے ساتھ جنسی درندگی کا مظاہرہ۔ یوں تو بچوں کے ساتھ جنسی درندگی اب ایک معمول بن چکی ہے لیکن انسانی حیوانیت نے اپنی تسکین کے لیے نت نئی راہیں تلاش کر لی ہیں۔ سات سالہ انابیہ کے ساتھ ہوس پوری کرنے والا اس کا ایک ایسا سگا رشتہ ہے جس پر لامحدود اعتبار ہوتا ہے۔ کیا یہ قربِ قیامت کی نشانی ہے کہ والدین نے بچی کے مکمل علاج کے بجائے اسے اسپتال سے لے جانے کا فیصلہ کرلیا اور اس سے بڑی ستم ظریفی کیا ہوگی کہ انہیں اس بات کا مشورہ دے کر مجبور کرنے والا انسان کوئی اور نہیں بلکہ ایک 'مسیحا' تھا۔ کیا انسانیت اب ہر اعتبار سے اپنا وجود کھونے لگی ہے؟ انسانیت کی اس تنزلی کا سفر آخر کس مقام پر ختم ہوگا؟''
سنبل نے فون بستر پر پٹخ کر اپنا سر تھام لیا۔ اس میں خبر کی تفصیل مزید پڑھنے کی تاب ہی نہیں تھی۔ سوشل میڈیا پر ایسی مسالے دار خبریں بنا کر لنکس تک رسائی دینے کا 'کاروبار' ایک معمول بن چکا تھا لیکن اس کاروباری سرگرمی میں کسی بھی فردِ واحد یا ادارے کی عزت اچھالنے پر باز پرس کرنے والا بھی تو کوئی نہیں تھا۔
''یا خدا! یہ سب کیا ہوگیا؟'' اس کی آنکھوں میں آتشیں جلن ہونے لگی۔
وہ کچھ لمحوں تک اسی کشمکش میں جامد بیٹھی رہی۔ اس کے بعد کسی سوچ کے تحت بستر سے اٹھی اور اپنا عبایہ اسکارف اوڑھ کر اسپتال روانہ ہوگئی۔ اس کے ذہن میں بڑی تیزی سے ایک منصوبہ پروان چڑھنے لگا تھا۔

☆☆☆

دوپہر کی دھوپ تیزی سے ڈھل رہی تھی۔
سرمد جاوید کے گھر میں موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ انابیہ مسکن ادویات کے زیرِ اثر اپنے کمرے میں لیٹی تھی جبکہ نور صحن میں رکھی ایک کرسی کی پشت سے سر ٹکائے خلاؤں میں گھور رہی تھی۔
کچھ دیر بعد اس ساکت فضا کو دروازے کی گھنٹی کی آواز نے مرتعش کردیا۔
''اب کون آن دھمکا ہے؟'' نور ہذیانی انداز میں کہنے لگی۔
''اس کی تو......'' سرمد نے دہاڑتے ہوئے نہایت بے ہودہ الفاظ استعمال کیے اور دندناتا ہوا دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے تیور نہایت جارحانہ تھے۔
وہ گزشتہ کئی روز سے جاری اس تماشے سے حقیقتاً طیش زدہ ہوکر بے قابو ہوچکا تھا۔ سوشل میڈیا کے اس مخصوص پلیٹ فارم پر دی جانے والی اس خبر نے ان پر قیامت در قیامت ڈھائی تھی۔ فون اور دروازے پر بجنے والی گھنٹیاں، واقف کاروں کی آمد اور چبھتے سوالات نے ان کی ذہنی حالت نہایت دگرگوں کردی تھی۔
سرمد نے طیش میں غیر متوازن تنفس سے بے حال ہوتے ہوئے دروازہ کھولا اور سامنے کھڑی شخصیت کو دیکھ کر ہڑبڑاتے ہوئے بولا۔
''تم...... میرا مطلب ہے آپ؟''
''کیوں، میں نہیں آسکتی؟''
''جی ہاں! کیوں نہیں آیئے۔'' سرمد نے ایک جانب ہو کر اسے راستہ دیا اور سنبل کو اپنی معیت میں صحن تک لے آیا۔
سنبل پر نظر پڑتے ہی نور پہلے حیرانی اور پھر آبدیدہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اگلے ہی لمحے وہ اس سے بغلگیر ہوتے ہوئے دہاڑیں مار کر رونے لگی۔
''خود کو سنبھالیے پلیز! آپ اس طرح ہمت ہار جائیں گی تو بچی کو کون سنبھالے گا؟'' سنبل نے نرمی سے کہتے ہوئے اس کی پشت تھپتھپائی۔
''ختم ہوگئی ہے۔ ساری ہمت ختم ہوگئی ہے۔'' وہ بلکنے لگی۔
اسے خود بھی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ سنبل کو دیکھ کر وہ ایسا ردِعمل کیوں دے رہی ہے۔

"آپ کو ہمارا ایڈریس کیسے ملا؟" سرمد نے نور کا ذہنی ارتکاز کسی اور سمت مبذول کرنے کے لیے سنبل سے استفسار کیا۔

"اسپتال ریکارڈ میں آپ نے جو آئی ڈی کارڈ کی کاپی دی تھی اسی کو ٹریس کر کے یہاں تک پہنچی ہوں۔ سوری! اگر آپ نے مائنڈ کیا ہے تو میں چلی جاتی ہوں۔" سنبل نے دانستہ طور پر کہا۔

"ارے نہیں! میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ آپ کا آنا اچھا لگا ہمیں۔ کاش ہم نے اس وقت آپ کی بات مان لی ہوتی۔" سرمد نے مضطرب ہوکر جواب دیا۔

"اسپتال میں کیا ہوا تھا؟ کون آیا تھا وہاں؟" سنبل اصل مدعے پر آئی۔

"مجھے تو اندازہ ہی نہیں ہوا۔" سرمد نے کچھ سوچ کر جواب دیا پھر ایک توقف کے بعد کہنے لگا۔

"آپ کے جانے کے بعد نور کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ بی پی یکدم ہی لو ہو گیا تھا۔ میں اس کے لیے جوس اور بسکٹ لینے گیا تھا۔ اس دوران ہی وہ سب کچھ ہو گیا۔"

سرمد کے خاموش ہونے پر نور نے گہری سانس لی اور سنبل کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"سرمد کے جانے کے بعد ایک شخص آیا تھا۔ حلیے سے بے حد عام اور بے چارہ سا لگ رہا تھا۔ وومٹنگ اور موشن کے لیے میڈیسن لینے آیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے ایک ہلکی پھلکی ڈرپ لگا دی۔ اس دوران وہ اپنے موبائل فون سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ اپنے ڈرپ لگے ہاتھ اور اسٹینڈ پر لگی بوتل کی تصویریں لیتا رہا۔ مجھے یہی لگا کہ اپنے کسی اسٹیٹس پر لگائے گا یہ تصویریں۔ اسی دوران شاید اس نے انابیہ کی تصویر بھی اتاری جس کا ہم دونوں میں سے ہی کسی کو اندازہ نہیں ہوا۔ آگے کی اسٹوری آپ کو پتا ہی ہے۔"

نور کی اس وضاحت پر سنبل ساری صورتِ حال سمجھ گئی۔

"اب میں تم دونوں کو کیا بتاؤں؟ میں تو اس سے مزید آگے کی اسٹوری بھی جانتی ہوں۔" اس کے ذہن میں ایک سوچ ابھری۔

"انابیہ کی طبیعت کیسی ہے اب؟" سنبل نے سر جھٹکتے ہوئے استفسار کیا۔

"بہت خراب۔" سرمد بے ساختہ بولا۔

"اس کے اسٹریس میں کمی ہی نہیں ہو رہی۔" نور نے بھی مضطرب ہو کر اپنی انگلیاں چٹخائیں۔

"کمی ہو بھی تو کیسے؟ کوئی نہ کوئی زخموں پر نمک چھڑکنے چلا آتا ہے۔" سرمد نے تلخی سے بتایا۔

"اسی بات کا ڈر تھا مجھے۔" سنبل نے ترس کھاتے ہوئے ان کی جانب دیکھا اور ایک توقف سے کہنے لگی۔

"آپ لوگ یہاں سے کہیں اور موو کیوں نہیں کر جاتے؟"

"کیسے کر لیں؟ جاب فی الحال چھوڑی نہیں جا سکتی۔ رشتے داروں کے معاملے میں ہم دونوں ہی کنگال ہیں۔ اگر کوئی ہوتا بھی تو کسی کے پاس جا کر رہ سکتے تھے بھلا؟" سرمد بھی تلخ ہوا۔

سنبل نے نقاب کی آڑ میں اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ اس کے ذہن میں چند مانوس مناظر جھلک دکھانے لگے تھے۔

"کیا انابیہ نے کچھ بتایا ہے آپ کو؟" سنبل نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

"نہیں! وہ تو مزید سہمی ہوئی دکھائی دینے لگی ہے۔ ذرا سی آہٹ پر بدک جاتی ہے جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔" نور آبدیدہ ہو گئی۔

اسی لمحے اندرونی جانب سے انابیہ کی گھٹی گھٹی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"مجھے لگتا ہے اس کی طبیعت پھر خراب ہو رہی ہے۔" سرمد نے ہراساں ہوکر دروازے کی سمت دیکھا۔

"آپ دونوں بیٹھیے! میں جا کر دیکھتی ہوں اسے۔" سنبل نے نرمی سے کہا۔

"آر یو شیور؟" نور نے آس بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"یس شیور! لیکن پلیز! آپ میں سے کوئی بھی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔" وہ ہنچی ہوئی۔

نور اور سرمد نے تفہیمی انداز میں سر ہلا دیا۔ ان کی ذہنی حالت اس قدر دگرگوں تھی کہ سنبل کو چائے پانی کا پوچھنا بھی یاد نہیں رہا تھا۔ سنبل متوازن قدموں سے چلتی کمرے کی جانب بڑھ گئی جہاں انابیہ ایک بستر پر لیٹی ہراساں سے انداز میں چھت کی جانب دیکھ رہی تھی۔ سنبل کا دل دکھ سے بوجھل ہو گیا۔ اس کے وجود میں اپنائیت کی ایک بھرپور لہر اٹھی تھی۔

"کیسی ہو گڑیا؟" اس نے محبت سے دریافت کیا۔

انابیہ کا بدن مرتعش ہونے لگا۔ نظروں میں یکدم ہی بے چینی اور ہراس جھلکا تھا۔ سنبل کے لیے اس کی یہ کیفیات سمجھنی مشکل نہیں تھیں۔

"اوہ...... اوکے! آپ کو یہ لفظ بالکل پسند نہیں ہے۔ یہ

لفظ ہرٹ کرتا ہے۔ ہے نا؟" وہ نرمی سے بولی۔
انابیہ کے اعصاب یکدم پُرسکون ہو گئے۔ وہ اب ممنون نگاہوں سے سنبل کو دیکھنے لگی تھی۔
"کس کلاس میں پڑھتی ہو آپ؟"
"ون میں۔" انابیہ دھیرے سے بولی۔
"آئی ایم شیور بہت برائٹ اسٹوڈنٹ ہوں گی آپ۔ ایسی ذہین آنکھیں تو کسی خاص الخاص بچے کی ہی ہو سکتی ہیں۔" سنبل نے ستائشی انداز میں کہا۔
انابیہ کی آنکھوں میں نمی در آئی۔
"ارے انابیہ ڈیئر! آپ رو کیوں رہی ہیں؟ آپ تو بہت بہادر ہیں اور بہادر بچے اس طرح تھوڑی روتے ہیں۔" سنبل اب اس کے پاس آ بیٹھی تھی۔
انابیہ کی آنکھیں مزید شدت سے برسنے لگیں۔ سنبل نے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما اور اپنے بائیں ہاتھ سے رخسار پونچھنے لگی۔
"میں جانتی ہوں بیٹا! جو کچھ بھی ہوا، اس میں آپ کا تو کوئی قصور ہی نہیں تھا۔ آپ تو بہت گڈ گرل ہو۔ آپ نے کچھ بھی غلط نہیں کیا۔"
سنبل نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس بار نگاہوں میں مزید احسان مندی اور تشکر واضح تھا۔
"ہماری انابیہ تو ایک اینجل ہے۔ پیور اینجل۔ اور اینجل کسی کے ساتھ کچھ غلط نہیں کرتے۔ غلط تو ڈیولز ہوتے ہیں۔ ہے نا؟" سنبل نے اسے پچکارا۔
انابیہ نے اس کے دونوں ہاتھ گرفت میں لیے اور بے ساختگی سے اس کے سینے میں سمٹ گئی۔ اس کا وجود ہچکیوں کی زد میں آیا ہوا تھا۔ سنبل دھیرے دھیرے اس کے بال سہلانے لگی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ابھی تک نور اور سرمد میں سے کبھی کسی نے اسے اس طرح 'ٹریٹ' نہیں کیا تھا اور اس میں بھی ان کا قصور کہاں تھا؟ انہیں حالات و واقعات کی دلدل نے ہی بہت ہولناک انداز میں جکڑ لیا تھا۔
"جسٹ ایزی مائی بے بی! جسٹ ایزی۔" سنبل نے اس کی پشت تھپتھپائی۔
"پانی...... پانی پلیز۔" انابیہ کی آواز سخت بھینچی ہوئی تھی۔
سنبل نے فوراً ایک جانب رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور اپنے ہاتھوں سے اسے پلانے لگی۔ اس کی یہ توجہ اور محبت انابیہ کے منتشر اعصاب کو سکون دینے لگی۔
"یس آئی نو! آپ نے کچھ بھی نہیں کیا۔ وہ انکل ہی بیڈ تھے۔ ہے نا؟" سنبل نے ایک بار پھر پچکارا۔
انابیہ نے فوری طور پر اثبات میں سر ہلا دیا۔
"آپ کو ماما پاپا یا ٹیچر نے کبھی گڈ ٹچ یا بیڈ ٹچ کے بارے میں نہیں بتایا تھا؟" سنبل نے اپنی گفتگو آگے بڑھائی۔
"بتایا تھا ایک بار۔" انابیہ الجھ گئی۔
"پھر آپ نے ماما پاپا کو کچھ کیوں نہیں بتایا؟"
کیونکہ ماما خود وہاں لے کر گئی تھیں۔ وہ ان کو اپنا 'بھائی' کہتی تھیں۔" انابیہ نے سادگی سے بتایا۔
سنبل ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو گئی۔ پھر ایک توقف سے کہنے لگی۔ "آپ کو کبھی بیڈ ٹچ فیل ہوا تھا؟"
"یس...... ہوا تھا۔" اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔
"ماما پاپا کو کیوں نہیں بتایا؟" سنبل نے اس کا رخسار پیار سے سہلایا۔
انابیہ نے بے بسی سے نظریں جھکا لیں۔
"ڈیول انکل نے منع کیا تھا؟ انہوں نے کوئی دھمکی دی ہوگی آپ کو؟ ہے نا؟" سنبل نے اگلا قیاس کیا۔
انابیہ کی آنکھوں میں یکدم ہراس سمٹ آیا۔
"اچھا! ایک بات بتاؤ؟" سنبل نے گہری سانس لی۔ "آپ کے اسپتال سے آنے کے بعد ڈیول انکل آپ سے ملنے آئے تھے کیا؟"
"یس...... آئے تھے۔" انابیہ نے آنکھیں میچ لیں۔
"کیا آپ نے اس وقت بھی ماما یا پاپا کو کچھ نہیں بتایا؟"
"نو! جب انہوں نے اپنی گردن پر اس طرح انگلی پھیری تو میں اور بھی ڈر گئی۔" اس نے اپنی گردن پر بائیں سے دائیں رخ پر انگشتِ شہادت پھیری۔
سنبل تاسف زدگی سے اسے دیکھنے لگی۔
"یا اللہ! اس معصوم کو کیا خبر کہ اب اس کے ساتھ کیا ہونا ہے۔"
اس کے ذہن میں شدید کشمکش برپا ہو چکی تھی۔ اپنے ارادے پر عمل کرنا دشوار محسوس ہو رہا تھا تاہم ابھی ہمت مجتمع کر کے چند اہم سوالات مزید کرنے تھے۔ انابیہ بھی سعادت مندی سے اس کے ہر سوال کا جواب دیتی گئی۔ اس کے انکشافات نے سنبل کا دل دہلا دیا۔
"یا اللہ! اب کسی بھی رشتے کا اعتبار نہیں ہے کیا؟ ایسا بھی ہو سکتا ہے کیا کسی کے ساتھ؟ پہلے تو کبھی ایسا دیکھا نہ سنا۔ اس نفس نے اپنی بے راہ روی کی تسکین کے لیے کہاں کہاں سے راہیں تلاش کی ہوئی ہیں؟" اس کے دل و دماغ میں ایک بار پھر کشمکش برپا ہو چکی تھی۔

انابیہ کے انکشافات کا سلسلہ تھا تو سنبل ایک دوراہے پر آکھڑی ہوئی۔ اگلے چند لمحے بے حد کٹھن تھے تاہم اب ہمت مجتمع کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔

"انابیہ! مائی بے بی! اگر میں آپ سے کوئی درخواست کروں تو آپ مانیں گی نا؟" سنبل نے آس و محبت سے اسے دیکھا۔

"یس! بالکل مانوں گی۔" انابیہ نے بھی محبت سے ہی اس کی جانب دیکھا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اگر آپ ایک انجکشن لگوا لو تو بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ آئی پرامس! اس کے بعد آپ کو کوئی میڈیسن بھی نہیں کھانی پڑے گی۔" سنبل نے اس کے بالوں میں نرمی سے انگلیاں پھیریں۔

انابیہ قدرے متذبذب دکھائی دینے لگی۔

"کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟" اس نے معصومیت سے استفسار کیا۔

"یس! یہی سمجھ لو۔ کیا آپ کو ڈاکٹرز سے ڈر لگتا ہے؟" سنبل نے اس سے دانستہ طور پر دریافت کیا۔ وہ اس کا اعتماد مکمل طور پر حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔

"نو! میں تو بڑی ہو کر ڈاکٹر ہی بننا چاہتی ہوں۔" انابیہ نے افسردگی سے جواب دیا۔

"ویلس گڈ! آپ انشاء اللہ بہت اچھی اور بہت قابل ڈاکٹر بنو گی۔ آئی ایم شیور۔" سنبل نے ایک بار پھر اس کے بال سہلائے اور اپنے بیگ سے مخصوص انجکشن نکال کر اس کی سوئی پر لگایا گیا ڈھکن اتار لیا۔

انابیہ نے فطری تشویش سے انجکشن کی جانب دیکھا اور پھر ایک نظر سنبل کے مسکراتے چہرے پر ڈالنے کے بعد پُراعتماد پُرسکون دکھائی دینے کی کوشش کرنے لگی۔ سنبل نے نرمی سے اس کا بازو تھاما اور بڑی مہارت سے بازو میں سوئی گھونپ دی۔ انابیہ کے منہ سے ہلکی سی سسکاری برآمد ہوئی تاہم دوسرے ہی لمحے وہ پُرسکون ہو گئی۔

"اب آپ آرام کرو! اب آپ کو کبھی کوئی درد یا تکلیف نہیں ہو گی۔" سنبل نے اس کی پیشانی پر ایک بوسہ ثبت کیا۔

"آنٹی! آپ ماما پاپا کو تو کچھ نہیں بتائیں گی نا؟ اگر ڈیول انکل کو پتا لگ گیا تو وہ انہیں......" انابیہ کی نظروں سے وحشت و ہراس جھلکنے لگے۔

"نہیں بتاؤں گی...... گاڈ پرامس!" سنبل نے اسے یقین دہانی کروائی۔

اس کے اعتماد اور پُرخلوص انداز نے انابیہ کو ایک بار پھر پُرسکون کر دیا اور وہ ایک توقف کے بعد کہنے لگی۔

"آنٹی! ایک انجکشن ماما پاپا کو بھی لگا دیں۔ وہ دونوں میری وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ انہیں نیند بھی نہیں آتی ہے۔" انابیہ نے افسردگی سے فرمائش کی۔

"ڈونٹ وری مائی چائلڈ! میں ان کے لیے میڈیسن لے کر آئی ہوں۔ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔" سنبل نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے ہونٹ کچلے۔

"تھینک یو آنٹی! آپ بہت اینجل ہیں۔" انابیہ نے محبت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

اس کے انداز اور طرزِ تخاطب نے سنبل کی آنکھیں نم کر دیں۔ اس کے دل میں تاسف کی گرفت ناقابلِ برداشت ہونے لگی تھی۔ انابیہ کو بستر پر لٹا کر کمبل اوڑھانے کے بعد وہ دروازہ بند کر کے باہر چلی آئی جہاں سرمد فون پر کسی سے تلخ کلامی میں الجھا ہوا تھا۔

☆☆☆

"انابیہ ٹھیک ہے نا اب؟" نور نے سنبل کو دیکھتے ہی بے تابی سے دریافت کیا۔

"جی ہاں! بالکل ٹھیک ہے۔" سنبل نے بشاشت اختیار کی۔

"جہنم میں جاؤ سب! میں تنگ آ گیا ہوں ہر ایک کو صفائی دیتے دیتے۔ اگر کسی کو یقین کرنا ہے تو کرے ورنہ جہنم میں جائے۔" سرمد کی آواز میں طیش در آیا تھا۔

سنبل کی حسیات چوکنا ہو گئیں۔ نور سے اس کی یہ کیفیت پوشیدہ نہ رہ سکی۔

"ان کے کسی فرینڈ کا فون ہے۔ اسی نیوز کے متعلق بات کر رہا تھا۔ ہم تو سب کو یہی یقین دلا رہے ہیں کہ وہ سب، پھر فیک تھا۔" اس نے وضاحت کی۔

"لیکن یقین کوئی بھی نہیں کرے گا۔ فون بھی کریں گے۔ یقین کوئی ایک بھی نہیں کرے گا۔" سنبل نے تلخی سے سر جھٹکا۔

"جی ہاں! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" نور کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

سرمد بھی اس اثنا میں فون بند کر کے وہیں چلا آیا تھا۔

"بلڈی ایڈیٹس! مدد کے بہانے تماشا دیکھنا چاہتے ہیں سب کے سب۔ پاگل سمجھ رکھا ہے مجھے۔" وہ ان دونوں کی موجودگی نظرانداز کیے اپنی ہی لے میں کہتا چلا گیا۔

"کیسی مدد کرنا چاہتا ہے اب یہ؟" نور کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"کہہ رہا تھا اس ویب سائٹ کے خلاف رپورٹ کرو سائبر کرائم میں۔ وہ یہ نیوز ہٹوادیں گے۔"
"کہہ تو ٹھیک ہی رہا ہے۔" سنبل نے بے ساختہ کہا۔
"ہاں لیکن اس کے لیے پھر سے وہی سوال جواب اور وہی قصہ۔" سرمد نے اپنے بال مٹھی میں جکڑے۔ "میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ نور! مجھے ایک کپ اسٹرانگ سی چائے پلا دو۔ میرا سر درد سے پھٹ رہا ہے۔" وہ بے بسی کی انتہا پر تھا۔
"میں ابھی بنا کر لاتی ہوں سب کے لیے چائے۔" نور نے فوراً جواب دیا۔ "سوری! مجھے پہلے ہی آپ کے لیے بنا لینی چاہیے تھی۔" اس نے سنبل کی جانب معذرت خواہانہ نظروں سے دیکھا۔
"اِٹس اوکے! ان حالات میں ایسی فارمیلٹی کس کو سوجھتی ہے؟" سنبل نے خلوص سے جواب دیا اور دانستہ طور پر ایک توقف کے بعد سرمد سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔
"اگر آپ کو مناسب لگے تو میرے پاس سر درد اور اعصابی سکون کی میڈیسن موجود ہے۔ آپ کو اس سے بہت بہتری محسوس ہو گی۔"
"یس پلیز!" سرمد نے مشکور نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔
"مجھے بھی دیجیے گا پلیز!" نور نے بھی ملتجی انداز میں کہا۔
"یس شیور! آپ چائے لے آیئے۔" سنبل نے اثبات میں سر ہلایا۔
اسے اپنا مقصد اس قدر آسانی سے حاصل ہو جانے کی بالکل بھی توقع نہیں تھی۔ نور عجلت میں باورچی خانے کی جانب بڑھی اور کچھ ہی دیر میں چائے کے تین کپ ٹرے میں رکھ لائی۔ سنبل نے اپنے بیگ سے 'اعصابی سکون' کی گولیوں کا مخصوص پتا نکال لیا۔ ان گولیوں میں نیند کی مقدار کسی بھی عام گولی سے کئی گنا زیادہ تھی۔
"مجھے دو دیجیے گا پلیز!" سرمد نے التجا کی۔
"زیادہ ہائی پوٹینسی کی نہیں ہیں۔ اگر آپ جلدی ٹھیک ہونا چاہتے ہیں تو تین بھی لے سکتے ہیں۔ اس کا کوئی سائڈ ایفیکٹ نہیں ہے۔" سنبل نے پیشہ وارانہ انداز میں انہیں 'گمراہ' کیا۔
"یس شیور! وائے ناٹ۔" سرمد بے چین ہوا۔
سنبل نے بارہ گولیوں کے اس پتے میں سے فی کس تین تین گولیاں ان کی ہتھیلیوں پر رکھ دیں۔ دونوں نے ہی وہ گولیاں نہایت بے تابی سے نگلی تھیں۔ سنبل تاسف زدہ نظروں سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ چائے کے اختتام تک سنبل نے دانستہ طور پر انہیں باتوں میں الجھائے رکھا تھا۔ اس کی توقعات اور علم کے عین مطابق کچھ ہی دیر میں ان دونوں پر ناقابلِ مزاحمت غنودگی طاری ہونی شروع ہوئی اور وہ اپنی کرسیوں پر ہی بے سدھ ہو گئے۔
سنبل کے لیے اب وقت کا ضیاع بالکل مناسب نہیں تھا۔ وہ بلا تامل اٹھی اور اپنا چائے کا کپ سنک میں دھو کر مخصوص جگہ پر رکھنے کے بعد گھر میں ہر ممکنہ مقام سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر کے مخصوص گولیوں کا وہ پتا سرمد کے کپ کے پاس ہی رکھ دیا۔
اس سرگرمی سے فراغت کے بعد سنبل نے تنقیدی نگاہوں سے سارے منظر کا جائزہ لیا اور مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے نہایت احتیاط سے دروازہ نیم وا چھوڑ کر گھر سے نکل آئی۔ اسے اپنے منصوبے کی کامیابی کا ایک سو ایک فیصد یقین تھا۔ مرکزی سڑک پر آنے کے بعد واپسی کے لیے کوئی رکشا تلاش کرتے ہوئے اس کے ذہن میں سنسناہٹ در آنے لگی تھی۔

☆☆☆

اس رات بستر پر لیٹنے کے بعد نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے دل و دماغ میں رہ رہ کر انابیہ اور اس کے والدین کا تصور گردش کر رہا تھا۔ ان کے ساتھ گزرے آخری لمحات کی ہر ایک جنبش مکمل جزئیات کے ساتھ ذہن میں نقش ہو چکی تھی۔
بے چین کروٹیں بدلتے اس کے دل میں کئی بار کوئی خواب آور گولی استعمال کرنے کی خواہش بیدار ہوئی تاہم اس نے قوتِ ارادی سے کام لیتے ہوئے ہر بار ہی اس خواہش کو کچل دیا۔ اس کشمکش اور تناؤ میں بالآخر کسی لمحے نیند مہربان ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی خواب نگری میں ایک مکمل جہان آباد ہو گیا۔
خواب میں دکھائی دینے والا وہ منظر بہت مانوس تھا۔ سنبل کے سامنے انابیہ نہایت مضمحل اور شکستہ انداز میں اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ اس کی نگاہیں چھت پر مرکوز تھیں۔ سنبل کی آہٹ پاتے ہی وہ مزید شکستہ دکھائی دینے لگی۔ اسے اپنی تنہائی میں کسی کی آمد گوارا نہیں تھی۔
"کون ہو تم؟" اس نے بیزاری سے دریافت کیا۔
"مسیحا...... میں مسیحا ہوں۔" سنبل نے بھی سپاٹ انداز میں جواب دیا۔
"کیوں آئی ہو یہاں؟" انابیہ مزید بیزار ہوئی۔
"تمہیں نجات دینے۔" وہ اب اس کے پاس چلی آئی تھی۔

اگلے ہی لمحے سنبل نے انابیہ کی گردن نرمی سے اپنی گرفت میں لے لی۔

''یہ کیا کر رہی ہو تم؟'' انابیہ نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

''تمہیں نجات دے رہی ہوں۔'' سنبل نے سرگوشی کی۔

''مجھے نہیں چاہیے نجات۔ پیچھے ہٹو۔'' انابیہ نے اس کی گرفت میں ہلکی سی سختی در آتے دیکھ کر ردعمل دیا۔

''نجات نہیں تو پھر کیا چاہیے؟'' اس نے اپنی انگلیوں میں اینٹھن محسوس کی۔

''مجھے زندگی چاہیے۔'' فوری جواب آیا۔

''زندگی......؟'' وہ حیران ہوئی۔ ''کیا تمہیں اب بھی زندگی کی بھوک ہے؟ اب بھی؟''

''ہاں! زندگی کی بھوک بھلا کب ختم ہوتی ہے؟'' انابیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''تم بھی تو آج تک جی ہی رہی ہو۔ تمہیں بھی تو یہی بھوک زندہ رکھے ہوئے ہے۔''

''تمہیں کیسے پتا؟'' سنبل درشت ہوئی۔ ''تمہیں کیسے پتا ہے وہ سب؟''

''مجھے سب کچھ پتا ہے۔ سب کچھ۔'' وہ محظوظ ہوتے ہوئے ہنسی۔

سنبل کی انگلیوں میں اینٹھن ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ اس نے اپنی گرفت مضبوط تر کردی۔ انابیہ کا بدن مچلنے لگا۔ سنبل کی نگاہیں اس کے بجائے سامنے دیوار پر مرکوز ہو چکی تھیں۔ اس کے وجود کی تمام تر وحشت دائیں ہاتھ کی انگلیوں اور ہتھیلی میں سمٹ آئی تھی۔ دھیرے دھیرے انابیہ کی مزاحمت مدھم پڑنے لگی۔ کچھ لمحوں بعد اس کا بدن ساکت اور آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں۔

سنبل چند ثانیوں تک خالی نظروں سے اس کی جانب دیکھتی رہی۔ اس کے بعد منظر تبدیل ہوگیا۔ اب سنبل کسی بستر میں آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی تھی۔ اسے اپنے پاس ایک آہٹ نے چونکا دیا۔ اگلے ہی لمحے اسے دو لڑکیوں کی دید نے الجھا دیا۔

''یہ دونوں ایک ساتھ کیسے؟'' اس کے ذہن میں سوچ اُبھری۔

وہ دونوں معنی خیزی سے مسکراتی اسی کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک انابیہ تھی۔ دوسری لڑکی بھی بے حد مانوس تھی۔ سنبل کو اس کی دید سخت مضطرب کر رہی تھی۔

''تم لوگ یہاں کیسے؟'' اس نے بے چینی سے دریافت کیا۔

''میں تو تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔'' انابیہ کہنے لگی۔ ''تم نے واقعی میرے لیے بہتر فیصلہ کیا۔''

''اور میں تمہیں ایک مشورہ دینے آئی ہوں۔'' دوسری لڑکی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اس بہتری کے اور بھی بہت سے لوگ حق دار ہیں۔''

''صرف بہتری ہی نہیں۔ کچھ لوگ سزا کے بھی حق دار ہیں۔ یاد کرو ذرا۔'' انابیہ نے لقمہ دیا۔

سنبل نے سحر زدہ ہو کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم صرف نجات مت دو۔'' انابیہ نے سرگوشی کی۔ ''سزا دو۔ یہ سزا دے کر ہی تم مسیحا بنو گی۔''

اگلے ہی لمحے سنبل کا تعلق خواب نگری سے منقطع ہوگیا۔ بیداری کے بعد اس کی سماعت میں یہ سرگوشی کتنی ہی دیر گونجتی رہی۔ اس نے اپنے ذہن میں چند اہداف متعین کر کے مختلف جزئیات طے کرنے کا آغاز کر دیا۔

☆☆☆

سنبل ایک بار پھر اپنے مخصوص حلیے میں سرمد کے گھر کے باہر موجود تھی جہاں حسبِ توقع عوام کا ایک جمِ غفیر موجود تھا۔ سنبل بے نیازی اور اعتماد سے رستہ بناتی آگے بڑھ گئی۔ گلی میں جنازوں کی تین چارپائیاں ہر ایک کے لیے دیدہ عبرت تھیں۔ سنبل اردگرد موجود افراد کے چہروں اور آنکھوں میں ترحم و سراسیمگی دیکھ کر اپنے طیش کو بمشکل قابو کر پا رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے بہن یہاں؟'' اس کے دائیں جانب کھڑی ایک فربہ اندام خاتون نے وہاں پہلے سے موجود دوسری خاتون سے دریافت کیا۔ وہ کسی کام سے گلی میں داخل ہو کر تین جنازے دیکھ کر رک گئی تھی۔

''قیامت ٹوٹی ہے بہن۔ قیامت ہی ٹوٹی ہے۔'' دوسری خاتون نے ڈرامائی انداز میں بتایا اور ایک توقف سے کہنے لگی۔

''ان کی بچی کے ساتھ زیادتی شیادتی ہوئی تھی۔ وہ اس زیادتی کے بعد زندہ نہیں بچی۔ ماں باپ یہ دکھ برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے بھی خودکشی کرلی۔ بس پورا خاندان ہی ختم ہو گیا۔''

خاتون کی اس بات پر سنبل کو کافی اطمینان بھی محسوس ہوا۔ اس کا تیار کردہ ڈراما مکمل طور پر کامیاب ہوگیا تھا۔

''حق ہاہ...... اولاد کا دکھ اللہ پاک کسی کو بھی نہ دکھائے۔ انسان کسی جوگا نہیں رہتا۔'' پہلی خاتون نے حقیقی تاسف سے کہا۔

سنبل اب خاموشی سے ہر ایک منظر اور گفتگو کا جائزہ

لے رہی تھی۔ اس کی نگاہیں دو مخصوص افراد کو تلاش رہی تھیں۔
کچھ ہی دیر میں تینوں جنازے یکے بعد دیگرے اپنی آخری منزل تک پہنچا دیے گئے۔
سنبل نہایت صبر و سکون سے وقت گزار رہی تھی۔ جنازے اٹھائے جانے کے بعد جم غفیر میں خاصی کمی ہوگئی۔ اگلے نصف گھنٹے میں صرف قریبی افراد ہی وہاں رہ گئے تھے۔ سنبل نہایت اعتماد سے وہاں بیٹھی رہی۔ اس کی نگاہیں ہنوز دو مخصوص افراد کی متلاشی تھیں اور پھر قسمت اس پر اچانک ہی اس طرح مہربان ہوئی کہ تلاش ازخود ہی سامنے چلی آئی۔
''ایکسکیوزمی! آپ کو پہچانا نہیں...... کون ہیں آپ؟''
سنبل نے چونک کر آواز کے ماخذ کی جانب دیکھا جہاں ایک تیس، بتیس سالہ خاتون سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب متوجہ تھی۔ اس کی گندمی رنگت پُرکشش تھی تاہم اب چہرے پر چھائیوں کے نشانات اس دلکشی کو ماند کررہے تھے۔ اس کے شانوں تک تراشیدہ مختصر بال بے ترتیبی سے ایک کیچر میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ انابیہ کی بتائی گئی نشانیوں پر پورا اترتی تھی۔
''ہاں! میں بھی کافی دیر سے یہی نوٹس کررہا ہوں۔ پہلے تو انہیں کبھی دیکھا نہ ہی ایسے کسی رشتے دار کے بارے میں سرمد سے سنا تھا۔''
ایک اور آواز نے سنبل کی تلاش بالکل مکمل کردی۔ سنبل پہلی ہی نظر میں پہچان گئی تھی کہ بھورے رنگ کی شلوار قمیص والا وہ چونتیس، پینتیس سالہ شخص انابیہ کا 'ڈیول انکل' تھا۔ سنبل اپنی تلاش کے یوں یکدم ختم ہوجانے اور قسمت کی اس یاوری پر حیرت سے سنسنا کررہ گئی۔
''میں ان کی رشتے دار ہوں بھی نہیں۔ میری تو ان سے کچھ دیر کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس ملاقات میں اپنائیت کا رشتہ بن گیا۔ بس اسی رشتے کے ناتے یہاں آئی تھی لیکن یہاں آکر علم ہوا کہ......'' سنبل نے گہری سانس بھری۔
اس کی آنکھوں میں نمی چھلک اٹھی تھی۔ اس کے متین و شائستہ لب ولہجہ اور باوقار انداز نے ان دونوں کو ہی بہت متاثر کیا۔
''کہاں ہوئی تھی آپ کی ملاقات؟'' ڈیول انکل نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔
''سٹی اسپتال میں۔ وہ اپنی بچی کو ٹریٹمنٹ کے لیے لائے تھے تو میں نے ہی اٹینڈ کیا تھا اسے۔'' سنبل نے بھی بھرپور اعتماد سے جواب دیا۔
سٹی اسپتال کا نام سنتے ہی وہ شخص بے طرح چونک گیا۔
''اوہ...... تو کیا وہ نیوز؟'' خاتون نے اضطراب سے پوچھا۔
''فیک تھی۔ ٹوٹل فیک۔'' سنبل نے سر جھٹکا۔ ''بچی سیڑھیوں سے گر کر زخمی ہوئی تھی۔ اسے میں نے ہی توٹریٹ کیا تھا۔ ایسا کوئی بھی 'سین' نہیں تھا۔''
''اوہ...... تو کیا وہ سب مس انڈر اسٹینڈنگ تھی؟'' ڈیول انکل کو اپنے اعصاب پُرسکون ہوتے محسوس ہوئے۔
''یس! ہنڈرڈ پرسنٹ۔ لیکن ان سب کا اب کیا فائدہ ہے؟'' سنبل نے تاسف سے کہا۔
اسی اثنا میں ایک اور ادھیڑ عمر خاتون ان کے پاس چلی آئی۔
''اقرا! گھر کا اب کیا کرنا ہے؟'' اس نے آتے ہی دریافت کیا۔
''کرنا کیا ہے خالہ جی؟ مالک مکان کو انفارم کرتو دیا ہے۔ لاک کردیں گے خود ہی۔'' اقرا نے بے نیازی سے جواب دیا۔
''تو سامان کہاں جائے گا پھر؟'' خاتون کو تشویش ہوئی۔ ''نور کے ماں باپ، بہن بھائی یا رشتے دار کوئی تو ہوگا ہی؟''
''نہیں خالہ جی! دونوں ہی اکیلے تھے۔ پسند کی شادی کی ہوئی تھی۔ بڑی لمبی اسٹوری ہے۔ چھوڑیں بس۔ اب جانے والے چلے گئے۔ سامان کا کیا کرنا ہے؟ دیکھی جائے گی۔'' اقرا کی بے نیازی برقرار تھی۔
''ارے! میں تو اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ اگر سیل کرنا ہوا تو مجھے بتادینا۔'' خاتون نے عجلت میں کہا۔
سنبل اس بے حسی پر حقیقتاً کڑھ کررہ گئی۔ اس گھر سے ابھی تین جنازے اٹھائے گئے تھے اور اہل علاقہ کی بے ضمیری کا یہ عالم تھا کہ وہ گھر کی تقسیم کے متعلق سوچنے اور الجھنے لگے تھے۔
سنبل نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور اقرا کی جانب متوجہ ہوکر کہنے لگی۔
''مجھے اجازت دیجیے! ایک پیشنٹ کی تھراپی کے لیے جانا ہے۔''
''تھراپی...... آہاں...... انٹرسٹنگ۔ کس چیز کی تھراپی دیتی ہیں آپ؟'' ڈیول انکل نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔
سنبل کو بھی ایسے ہی ردعمل کی توقع تھی۔ وہ اعتماد و بے نیازی سے کہنے لگی۔

''فزیو بھی اور مینٹل بھی۔ یہ میری پارٹ ٹائم جاب سمجھ لیجیے۔ اسپتال میں تو بس نرس ہی ہوں میں۔'' سنبل نے ازخود ہی اس کے مزید متوقع سوالات کی تشفی کر دی۔

''میکال! کہیں آپ کے ذہن میں بھی تو وہی نہیں چل رہا جو اس وقت میں سوچ رہی ہوں۔'' اقرا نے قدرے جوش سے شوہر کی جانب دیکھا۔

''ہاں! ایسا ہی سمجھ لو۔'' میکال نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور سنبل سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''آپ اپنی تھراپی سروسز کے لیے ایک اور پیشنٹ مینیج کر سکتی ہیں کیا؟''

میکال کے اس مطالبے پر سنبل کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ قسمت اس کے لیے بھرپور یاوری کرتے ہوئے ہر موقع گویا پلیٹ میں رکھے پیش کر رہی تھی۔

''ویل! مشکل ہے کچھ۔ میرا شیڈول پہلے ہی بہت ٹف ہے۔'' اس نے دانستہ طور پر تجاہل عارفانہ برتا۔

''پلیز! انکار مت کیجیے۔ ہم تو کتنے ہی عرصہ سے ماں جی کے لیے کوئی تھراپسٹ ڈھونڈ رہے تھے۔'' اقرا نے اصرار کیا۔

سنبل لمحہ بھر کے لیے تذبذب کا شکار ہو گئی۔ ہر ایک قدم بالکل درست سمت کی جانب اٹھتے دیکھ کر وہ ایک فطری گھبراہٹ میں بھی مبتلا ہونے لگی تھی۔

''کیا کنڈیشن ہے پیشنٹ کی بائی دا وے؟'' اس نے ایک توقف کے بعد دریافت کیا۔

''میری مدر ان لاء ہیں۔ ان کی رائٹ سائڈ پیرالائزڈ ہے ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ایکسرسائز لازمی کروائی جائے لیکن ہم دونوں کے ہی پاس اتنا ٹائم نہیں ہوتا۔'' اقرا نے بتایا۔

''اگر آپ ایک گھنٹا نکال لیا کریں تو مہربانی ہو گی۔'' میکال نے بھی اصرار کیا۔

سنبل تھوڑی سی ردوکد کے بعد متفق ہو گئی۔

''او کے! کل شام پانچ بجے تک آنے کی کوشش کروں گی میں۔''

''اپنا موبائل نمبر دے دیجیے۔ میں کل آپ کو ریمائنڈ کروا دوں گی۔'' اقرا نے اسے مزید گھیرا۔

سنبل نے لمحاتی تذبذب کے بعد اسے نمبر محفوظ کروایا اور الوداعی کلمات کے بعد رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

اقرا اور میکال کے گھر میں سنبل کی آمد و رفت کو ایک ہفتہ بیت چکا تھا۔ وہ اسپتال سے اپنی شفٹ ختم ہونے کے بعد وہاں پہنچ جاتی تھی۔ اقرا اس دوران زیریں منزل پر اپنے کام میں مشغول ہوتی۔ سنبل کو اپنے فرائض بالائی منزل پر جا کر نبھانے ہوتے تھے۔ اس گھر کی تعمیر کچھ اس طرح تھی کہ میکال اور اقرا کے علاوہ اس کی بیمار ساس کا بیڈ روم بھی بالائی منزل پر ہی تھا۔ باورچی خانہ اور ایک ڈرائنگ روم زیریں منزل پر تھا۔

سنبل نے مکمل خاموشی، سنجیدگی اور دیانت داری سے اپنے فرائض نبھانے کا آغاز کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ قسمت ازخود ہی کوئی نہ کوئی بہترین موقع فراہم کر دے گی۔ اس خاموشی کے دوران اسے گھریلو حالات اور افراد خانہ کے باہمی تعلقات کا بھی اندازہ ہونے لگا تھا۔

اقرا اور میکال کے مزاج دو مخالف قطبین کی طرح تھے۔ ان دونوں میں ہی مخصوص انا اور نرگسیت پائی جاتی تھی۔ اپنی ذات کے اسیر ہونے کی بدولت انہیں اپنی ہر بات اور عادت بالکل درست معلوم ہوا کرتی۔ اس پر مستزاد اقرا ملازمت پیشہ ہونے کے باعث شوہر سے دبنے کے لیے بالکل تیار نہ ہوتی۔ اس صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے سنبل اب شدت سے کسی نہ کسی موقع کی منتظر تھی اور یہ موقع فرزانہ نے اسے ازخود فراہم کر دیا۔

اس روز وہ معمول کے مطابق اس کے کمرے میں ایکسرسائز کروانے آئی تو فرزانہ کی طبیعت قدرے نڈھال محسوس ہو رہی تھی۔

''کیا بات ہے آنٹی جی؟ آج آپ اتنی اپ سیٹ کیوں لگ رہی ہیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' سنبل نے بے حد اپنائیت سے دریافت کیا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ اس کا یہ مخصوص لب و لہجہ اور شیریں انداز مقابل کو چاروں شانے چت کر دیا کرتا ہے۔

''ہاں! بس ٹھیک ہی ہوں۔'' وہ پژمردگی سے بولیں۔

''ٹھیک نہیں ہیں اسی لیے تو پوچھ رہی ہوں۔ کیا ہوا ہے؟ مجھے بھی نہیں بتائیں گی؟'' سنبل نے مزید شیرینی سے استفسار کیا۔

''ہونا کیا ہے میری بچی؟ یہاں تو روز کا یہی کام ہے۔ مجھے برداشت کی عادت ہو جانی چاہیے اب تک لیکن نہیں ہو پا رہی۔ کسی نہ کسی مقام پر آ کر میری ہمت ختم ہو جاتی ہے۔'' وہ آزردگی سے کہنے لگیں۔

''تو اس میں ٹینشن والی کیا بات ہے؟ انسان تو انسان ہی ہوتا ہے۔ روبوٹ تو نہیں ہوتا نا۔ درد اور تکلیف انسان ہی محسوس کرتے ہیں اور عادت کی بات بھی کیا کریں؟ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ انسان کی ہمت اور برداشت بھی پانی کے کسی برتن کی طرح ہوتی ہے۔ اس میں پانی انڈیلتے رہو گے تو وہ ایک حد تک

ہی اس پانی کو اپنے اندر سموئے گا۔ پھر ایک پوائنٹ ایسا آئے گا جب وہ برتن چھلک جائے گا۔ یہ چھلکنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ برتن ایک بار پھر پانی کو اپنے اندر سمونے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔"

سنبل کی اس مثال اور اپنائیت وخلوص بھرے انداز نے فرزانہ کو آبدیدہ کردیا۔

"جیتی رہ میری بچی! بہت نیک ماں باپ کی اولاد ہو یقیناً۔ بہت اچھے خاندان اور سکھی حالات میں پرورش ہوئی ہے تمہاری۔" فرزانہ نے اپنا واحد متحرک ہاتھ اس کے سر پر پھیرا۔

سنبل کے چہرے پر پل بھر کے لیے کرب کی ایک لہر اٹھی۔ آنکھوں میں چند کرچیاں سی چبھتی آتشیں جلن پیدا کرنے لگی تھیں تاہم یہ کیفیت لمحاتی ہی ثابت ہوئی۔ اس نے حسبِ عادت وحسبِ سابق خود کو بہت تیزی سے سنبھالا تھا۔

"یہ تو آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے آنٹی جی! آپ خود اتنی اچھی اور محبت کرنے والی ہیں اس لیے آپ کو ہر کوئی اچھا ہی لگتا ہے۔" سنبل نے نہایت محبت سے فرزانہ کا ہاتھ تھاما اور نرمی و مہارت سے مخصوص ورزشیں کروانے لگی۔

فرزانہ کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ ابھری۔

"کبھی میری بہو سے پوچھ کر دیکھو۔ ہزاروں برائیاں نظر آئیں گی اسے۔ ہٹلر...... کم ظرف...... اور اب ایک بوجھ۔"

"اوہ...... کیا...... نہیں...... میرا مطلب ہے وہ ایسا کیسے سوچ سکتی ہیں بھلا؟" سنبل نے حیرت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اس نے گفتگو کے دوران ورزش کا بالکل کوئی تعطل نہیں آنے دیا تھا۔

"کبھی پوچھ کے دیکھ لینا اس سے۔" فرزانہ نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔ "ان سے بھی بڑھ کر 'تعریفیں' کریں گی وہ میری۔"

"بہت دکھ ہوا مجھے یہ سن کر۔ میں تو انہیں بہت سمجھ دار سمجھتی تھی۔ وہ خوش قسمت ہیں کہ انہیں آپ جیسی خاتون کا ساتھ ملا ہوا ہے۔" سنبل نے تاسف سے سر ہلایا۔

"اس سے پوچھ کر دیکھنا۔ وہ کہے گی کہ اس سے بڑھ کر بدقسمت ہی کوئی نہیں کہ اسے ایک بوجھ اٹھانا پڑ رہا ہے۔" فرزانہ خاصی بھری بیٹھی تھیں۔

"بوجھ کیسا؟ ماں باپ بوجھ تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ ماں باپ کی خدمت کا موقع تو خوش نصیبوں کو ملتا ہے۔" فرزانہ کو اپنے سوختہ دل پر سکون اور ٹھنڈک بھری پھوار پڑتی محسوس ہونے لگی۔ بیٹے اور بہو کی مصروف ترین زندگی، ان کی بے حسی کی حد تک بے نیازی اور گھریلو ماحول میں ہم آہنگی کے فقدان نے انہیں بے حد چڑچڑا بنا رکھا تھا۔

"افسوس ہوا مجھے یہ سب جان کر۔" سنبل نے گہری سانس بھری۔

"افسوس تو مجھے ہوتا ہے کہ اسے کمانے کی اجازت کیوں دے دی؟ جب سے پیسے ہاتھ آنے لگے ہیں شوہر اور ساس کا رتبہ ہی بھول گئی ہے۔ بس دماغ ہر وقت ساتویں آسمان پر ہی رہتا ہے۔" فرزانہ نے دانت پیسے۔

"ایسا کیوں سوچ رہی ہیں آپ بھلا؟ کمانے کی اجازت کسی مجبوری کی وجہ سے ہی دی ہوگی نا آپ لوگوں نے۔" سنبل نے دانستہ طور پر کہا۔

اس بات پر فرزانہ سوچ میں پڑ گئیں اور ایک توقف کے بعد کہنے لگیں۔

"ہاں! ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ مجبوری میں ہی دی تھی۔ ان دنوں میکال کی جاب چھوٹ گئی تھی۔ اس لیے اس کی ضد ماننی پڑی۔ بعد میں میکال نے کئی بار اسے کام چھوڑ دینے کا کہا ہے لیکن وہ سنتی ہی نہیں۔ اب تو تنگ آکر میکال نے بھی کہنا چھوڑ دیا ہے۔"

فرزانہ کی اس بات پر سنبل کا حلق کڑوا ہونے لگا۔

"اب کیوں کہے گا وہ؟ اب تو وہ......" اس کے ذہن میں تلخ سوچ ابھری۔

سنبل نے سر جھٹکتے ہوئے خود کو پرسکون کیا اور فرزانہ سے تشفی بھری باتیں کرنے لگی۔ فرزانہ بھی اب کچھ پرسکون دکھائی دینے لگی تھیں۔ انہیں سنبل کے روپ میں ایک بہترین 'سامع' میسر آگیا تھا۔ اس نے سنبل سے اپنے مرحوم شوہر، بہترین شادی شدہ زندگی، بچوں کی تعلیم وتربیت اور شادی کے مراحل سے تاحال چھوٹی چھوٹی باتیں چھیڑ دیں۔ اس روز ورزش کے اختتام تک سنبل اسے اپنے اعتماد کی گرفت میں مکمل طور پر جکڑ چکی تھی اور اب اسے اپنی اس 'محنت' کے نتائج کا انتظار تھا۔

☆☆☆

"ایکسکیوزمی مس سنبل! میں آپ سے دو منٹ بات کر سکتا ہوں پلیز؟" فرزانہ کے کمرے سے نکلتے ہی سنبل کی سماعت میں ایک آواز پڑی۔

سنبل نے بے نیازی سے آواز کے ماخذ کی جانب دیکھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہاں میکال پرشوق نگاہوں سے اس کی جانب متوجہ تھا۔

"جی کہیے؟" سنبل نے اسی بے نیازی سے دریافت کیا جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔

"وہ...... میں...... ایکچوئیلی...... امی کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔" میکال اس کے پُراعتماد انداز پر گڑبڑا گیا۔ اس نے ایسی بے نیازی، متانت اور پُراعتماد انداز کم ہی خواتین میں دیکھا تھا۔

"آنٹی جی کے بارے میں کیا بات کرنی ہے؟ کہیں انہیں میری سروسز سے کسی قسم کا کوئی ایشو تو نہیں؟" سنبل نے دانستہ طور پر الجھ کر استفسار کیا۔ وہ اس موقع اور میکال کی جانب سے پیش قدمی کی شدت سے منتظر تھی اور اس لمحے کسی بھی قسم کی غلطی کر کے اپنا کھیل نہیں بگاڑنا چاہتی تھی۔

"ارے نہیں! بالکل بھی نہیں۔ میں اسی بارے میں تو ذرا بات کرنا چاہ رہا تھا۔" میکال نے پُرشوق نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ نقاب کی اوٹ سے اس کے چہرے اور وجود کا ہر ایک نقش کھوج نکالنا چاہتا تھا۔

سنبل سے اس کی یہ کیفیات پوشیدہ رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس نے لمحاتی تذبذب کا مظاہرہ کیا اور ہچکچاتے ہوئے کہنے لگی۔

"آئی ایم رئیلی سوری! ابھی تو میں کچھ جلدی میں ہوں۔ میری ڈینٹسٹ کے ساتھ ضروری اپائنٹمنٹ ہے۔ میں ایسا کروں گی کہ فری ہوتے ہی آپ سے فون پر کانٹیکٹ کر لوں گی۔ پھر ڈیٹیل سے ڈسکس کر لیجیے گا۔"

سنبل کی اس پیشکش پر میکال کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"آل رائٹ! یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔ آپ پلیز میرا نمبر نوٹ کر لیجیے۔" اس نے باچھیں پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔

سنبل کے ہونٹوں پر در آنے والی مسکراہٹ اس کی آنکھوں سے بھی منعکس ہونے لگی تھی۔ میکال اس 'دلکش' پر ریشہ خطمی ہونے لگا۔ سنبل نے اپنے موبائل میں اس کا نمبر محفوظ کیا اور الوداعی کلمات کے بعد رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

اقرا اپنی خواب گاہ میں بستر پر دراز ہینڈز فری لگائے موبائل پر کوئی ڈراما سیریل دیکھنے میں مگن تھی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے تھکاوٹ عیاں تھی۔ میکال بھی اس کے قریب ہی موجود اپنے موبائل فون کے ساتھ مصروف تھا۔

"اس کی آواز آہستہ نہیں کر سکتے تو ہینڈز فری ہی لگا لو۔ کانوں کے پردے پھاڑ رہی ہے تمہارے موبائل کی آواز۔" کچھ لمحوں بعد اس نے جھنجلا کر میکال کی جانب دیکھا اور بیزاری سے کہنے لگی۔

"آواز تو آہستہ نہیں ہو سکتی۔ تم اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لو۔" میکال نے بھی اسی بیزاری سے جواب دیا۔

اقرا کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔ اس کا ذہنی ارتکاز اب ڈراما کی جانب سے مکمل طور پر ہٹ چکا تھا۔ دل و دماغ میں شدید کشمکش برپا ہو چکی تھی۔ میکال اور اقرا کی شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ شادی کے تیسرے سال حاشر کی صورت میں اولاد کے تحفے نے زندگی مکمل کر دی لیکن اس بظاہر مکمل اور بھرپور زندگی میں بھی کہیں نہ کہیں ایک خلش پنہاں تھی۔

میکال کی ملازمت ختم ہونے کے بعد اقرا نے معاشی تگ و دو میں بھرپور تعاون کیا تھا اور تاحال اس کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے باوجود میکال کے رویے کی سرد مہری اور روکھائی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس سے دور ہونے لگا تھا اور اقرا اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اس دوری کی 'وجہ' تلاشنے میں ناکام تھی۔ اس پر مستزاد فرزانہ کی طبیعت اور چڑچڑاپن بھی اسے کوفت و طیش میں مبتلا کرتا تھا۔

ان تناؤ زدہ شب و روز میں وہ خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگی تھی۔ اس سے قبل حالِ دل کہہ ڈالنے کے لیے نور کی صورت میں ایک بہترین سامع اور پرخلوص دوست موجود تھی لیکن اس کی ناگہانی موت نے اقرا کے لیے حالات سے مقابلہ مزید مشکل بنا دیا تھا۔ اقرا نے کتنی ہی بار میکال سے براہِ راست بات کرنے کا ارادہ بھی کیا لیکن اس کا روکھا پھیکا، تمسخر اڑاتا انداز ہر دفعہ اسے قدم پیچھے ہٹانے پر مجبور کر دیتا۔ اس لمحے بھی اس نے ہینڈز فری کانوں سے نکال کر میکال سے گفتگو کے لیے پر تولے ہی تھے کہ کمرے میں گھنٹی کی مخصوص آواز نے اعصاب میں ارتعاش پیدا کر دیا۔

میکال بھی یہ آواز سن کر چوکنا ہو کر یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ گھنٹی درحقیقت فرزانہ کے کمرے سے بجائی گئی تھی اور اس کا مطلب واضح طور پر یہی تھا کہ انہیں کمرے میں کسی نہ کسی کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ اس نے اپنی بیزاری پر قابو پاتے ہوئے ہینڈز فری ایک بار پھر کانوں میں اڑس لیں۔ میکال نے ایک نگاہ اس کی جانب ڈالی اور جبڑے بھینچتا ہوا فرزانہ کے کمرے کی جانب چل دیا جہاں فرزانہ بے بسی اور کرب کے تاثرات چہرے پر سجائے بستر پر بیٹھی تھیں۔

"کیا بات ہے امی جی؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟" میکال نے نرمی سے دریافت کیا۔

"واش روم گئی تھی میں۔ صابن ختم ہو گیا ہے۔ ویسے ہی ہاتھ دھوئے بغیر باہر آنا پڑا ہے۔" فرزانہ کی آنکھوں میں نمی در آئی۔

میکال اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے کمرے میں موجود واحد الماری کی جانب بڑھا اور اوپری خانے سے ایک صابن نکال کر ٹوائلٹ میں مخصوص مقام پر رکھ آیا۔ فرزانہ نے شکوہ کناں نگاہوں سے بیٹے کی جانب دیکھا اور خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میکال اس نظر کا مفہوم اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ گہری سانس بھرتے ہوئے اپنے بوجھل اعصاب کو پرسکون اور متوازن کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس لمحہ اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ اقرا کو جھنجوڑتے ہوئے اس کی ذمے داریوں کا احساس دلائے لیکن اگلے ہی پل میکال کی فطری کمزوری اور بزدلی آڑے آ گئی۔

میکال ان 'عقل مند' افراد میں سے تھا جس نے منگنی اور شادی کے درمیانی عرصے میں اقرا سے استوار ہونے والے مواصلاتی رابطے میں اپنے والدین، خاندان اور ذاتی زندگی کے سبھی نشیب و فراز سے آگاہ کر دیا تھا۔ شادی سے دو روز قبل اس کے مرحوم والد نے اپنے کمرے میں بلا کر رشتوں کی نزاکت سے آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"دیکھ میکال پتر! یہ عورت ذات اپنے وجود میں ایک بہت بڑی پہیلی ہوتی ہے۔ اس کی فطرت کے رنگ بہت عجیب ہوتے ہیں۔ اسے اس کی 'حدود' بتانی اور جتانی پڑتی ہیں ورنہ یہ بہت تباہی مچاتی ہے۔ اپنی عورت کو کبھی ماضی کے رازوں اور خاندان کی کمزوریوں سے آگاہ مت کرنا ورنہ یہ کسی نہ کسی موڑ پر تجھے طعنے دینے سے نہیں چوکے گی۔ اپنی اور خاندان کی عزت کروانے کا یہی ایک اصول ہے کہ انہیں اپنی عورت کے سامنے کبھی بے عزت نہ کیا جائے۔"

میکال شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔ وہ تو دیانت داری کے زعم میں اقرا کو ہر چھوٹے بڑے راز سے آگاہ کر چکا تھا۔

"ضروری تو نہیں بڑوں کی باتیں ہر بار ہی صحیح ثابت ہوں۔ پہلے وقت اور تھے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ ہزبینڈ وائف میں انڈر اسٹینڈنگ، سچائی اور ایمانداری ہونا بہت ضروری ہے۔ میں نے جو کیا ہے، بالکل ٹھیک کیا ہے۔"

میکال نے خود کو تسلی دے کر اس وقت تو بہلا لیا تاہم آنے والے وقت نے یہ بات ثابت کر دی کہ بڑوں کے یہ نصائح ان کی عمر بھر کے مشاہدات اور تجربات کا ہی نچوڑ ہوتے ہیں اور ان سے روگردانی کر کے نسلِ نو اپنی زندگی میں تباہی خود ہی مقسوم ٹھہرا لیتی ہے۔ میکال کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اقرا کو خود ہی پیش کر دیے تھے۔ اقرا میں ایک عجیب خودسری پیدا ہو چکی تھی۔ وہ اس کی جانب سے کسی بھی روک ٹوک کو خاطر میں نہ لاتی۔ کسی بھی تلخ کلامی کی صورت میں اس کے خاندان بھر کے عیب مکمل جزئیات کے ساتھ دہرا دیتی۔

میکال کی بے روزگاری کے دنوں میں اقرا نے معاشی تنگ و دو میں اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا لیکن اس کے بعد اس کے مزاج میں ایک عجیب آمرانہ پن در آیا تھا۔ وہ اس تگ و دو کے عوض میکال اور فرزانہ کی جانب سے دائمی احسان مندی کی خواہش مند تھی۔ اس کی مخصوص سوچ اور طرزِ فکر اس بات کی متقاضی تھی کہ اسے گھر کے دیگر کاموں میں اس کی مرضی کی حد تک رعایات دی جائیں۔ اس کی ہر ایک بات بلاچون و چرا تسلیم کی جائے اور خاندان بھر میں اس کے خلوص و تعاون کا ڈھنڈورا پیٹ کر اس کی تعریفوں کے پُل باندھے جائیں۔ اس کا وجود اپنی زندگیوں اور خاندان کے لیے ایک نعمت عظیم قرار دیا جائے۔

اپنی ان خواہشات کے خمار میں اقرا چند بنیادی نکات بھول گئی تھی کہ مرد کی فطرت قطعی متضاد ہوتی ہے۔ وہ عورت کی جانب سے احسان جتاتے رہنے کے بجائے احسان مندی کی توقع رکھتا ہے۔ وہ عورت کو کبھی بھی اپنی ذات سے برتر برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی ذاتی انا اور خودداری اس چیز کو کبھی تسلیم نہیں کرتی کہ اس کا وجود عورت کے احسانات تلے زیر بار رہے۔ اقرا کی جانب سے ان خواہشات اور تمناؤں کے ردعمل میں میکال کے رویے میں سرد مہری، بے پروائی اور رکھائی در آنے لگی تھی۔ اس پر مستزاد اقرا پر ہمہ وقت تھکاوٹ، پژمردگی اور بوجھل پن طاری رہنے لگا تھا۔ دن بھر متفرق کاموں میں الجھے رہنے کے بعد جب میکال کو بیوی کے روپ میں ایک محبوبہ کی دلربائی اور ناز و انداز اٹھوانے کی ضرورت ہوتی تھی تو اس وقت اقرا اعصابی طور پر منتشر اور ذہنی طور پر تھکاوٹ کے باعث اس سے بے حد دور ہوتی۔

اقرا کی یہ پژمردگی اور بیزاری میکال کو جذباتی، ذہنی اور نفسیاتی طور پر اس سے بہت دور کر چکی تھی۔ اس نے اپنے جذبات کی تسکین کے لیے نت نئی راہیں تلاش کرنی شروع کر دیں۔ گو اخلاقی بے راہ روی کے لیے یہ کوئی بھی قابل عذر جواز نہیں تھا لیکن وہ اپنے نفس اور جذبات کے تلاطم سے بے بس ہو چکا تھا اور اس بے بسی میں کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار تھا۔ اپنے اسی جذباتی تلاطم سے مجبور ہو کر ہی وہ سنبل کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ اس پر مستزاد سنبل کا لیا دیا محتاط رویہ، بے نیاز انداز اور ہمہ وقت حجاب کی اوٹ میں رہنے کے عناصر اسے سنبل کی ذات پرت در پرت کھوجنے کی تحریک دے رہے تھے۔

اپنے انہی خیالات میں الجھے میکال کو فرزانہ کی جانب سے نلکا بند کرنے کی آواز سنائی دی تو وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس میں ماں کی آنکھوں میں موجزن شکوے شکایات، بیزاری دیکھنے اور پھر ان کی تشفی کرنے کی بالکل تاب نہیں تھی۔ اس لمحہ میکال کو اپنے وجود میں شدید گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے جیب تھپتھپاتے ہوئے سگریٹ کی موجودگی یقینی بنائی اور لمبے ڈگ بڑھتا چھت کی جانب بڑھ گیا۔

آخری زینے پر قدم رکھتے ہی اسے فون کی گھنٹی سنائی دی۔ اسکرین پر کوئی انجان نمبر دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لیے متذبذب ہوا تاہم اگلے ہی پل ایک خیال کے تحت اس کے رگ و پے میں سنسنی سرایت کر گئی۔

''کہیں یہ سنبل تو نہیں؟'' اس کے ذہن میں ایک مضطرب سوچ نے دستک دی اور سنسناتی پوروں نے فوراً سبز بٹن دبا دیا۔

''السلام علیکم جی! میں نے ڈسٹرب تو نہیں کر دیا آپ کو؟'' اس کے فون اٹھا کر ہیلو کہتے ہی دوسری جانب سنبل کی شائستہ، نرم اور شیریں آواز سنائی دی۔

''ارے نہیں! بالکل بھی نہیں۔ میں تو انتظار ہی کر رہا تھا آپ کے فون کا۔'' اس نے فوراً بے تابی سے جواب دیا۔

''اوہ...... آئی ایم سوری...... میری وجہ سے آپ کو انتظار کی زحمت کرنی پڑی۔ میں بس وہ ذرا ڈیمنشٹ کے پاس چلی گئی تھی۔'' سنبل نے اپنے مخصوص انداز میں تاکتے ہوئے ایک اور وار کیا۔

''اوہو...... دیکھا نا...... میں بھی کتنا ایڈیٹ ہوں۔ آپ نے مجھے یہ سب بتایا بھی تھا پھر بھی میں آپ سے یہ پوچھنا بھول گیا کہ اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' میکال نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔ اس کے دل و دماغ میں ایک عجیب ہیجان برپا ہو چکا تھا۔

''ایسے تو مت کہیں نا اپنے بارے میں۔ اب انسان تو انسان ہے کبھی کوئی بات مائنڈ سے اسکپ ہو ہی جاتی ہے۔ خیر آپ بتائیں؟ آنٹی جی کی طبیعت کیسی ہے اب؟'' سنبل نے بڑی اپنائیت سے گھر کتے ہوئے دریافت کیا۔ اس کا ہر ایک وار بالکل نشانہ پر بیٹھ رہا تھا۔

''امی تو الحمدللہ بالکل ٹھیک ہیں۔ میں نے ان فیکٹ آپ کو اسپیشل تھینکس کہنا تھا۔'' میکال نے فوراً بات بنائی۔ ''آپ امی کا بہت خیال رکھتی ہیں۔''

''تو اس میں کیا کمال ہے؟ یہ تو میرا پروفیشن ہے۔'' سنبل مسکرائی۔

''پروفیشن کو بھی ہر کوئی اس طرح تھوڑی نبھاتا ہے۔ میں نے آپ سے پہلے بھی ایک دو فزیوتھراپسٹ ہائر کیے تھے لیکن انہوں نے بہت مایوس کیا۔ آپ انہیں بالکل آؤٹ آف وے ٹریٹ کر رہی ہیں۔ امی آپ سے بہت اٹیچڈ ہو گئی ہیں۔''

''وہ بھی بہت محبت کرنے والی خاتون ہیں۔ میں خود بھی ان سے بہت اٹیچڈ ہو گئی ہوں۔'' سنبل کے لہجے میں جذبوں کی مدھم لو بہت مسحور کن تھی۔ ''بس یہی کہنا تھا کیا؟''

''ہاں...... نہیں...... ہاں...... وہ...... تھینکس......''

میکال سے اس لمحے کوئی اور بات بن کے نہ دی۔

''اٹس او کے! بس ان کا خیال رکھا کریں۔ انہیں اس عمر

ٹکٹ

باگڑ سنگھ ریل گاڑی میں سفر کر رہا تھا، ٹکٹ چیکر آیا۔ سردار جی نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو پتا چلا کہ جیب کٹ چکی تھی۔ ٹکٹ بٹوے میں تھا۔ بٹوا غائب، باگڑ سنگھ نے ''بھاؤں بھاؤں'' کر کے رونا شروع کر دیا۔ ٹکٹ چیکر کو اس پر ترس آ گیا...... کہنے لگا۔

''سردار جی...... تسی مینوں شریف آدمی لگدے او...... تُسی ضرور ٹکٹ خریدیا ہووے گا۔ میں تہانوں کج نہیں کہندا، تسی رونا بند کر دیو!''

باگڑ سنگھ کہنے لگا۔ ''ایہہ گل نہیں باؤ جی!''

چیکر نے پوچھا۔ ''تے فیر کیہہ گل اے؟''

باگڑ سنگھ روتے روتے بولا۔ ''ٹکٹ توں بغیر مینوں پتا کس طراں لگے گا کہ میں کتھے اترناویں!''

ساہیوال سے ساجد اقبال کا واویلا

منکر نکیر

سردار آپریشن کرانے اسپتال میں داخل ہوا، آپریشن کے بعد ہوش آیا تو سفید کپڑے پہنے دو آدمی اس پر جھکے ہوئے تھے۔

سردار نے اشتیاق سے پوچھا۔ ''کیوں ڈاکٹر صاحب...... میرا آپریشن ٹھیک ہو گیا اے ناں!''

ان میں سے ایک سفید پوش بولا۔ ''کاہدا آپریشن...... اسیں منکر نکیراں...... اٹھ حساب دے۔''

پشاور سے سردار سوڈی سنگھ کا امتحان

میں اپنوں کے ساتھ اور خلوص کی ضرورت ہے۔ یہی ان کی اصل تھراپی ہے۔"

سنبل کی اس بات پر میکال لمحہ بھر کے لیے بالکل خاموش ہوگیا۔ سنبل کو اس کی خاموشی اور تذبذب کھلنے لگا۔

"کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہے؟ یا کچھ ایسا جو آپ کو بُرا لگا ہو؟" سنبل نے بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

"نہیں! آپ نے تو کچھ بھی غلط نہیں کہا۔" اس نے گہری سانس بھری۔

"تو پھر اس خاموشی کا میں کیا مطلب سمجھوں؟" سنبل نے اکسایا۔

"شرمندگی سمجھ لیجیے یا حسرت۔" وہ ہونٹ کچلنے لگا۔

"شرمندگی اور حسرت..... ہمم...... کچھ الگ سا کمبی نیشن نہیں ہے۔" سنبل نے اس بار مسکراتے ہوئے استفسار کیا تھا۔ وہ اپنا ہر ایک داؤ مکمل احتیاط اور اعتماد سے کھیل رہی تھی۔

"نہیں! بالکل جینوئن کمبی نیشن ہے۔ شرمندگی اس لیے کہ ہمیں ان باتوں کا خود سے احساس کیوں نہیں ہوا اور حسرت اس لیے کہ کاش اتنی ذمے داری کا مظاہرہ اس شخص کی جانب سے ہوتا جسے اس کی اصل میں فکر ہونی چاہیے تھی۔" میکال کے انداز میں نہ چاہتے ہوئے بھی تلخی در آئی۔

سنبل اس کا یہ اشارہ سمجھ گئی تھی تاہم تجاہلِ عارفانہ برتتے ہوئے بولی۔

"مجھے آپ کی بات سمجھ نہیں آئی۔ خیر چھوڑیے! مجھے اب اجازت دیجیے۔"

"کوئی مصروفیت ہے کیا آپ کو؟" میکال نے فوراً استفسار کیا۔ وہ ابھی یہ فون کال جاری رکھنا چاہتا تھا۔ وہ سنبل سے گفتگو کر کے حقیقی معنوں میں لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"نہیں مصروف تو نہیں ہوں۔ اور مصروف ہونا بھی کہاں ہے؟" سنبل نے آزردگی سے جواب دیا۔

"کیوں؟ آپ کی فیملی آپ کو ٹائم نہیں دیتی کیا؟" میکال حیران ہوا۔

"نہیں! میں یہاں اکیلی رہتی ہوں۔ میری کوئی فیملی نہیں ہے۔" سنبل کے انداز میں ایک چبھن و شکستگی جھلکی۔

"وہ کہاں رہتے ہیں؟ آئی مین آپ کسی ہاسٹل میں رہتی ہوں گی پھر شاید....." میکال نے فطری تجسس کے تحت اگلا سوال کیا۔

"آپ نے شاید میری بات غور سے نہیں سنی۔ میں نے کہا میری کوئی فیملی نہیں ہے۔ میں اکیلی ہوں..... بالکل اکیلی۔" سنبل نے چیختے ہوئے ہر ایک لفظ پر زور دیا۔

میکال اس کے انداز پر ششدر رہ گیا۔ اسے سنبل جیسی تحمل مزاج کی حامل لڑکی سے ایسی شکستگی کی توقع نہیں تھی۔ وہ فوراً مناسب اور شیریں الفاظ میں معذرت کرنے لگا۔

"اٹس اوکے! میں جانتی ہوں کہ آپ کے سوال بالکل نیچرل ہیں۔ تنہا انسان کے متعلق ایسی ہی سوچ مائنڈ میں آسکتی ہے۔" اس نے دانستہ طور پر گہری سانس بھری۔ "خیر! آپ تو بہت لکی ہیں کہ ایک مکمل فیملی کے مالک ہیں۔ زندگی میں اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے ہوتا ہے؟"

"چاہیے ہوتا ہے مس سنبل! بہت کچھ چاہیے ہوتا ہے۔" میکال کے لہجے میں چبھن جھلکنے لگی۔

"اور اس بہت کچھ میں کیا شامل ہے؟" سنبل نے محظوظ ہو کر دریافت کیا۔ وہ گفتگو کو اسی موڑ پر لانا چاہ رہی تھی۔

"سکون، توجہ، پیار، احترام، تابعداری، رشتوں کی عزت۔" میکال ایک ہی سانس میں کہتا چلا گیا۔

سنبل اب باوقار خاموشی اور اپنائیت بھرے تاسف سے اقرا کے متعلق اس کی شکایات سننے لگی۔ اس کی یہ توجہ اور اپنائیت میکال کے حواس مزید سلب کر رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سب کچھ فراموش کر کے سنبل کے قدموں میں لوٹنے لگے۔

"آئی ایم سوری میکال! آپ ایسی لائف اور وائف بالکل ڈیزرو نہیں کرتے تھے۔ خیر! اب رات کافی ہوگئی ہے۔ زیادہ دیر فون پر رہیں گے تو اقرا کو پھر ایشو ہوگا۔ گڈ نائٹ! اپنا خیال رکھیے گا۔"

سنبل کی اس لگاوٹ اور شیرینی نے میکال کو ایک عجیب سرور و خمار میں مبتلا کر دیا۔ اس کے رگ و پے میں سنسنی و سرشاری کی لہریں سرایت کرنے لگی تھیں۔

☆☆☆

رات اپنے پہلے پہر میں تھی۔ سنبل بستر پر نیم دراز کسی گہری سوچ میں مگن تھی۔ میکال سے ہونے والی گفتگو ذہن کے دریچوں پر دستک دیتی اسے متفرق کیفیات میں مبتلا کر رہی تھی۔ اس نے میکال کو اپنی تشنہ لبی کا بھرپور تاثر دیا تھا جس کا نتیجہ بالکل خاطر خواہ برآمد ہوا تھا۔

اگلے چند لمحوں تک وہ اپنے اگلے منصوبے کے بارے میں سوچتی مکمل جزئیات طے کرتی رہی۔ کچھ اثناء بعد اس نے موبائل فون تھاما اور انٹرنیٹ پر اپنے منصوبے کے لیے تفصیلی مواد تلاش کرنے لگی۔ اس کی پیشانی پر بل گہرے ہوگئے تھے۔ اگلے نصف گھنٹے تک اپنی مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کے بعد اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے موبائل فون ایک

جانب رکھا اور خود کلامی کرتے ہوئے بولی۔
''بس اگلے دو تین روز میں یہ کام نمٹ جانا چاہیے۔ اس سے زیادہ دیر مناسب نہیں ہوگی۔''
''پھر اس کے بعد ایک اور قرض بھی تو چکانا ہے۔'' ذہن میں سرسراہٹ ابھری۔
''ہاں! یہ کام بھی کرنا ہے اور بہر صورت کرنا ہے۔'' اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے اعتراف کیا اور اب اس نئے پہلو پر دماغ سوزی کرنے لگی۔

☆☆☆

رات اپنے دوسرے پہر میں تھی۔
میکال بستر پر دراز کسی گہری سوچ میں مگن تھا۔ سنبل سے ہونے والی گفتگو اور اس کی تشنہ لبی کا احساس ذہن کے دریچوں پر دستک دیتا اسے ہیجان و سنسنی میں مبتلا کر رہا تھا۔ سنبل کی پُراسرار شخصیت کا کھوج اسے ایک عجیب اضطراب کا شکار بنا رہا تھا۔
''دینے والا جب بھی دیتا ہے چھپر پھاڑ کے ہی دیتا ہے۔ اس پر بالکل بھی محنت کی ضرورت نہیں ہے، بس ذرا سی توجہ اور پیار اسے پکے ہوئے پھل کی طرح میری جھولی میں گرا دے گا۔'' میکال کے ذہن میں سوچ ابھرتے ہی وہ بے چینی سے کروٹ بدل کر رہ گیا۔
''کیا مصیبت ہے بھئی؟ کیوں بار بار کروٹیں بدل رہے ہو؟ سو کیوں نہیں جاتے؟ اپنے ساتھ دوسروں کی نیند بھی حرام کی ہوئی ہے۔'' اقرا نے تلخی سے کہا۔
''کیا وقت آ گیا ہے؟ مصیبت خود کو خود ہی مصیبت کہہ رہی ہے۔'' اس نے جھنجلا کر خود کلامی کی۔
''سو جاؤ اب خدا کا نام لے کر۔'' اقرا نے بیزاری سے اسے مخاطب کیا۔
میکال نے طیش اور تنفر بھری نگاہ اس پر ڈالی اور ایک بار پھر کروٹ تبدیل کر کے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

رات اپنے آخری پہر میں تھی۔
اقرا بستر پر دراز گہری سوچ، اضطراب اور شکستگی میں مبتلا تھی۔ میکال کا رویہ، فرزانہ کی بیزاری اور ناشکری، اسے دبیز اداسی کا شکار بنا چکی تھی۔ اسے سکون درکار تھا جو میکال کی ہم سفری میں ملنا ناممکن ہی تھا۔
''سو جاؤ اقرا اب! کتنی دیر جاگو گی اور؟'' اس نے تاسف سے خود کلامی کی۔ ''تم جس آس اور امید میں یہاں بے چین لیٹی ہو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہونے والا۔ یہ شخص صرف اپنی ذات کا پجاری ہے۔ سو جاؤ! کل بہت سے کام ہیں جو ہر حال میں تمہیں ہی نمٹانے ہیں۔''
اگلے ہی لمحے اسے اپنے موبائل پر کسی پیغام کی آمد سے جھنجلا۔
''اُف! ابھی یہ ذمے داری بھی پوری کرنی ہے۔ میری قسمت میں سکون و آرام کیوں نہیں ہے۔'' اس نے بیزاری سے سوچا اور کروٹ تبدیل کر کے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

اگلے روز سنبل نے حسبِ معمول فرزانہ کو ورزش کروانے کا آغاز کیا تو ان کی طبیعت میں پژمردگی اور تلخی نما بیزاری اس سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ وہ صبر و سکون سے فرزانہ کو مختلف ورزشیں کرواتی رہی۔
''تمہارے پاس سر درد کی کوئی ٹیبلٹ ہوگی؟ فرزانہ نے یکدم اسے مخاطب کیا۔ ''میری میڈیسنز ختم ہوگئی ہیں۔ میکال آج رات کو لے آئے گا۔''
''اپنا خیال رکھا کریں آنٹی جی!'' سنبل نے شیریں انداز میں کہا اور بیگ سے ایک مخصوص پتا نکال کر دو گولیاں ان کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے پانی کا گلاس بھی تھما دیا۔
فرزانہ ممنون نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگیں۔
''اب آپ ریلیکس کیجیے۔ کچھ دیر آرام کریں گی تو ہی یہ ٹیبلٹس اثر کریں گی ورنہ بیزار رہیں گی۔'' اس نے پیشہ وارانہ انداز میں بتایا۔
فرزانہ نے بوجھل مسکراہٹ سے اثبات میں سر ہلایا اور آنکھیں موند لیں۔ سنبل کی آنکھوں میں چمک گہری ہوگئی۔ اس نے اگلے دس منٹ تک فرزانہ کی جانب سے کسی ردِعمل کا انتظار کیا اس کے بعد پُرسکون سے انداز میں چلتی کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس کی توقع کے عین مطابق میکال اپنے لیپ ٹاپ پر کسی کام میں مصروف تھا۔ سنبل کی آہٹ پا کر وہ چونک گیا۔
''میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟'' سنبل نے کھلے دروازے پر ہلکی سی دستک کے بعد کہا۔
''تم...... یہاں...... آؤ نا...... میں تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔'' وہ مسکرا کر بولا۔
''آہاں...... کیا سوچ رہے تھے؟'' سنبل اپنے بازو سینے پر لپیٹ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔
''تمہارا خلوص، سمجھداری اور امی کے لیے اپنائیت۔''
میکال نے بھی اس کی آنکھوں میں جھانک کر ہی جواب دیا۔ وہ اس لمحے یہ بھی فراموش کر بیٹھا تھا کہ سنبل فرزانہ کو کمرے میں تنہا چھوڑ آئی ہوئی ہے۔

سنبل اس کے جواب میں خاموشی سے یک ٹک اس کی جانب دیکھتی رہی۔ وہ کوئی بھی لمحہ ضائع کیے بغیر میکال کو اپنی ہر ایک 'جنبش' سے 'دعوت' دینا چاہتی تھی۔ سنبل کی یہ کوشش بارآور ثابت ہوئی۔ میکال اس کے جذبوں کی حدت سے متاثر ہو کر آگے بڑھا اور چہرہ بے حجاب کر دیا۔ سنبل نے بالکل مزاحمت نہ کی۔ اس کی شہد رنگ آنکھوں میں خمار عود آیا تھا۔ کٹاؤدار عنابی ہونٹوں کی ہلکی مسکراہٹ میں مقابل کے لیے مزید 'شہ' تھی۔

میکال نے اس کے سر سے اسکارف بھی اتار دیا۔ بائیں جانب سے مانگ نکال کر سنوارے گئے شہد رنگ بال منتشر ہو کر مزید پرکشش محسوس ہو رہے تھے۔ ستواں ناک، تمتماتے رخساروں کی دید نے میکال کو مبہوت کر دیا۔

''بہت خوب صورت ہو تم سنبل!'' وہ سحر کے عالم میں کہنے لگا۔

''آہاں...... کتنی خوب صورت؟'' سنبل نے آگے بڑھ کر اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیے۔

اس پیش قدمی نے میکال کے ہوش و حواس مختل کر دیے۔ سنبل نے مخمور انداز میں اپنا عبایہ اتار دیا۔ اس کے نیلگوں کپڑوں میں مقید ہوش ربا سراپا میکال کو دیوانگی میں مبتلا کر رہا تھا۔ سنبل کی نگاہوں میں 'پیاس' اور 'دعوت' نے اسے قرب و جوار سے بیگانہ کر دیا تھا۔ اس کے جذبات برانگیختہ ہونے لگے تھے۔

''اتنی خوب صورت کہ کسی کو بھی پاگل کر دو۔''

''کاش! تم جیسا مرد مجھے پہلے مل گیا ہوتا۔ کاش میں اقرا جیسی خوش نصیب ہوتی۔ کاش تم پر صرف میرا حق ہوتا۔ تمہیں تو علم ہی نہیں ہے کہ میں نے اس جاب کی حامی صرف تمہاری وجہ سے بھری تھی۔ میں تمہارے قریب آنا چاہتی تھی۔''

سنبل کی ان مخمور سرگوشیوں نے میکال کو جذبات سے بے قابو کر دیا۔ اس نے وحشت کے عالم میں اپنے ہونٹ سنبل کے چہرے سے ہم کلام کر دیے۔ سنبل نے بھی جوابی طور پر بھرپور وحشت کا مظاہرہ کیا اور اسے 'بے لباس' کرنے کا آغاز کر دیا۔ میکال کے جذبات اب مکمل طور پر برانگیختہ ہو چکے تھے۔ اس نے سرعت سے دروازہ مقفل کیا اور سنبل کو بستر پر دھکیل دیا۔ سنبل بھی اس دیوانگی میں اس کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ اس کی یہ پیش قدمی میکال کو مخمور کر چکی تھی۔

چند ہی لمحوں بعد یہ خمار اذیت و کرب کی ایک ناقابل بیان لہر میں ڈھل گیا۔ وہ پھٹی ہوئی نگاہوں سے سنبل کے ہاتھ میں ایک مختصر تیز دھار خنجر اور اپنی رانوں پر بہتے لہو کو دیکھنے لگا۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہو پایا تھا کہ سنبل نے کس لمحے اپنے لباس سے وہ خنجر برآمد کیا تھا۔ اس کے حلق سے ڈکراہٹ برآمد ہوئی تو سنبل نے اپنے ہاتھ کو ایک بار پھر مخصوص انداز میں حرکت دے کر اسے بالکل ہی ادھ موا کر دیا۔ اس کے بعد وہ سرعت سے اٹھی، میکال کا موبائل فون اپنے قبضے میں لیا اور عبایہ پہن کر دروازہ غیر مقفل کر کے برآمدے میں نصب جنگلے کے پاس کھڑی ہو گئی۔

اس نے ایک لمحہ کے لیے اپنا تنفس متوازن کیا اور زیریں صحن کی جانب رخ کیے چلاتے ہوئے بولی۔

''اقرا...... اوئے اقرا...... اوپر آ حرامزادی...... ایک منٹ سے پہلے اوپر آجا۔''

اس کی دھاڑ اور طرز تخاطب نے زیریں منزل پر موجود اقرا کا دماغ بھک سے اڑا دیا۔ وہ تن فن کرتی صحن میں آئی اور درشتی سے کہنے لگی۔

''تمہارا دماغ تو ٹھکانے پر ہے......؟'' اس نے اپنی بات کے اختتام پر چند نازیبا کلمات کا اضافہ کیا۔

''تو ایسے نہیں مانے گی۔ تو لاتوں کی بھوت ہے۔ باتوں سے کہاں ماننے والی ہے؟'' سنبل دندناتی ہوئی سیڑھیوں سے اتری اور حیرت و بے یقینی سے ساکت کھڑی اقرا کو بالوں سے دبوچ کر زینے پر گھسیٹنے کا آغاز کر دیا۔

اقرا اس کی وحشت اور جنون کے سامنے خود کو مکمل بے بس محسوس کر رہی تھی۔ سنبل نے چند ہی لمحوں میں اسے میکال کے سامنے لا پٹخا۔ میکال کی 'حالت' نے اقرا کو گنگ کر دیا۔

''یہ...... سب...... کیا......'' وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکی۔

''جیسا کرو گے...... ویسا بھرو گے۔'' سنبل اطمینان سے بولی۔ اس نے ایک بار پھر دروازہ مقفل کر لیا تھا۔

''کیوں؟ میں نے کیا کر دیا تھا ایسا؟'' میکال پھٹ پڑا۔ وہ اس لمحے شدید نقاہت محسوس کر رہا تھا۔

اقرا کی زبان بالکل ہی گنگ ہو چکی تھی۔ سنبل طیش سے آگے بڑھی اور اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے بولی۔

''تو نے ایک نہیں کئی زندگیاں برباد کی ہیں حرامزادے! کئی زندگیاں برباد کی ہیں اور اس بربادی میں صرف تو ہی نہیں یہ...... بھی برابر کی حصے دار ہے۔'' اس نے اقرا کی جانب تنفر سے دیکھا۔

اقرا نے غصے سے بے قابو ہو کر اٹھنا چاہا تو سنبل نے اپنا خنجر اس کے حلق پر رکھ کر مزاحمت کی ہر راہ مسدود کر دی۔ اسے میکال کی جانب سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ 'احساسِ زیاں' سے بے بسی کی سرحد پر پہنچ چکا تھا۔

''تیرے شوہر کی جاب ختم ہونے پر تو نے کیا فیصلہ کیا تھا؟'' سنبل نے ہونٹ بھینچتے ہوئے دریافت کیا۔
''انہیں سپورٹ کرنے کا۔ بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کا۔ میں شادی سے پہلے بھی ٹیچر ہی تھی۔'' اقرا نے تھوک نگلتے ہوئے بمشکل بات مکمل کی۔
''ٹھیک ہے! اچھا فیصلہ تھا۔'' سنبل نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ''بیوی کو ہر قدم پر ہی شوہر کا ساتھ دینا چاہیے۔ پھر اس کے بعد کیا ہوا؟'' وہ سرد مہری سے کہنے لگی۔
''میرا ٹیوشن اچھا چلنے لگا۔ میں سائنس سجیکٹس اچھے پڑھا لیتی ہوں تو جو لوگ اکیڈمیز کی فیسیں افورڈ نہیں کر سکتے یا کسی وجہ سے اپنی بچیوں جو اکیڈمیز کے 'کو ایجوکیشن' ماحول میں نہیں بھیجنا چاہتے وہ مجھ سے کانٹیکٹ کر لیتے۔'' اقرا نے ہونٹ کچلتے ہوئے بتایا۔
''کیا مہان عقل مند تھے نا... ویسے وہ؟'' سنبل نے دانت پیسے۔ ''اپنی اولاد کو کنوئیں سے بچاتے کھائی میں دھکیل دیتے تھے۔''
اقرا نا سمجھی و الجھن سے اسے دیکھنے لگی۔ سنبل کے وجود میں طیش کی ایک لہر اٹھی۔ اس نے اقرا کے دائیں رخسار پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا اور اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑتے ہوئے بولی۔
''لوگ اپنی بچیوں کو تیرے پاس بھیجتے تھے تو تجھے اس بات کا لائسنس کس نے دیا کہ انہیں اپنے کاموں میں الجھا دو۔ تجھے اس بات کا حق کس نے دیا کہ ان سے اپنے ذاتی کام کروانے شروع کر دو۔ انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی نگرانی میں کیوں نہیں رکھا تو نے؟'' سنبل دہاڑی۔
اقرا کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور پردۂ تصور پر مختلف مناظر رقصاں ہو گئے۔ ان سبھی مناظر میں اس کی ذات مشترک مبصر تھی۔
''شانزہ! جاؤ ذرا صحن میں موٹر چلا آؤ۔''
''آنسہ! میں کچن کی لائٹ آن چھوڑ آئی ہوں۔ جاؤ ذرا آف کر آؤ۔''
''صیام! میرے موبائل میں بیلنس ختم ہو گیا ہے۔ جاؤ ذرا باہر سے ایک کارڈ لا دو۔''
''احمد! چھٹی سے پہلے مجھے ایک کلو چکن لا دینا۔''
آغاز میں ان چھوٹے موٹے کاموں سے قدرے سکون ملا تو اس نے تعاون کا دائرۂ کار وسیع کر دیا۔
''بارش کا موسم ہو رہا ہے صحن میں دھلے ہوئے کپڑے تاروں پر بکھرے ہیں۔ رومیصہ اور ثناء! تم دونوں باہر جا کر کپڑے اتار لاؤ۔''
''کچن میں چائے کے برتن سنک میں پڑے رہ گئے ہیں۔ نمرہ! ذرا تم جا کر انہیں دھو آؤ۔ صبا کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ وہ باقی برتن ریکس میں لگا کر فرش پر وائپر لگا دے گی۔''
بچیاں یہ کام بہت خوشی سے انجام دیا کرتیں۔ اقرا ان کی خوشی و جوش پر حیران بھی ہوا کرتی تاہم اپنی ذات کو کام کاج سے رعایت ملنے والا سکون ایک بنیادی نکتہ فراموش کروا بیٹھا کہ وہ سب یہ کام بخوشی اس لیے کر لیتی تھیں کہ انہیں پڑھائی سے وقتی بریک ملتے ہوئے ایک دوسرے سے 'گپ شپ' کا ٹائم مل جاتا تھا۔ اقرا کو جب کسی کے بھی والدین کی جانب سے کوئی 'شکایت' موصول نہ ہوئی تو وہ مزید شیر ہو گئی۔ اس نے اپنے مطالبات کا دائرۂ کار مزید بڑھا دیا۔ اب وہ ان بچیوں کو بالائی منزل پر بھی بھیج دیا کرتی۔
''دادو کے کمرے میں پانی کا یہ جگ رکھ آؤ..... اور دیکھ لینا اگر کوئی برتن وغیرہ پڑے ہوں تو اٹھا لانا۔''
''ثناء! دادو کے کمرے کی صفائی کر دو گی کیا؟''
''جی باجی! کر دوں گی۔ میری ماما کہتی ہیں کہ بیمار کی خدمت کرنے سے اللہ خوش ہوتا ہے۔'' وہ اسے جوش سے بتاتی اور ایک توقف سے گویا ہوتی۔
''باجی! میں شانزہ کو بھی لے جاؤں ساتھ؟''
''ہاں! لے جاؤ۔ جلدی ہو جائے گا کام۔'' وہ تائید کرتی۔
''انابیہ! انکل سے میرے موبائل کا چارجر تو لے کر آؤ۔ بیٹری لو ہے بالکل۔''
سنبل اس لمحے اقرا کے چہرے کا ہر اتار چڑھاؤ غور سے دیکھ رہی تھی۔
''ہاں، ہاں! کرو یاد۔ سب کچھ یاد کرو۔ تم نے بہت ظلم کمایا ہے اقرا۔ بہت ظلم کمایا ہے۔ ایک ہنستے کھیلتے وجود کو اس کی درندگی کا نشانہ بنا دیا۔ کیا کر دیا تم نے یہ؟ تم اتنی نا سمجھی کیسے کر سکتی ہو؟ تمہیں اکیلے کمرے میں ایک تنہا مرد کے پاس بچیوں کو بھیجتے ذرا بھی خیال نہیں آیا؟'' اس نے تنفر سے استفسار کیا۔
''لیکن تم نے تو کہا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔'' اقرا کی آواز پھٹنے لگی تھی۔ اس کے وجود میں یقین اور مان کی کرچیاں شکستہ ہو کر بہت جان لیوا انداز میں چبھنے لگی تھیں۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میکال اس حد تک بھی گر سکتا ہے۔
دوسری جانب میکال اپنی مردانگی سے محروم ہونے کے بعد ہر ایک پل موت کا شکار ہو رہا تھا۔ اسے اپنے وجود سے گھن آ رہی تھی۔ وہ اپنے نفس سے اس حد تک کیسے مغلوب ہو گیا تھا

کہ بچیوں کے جسمانی نشیب وفراز سے چھیڑ چھاڑ کا وقتی سکون حاصل کرنے کے لیے انہیں ہراساں کرنے لگا۔ اس نے انابیہ کو اس حد تک دباؤ زدہ اور ہراساں کیا تھا کہ وہ اپنی ذہنی کیفیت پر قابو نہ رکھ پائی اور زینوں سے لڑھک کر خود کو زخمی کر بیٹھی۔

"ہاں! اس کے ساتھ ویسا کچھ نہیں ہوا تھا لیکن جو بھی ہوا اس کا کیا جواز ہے تمہارے پاس؟ کمینو...! تم لوگوں کو کس نے یہ حق دیا تھا کہ کسی کلی کو اپنی وحشت سے مسل کر اس کی نرمی کچل دو۔"

سنبل کے اس تلخ سوال کا کسی کے پاس بھی جواب نہیں تھا۔ وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پل پل موت کا شکار ہو رہے تھے۔ اقرا کو اس مقدس پیشے میں ذاتی مفاد ملوث کر دینے کا ملال تھا تو میکال کا احساسِ زیاں بدترین موت سے بھی بدتر تھا۔

"مار دو مجھے! تمہیں خدا کا واسطہ ہے مجھے مار دو۔" وہ گڑگڑایا۔

"نہیں! میں تمہیں ماروں گی نہیں۔ تم زندہ رہو گے۔ ہر پل مرنے کے لیے اور یہ تمہارے روپ میں ایک 'سزا' پا کر ہر لمحہ مرے گی۔ ایسے ہی زندگی گزرے گی تم لوگوں کی۔ اگر بہت ہمت ہوئی تو خودکشی کر لینا۔" وہ تنفر سے بولی اور پھر عجلت میں دروازہ غیر مقفل کر کے باہر چلی گئی۔ اسے اب اپنی اگلی اور مبینہ طور پر آخری منزل کی جانب بھی روانہ ہونا تھا۔

☆☆☆

بس میں کھڑکی کے ساتھ نشست پر بیٹھی سنبل کے ذہن میں جھکڑ رواں تھے۔ اسے سٹی اسپتال میں اپنی ملازمت، انابیہ اور اس کے والدین سے ملاقات اور اس کے بعد واقعات در واقعات کا سلسلہ ایک عجیب سے بوجھل پن میں مبتلا کر رہا تھا۔ ان واقعات کی بازگشت اور پھر اقرا، میکال کے کردار اسے مزید آزردہ کر رہے تھے۔ حلق میں آنسوؤں کا پھندا اس قدر بڑھ گیا کہ ان کے حجم سے حلق پھٹنے کا گمان ہونے لگا۔

وہ تیزی سے پلکیں جھپک کر اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ اگلے ایک گھنٹے کا سفر اسی کشمکش میں بیت گیا۔ بس سے اترتے ہی اس نے لاشعوری طور پر اپنے اسکارف کو مزید پھیلایا اور حجاب درست کرتے ہوئے غیر متوازن قدموں سے چلتی آگے بڑھ گئی۔ اس کے دل و دماغ پر تلخ یادوں نے بھرپور انداز میں دھاوا بول رکھا تھا۔ وہ قرب وجوار کے مناظر اور لوگوں سے نظریں چراتی شدید ہراساں دکھائی دے رہی تھی۔

"خود کو سنبھالو سنبل! بہادر بنو! اگر یہاں تک آنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو بہادری سے ہر چیز کا سامنا کرو۔" اس نے خود کو گھرکا اور اپنے قدموں میں توازن پیدا کرنے کی کوشش میں ہلکان ہونے لگی۔

یہ کشمکش اگلے پندرہ منٹ یونہی جاری رہی۔ اس سفر کا اختتام ایک سال خوردہ بھورے رنگ کے چوبی دروازے پر ہوا۔ اس دروازے پر پہنچتے ہی سنبل کی آنکھوں میں آتشیں جلن پیدا ہونے لگی تھی۔ آنکھوں کی نمی باقاعدہ آنسوؤں کی باڑھ میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے چند لمحے وہیں کھڑے رہ کر خود کو پُرسکون کیا اور گہرے سانس لیتی اندر بڑھ گئی۔

دروازہ حسبِ توقع غیر مقفل ہی تھا۔ مٹی اور خشک پتوں سے اٹے صحن میں اپنے قدموں کے نشانات ثبت کرتی وہ ایک کمرے میں داخل ہوئی تو نیم تاریکی اور گھٹن کی مخصوص باس نے اس کا استقبال کیا۔ کمرے کے ایک کونے میں بان کی مخصوص چارپائی رکھی تھی جس پر پڑے سفید بستر کا رنگ اب بالکل میلا ہو چکا تھا۔ اس بستر پر دراز وہ نحیف وجود اس شخص کا تھا جو اس کے لیے خوف اور دہشت کی علامت ہوتا تھا۔ پرویز خورشید۔ سنبل کے 'ابا جی'۔ ایک سخت گیر اور اپنے اصولوں میں بے لچک انسان۔

سنبل نے اس گھر میں اپنی زندگی کے بارہ برس گزارے تھے اور ان بارہ برسوں کی تلخ یادیں آج بھی کسی آسیب کی طرح اسے اپنی گرفت میں جکڑے ہوئی تھیں۔ پرویز کی سخت گیری اس کی والدہ اور ان دونوں بہنوں کے لیے ایک دائمی امتحان تھی۔ وہ معمولی ترین باتوں پر بھی ان تینوں کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا تھا۔ نتیجتاً وہ اعتماد سے عاری اور سہمی ہوئی شخصیت کی حامل بنی پروان چڑھ رہی تھیں۔ اس روایتی ماحول میں پرورش پاتے ان کی کہانی اسی روایتی انداز میں آگے بڑھی جو اس معاشرے کا ایک ناسور بن چکا تھا۔ سنبل سے دو سال چھوٹی انعم کو ان کے علاقے کے ایک دکاندار نے جنسی ہراساں کیا۔ سکینہ نے یہ بات شوہر سے پوشیدہ ہی رکھی تھی لیکن آٹھ سالہ انعم اس اذیت اور کرب کا دباؤ برداشت نہ کر سکی۔ وہ انابیہ کی طرح اعصابی تناؤ کا شکار ہوئی اور بخار کے ہذیان میں اپنے ساتھ ہونے والے سانحے کا راز فاش کر دیا۔ اس روز گھر میں ایک قیامت برپا ہو گئی تھی۔

"تو نے اتنی بڑی بات چھپائی مجھ سے؟ تیری اتنی مجال؟" پرویز نے دہاڑ کر کہا تھا۔

"میری بات سنیے۔ میں آپ کو ساری بات آرام سے سمجھاتی ہوں۔ اندر چل کر آرام سے بیٹھیے۔" سکینہ ہچکچاتی ہوئی۔

"میں تیری کوئی بھی گندی بکواس نہیں سننا چاہتا۔ اس حادثے کی ذمّے دار صرف اور صرف تو ہی ہے۔" پرویز کی نفرت زدہ آواز نے کمرے میں دبکی سنبل کو سہما دیا۔ اس نے ایک چارپائی پر بے سدھ لیٹی انعم کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔

"میں نے کیا کردیا ہے؟ کوئی بھی ماں اپنی اولاد کے ساتھ کچھ غلط کیسے کرے گی؟" سکینہ تڑپ گئی۔

"تو نے ہی کیا ہے۔ تجھے بچی کو باہر بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ میں تجھے منع کرتا تھا کہ بچیوں کو اکیلے باہر مت بھیجا کر۔ تو نے میری ایک نہیں سنی۔ شوہر کی نافرمان عورتیں ایسے ہی سزا پاتی ہیں۔" پرویز کی آواز غصے میں بلند ہونے لگی تھی۔

"میری طبیعت خراب تھی اس لیے....." سکینہ نے اپنی صفائی دینی چاہی۔

"زبان چلاتی ہے میرے سامنے!" پرویز نے سکینہ کو ایک طمانچہ رسید کیا۔

"نہیں وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب تو میرے پلے پڑ گئی۔ عذاب بنا کے رکھ دی ہے میری زندگی تو نے۔"

"تو آپ نے بھی کون سا پھولوں کی سیج پر بٹھا رکھا ہے مجھے؟ زندگی تو میری عذاب بنی ہے جو ایک جاہل انسان کے پلے بندھ گئی ہیں۔ جسے رشتوں کی عزت ہی کرنی نہیں آتی۔" سکینہ بھی اپنا ضبط کھو بیٹھی۔

"اتنی ہی تنگ ہے تو دفع کیوں نہیں ہو جاتی؟ میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔" پرویز دہاڑا۔

اس چیخ و پکار میں انہیں اندازہ ہی نہ ہوا کہ یہ آوازیں قریبی ہمسایوں کے گھر تک پہنچنے کے بعد سبھی راز منکشف کر چکی ہیں۔ پرویز نے دونوں بچیوں کو اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ روتی تڑپتی سکینہ اپنے والدین کے پاس منتقل ہوگئی لیکن انعم اور سنبل کی زندگیاں ایک نئی آزمائش میں مبتلا ہوگئیں۔ انعم کے ساتھ ہونے والا حادثہ زبان زدعام تھا۔ علاقے کا ہر ایک مرد اب اسے ہی نہیں بلکہ سنبل کو بھی اسی نظر سے دیکھتا تھا۔ ان کے تئیں وہ جنسی آسودگی سے آشنا ہوکر اب ان کے لیے ایک 'فری پیکیج' بن چکی ہیں۔ وہ جب چاہیں اور جس طرح چاہیں انہیں اپنے 'مصرف' میں لاسکتے ہیں۔ یہ صورت حال اس وقت مزید بدتر ہوگئی جب اسکول کے چوکیدار نے بھی جنسی دیو کا روپ دھار لیا۔ پرویز نے انہیں تنہا گھر آنے سے منع کر رکھا تھا۔ وہ اپنے دفتر سے انہیں خود لینے آیا کرتا۔ ایک روز ٹریفک میں پھنس جانے کے باعث تاخیر ہونے سے ان دونوں کو شامت اعمال نے گھیر لیا۔

"میں نے سنا ہے تمہارے ساتھ اس دکان پر کچھ مسئلہ ہوا تھا؟" رشید ان دونوں کے پاس آکر معنی خیزی سے کہنے لگا۔

انعم اور سنبل ہراساں ہوکر ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ اسکول کی تبدیلی کے باوجود یہ قصہ جانے کیسے یہاں تک پہنچ گیا تھا؟

"پریشان کیوں ہو رہی ہو؟ تمہارے ساتھ کچھ غلط نہیں ہوا تھا۔ یہ سب تو زندگی کا ایک حصہ ہے۔ ایک لازمی حصہ۔" رشید نے انعم کا ہاتھ نرمی سے تھام لیا۔

"چھوڑ دو میری بہن کو! چھوڑ دو اسے۔" سنبل چلائی۔

انعم البتہ خوف و دہشت سے گنگ ہو چکی تھی۔

"ارے! اس میں چلانے کی کیا بات ہے؟ کہہ تو رہا ہوں کہ یہ سب زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اور اس میں بہت سکون بھی ہے۔" وہ خباثت سے بولا۔ "چھٹی کے بعد میرے ساتھ تھوڑا وقت گزار لیا کرو۔ میں تمہیں کھلونے اور کتابیں بھی لے کر دوں گا۔" اس نے انعم کے ہونٹوں کو انگلیوں سے مسلا اور سنبل سے مخاطب ہوکر کہنے لگا۔

"ویسے تمہاری بہن نے تمہیں بھی سب کچھ بتایا تو ہوگا۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں بھی یہ سکون......"

رشید کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی انعم نے ہذیانی انداز میں اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے اور دہشت سے آنکھیں میچے اسکول سے باہر نکل گئی۔

"انعم! رکو انعم! کہاں جا رہی ہو؟" سنبل خوفزدہ ہوکر اس کے پیچھے لپکی۔

انعم اس دوران مرکزی سڑک پر پہنچ چکی تھی۔ بند آنکھوں سے وحشت زدہ انداز میں دوڑتے وہ ایک گاڑی کی زد میں آئی۔ سنبل نے اس کا جسم ہوا میں اچھل کر سڑک پر گرتے اور پھر ایک دوسری گاڑی سے کچلتے ہوئے دیکھا۔ اس کی حسیات خوف و دہشت سے بالکل منجمد ہو چکی تھیں۔ اگلے ہی لمحے وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگئی۔

سنبل کے ہوش میں آنے سے قبل انعم کی تجہیز و تکفین کے مراحل مکمل ہو چکے تھے۔ سنبل نے بیٹی کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے آنے والی سکینہ کو دیکھا تو ماں کے ساتھ روانگی کے لیے مصر ہوگئی۔

"مجھے آپ کے ساتھ نہیں رہنا ابا جی! انعم کو اس گاڑی نے نہیں بلکہ آپ نے مارا ہے۔ آپ اپنا غصہ کنٹرول کر لیتے تو یہ بات بھی اوپن ہی نہ ہوتی۔ آپ ذمّے دار ہیں۔ صرف اور صرف آپ۔ اور اچھا ہوا مرگئی انعم! زندہ رہتی تو یہ دنیا اسے ہر

لمحہ مارتی۔ اللہ کرے میں بھی مر جاؤں۔ اللہ مجھے بھی موت دے دے۔" وہ شکستگی سے پھٹ پڑی۔

پرویز اس کی وحشت کے سامنے بے بس ہو گیا۔ سنبل، سکینہ کے ساتھ ننھیال منتقل ہو گئی لیکن اپنی ذات سے انعم کے ساتھ ہونے والے سانحے کا ٹھپہ نہ اتار سکی۔ اسے ہر ایک آنکھ میں اپنے لیے شہوت اور طلب ہی دکھائی دیتی تھی۔ وہ ایک شدید نفسیاتی الجھن میں مبتلا ہو گئی تھی کہ اس کے قرب و جوار کا ہر شخص اس کا صورت آشنا اور اس حادثے سے آگاہ ہے۔ اس صورتِ حال سے تنگ آ کر اس نے نقاب اوڑھنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد سکینہ ایک اور شہر میں منتقل ہو گئی اور اپنی بساط کے مطابق بیٹی کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے لگی۔ وہ اسے اپنی خواہش کے مطابق ڈاکٹر تو نہ بنا سکی البتہ نرس ضرور بن گئی تھی۔

"کون ہے وہاں؟" پرویز کی آواز نے سنبل کو ماضی کے پُرخار سفر سے واپس لا پٹخا۔

"میں ہوں ابا جی!" اس کی آواز رندھ گئی۔

"سنبل! آ گئی تو میری بچی؟ اتنی دیر کیوں کر دی؟" پرویز نے بلکتے ہوئے کہا۔

سنبل کے لیے والد کا یہ روپ بالکل انوکھا تھا۔ اسے اس لمحہ اپنا وجود گداز ہوتا محسوس ہونے لگا۔ برسوں کے شکوے شکایات کا کہر پل بھر میں ہی چھٹ گیا تھا۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھی اور پرویز کے سینے میں سما گئی۔ والد کی مانوس خوشبو نے اسے سراپا اشک بنا دیا تھا۔ وہ اپنی یہاں آمد کا مقصد یکسر فراموش کر بیٹھی تھی۔ اسے پرویز سے ماضی میں کی گئی زیادتیوں کا 'عملی' حساب لینا تھا لیکن ان کی آواز سنتے ہی ذہن بالکل سپاٹ ہو گیا تھا۔

"اتنی دیر کیوں کر دی؟ میں کتنی دعائیں مانگتا تھا کہ میری زندگی کا سفر ختم ہونے سے پہلے تجھ سے ایک بار ملاقات ہو جائے۔ میں تجھ سے معافی مانگنا چاہتا تھا میری بچی! تیری اس آخری بات کی پھانس آج تک میرے دل میں گڑی ہے۔ میں اپنے غصے پر قابو کر لیتا تو شاید وہ سب نہ ہوتا۔ ہم ایک ساتھ رہتے۔" وہ روتے ہوئے بولا۔

"جو کچھ ہونا تھا ہو گیا ابا جی! دکھ تو اس بات کا ہے کہ آج بھی وہ سب اسی شدت سے ہو رہا ہے۔ آج بھی کسی ننھی کلی کے مسلے جانے کے بعد ہر شخص اسے مسلنا اپنا حق سمجھتا ہے۔" سنبل کے ذہن میں انابیہ کا سراپا گھوم گیا۔ اس نے انابیہ اور اس کے والدین کو اپنی تجربہ کردہ اذیت سے نجات کے لیے ہی زندگی سے آزاد کیا تھا۔

"ہاں میری بچی! میں بھی اسی دنیا میں رہتا ہوں۔ سب کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہوں۔ اسی لیے دعا کرتا تھا کہ تجھ سے ایک بار ملاقات ہو جائے۔ میں تیرے ذمے ایک قرض کی ادائیگی لگانا چاہتا ہوں۔" پرویز کا لہجہ سرسرایا۔

"کیسا قرض ابا جی؟" وہ حیران ہوئی۔

"مسیحا بن جا۔" پرویز نے سرگوشی کی۔ "ان جاہل اور کم عقل لوگوں کو شعور دے کہ بچیوں کی حفاظت کریں۔ ان کے ساتھ ہونے والے حادثے کی تشہیر کر کے ان کی زندگیاں عذاب نہ بنائیں۔ ان بچیوں کو اعتماد دے۔ انہیں زندگی کا ایک نیا اور مثبت سبق سکھانا۔ بول میری بچی! ایسا کرے گی نا تو؟"

"ہاں جی ابا جی! میں ایسا ہی کروں گی۔" سنبل نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے ہامی بھری۔

پرویز نے آسودگی سے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

سنبل اپنے آبائی گھر کے باہر کھڑی تنقیدی نظروں سے عمارت کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ گزشتہ ایک ماہ سے اس کی تعمیر و تزئین میں مگن تھی۔ اس نے گھر کی ساخت میں کچھ تبدیلیاں کر کے اسے ایک نیا روپ دے دیا تھا۔ وہ عنقریب یہاں ایک فلاحی ادارہ کھولنا چاہتی تھی جس میں پرویز کی خواہش کے مطابق معاملات رواں رکھے جا سکیں۔ ان خیالات میں مگن سنبل کو موبائل فون کی گھنٹی نے چونکایا۔ اسکرین پر ڈاکٹر رندھاوا کا نمبر اور نام جگمگا رہا تھا۔

"السلام علیکم ڈاکٹر صاحب! کیسے یاد کیا؟" وہ بشاشت سے بولی۔

"وعلیکم السلام! آپ کو یہ یاد کروانے کے لیے کہ کل آپ نے چیک اپ کے لیے آنا ہے۔" دوسری جانب سے ایک نرم و پُرخلوص آواز سنائی دی۔

"جی ہاں! مجھے یاد ہے۔ میں ضرور حاضر ہو جاؤں گی۔" اس نے اعتماد سے کہا۔

"او کے! اور 'مسیحا' کے متعلق مزید کسی ہیلپ کی ضرورت ہو تو بھی بتائیے گا۔" ڈاکٹر نے خلوص سے پیشکش کی۔

"یس شیور! وائے ناٹ!" سنبل مسکرائی۔

پرویز کے اس دیرینہ دوست نے سنبل کی دامے درمے سخنے بھرپور انداز میں مدد کی تھی۔ پرویز نے اپنی جمع پونجی بھی اس کے حوالے کر دی تھی۔ ڈاکٹر رندھاوا کا فون بند کرنے کے بعد سنبل نے ایک گہری سانس لی اور عمارت کی پیشانی پر آویزاں بورڈ 'مسیحا' کو آبدیدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

❖❖❖